وما دام ذکر العبد بالفضل باقیا فذالک حیٌّ وھو فی الترب ھالک

تذکرۂ علامۂ میر عبدالجلیل بلگرامی

موسوم بہ

حیات جلیل



حصۂ اوّل

متضمن حالات ذات و صفات علامۂ ممدوح

وحواشی و فوائد مشتمل بر ذکر مختلف بلاد و معارف و عمائد

از

مولوی سیّد مقبول احمد صاحب صمدنی

ممبر رائل ایشیاٹک سوسائٹی آف گریٹ برٹین اینڈ آئرلینڈ۔ و فیلو رائل

سوسائٹی آف آرٹس، مینوفیکچرس اینڈ کامرس، لندن وغیرہ

*

یادِ ماضی کے بہت نقش ابھی باقی ہیں   حافظہ دل کی طرح زود فراموش نہیں

فہرست عناوین مضامین تذکرہ میر عبدالجلیل بلگرامی حصہ اول

فہرست حواشی و فوائد تحت المتن تذکرۂ میر عبد الجلیل بلگرامی حصہ اوّل

ف

ف

جدول بعض اغلاط طبع۔ حصہ اول

صفحہ	سطر متن	سطر نوٹ	غلط	صحیح	صفحہ	سطر متن	سطر نوٹ	غلط	صحیح
۳	۴	-	بَہ تی	تباری	۶۱	۶	-	ہیں"	ہیں۔
۴	۳		حہ	جبہہ	״	۷	-	گلزارابرار	گلزار ابرار،
۶	-	۱۵	۲ مخطسے)	۲ الخطیرۃ سے	״	۱۹	-	مذکو الصدر	مذکور الصدر
۲۵	-	۱۳	لؤو	۲ لؤ	۶۶	۱۷	-	سبحانہٗ	سبحانہٗ
۲۶	-	۵	صولَ	مولیٰ	״	۱۷	-	شانہٗ	شانہٗ
۳۰	-	۷	للالی	لآلی	۶۸	-	۱	سفربت	غربت
۳۳	۴	-	چلاوں	حلاوت	״	-	۵	کہلاہتا	کہلاتا تھا
۳۵	-	۴	۲ العاوت	۲ الغاوت	۶۹	-	۴	حبن	مہلں
۲۸	۴	-	سعادت خان ۵۴۷	سعادت خان ۷۵	״	-	۸	۱۵۲۶ء	(۱۵۲۶ء)
۳۴	-	۱	عماہ	عمادؔ	۷۱	-	۹	ضیاد پاشا	ضیاء پاشا
۵۳	۸	-	درمددری	ومدہ دری	۷۹	۳	۴	لم یکن	لم یکن
۵۶	۱۶	-	سخہ سُرو	نسخہ سرو	״	۵	-	استخفاظ	استحفاظ
۵۷	۱		نقل	سے نقل	۸۷	-	۴	لہ	لہ
۵۸	۳	-	لیسب	بشب	۹۷	-	۱۳	نفرہ	نقرہ

صفحہ	سطر متن	سطر نوٹ	غلط	صحیح	صفحہ	سطر متن	سطر نوٹ	غلط	صحیح
۱۱	۸	۰	الاِتباعِ	الاتباعُ	۲۱۲	۰	۳	فجمعہٗ	فجمعہٗ
۱۱	۹	۰	فکذبت	فکذّبتَ	۲۲۵	۹	۰	تہیاء	تہیۂ
،،	۱۶		یحفون	یَحُفّوْنَ					
۱۱۲	۳	۰	مولانا	مولانا	،،	۱۵	۰	انجادم	انجام
۱۱۶	۱	۰	وَ ۲ صـ ۳	وَ ۲ صـ ۳	۲۴۸	۱۱	۰	تہباء	تہیۂ
۱۶۴	۰	۱	بانکے بور	بانکی پور	۲۴۹	۳	۰	۱۱۱۶ھ	۱۱۱۶ھ
۱۶۶	۲۱	۰	اعما	اِتّما	۲۵۱	۰	۳	بیتں	نکیں
۱۹۷	۰	۹	انفصل	افضل	۲۶۴	۴	۰	فضل کمال	فضل و کمال
۲۰۶	۰	۲۲	حنیفہ	حنفیہ	۲۷۱	۰	۳	تفصیل	تفضیل
۲۱۱	۰	۹	بعض ،،	بعض منزل فتاویٰ سراجیہ	۲۷۳	۲	۰	ضعفہٗ	صعقہٗ



ربنا لک الحمد

یا ازلیؔ الفیاض، یا ابدیؔ البقا ۔ انت اجیلؔ العطا انت عجیلؔ الرضا

عشق ترا جان فزا، شوق ترا دل ربا ۔ ذکر ترا قوت روح، نام ترا غم زدا

راہ تقرب مین تھا، نفس شقی اژدہاؔ ۔ جادۂ تسلیم کو، تو نے بنایا عصا

ہوش کا جب کارواں، تیری طلب مین چلا ۔ نعرۂ ہو بن گیا، شوق کو بانگ درا

مکتب عرفان ترا، درس گہ انبیا ۔ شرح حقیقت تری، درس حروف ہجاؔ

راہ مین تیری جو ہون صدق و یقین گام زن ۔ دیدۂ حوراؔ بنے، حسن مین ہر نقش پا

علت خلق حدوثؔ، اس کے سوا کچھ نہین ۔ حسن قدم کے لئے آئنہ ہو، ماسوا

تیرے حرم کا غبار، تیرے مکان کا سواد ۔ غازۂ روئے یقین، سرمۂ چشم صفا

روز ازل کی خبر، اور کسے جز ترے ۔ اپنی قدامت پہ تو، آپ ہے اپنا گوا

پھول مین گلزار ہے، پھول ہے گلزار مین ۔ وحدت کثرت نما، کثرت وحدت نما

تیرا ازل ہے ابد، تیرا ابد ہے ازل ۔ کس کو کہون ابتدا، کس کو کہون انتہا

---

۱ ازل ہمیشگی۔ وہ زمانہ جس کی ابتدا نہین۔ ۲ ابد ہمیشہ۔ وہ زمانہ جسکی غایت و انتہا نہین ۳ اجیل۔ دیر کرنے والا ۴ عجیل جلدی کرنے والا ۵ اژدہا۔ اژدر۔ مار بزرگ جثہ ۶ حروف ہجا۔ الف، بے، تے، ثے وغیرہ سے مراد ہے ۷ حورا، خوب گوری عورت جسکی آنکھون کی سیاہی سیاہ گہری اور بال خوب کالے ہون ۸ حدوث نئے نئے واقعات اور چیزون کا پیدا ہونا۔ مخلوقات کی صفت ہے۔

بادۂ روزِ الستؔ۱، اس میں ضیا بار ہو — جامِ شرابِ کہن، ہے یہ دلِ مبتلا
ساحتِ۲ عرفان ترا، ہو کا عجب ہے مقام — ہوش اسی جا نہیں، فہم و خرد کے بجا
پردہ بھی تیری صفت، آنکھ نے دیکھا نہ کچھ — جب یہ حجاب اُٹھ گیا، ذات ہوئی رونما
جاؤں کدھر ڈھونڈھنے، پاؤں کہاں تیرا مثل — تجھ سا ملے بھی اگر، تو ہی ہوا، وہ دوسرا
جل کے فنا ہو گئے، سب خس و خارِ ہوس — تیری تپِ عشق جب دل میں ہوئی شعلہ زا
پردہ زنبور ہے، تیری نقابِ جمال — تیرا اخفا ہے عیاں، تیرا عیاں ہے خفا
آنکھ میں بھی تو مکیں، دل میں بھی تو جاگزیں — وہ ترا جلوت کدہ، یہ تری خلوت سرا
آبِ بقا کا اثر، تیری تفِ۴ غم میں ہے — یہ مرض لادوا، آپ ہے اپنی دوا
ہے تو ہی اے لایزال! وجہ قیام و زوال — تجھ سے عدم کو دوام، تجھ سے فنا کو بقا
ساغرِ جمشید میں، ایک جہاں کی نمود — بادۂ عرفاں سے آنکھ، جامِ دو عالم نما
دونوں جہاں بھی نہیں ایسے لہو کی دیت۵ — خون ہے وہ بے بہا، جس کی بہا تو ہوا
یوں تہِ شمشیرِ عشق، حوصلہ میرا بڑھے — شوق ہر اک ضرب پر مجھ سے کہے "مرحبا"
خاک میں جو مل گیا، تیرے لئے ہو کے خاک — وہ ہی ہوا کیمیا، ورنہ کہاں کیمیا
قابلِ بابِ قبول کیوں نہ ہو میری نماز — عشق کا میں مقتدی، عشق مرا مقتدا
میری تمنا کہاں، اور نکلنا کہاں — کاش نکلے بجائے تو، دل کا مرے مدعا
نشترِ غم فضول، فصد رگِ جاں عبث — روح کا دمساز ہے، عشق کا ماخولیا۶
مرنے سے پہلے مروں، تاکہ ہمیشہ جیوں — میری بقا ہو فنا، میری فنا ہو بقا
بہرِ رسولِ جلیل، کر یہ دعا مستجاب — سہل ہو مقبول یہ، سختیِ روزِ جزا

ف۱ آیۂ کریمہ اَلَسْتُ بِرَبِّکُمْ قَالُوْا بَلٰی کی طرف اشارہ ہے۔ اَلَسْتُ لفظی معنی "آیا میں نہیں ہوں"۔ ف۲ ساحت کشادگی، فضائے مکان۔ ف۳ ناحیہ۔ ف۴ تف بخار و گرمی۔ ف۵ دیت خوں بہا۔ ف۶ ماخولیا۔ مالیخولیا کا مخفف یونانی لفظ، خلط سیاہ کے معنی میں ہے۔ ایک دماغی مرض جو سوداویت سے پیدا ہو جاتا اور بہت زیادہ فکر اور سوچنے کا نتیجہ ہوتا ہے۔ مگر ایسا دیوانہ کسی کو اذیت و تکلیف نہیں دیتا۔

تیرے کرم کا وفور، عدل پہ غالب رہے ۔۔۔ خلعتِ بخشش ملے، اس کو بجائے سزا

والصلوٰۃ والسلام علیٰ رسولک المقبول

یا شرف الاتقیا، یا حسن الاولیا ۔۔۔ قلبک عین الجلا، نفسک اصل الصفا
انت جمیل الشیم، انت سری العطا ۔۔۔ انت شفیع الامم، انت نبی الوریٰ
جانتے تھے انبیا، اپنا تجھے مقتدا ۔۔۔ مسجد اقصیٰ میں کی، سب نے تری اقتدا
ناسخ ہر سہ کتاب، ماحیٔ کفر و شقاق ۔۔۔ برزخ کبریٰ[۱۳] لقب، رحمت حق مصطفیٰ
صاحب فہم و فطن، واقف سرّ و علن ۔۔۔ عالم علم لدنی[۱۴] محرم راز خدا
خواجۂ گردوں مسیر، مہبط روح القدس ۔۔۔ قدسیٔ انساں سرشت، باقیٔ فانی نما
دادرس بیکساں، ناصر واماندگاں ۔۔۔ چارہ گر عاصیاں، شافع روز جزا
ماہ سپہر جلال، نیّر اوج کمال ۔۔۔ لعل بدخشان مجد، گوہر بحر علیٰ
مجمع رحم و کرم، مظہر لطف اتم ۔۔۔ منبع دریائے فیض، مصدر جود و عطا
نقش کف پا ترا، شمع رہ راستی ۔۔۔ عارض انور ترا، آئینۂ حق نما
تیری مطہر نگاہ، موجۂ آب طہور ۔۔۔ دیدۂ حق بیں ترا، چشمۂ عین الصفا
شمسۂ ایواں ترا، مہر مبیں کے مثال ۔۔۔ چرخ بریں کا جواب، گنبد خضرا ترا
تیرا وہ چرخ جلال، جس میں کہ بے قیل و قال ۔۔۔ کرمک شب تاب ماہ، انجم و نیّر ہبا[۱۵]
کس کی رہین وجود، ہے یہ جہاں کی نمود ۔۔۔ باعث ایجاد[۱۶] خلق، کون ہے تیرے سوا
نور سے کس کے بجھا، نار عجم کا چراغ ۔۔۔ جز تری شمع جمال، کس میں تھی اتنی ضیا

---

۱۳ برزخ کبریٰ۔ خالق و مخلوق کے مابین وسیلہ و ذریعہ۔ دراصل برزخ وہ چیز ہے جو دو متخالف و متغائر چیزوں کے درمیاں حائل ہو۔ ۱۴ علم لدنی جس کو خداتعالیٰ محض اپنے کرم و فضل سے بلاسعی وکوشش کسی کو عطا کردے یا بغیر دوسرے سے تعلیم پانے کے ذہن و طبیعت سے خود بخود حاصل ہوجائے ۱۵ ہبا غبار یا چیز وہ گرد و ہوا، جو روشنی میں روزن در سے آجاتی ہے ۱۶ ایجاد خلق کا باعث۔ حدیث قدسی لولاک لما خلقت الافلاک کی طرف اشارہ ہے۔

وہ ہے ترا اسمِ پاک، اے شہِ عالی نژاد! | سُن کے تنگ بھی جسے، کہتے ہیں صلِّ علیٰ
قامتِ عُزّیٰ[۱۷] جلا، نارِ غضب سے تری | تیشۂ لا[۱۸] سے ترے، لات کا نقشہ مٹا
ہو کے مجلّیٰ بنی، مہر اُسی کی جبین | جو تری دہلیز پر، جا کے ہوا جبہ سا
جب بھی تھا چاروں طرف نور ترا ضو فگن | عالمِ لاہوت[۱۹] بھی، تجھ سے نہ خالی رہا
دو سبھوں سے تھا جسم میں سایہ ترے | تو ہی تھا نورِ خدا، تو ہی تھا ظلِّ خدا
اُس کی صفائی پہ ہو کیوں نہ طہارت گواہ | جس سے قرآں میں پاک جس کو کرے انّما[ف۲]
لیکے تجھے چرخ پر، آن میں پہونچا بُراق | صلِّ علیٰ شہسوار، صلِّ علیٰ بادپا
تجکو جو تھا دیکھنا، دیکھ لیا تو نے خوب | تیرے لئے کردیا، شوق نے کشفِ غطا
ہاتھ رہا کام میں، قلب رہا دوست میں | جنگ کا میدان بھی، تجکو تھا غارِ حرا
بخششِ حاتم کہاں، تیری سخاوت کہاں | اُس نے دیا سیم و زر، تو نے کی جنّت عطا
بذل جو بخشے ترا، بخل کو تو شیر جود | دستِ ردِ شوم سے، دم میں ہو مطلب روا
غیب میں آیا نظر، تجکو جمالِ شہود[۲۰] | سُرمۂ مازاغ نے، آنکھ کو وہ دی جلا
تجھ پہ درود و صلوٰۃ، آل پہ تیری سلام | ہے یہ وظیفہ مدام، خاطئ[ف۳] مقبول کا
ناوکِ غم کا ترے، زخم نہ ہو مندمل | آنکھ سے بہے خونچکاں، دل رہے درد آشنا
فردِ عمل ہے سیاہ، پاس نہیں زادِ راہ | تیری شفاعت کا ہے، اُس کو فقط آسرا

۱۷ عرب کا مشہور معبود۔ ایک درخت تھا جس کی پوجا کرتے تھے۔ آنحضرت صلعم کے حکم سے خالد بن ولید اسکو جلادیا تھا ۱۸ تیشۂ لا سے مُراد، کلمۂ توحید کے لائے نافیہ سے ہے۔ لات بھی کعبہ کا ایک بُت تھا۔ جس کی پرستش شعیب علیہ السلام کی قوم کرتی تھی ۱۹ لاہوت۔ ذات الٰہی کا عالم۔ سالک کو یہاں پہونچکر فنا فی اللہ کا مقام حاصل ہوجاتا ہے۔ "لاہوت" اصل میں "لاہوالاھو" تھا تا زائد ہے ف۲ آیۂ تطہیر کی طرف اشارہ ہے اِنَّمَا یُرِیْدُ اللّٰہُ لِیُذْھِبَ عَنْکُمُ الرِّجْسَ اَھْلَ الْبَیْتِ وَیُطَھِّرَکُمْ تَطْھِیْرًا ۲۰ جمالِ شہود، اہلِ سُلوک کی اصطلاح میں "رُویتِ حق" کو کہتے ہیں کہ مراتب کثرات اور موہومات صوری کو عبور کرکے سالک توحید عیانی کے مقام پر پہونچ جاتا ہے اور تمامی موجودات (کی صورتوں) میں مشاہدۂ حق کرنے لگتا ہے۔ غیریت دور ہوجاتی ہے۔ جو کچھ نظر آتا ہے جلوۂ حق کے سوا کچھ نہیں ہوتا ف۳ اضافت توصیفی ہے۔

مقدمہ

خلتِ[1] الدیار فسدتُ غیرَ مسوّدٍ ومن البلاءِ تفرّدی بالسؤددِ

علامہ[2] محمد بن احمد نے جب سنہ ۵ھ[3] (۱۱۱۱ء) میں نظامیہ[4] بغداد کی مسندِ درس پر قدم رکھا تو یہ شعر ان کی زبان پر تھا اور حسرت و عبرت کے آنسو اُن کی آنکھوں میں۔ اُن کو

---

[1] یہ شعر عمرو بن لعمان بیاضی مشہور خزرجی شاعر کا ہے جس نے پردرد داستان یاستان نظم کی اور اپنے خون جگر سے اپنی قوم اور اپنے اسلاف کا مرثیہ لکھا ہے

حلت الدیار فسدت غیر مسوّد ومن العناء تفردی بالسّؤدد

این الذین عهدتهم فی غبطة بین العقیق الی بقیع الغرقد

العناء۔ رنج اُٹھانا۔ شاق گزرنا۔ بقیع الغرقد۔ مدینہ میں انصار کا گورستان ہے جو نخلستان کو صاف کرکے میدان بنایا اور مرنے والوں سے آباد کیا گیا تھا۔

[2] ابوالمظفر محمد بن ابی العباس الکوفنی الابیوردی۔ پردادا کا وطن کوفن تھا جو نسا اور ابی ورد کے مابین ایک قصبہ ہے، وہاں سے ابیورد چلے آئے تھے، اسی تعلق سے خاندان ابیوردی کہلاتا ہے۔ ان کو اپنے نسب اور عالی خاندان ہونے پر بڑی نازش و مباہات تھی۔ مورخین میں سے منوچہر[1] بن اسفرسیان بن منوچہر اور ابوزکریا[2] یحییٰ بن عبدالوہاب بن مندہ (صاحب تاریخ اصفہان) نے ان کے نسب نامہ کی بعض کڑیاں مختلف طور پر بیان کی ہیں، محمد بن احمد ابیورد سے بغداد چلے آئے تھے وہاں سے ہمدان گئے، مصر و اصفہان بھی رہے تھے، ابوسعد سمعانی لکھتے ہیں کہ ابیوردی بغداد میں بیس سال رہے تھے اور وہیں اُن کو عربی زبان اور ادب پر عبور و تبحّر حاصل ہو گیا تھا اور لکنت بھی دور ہو گئی تھی۔

اِن کو اکثر ملوک خراسان اور اُمرا و وزرا الملکہ خلفائے عراق کے حضور میں رسوخ حاصل تھا۔ مویدالملک فرزند نظام الملک اور سیف الدولہ ان کی بڑی عزت و توقیر کرتے تھے خود ابیوردی نے ہمیشہ نہایت شان و شوکت اور اہتمام و احتشام سے بسر کی، چلتے تو حوالی و موالی، خدم و حشم، سوار و پیادہ جلو میں ہوتے، ہر شخص مولانا کہکر

شکایت تھی کہ "دنیا بڑوں سے خالی ہوگئی اور بڑا بن جانے کے لیے تنہا وہی باقی رہ گئے جو بجائے خود ایک بلا یعنی ایک بہت بڑی بدنصیبی و ندامت ہے۔"

خطاب کرتا تھا، سرکاری خطاب افضل الدولہ تھا۔ عسرت و تنگی کی حالت میں بھی بقول اہل سیر مہیب محترم و جلیل معظم رہے۔ باوجود احتیاج شدید و ضیق معاش قطعاً کبھی کسی سے کچھ نہیں مانگا۔ اُن کی زبان پر ہر وقت یہ دعا رہتی تھی، اللّٰھُمَّ ملکنی مشارق الارض و مغاربھا۔ ایک بار شکستہ حالی میں اصفہان پہونچے تو وہاں بھی ایک شریفانہ اور معزز مشغلہ اختیار کیا یعنی زین الملک برسق کے لڑکوں کو تعلیم دیتے رہے۔ تاج الاسلام اُن کو "وحید عصر، فرید دہر، معرفت لغت و انساب میں یکتا حسن السیرت جمیل الامر منقطعاً عن الرجال" (بلند تر از مردمان) لکھتا ہے عماد اصفہانی "عفیف الذیل، غیر طفیف الکیل، صائم النہار، قائم اللیل، متبحر ادب، خیر علم نسب" بتاتا ہے یاقوت رومی "کبیر النفس عظیم الہمت" ظاہر کرتا ہے صاحب وشاح الدمیۃ نے ان کی مدح میں قصیدہ نقل کیا ہے۔ مختصر یہ کہ ابیوردی کی زندگی کے ہر پہلو کو مورخین نے جانچ کر ایک اعلیٰ اور پاکیزہ رائے قائم کی، اور ہر ایک نے حمیدہ اور قابل قدر الفاظ سے ستایش کے ساتھ یاد کیا ہے۔

وہ خصائل حمیدہ میں کامل تھے اور زبان و علوم عربیہ میں بے بدل فاضل۔ فی البدیہہ اور مرتجلانہ اشعار کہنے میں بڑی مہارت تھی، حضرت امام حسن علیہ السلام کے مراثی میں قصائد غرا لکھے ہیں۔

کبھی کبھی اپنی غلط روی یا اغیار و اعداء کی سعایت و بدگوئی کا بھی شکار ہوئے ہیں اور گھر بار، وار و دیار چھوڑنا پڑا ہے۔ اعیان سلطنت و اشراف مملکت میں سے الخطیر، ابو اسماعیل، المعین، اور شرف الدین سے معاصرانہ نوک جھونک رہتی تھی۔ عماد محمد بن حامد اصفہانی کتاب خریدۃ العصر میں لکھتا ہے کہ آخر عمر میں سلطان محمد بن ملک شاہ کے بعض درباریوں سے پیچ ہوگیا تھا انھوں (بلکہ خود الخطیر نے) ابی وردی کو زہر دیدیا۔ ابیوردی سریر سلطانی کے قریب کھڑے ہوئے تھے کہ اُن کے پاؤں نے جواب دیا یا عربی مورخین کی اصطلاح میں "خیانت کی"۔ وہ گرے، لوگوں نے گھر پہونچایا اسی حالت میں برجستہ ایک قطعہ ارشاد فرمایا۔

ابیوردی کے اساتذۂ حدیث میں اسماعیل بن مسعدہ جرجانی عبد الوہاب محمد بن الشہید اور ابوبکر بن خلف شیرازی اور دیگر فنون میں ابو محمد الحسن بن احمد سمرقندی اور عبد القاہر بن عبد الرحمان جرجانی نحوی کے نام لیے جاتے ہیں۔

قاضی ابو یوسف یعقوب بن سلیمان اسفرائنی نے رمضان ۴۹۸ھ (جون ۱۱۰۵ء) میں وفات پائی، تو ان کی بجائے مولانا محمد بن احمد ابیوردی نظامیہ بغداد میں خزانہ وار دار الکتب (لائبریرین) مقرر ہوئے تھے۔

تیرہ تصانیف ضخیم و عالی یادگار چھوڑی ہیں لغت کی کتابیں اس شمار سے باہر ہیں، ان کی تفصیل ارشاد الادیب لیے

کہتے ہیں کہ تاریخ اپنے کو دھراتی ہے، لیکن آج آٹھ سو چالیس سال بعد یہاں واقعہ بالعکس پیش آتا ہے۔ وہاں تو حضرت علامہ کو مسندِ فضل و درس پر جلوہ افروز ہونے میں تکلف و تامل تھا

معرفۃ الادب کی جلد چہارم میں موجود ہے، اسی کتاب میں وہ خط بھی بنسخہا نقل کر دیا ہے جس کو ابی وردی نے امیر المومنین المستظہر باللہ کے حضور میں اپنے اعتذار اور بغداد سے بھاگ جانے کے الزام کی برأت و صفائی میں بھیجا تھا۔ اس کو عربی ادب اور اعلیٰ نظم و نثر کی حال کہنا چاہیئے ابیوردی کا دیوان سنہ ۱۳۱۷ھ میں لبنان میں طبع ہو چکا ہے۔ ان کی النجدیات الف بیت فی النسیب بھی قابل دید ہے۔

۲۵۔ ربیع الاول سنہ ۵۰۷ھ (۹ ستمبر سنہ ۱۱۱۳ء) کو اصفہان میں ناگہاں وفات پائی۔ باب دریہ میں دفن ہوئے۔ اسمٰعیل المنشی طغرائی نے مرثیہ لکھا

اس خیال سے کہ علامہ ابی وردی کا اُن کے ایک اور ہمنام، ہم پیشہ اور ہم عصر سے التباس نہ ہو جائے گزارش ہے کہ وہ بزرگ محمد بن احمد بن طاہر بن احمد خازن نحوی تھے طبقات النحاۃ میں لکھا ہے کہ انھوں نے اپنی کنیت ابو منصور سے زیادہ شہرت پائی تھی بغداد کے محلہ کرخ میں جو کتب خانہ قدیم تھا اُس کے خازن تھے۔ ابن جوزی فرماتے ہیں کہ محمد مذکور نحوی، ادیب، فاضل، فقیہ شیعی تھے، بڑے خوشنویس تھے ابو محسن تنوخی وغیرہ سے استفادہ کیا تھا سنہ ۴۱۶ھ (سنہ ۱۰۲۵ء) میں متولد ہوئے ۱۳ شعبان سنہ ۵۱۰ھ (۲۱ دسمبر سنہ ۱۱۱۶ء) کو انتقال کیا

۲۳ سنین و اعوام ہجری و مسیحی کی مطابقت و تصحیح میں اس ہیچمدان جامع تذکرہ کو اہتمام خاص و التزام کرنا پڑا ہے۔

سال ہجری ۱۶ تاریخ ماہ جولائی سنہ ۶۲۲ء سے شروع ہوتا ہے، اس کا شمار چاند کی حرکتوں پر ہے عقلائے یورپ کو بھی تسلیم ہے کہ سال اسلامی فی الواقع احسن تقویم ہے اور سہل ترین ترکیب کا اس میں بارہ مہینے ہوتے ہیں اور ہر مہینہ تیس ۳۰ یا اُنتیس ۲۹ دن کا ہوتا ہے تیس سال قمری کے دور میں ہر دوسرے، پانچویں، ساتویں، دسویں، تیرھویں، سولھویں، اٹھارھویں، اکیسویں، چوبیسویں، چھبیسویں اور اُنتیسویں سال کے اخیر مہینہ میں، استداد وقت کی برابر و یکساں قائم رکھنے کے لئے ایک دن اور جوڑ دیا جاتا ہے یہ صحیح ہے کہ سال ہجری کا آغاز نئے چاند (ہلال) کی رویت سے قرار دیا جاتا ہے، مگر یہ کلیہ بھی اُس کے تاریخی و حسابی قوام پر اثر نہیں ڈالتا یہ تین سو چون ۳۵۴ یوم آٹھ ساعت اڑتالیس دقیقہ کا ہوتا ہے جو بقدر دس یوم اکیس ساعت بارہ دقیقہ کے سال شمسی سے کم ہے۔

مسیحی سال کا حساب دورہ شمس پر منحصر ہے، اس کے شمار کرنے کا طریقہ اسٹائل Style کہلاتا ہے جولین یا پرانا طریقہ Julian or old style جولیس سیزر (مشہور و معروف شہنشاہ روم) سے منسوب ہے

یہاں اس آوارۂ وادی علم و ادب کو اپنی اس جسارت و دلیری سے شرم ہے کہ وہ ایسے کارِ خطیر کی انجام دہی پر آمادہ ہوا ہے جس کا وہ کسی طرح اہل و مستحق نہیں ہے۔

جس سے مہینوں، دنوں اور ساعتوں کے محسوب کرنے کا یہ طریقہ وضع و قائم کیا تھا اس کی ابتدا ۴۶ سنہ قبل مسیح سے ہوئی، اس میں ہر سال میں تقریباً گیارہ منٹ کا فرق پڑ جاتا تھا، اس لیے پوپ گریگوری سیزدہم Pope Gregory XIII نے اس تقویم کی اصلاح کی اور اکتوبر ۱۵۸۲ء میں دس دن گھٹا دیے "۳۲۵ء کی کونسل آف نائس کے مجوزہ و مروجہ آئین و ہدایت کے مطابق حساب لگا کر وقت کا تعین کیا، یعنی ۴۔ اکتوبر کو ۱۵ اکتوبر قرار دیا اور منتصف اکتوبر ۱۵۸۲ سے اس کو رائج کیا اس کو گریگورین یا جدید طریقہ Gregorian or new style کہتے ہیں، ۱۷۵۱ء میں برطانیہ عظمیٰ نے پارلیمنٹ کے ایک قانون کی رو سے اس اصلاح کو اختیار و نافذ کیا اور اس طرح پر ستمبر ۱۷۵۲ء میں گیارہ دن گھٹا کر تیسری تاریخ کو چودھویں قرار دیا اس طریقہ کے مطابق ہر وہ سال جو چار کے عدد سے تقسیم ہو سکتا ہو ۳۶۶ دن کا ہوتا ہے باقی سب میں ۳۶۵ دن کے رہیں گے ۳۶۶ دن والے سال کے لیے یہ بھی مشروط ہے کہ وہ سو سے تقسیم نہ ہو سکے اگرچہ چار سو سے ہو جائے۔

یہ دلچسپ بحث میرے موضوع کلام سے خارج ہے کہ آیا یہ اصلاح خود جناب پوپ کی زیرکی و ذہن نقاد کا نتیجہ تھی یا انھوں نے کسی حد تک جلال الدین ملک شاہ سلجوقی کے طبع زاد "سال جلالی" سے استفادہ و استفاضہ کیا تھا سال جلالی ۳۶۵ (دن) اور ربع روز کا ہوتا تھا۔ ہر ماہ سی روزہ، آخر اسفندار میں پانچ روز بڑھا لیتے تھے اور چوتھے سال میں چھ روز۔ جدید گریگورین طریقہ میں مہینہ کی سہل اور معینہ تیس دن کی تعداد تو قائم نہ ہو سکی بلکہ وہی پیچیدہ اور خبط طلب مختلف اعداد ایام مختلف مہینوں کے برقرار رہے، البتہ اس قدر آسانی ہو گئی کہ ہر سال میں چہارم روز (چھ گھنٹہ) شمار کرنے کے بجائے چوتھے سال میں ایک پورا دن بڑھا دیا گیا

اہل ادراک نے سنہ ہجری سے سنہ عیسوی نکالنے کا یہ طریقہ بتایا ہے کہ سنہ ہجری میں سے فیصدی ۳ عدد منہا کر کے باقی کو ۶۲۱٫۵ میں جمع کر دیا جائے اور سنہ ہجری کو ۰٫۹۷ میں ضرب دے کر حاصل ضرب کو ۶۲۱٫۵ میں ملا دیا جائے ان دونوں صورتوں میں جو حاصل جمع آئے سنہ عیسوی ہو گا۔

فاضل محترم پروفیسر مولانا زبید احمد نے ایک آسان، عمدہ، نو ایجاد طریقہ یہ بتایا ہے کہ سنہ ہجری کو ۳۳ پر تقسیم کر کے خارج قسمت کو اسی سنہ ہجری اور ۶۲۲ کی حاصل جمع میں سے منہا کر دیا جائے، سنہ عیسوی نکل آئے گا

انگریزوں کی شروع عملداری میں ہندوستان میں تمام تر سال ہجری کا رواج تھا سلطنت کے سوا عام مسلمانوں اور ہندو امرا کے حسابات و تحریرات کا دار و مدار بھی اسی پر تھا، اس کا سلسلہ بیک دم منقطع کیا جانا ممکن نہ تھا، سا

مدت ہوئی کہ راقم عاجز نے مستشرق شیخ[25] ولیم آیروین کی تحریک و ارشاد سے میر غلام علی[26] آزاد کی
سوانح حیات لکھنا شروع کئے تھے اور ایک ضخیم جلد چھ سو صفحات کی مرتب کر لی تھی مگر افسوس ہے کہ

اسی طرح انگریزی دفاتر کی ترتیب، کاغذات سرکاری کی تحریر و تکمیل اور احکام کے اجراء کے لیے صرف انگلستان
کے ارباب حل و عقد بلکہ ہندوستان کے مدبر اور [illegible] ارکان حکومت کی واقفیت و سہولت کے واسطے سال
مسیحی کی پابندی و مطابقت بھی ضروری [illegible] انہیں ضروریات و مصالح سے مدت دراز یعنی ۱۸۳۷ء
تک دونوں (سال ہجرت و بعد مسیح) کے [illegible] دفاتر میں ایام یکساں اور دوش بدوش رائج و رواں رہے ایک
صدی کی کثرت حل اور [illegible] عبارت سے انگریزی تاریخوں کا لکھنا اور پورا رواج ہو گیا اور عربی یا ہجری تاریخ کے لکھنے اور
جاننے والے باقی نہ رہے، الا ماشاء اللہ

اس ضرورت کو رفع کرنے یعنی دونوں تاریخوں کے تطابق کے لیے پہلے وارن صاحب Warren نے [illegible]
مرتب کیا، بعد کو اس میں متعدد غلطیاں برآمد ہوئیں تو پلے فیر صاحب نے 'لائحۂ تواریخ' Playfair's Chronology
شائع کیا، سنین ہجری و مسیحی کی ایک جدول جیمس وائٹ نے Tables of the Christian and Mohammadan Aeras by James White
۱۷۹۰ء میں کلکتہ میں چھاپی لیکن اس میں ۱۸۰۰ء کے بعد کی برسوں میں ایک یوم کی غلطی نکلتی ہے۔ صدر دیوانی
عدالت نے جو جنتریاں ۱۸۶۱ء سے شائع کی تھیں ان میں تو بے شمار غلطیاں پائی جاتی ہیں خصوصاً ابتدا کے ہجری
سنین میں، سو اتفاق سے وہی غلط تاریخیں [illegible] سرکاری و آئین ہائے منضبط میں مندرج ہو گئی ہیں یہ اغلاط
صرف دو ایک دنوں ہی کی نہیں بلکہ ہفتوں اور مہینوں کی بھی ہیں اور صدیوں ہیں۔ صدر دیوانی عدالت کا طریقہ ترتیب تقادیم یہ
تھا کہ ہر انگریزی سال کے آغاز پر عدالت مذکور کا پنڈت ایک جنتری انگریزی اور دیسی سنین کی تیار کر کے پیش
کر دیتا تھا۔ اس کی ایک نقل دفتر عدالت میں رکھ لی جاتی تھی، دوسری گورنمنٹ کو بھیجی جاتی تھی

کپتان جرولس کی جنتریاں Captain Jervis Tables جو بمبئی میں طبع کی گئی تھیں زیادہ تر صحیح تھیں
ان میں اگر کوئی اختلافات تھے تو سال ہائے کبیسہ کے متعلق اور وہ بھی کم

سب سے صحیح اور مکمل وہ تیرہ سو (۱۳۰۰) اٹھارہ سال کی جنتری تھی جو ۶۲۲ء یا ۱۹۱۸ء تک کی ارل آف
آکلینڈ گورنر جنرل کے حکم سے ۱۸۴۲ء میں ولیم رشٹن و رفقا William Rushton and Company
نے کلکتہ میں طبع اور شائع کی۔

تذکرہ ہذا میں مختلف تاریخوں اور سنوں کو درج کرتے وقت ناچیز مؤلف نے ان سب پر نظر رکھی اور خود صحت
کی ہے انگریزی سال ۱۷۵۰ء تک تو تاریخوں کا حساب تقویم پاپیہ کے اصول پر لگایا ہے، اس کے بعد جدید قاعدہ

اُس میزنگاہ تکمیل نہ ڈال سکا اُن اوراق پریشاں کی تہذیب و تکمیل و اشاعت ایک طرف میری کم مائگی و فقدان لیاقت، دوسری طرف میری گراں باری و انہماک خدمات سرکاری سے ہنوز معرض تعویق

وما توفیقی الا باللہ

خیال رہے کہ مسلمانوں کے یہاں سال شمسی ۲۲ یا ۲۳ مارچ سے شروع ہوتا ہے۔ سال قمری کا آغاز کسی فصل یا موسم یا دن پر معین نہیں یوں کہئے کہ برابر گشت میں رہتا ہے

۵۲۴ "نظام" یا "نظام الملک" کو علوم و فنون کے نشر و توسیع کے ساتھ ازلی مناسبت رہی ہے، جو مبارک کام عہد حاضرہ میں سلطان العلوم نظام الملک شہریار دکن خلد اللہ ملکہ کی نگاہ مہر اور دست جود و سخا سے انجام پا رہا ہے نو صدی پیشتر الپ ارسلان و ملک شاہ سلجوقی کا وزیر اعظم بلکہ مختار سلطنت نظام الملک طوسی بھی اُسی کا شیفتہ تھا۔ پہلے خاص دار الملک نیشا پور (خراساں) میں اُس نے مدرسۂ نظامیہ قائم کیا۔ اُس چشمۂ فیض سے ایک عالم سیراب ہوتا رہا۔ رفتہ رفتہ اُس نے تمام قلمرو سلاجقہ میں (جس کی وسعت طولاً کاشغر سے بیت المقدس تک اور عرضاً قسطنطنیہ سے بلاد خزر تک تھی) مکاتب و مدارس کھول دیئے، ان میں سے مرو، ہرات، بلخ، اصفہان اور موصل کے کالج علم و ہنر کے مخزن اور شائقان و طالبان کے مرجع و مرکز تھے، یہ بھی نظامیہ کہلاتے تھے

۴۵۷ھ (۱۰۶۵ء) میں اُس نے نظامیۂ بغداد کی بنیاد ڈالی۔ دو ڈھائی سال میں تعمیر ختم ہوئی تو شنبہ کے دن ۱۰ ذیقعدہ ۴۵۹ھ (۲۵ ستمبر ۱۰۶۷ء) کو بڑے اہتمام و احتشام کے ساتھ مراسم افتتاح عمل میں آئے علامہ ابو اسحق شیرازی جو اُس زمانہ میں استاذ الاساتذہ شمار ہوتے تھے پرنسپل یا مدرس اعلےٰ مقرر ہوئے، ابتداءً کچھ روز اس خدمت پر ابو نصر صباغ مصنف شامل بھی رہے تھے ان کے بعد امام محمد غزالیؒ ابن الخطیب تبریزی شارح حماسہ، ابو الحسن فصیحی شاگرد امام عبد القاہر جرجانی (استرآبادی) وغیرہم نے اس مسند افادہ و افاضہ کو عزت دی تھی۔ استادان فن یا معاودان کی فہرست میں بڑے ممتاز نام مثل امام احمد غزالی ابو المعالی قطب الدین شافعی، کیا الہرسی وغیرہم کے نظر آتے ہیں نظامیہ کا فیضان اور دائرہ خیر توفیقات ربانی اور اہل اللہ کی قدردانی سے برابر بڑھتا گیا۔ اس کی پروفیسری ہر زمانہ میں علماء کے لئے وجہ نازش و مباہات رہی ہے دو سو برس کی مدت میں اس منصب پر کوئی ایسا باکمال نامور مقرر نہیں ہوا جو اپنے زمانہ میں یکتائے فن اور یگانۂ عصر مانا نہ جاتا ہو۔

دو عظیم الشان اور وسیع شاہی کتب خانے بھی نظامیہ کے متعلق تھے۔ طلبہ کو وظائف اور تنخواہیں دی جاتی تھیں، لاکھوں اشرفیاں سالانہ اس پر خرچ ہوتی تھیں

وتاخیر میں ہے ؎

یسعی الفتی لامور لیس یدرکہا   فالنفس واحدۃ والھموم منتشرۃ

نظامیہ یونیورسٹی کے علاوہ بغداد میں تیس بڑے بڑے کالج تھے جن کی رفعت و عظمت کا ذکر سیاح اس عصر نے اپنی سیاحت بغداد واقع ۴۵۹ھ (۱۰۶۷ء) کے سلسلہ میں کیا ہے۔

شیخ مصلح الدین سعدی شیرازی بھی اسی نظامیہ کے دور آخر کے طلبہ میں سے تھے۔

۲۵ ولیم اِروِن William Irvine ایک ممتاز محقق و ماہر مسلمانان ہند کی تاریخ کے تھے ۱۸۴۰ء میں ایبرڈین واقع اسکاٹ لینڈ میں پیدا ہوئے اور اکہتر سال کی عمر پاکر ۳ نومبر ۱۹۱۱ء کو مضافات لندن میں اس جہان فانی سے رخصت ہوئے۔

آبائی پیشہ قانون و وکالت تھا۔ اس کے ساتھ ان کا تجرد و توکل مایۂ تخمیر کہنا چاہیئے، لیکن وہ خود ہندوستان کی سول سروس میں داخل ہوئے ۱۸۶۳ء سے ۱۸۸۸ء تک صوبہ مغربی و شمالی میں جو اب ممالک متحدہ آگرہ و اودھ کا ایک جزو ہے حکومت کے مختلف مالی و ملکی مناصب پر مامور رہے ملازمت سے دست کش ہو جانے کے بعد ہمہ تن علم و تاریخ کی خدمت میں منہمک ہو گئے

ذوق علمی کی مناسبت سے میرے والد مرحوم مولوی حکیم سید منظور احمد خاں صاحب ڈپٹی کلکٹر سے بزمانۂ قیام فرخ آباد ارتباط خاص تھا جس کا اظہار بہ امتنان تاریخ نوابین بنگش فرخ آباد میں دو جگہ پر کیا ہے۔ حضرت مرحوم ہی کے فیض صحبت اور لطافت مذاق سے متاثر ہو کر فرخ آباد میں ۱۸۷۸ء میں اُنھوں نے تاریخ ہندوستان پر توجہ شروع کی تھی۔ دونوں بزرگوں کی متفقہ کوشش و تحقیقات یا اُس عہد زریں کی یادگار بہت سے کاغذات اور علمی و تاریخی تحریرات ایک عالم کو صلائے فیض دے چکی ہیں جب میں نے علمی دنیا میں قدم رکھا تو بزرگانہ شفقت مجھ پر بھی مبذول ہوئی۔ میری استعداد و استحقاق سے زیادہ میری ناچیز مساعی پر تحسین و آفریں فرماتے رہے۔ اکثر علمی نکات اور تاریخی مسائل کی عقدہ کشائی کے لیے مجھے لکھتے بلکہ اپنے رفقائے کار کی ضرورتوں کے وقت بھی بے تکلف تحریر فرماتے تھے چنانچہ مسٹر بیوریج H. Beveridge نے اپنے ترجمۂ مآثر الامراء میں اس حقیر کو بھی یاد کیا ہے۔ انتقال سے کچھ دن پہلے اِروِن صاحب نے اپنی بیماری اور ضعف پیری کا شکوہ مجھے لکھا تھا۔

انڈیا آفس اور برٹش میوزیم اور رائل ایشیاٹک سوسائٹی کے بیش بہا علمی جواہرات کے خازن تھے، وہاں کی بہت سی علمی کتابیں اور نادر چیزیں ان کی نگاہ کرم اور دست حفظ کی رہین منت ہیں۔

وفات اورنگ زیب (۱۷۰۷ء) سے لے کر لارڈ لیک کے (۱۸۰۳ء میں) دہلی فتح کرنے تک کی ایک جامع

اُس کی تالیف کا دوسری اجل تو حق ہم وطنی وعلاقہ برادری تھا یعنی آزاد کے مورث بزرگوں کے
خمیر کا اسی خاک (شمس آباد ضلع فرخ آباد) سے ہونا جہاں سے توطن کا شرف بندہ ہیچمدان کو بھی حاصل ہے

وسعت تاریخ "عروج و زوال سلطنت مغلیہ" کے نام سے لکھ رہے تھے افسوس ہے کہ پیام اجل نے اُن کو پورا کرنے
کی مہلت نہ دی۔ ایک عظیم قلمی سرمایہ اور سکوں کا ذخیرہ اس کے لیے فراہم کر لیا تھا اس میں سے جتنے مکمل ہوتے گئے تھے
اُن کو ولایت اور ہندوستان کے مشہور تاریخی رسائل کے نذر کئے گئے ہیں ایک کتاب افواج مغول پر ۱۹۰۳ء
میں لکھی تھی

ہندوستان کے جدید امپریل گزیٹیر میں باب دوم یعنی تاریخ مسلمانان ہند لکھنے کے لئے قرعہ انتخاب مسٹر اَروِن
پر پڑا اور موصوف نے بڑی خوبی سے اس حصہ کو تحریر کیا اُن کے قلم کی قوت، معلومات کی وسعت اور مطالب و
معانی کا ایجاز ایک تاریخی اعجاز دکھاتا ہے

سب سے اخیر تالیف اورنگ زیب کی سیرت تھی جو [illegible] کتابی صورت میں شائع ہوئی ان کے اور بہت سے
کراسات و رسائل طبع ہو چکے ہیں

منوکی اطالوی کی "تاریخ مغول" کا ترجمہ و تحشیہ و تصحیح ان کی علمی زندگی کا ایک عظیم کارنامہ ہے۔ یہ کتاب وینس
اور برلین کے کتب خانوں کو چھوڑ کر نایاب تھی۔ ولایت کے نامور طالبان استفادہ نے ان کو توجہ دلائی لارڈ کرزن اور
گورنمنٹ ہند نے سرپرستی و دستگیری کی اور یہ ضخیم کتاب انگریزی میں کئی جلدوں میں مرتب اور درست ہو کر شائع
کر دی گئی [نکولا منوکی Manucci N کی یہ تاریخ ہندوستان میں تیمور لنگ کے ہاتھوں خاندان
مغلیہ کی بنیاد پڑنے کے زمانے یعنی ۱۳۹۹ء سے جلوس اورنگ زیب واقع ۱۶۵۷ء تک کی ہے

سنیور منوکی، Signor Manouchi وینس Venice کا رہنے والا تھا جو ہندوستان میں
آیا اور کچھ دنوں رہا تھا۔ اُس نے اس ملک کی ہر بات اور طریقہ حکومت اور حکمرانوں کو بیگانہ نگاہ سے دیکھا اور عیب
جویانہ روش سے لکھا ہے اس کا دعویٰ ہے کہ اس میں عہد مذکور کے تمام بیانات و حالات متعلق دربار شاہی و
حرم سرائے سلطانی اور افواج کی قوت و طاقت اور ذرائع آمدنی وغیرہ بالتفصیل مرقوم ہیں۔ اصل یادداشتوں
اور تحریرات کا ترجمہ فرانسیسی زبان میں پادری فرانسیس کیٹرل Father Francis Catron
نے کیا تھا جس کا کچھ حصہ اپنی زبان سے انگریزی میں نقل ہو کر [illegible] میں چھپا تھا مسٹر اَروِن نے پوری کتاب
کو اصل سے اپنی زبان میں لیا اور تہذیب و تکمیل کر کے بہترین صورت و اہتمام سے شائع کرایا]

فارسی و ہندی پر ان کو پوری قدرت تھی عربی میں بھی کچھ دستگاہ رکھتے تھے السنہ فرنگ خصوصاً فرانسیسی

مد نام کنندۂ نکو نامے چند اسی کے ساتھ حق پسندی و انصاف کوشی کا یہ جاذبہ کہ ایسے نامور نادر روزگار کا کارنامۂ حیات خمول و گمنامی کے گوشہ میں پڑا نہ رہنا چاہیئے۔

حرمتی، اطالوی میں عبور کامل تھا ترجمہ کی ضرورتوں سے مجبور ہو کر اس کمسنی میں پرتگالی زبان بھی سیکھ لی تھی اتفاقات حسنہ سے بلگرام کے پرانے گزیٹیر کی تصحیح و توثیق بھی مسٹر ایروین نے کی تھی۔ اُن کا درست کیا ہوا نسخہ دستخطی ہم۔ یونیورسٹی ۱۹۵۱ء مین محفوظ ہے

۵۹ میر غلام علی آزاد کا مستقل تذکرہ ملاحظہ طلب ہے پایان کتاب ہذا میں بھی کچھ حال مندرج ہے

۶۰ سمدن (ضلع فرخ آباد ممالک متحدہ آگرہ و اودھ میں) مسلمانوں کا ایک مشہور قصبہ ہے، حوادث دہر سے گھٹتے گھٹتے اُس کی مردم شماری تین ہزار رہ گئی ہے

سادات کی آبادی بہت پرانی ہے، کسی وقت سادات کے بہت سے قبائل و عشائر یہاں رہتے تھے جو عرب و عجم کے مختلف مقامات سے آئے تھے۔ رفتہ رفتہ بتقاضائے ضرورت یا بہ تلاش معاش ترک توطن کر گئے میر غلام علی آزاد کا خاندان (زیدیہ) بھی انھیں میں سے تھا ان کے مورث ملک بہلول لودی کے عہد میں طلب علم کے لیے بلگرام گئے اور وہیں کے ہو رہے، اسی لیے شیخ غلام حسن شہین نے شرائف عثمانی میں آزاد کے دعوائے بلگرامیت پر تعریض کی ہے اور اپنے انگریزی ترجمۂ "احمد شاہ ابدالی و وزیر عماد الملک" کے دیباچہ میں ایروین صاحب بھی اُن کے ہم نوا پائے جاتے ہیں

سادات رضویہ کا خاندان ہندوستان میں مشہد مقدس سے شاہ طہماسپ صفوی کی افواج کے ساتھ آیا تھا ہمایوں کو تاج و تخت دلانے کے بعد اسی کشت زار میں اقامت فرما ہو گیا۔ مُلا سید عبدالصمد جامی کے نام نامی کے انتساب سے اسی وقت ۹۶۳ھ (۱۵۵۶ء) سے اس قریہ کا نام صاد سے بھی لکھا جاتا ہے ؎

خدا جانے تراجی لگ گیا سمدن میں کیوں سید　　اُجاڑ اک چند گھر ہیں بے حقیقت سی یہ بستی ہے

امیر میراں علامہ ابو الفتح معروف بہ سید معدن جو فتاوائے عالمگیری کی ترتیب و تالیف میں دیگر علمائے عصر کے دست و بازو تھے اسی خاک پاک میں راحت گزیں ہیں۔ سید حامد، سید ابراہیم و سید جلال کے سے جلیل القدر علمار کو بھی اسی دودمان عالی سے توسل تھا۔ سید نثار (جن کا نام بزرگان جاوید دولت کی جدول میں آئین اکبری میں موجود ہے) اور خواجہ حافظ سید احمد کبیر المعروف بہ خواجہ پیر کبیر (جن کا ذکر تاریخ فرشتہ میں ہے) اسی برگزیدہ طبقہ کے رکن رکین تھے

ان آسودگان خاک پاک حضرت سمدن نور اللہ مضاجعہم کی زیارت کے لئے اب بھی اہل نظر اور صاحبان

فطرتِ انسانی کا خاصہ ہے کہ وہ ہر نفس نیا رنگ بدلتی اور نئی نئی مصلحتوں کا بہانہ ڈھونڈتی یا تقاضا کرتی ہے۔ ترمیم و تنسیخ شئون آلہیہ کا ایک جزو اہم ہے اور مَا نَنْسَخْ مِنْ اٰيَةٍ اَوْ نُنْسِهَا اٰيات

بصیرت آتے اور اُس گورستانِ کنارے جو باغ مرہانہ (دبیرہانہ) کے نام سے معروف ہو اقتباس انوار کرتے اور فیوض و برکات پاتے ہیں

(از کتاب سلسلۃ الاسباب سادات صمدنیۃ مولفہ مولوی حکیم سید منظور احمد و تاریخ عزیزیہ یوسفۃ حاجی سید عبدالعزیز خان بہادر و تاریخ نوامین بنگش مرتبہ مسٹر ایردین)

اپنی حالت دیکھ کر مقبول ہیچ میرز کوان احداد صالح کی آل ہونے پر کیا نازش ہوسکتی ہے ؎

ان افتخرت بآباء مصوا سلفا　　　قلنا صدقت ولکن بئس ما ولدا

۵۲۲ ابو عبداللہ محمد بن صفی الدین ابوالفرج محمد بن نفیس الدین ابوالرجا حامد بن محمد بن عبداللہ بن علی بن محمود بن ہبتہ اللہ پورا نام و نسب، اَلُہُ عُرف، عماد الدین کاتب اصفہانی لقب تھا۔ ابن اخی العزیز بھی کہلاتے تھے ان کے چچا العزیز بڑے نامور اہل علم سے تھے [اَلُہ بفتح الف وضمہ لام و سکون ہا عجمی زبان میں عقاب کو کہتے ہیں جو ایک طائر معروف ہے]

عماد شافعی المذہب فقیہ تھے۔ شعرا ور رسائل میں ان کا پایہ نہایت بلند اور شرح و تفصیل سے مستغنی تھا۔ اصفہان میں نشو و نما تعلیم و تربیت پائی جوانی میں علوم مروجہ سے فارغ ہو کر بغداد چلے آئے۔ کچھ زمانہ تک مدرسۂ نظامیہ میں فقہ کی تکمیل اور کمال اتقان کے ساتھ فنون ادب کی تحصیل کی۔ شیخ ابو منصور سعید بن محمد الوزان، پروفیسر نظامیہ سے سند پائی۔ ابوالحسن علی بن ہبتہ اللہ بن عبدالسلام، ابو منصور محمد بن عبدالملک بن خیرون، ابوالمکارم مبارک بن علی سمرقندی، ابوبکر احمد بن علی الاشقر وغیرہم نامور اساتذہ سے حدیث کی سماعت کی اور مدت تک وہاں مقیم رہے۔ جب تمام علوم میں ماہر و متبحر ہو گئے تب ماہر نکلے۔ اور وزیر عون الدین یحییٰ بن ہبیرہ کے دربار میں رسائی پیدا کی۔ وزیر اُس وقت بغداد میں اقامت گزین تھا۔ وزیر نے عماد کو بصرہ کا والی یا ناظر (حاکم) مقرر کر دیا کچھ دن بعد اُسی عہدہ پر واسط بھیجدیا۔ حقیقت یہ ہے کہ یہ عمر بھر ایک جگہ نہ رہ سکے ادھر سے اُدھر تبدیل ہوتے رہے

وزیر عون الدین نے جب ۵۶۰ھ (مطابق ۱۱۶۵ء) میں وفات پائی تو اس کے اتباع و منتسبین کا شیرازہ منتشر ہو گیا سب پریشان و متفرق ہو گئے بعض کو ناگوار و ناقابل برداشت حالات بھی پیش آگئے۔ بیچارے عماد بھی اسی طرح بحال تباہ کچھ روز واسط میں پڑے رہے پھر شہر دمشق کو چلے آئے۔ شعبان ۵۶۲ھ (مئی جون ۱۱۶۷ء) میں وہاں پہنچے۔ ملک العادل نور الدین ابوالقاسم محمود بن آتابک زنگی سلطان تھا لیکن حاکم ذی اختیار

بِخَیْرٍ مِّنْهَا اَوْ مِثْلِهَا (ہم کوئی آیت منسوخ کردیں یا ذہن سے اُس کو اُتار دیں تو اُس سے بہتر یا ویسی ہی نازل کردیتے ہیں جزو اول سورۂ بقرہ ع ۱۳) اس کا مصداق ہر نظر جو احد کو پڑتی ہے

اور متولّی مہام و تدابیر دولت قاضی کمال الدین ابو الفضل محمد بن الشہرزوری تھا اُس سے تعارف ہوگیا اور اُس کی مجالس میں جانے آنے لگے ایک بار اُس کے ہاں کسی مسئلہ اختلافی پر گفتگو ہو رہی تھی، عماد کو اس مباحثہ میں امیر کبیر نجم الدین ابو الشکر ایوب والد سلطان صلاح الدین نے پہچان لیا، وہ ان کے چچا العزیز کو قلعہ تکریت سے جانتا تھا، اعزاز و اکرام کے ساتھ اِن سے پیش آیا اور احسانات کئے۔ باپ کی معرفت دمشق میں سلطان صلاح الدین سے بھی معرفت و شناسائی ہوگئی۔ انھوں نے قصائد لکھے اور پیش کیے اُدھر قاضی کمال الدین نے سلطان نور الدین سے عماد کی بڑی تعریف و ستائش کی۔ کتابت و انشا کے لئے ان کو شایان و مناسب تھایا۔ سفارش منظور ہوئی۔ خود عماد کو بھی اس منصب خطیر (دفتر دار یا افسر دار الانشاء) کے قبول کرنے میں تامل تھا نہ کبھی اس کا سابقہ پڑا تھا نہ اپنے میں اس کی قابلیت پاتے تھے۔ یہ صحیح ہے کہ مواد و استعداد تو بحد وافر اُن میں مجتمع تھا لیکن نوبت ممارست نہیں پہونچی تھی چار ناچار منظور کیا، اور کچھ روز بعد عدیم النظیر و فقید المثال کاتب ہوگئے، عربی و عجمی (فارسی) دونوں زبانوں میں یکساں اور بے مثل لکھتے تھے۔ اسی زمانہ میں صلاح الدین سے مودّت اکید ہوگئی اور انشراح تام پیدا ہوگیا اُدھر نور الدین کے دربار میں بھی روز افزوں ترقی مراتب ہونے لگی عماد اُس کے رازدار اور سکرٹری خاص ہوگئے امام مستنجد کے زمانہ میں اِنکو سفیر (اُس وقت رسول کہلاتا تھا) بناکر دار السلام بغداد کو بھیجا گیا جب واپس آئے تو اُس مدرسہ میں جو دمشق میں ان (عماد) کے نام سے معروف تھا پڑھانا شروع کیا ماہ رجب ۵۶۶ھ (مارچ ۱۱۷۱ء) یا ۵۶۷ھ (فروری و مارچ ۱۱۷۲ء) میں ان کو اشراف دیوان کا رتبہ عطا ہوا یہ زمانہ ان کے مستقیم الحال اور رضی البال ہونے کا تھا۔ نور الدین کے انتقال پر اُس کا فرزند ملک الصالح اسمٰعیل جانشین ہوا۔ وہ صغیر السن تھا۔ عماد کے مخالفین کی بھی ایک جماعت تھی جس نے ان کو تنگ و پریشان کیا، اور خوب دھمکایا، وہ سب کو چھوڑ چھاڑ کے بغداد کے ارادہ سے چل نکلے، موصل پہونچے تو سخت بیمار ہوگئے۔ یہاں پر سلطان صلاح الدین کے دیار مصر سے اس طرف کا رخ کرنے اور دمشق لے لینے کی خبر پائی۔ انھوں نے عراق کا عزم فسخ کیا، شام کو واپس جانے کی ٹھان لی ۴ جمادی الاولیٰ ۵۷۰ھ (۴- دسمبر ۱۱۷۴ء) کو موصل سے چل دیے۔ صحاری و بیابان طے کرتے ہوئے ۶ جمادی الآخرہ (۲ جنوری ۱۱۷۵ء) کو دمشق پہونچے۔ صلاح الدین حلب لے چکا تھا اُسکی خدمت میں جانے کا قصد کیا، شعبان (مارچ ۱۱۷۵ء) میں قلعہ حمص بھی حوالہ ہوگیا تو عماد حاضر ہوئے اور قصیدۂ تہنیت پڑھا، اُس وقت سے برابر سفر و حضر، رزم و بزم، جلوت و خلوت

ثانی ہو، یا ثالث، وَہُم جرّا، تصنیف کو نئے پیرایوں میں دیکھنا اور نئے الفاظ و عبارات میں بدلدینا چاہتی ہے۔ عماد کاتب اصفہانی نے جب قاضی عبدالرحیم بیسانی کے کلام پر اعتراضات فرما کر علم مناقشہ

میں سلطان کے رفیق رہے۔ سلطان نے ان کو اپنا کاتب مقرر کر لیا۔ اعتماد و قرب روز بروز بڑھتا گیا حتیٰ اکو وزراء بھی رشک کرنے لگے (ہی زمانہ کاتب کو میر منشی نہیں بلکہ چیف سکریٹری کہنا چاہیئے حسب تحریر ابن خلدون دول خارجہ سے مراسلت اور فرامین شاہی کا اجراء اُس کے متعلق تھا وہ وزیر اعظم سے کسی طرح کم درجہ پر نہ تھا) قاضی فاضل اکثر اوقات حضور سلطانی سے دور ہو جاتے تھے اُن کو بار بار مصالح ملکی و انتظامات سلطنت کے لئے مصر کو جانا پڑتا تھا۔ اس لیے عماد برابر شام میں ملتزم بارگاہ عالی رہتے اور اسرار سلطنت کے حافظ و محافظ سمجھے جاتے تھے

بہت سی تصانیف وائقہ چھوڑی ہیں (۱) کتاب خریدۃ القصر و جریدۃ العصر جس کو ابوالمعالی سعد بن علی الوراق الحظیری کی زینۃ دمیۃ الدہر کے ذیل کے طور پر لکھا تھا واضح رہے کہ خطیری نے اپنی کتاب دمیۃ القصر و عصرۃ اہل العصر مصنفہ باخرزی کے ذیل میں، اور باخرزی نے اپنی کتاب تیمیۃ الدہر ثعالبی کے ذیل میں، اور ثعالبی نے اپنی کتاب ہٰرون بن علی المنجم کی کتاب البارع کے ذیل کے طور پر لکھی تھی، عماد نے اس خریدہ میں اُن تمام شعرا کا ذکر کیا ہے جو پانچویں صدی ہجری کے بعد سے سال پانچسو بہتر (سنہ ۵۷۲ھ) تک گذرے ہیں اس میں شعرائے عراق و عجم و شام و جزیرہ و مصر و مغرب کی تخصیص نہیں حتی الوسع کسی کو چھوڑا نہیں اور نیکی کے ساتھ یاد کیا ہے۔ دس جلدوں میں ہے، (۲) البرق الشامی سات جلدوں میں ایک مجموعۂ تواریخ ہے۔ ابتدا اپنے ہی احوال اور عراق سے شام جانے کے بیان سے کی ہے سلطان نورالدین محمود کی خدمت اور سلطان صلاح الدین کے تعلق اور بعض فتوحات شام کا بھی ذکر کیا ہے۔ نادر کتاب ہے۔ وجہ تسمیہ یہ ہے کہ اُنھوں نے اپنے اُس زمانہ کے اوقات عزیز کو اُن کی خوبی اور سرعت انقضا کے لحاظ سے برق خاطف قرار دیا تھا (۳) کتاب الفتح القسی فی الفتح القدسی دو جلدوں میں ہے اس میں بیت المقدس کی فتح کے حالات مندرج ہیں۔ (۴) السیل علی الذیل، اس کو ابن سمعانی کی کتاب الذیل کا ضمیمہ کہنا چاہیئے ابن سمعانی نے خود خطیب حافظ کی تاریخ بغداد پر یہ کتاب الذیل لکھی تھی مگر قاضی احمد بن خلکان لکھتے ہیں کہ نہیں، السیل کو اپنی ہی کتاب خریدۃ القصر کے تتمہ کے طور پر تحریر کیا تھا (۵) نصرۃ الفترۃ و عصرۃ الفطرۃ۔ دولت سلجوقیہ کے اخبار کے متعلق ہے (۶) دیوان رسائل (مکاتیب) اور دیوان اشعار چار جلدوں میں تھے۔ قصائد بھی بعض طویل ہیں (۷) ایک دیوان صغیر مختصر سا ہے جس میں صرف دو دو ابیات جمع کر دیے ہیں۔

بلند کیا تو قاضی صاحب نے نہایت سادگی اور راستبازی سے یہ مختصر سا جواب دیدیا تھا۔

قَدْ وَقَعَ لِی شَیْءٌ وَمَا اَدْرِی اَوَقَعَ لَکَ اَمْ لَا وَهُوَ اِنَّ الْاِنْسَانَ لَا یَکْتُبُ کِتَابًا

عماد اور قاضی فاضل کے مابین مکاتبات نازک اور محاورات نفیس اکثر چلتے تھے معاصرانہ چھیڑ چھاڑ بھی ہو جاتی تھی۔ ایک بار سر راہ دوچار ہوئے۔ قاضی توسن خوشخرام کی پشت پر تھے۔ انھوں نے کہا سر فلا کبا بک الفرس فاضل نے جواب دیا دام علا العماد ان کو مقلوب بھی پڑھ لیجئے تب بھی مفہوم صحیح رہے گا۔ (واضح رہے کہ یہ کوئی بڑا کمال نہیں ہے، مقامات حریری میں ایک پورا مقامہ اسی صنعت میں موجود ہے ادھر سے پڑھئے تو بھی وہی عبارت اور الٹ کر پڑھئے تو بھی وہی۔ یہی بات قرآن پاک کی ایک چھوٹی سی آیت میں ہے ربک فکبر)۔ ایک بار موکب سلطانی میں دونوں یکجا تھے، سواروں کی کثرت سے اس قدر خاک اوڑی کہ ساری فضا پر چھا گئی۔ دونوں متعجب تھے۔ عماد نے برجستہ پڑھا ؎

اما الغبار فانہ | مما اثارتہ السنابک | والجو منہ مظلم | لکن انارتہ السنابک
یا دھر لی عبد الرحیم | فلست اخشی مس نابک

اس کو حسن کلام کہہ لیجئے یا اتفاق وقت کہ تینوں شعروں میں مجانست (صنعت تجنیس) پیدا ہو گئی ہے قاضی فاضل جب سنہ ۵۷۲ھ (۱۱۷۶ء) میں مصر سے بعزم حج روانہ اور کشتی پر سوار ہوئے تو عماد کاتب نے جو خط انکو لکھا تھا اُس کو فصاحت و بلاغت کی جان اور ادب و آداب، لطائف و ظرائف اور نثر و ایجاز کی روح کہنا چاہیے یاد ہوگا کہ جب وزیر عون الدین بن ہبیرہ کی وفات پر اس کے اعوان و انصار و نوابات شاہی و خدمات سرکاری سے ہٹا دیئے گئے تھے اور اُن سے دار و گیر ہوئی تھی تو عماد بھی اُسی گرفتار بلا گروہ میں تھے کیونکہ اُس زمانہ میں وزیر کی نیابت واسط میں کرتے تھے۔ جب قید ہوئے تو محبس سے عماد الدین بن عضد الدین بن رئیس الرؤسا کو جو اُس وقت دار مستجدیہ میں استاد تھا شعبان سنہ ۵۶۲ھ (جولائی ۱۱۶۷ء) میں یہ قصیدہ لکھکر بھیجا

قل للامام علام حبس ولیہ | ولواجبالکم جمیل ولائہ
اولیس اذ حبس الغمام ولیہ | خلی ابوک سبیلہ بدعائہ

اُس نے فوراً حکم رہائی دلایا اس میں ایک نازک لطیفہ ہے جس کو عربی محاورہ میں "تلمیح غریب" کہتے ہیں اس میں حضرت عباس بن عبد المطلب (عم نبی صلے اللہ علیہ وسلم) اور حضرت عمر بن الخطاب رضی اللہ عنہما کے ایک قصہ کی طرف اشارہ ہے۔ آپ کے زمانۂ خلافت میں ایک بار پانی نہیں برسا، اہل زمین خشکی سے پریشان تھے حضرت عمر جناب عباس اور جماعۃ الناس کو ہمراہ لے کر استسقاء (طلب باراں) کے لئے نکلے۔ جب شہر سے باہر ٹھہرے تو

فِی یَوْمِہٖ اِلَّا یَقُوْلُ فِیْ غَدِہٖ لَوْ غُیِّرَ ھٰذَا لَکَانَ اَحْسَنَ وَلَوْ تُرِکَ ذَالِکَ لَکَانَ اَوْلیٰ وَ
ھٰذَا عِبْرَۃٌ عَظِیْمَۃٌ وَحُجَّۃٌ مُسْتَقِیْمَۃٌ عَلیٰ اِسْتِیْلَاءِ صِفَۃِ النُّقْصَانِ عَلیٰ طَبِیْعَۃِ

دعا فرمائی، کہ اے بار الٰہ ہم پر جب قحط پڑتا تھا تو ہم تیرے نبی کا وسیلہ لاتے تھے تو ہم کو سیراب کر دیتا تھا ہم آج اپنے نبی کے چچا کا توسل لے کر تجھ تک آئے ہیں تو ہم کو سیر کر دے چنانچہ بارش ہوئی اور خوب ہوئی ان اشعار میں "ولی" سے دو سطر (باراں) مراد ہے جو بعد "وسمی" آتا ہے وسمی ربیع الاول کی بارش کو کہتے ہیں جو موسم بہار میں برستی ہے یہ نام اس لیے رکھا گیا کہ زمین کو نباتات و سبزہ سے موسم کر دیتا ہے۔ ولی اس بارش کا نام اس وجہ سے قرار پایا کہ وہ وسمی کے نزدیک ہوتا ہے متنبی نے اپنی تقریر میں ان سب اسماء و اقسام کو جمع کر دیا ہے

معمہ بردۃ المطمہ الستوا   سیر ولی کان نائلها الوسمی

عماد کاتب اپنے مرتبہ بلند اور منزلت رفیع پر برابر قائم رہے جب سلطان صلاح الدین نے وفات پائی تو ان کی حالت پریشانی اور تکلیف کی تھی، ذرائع آمد مسدود ہو گئے تھے جب اپنے لیے کوئی فراخات وا نہ دیکھا تو خانہ نشینی اختیار کر لی اور تصنیف و تالیف میں مشتغل ہو گئے۔ اس روئیداد کو برق الشامی کے اوائل میں اضافہ کر دیا ہے۔ ابن التعاویذی کاتب مشہور کو ایک بار "فرجہ" اور "رسالہ" اور "عقیدہ" کی طلب میں خط لکھا تھا۔ یہ سوال و جواب دونوں نہایت مختصر اور پر لطف چھوٹے چھوٹے جملوں میں دیکھنے کے قابل ہیں

عماد کی ولادت روز دوشنبہ ۲ جمادی الآخرہ (۷ جولائی) اور بروایت دیگر شعبان (ستمبر) میں ۵۱۹ھ (۱۱۲۵ء) میں اصفہان میں ہوئی تھی وفات بروز دوشنبہ مستہل ماہ رمضان المعظم ۵۹۷ھ (۳۰ مئی ۱۲۰۱ء) کو دمشق میں پائی، باب النصر کے باہر صوفیوں کے قبرستان میں دفن ہوئے

عماد کاتب کے ہاتھ کی لکھی ہوئی تحریریں کسی وقت قسطنطنیہ میں موجود تھیں، ہالینڈ کے اہل نظر انکو سولھویں صدی کے وسط میں اپنے حسن تدبیر سے مع اور بہت سی نادر کتابوں کے اڑا لے گئے۔ اس ملک (ہالینڈ) کے مشہور کتب خانہ لیڈن میں یہ نایاب ذخیرہ اس وقت تک محفوظ ہے عرب کے بڑے بڑے کتب خانوں میں یہ کتاب جا ہے کبھی شمار ہوتا ہے

۲۹ ابو علی عبد الرحیم بن قاضی اشرف بہاء الدین ابی المجد علی بن قاضی سعید لخمی عسقلانی۔ کا قاضی فاضل عرف، اور مجیر الدین لقب تھا میر غلام علی بلگرامی نے سرو آزاد میں انکو "نسائی" لکھا ہے۔ اس کو کتابت یا بیسانی کی غلطی کہنا چاہیئے۔ وہ نسائی نہ تھے (منسوب بہ نسا۔ بفتح نون و سین مہملہ آخر میں ہمزہ۔ جو خراسان کا ایک مشہور شہر ہے اور جہاں سے بڑے بڑے نامور اہل علم و فضل نکلے ہیں) قاضی احمد بن خلکان وفیات الاعیان

میں ان کا مولد عسقلان (شام کا مشہور شہر ساحل بحریر) اور جائے قیام مصر لکھتے ہیں، ضیاء الدین ابو الفتح نصر اللہ معروف ابن اثیر جزری موصلی نے "الوشی المرقوم فی حل المسطوم" میں قاضی فاضل عبدالرحیم کو "البیسانی" لکھا ہے۔ وہ دمشق میں ۵۸۸ھ (۱۱۹۲ء) میں ملا تھا جب قاضی دولت صلاحیہ کا کاتب تھا۔ ان کا باپ شہر بیسان کا قاضی تھا اس لئے بیسانی کہلاتے ہیں۔ ان کا مورث موفق یوسف بن خلال دیار مصر کو چلا آیا تھا اور یہاں فن انشا میں کمال شہرت پائی تھی۔ اس کے بعد بندر گاہ اسکندریہ میں سرکاری خدمت منظور کرلی تھی اور مدت تک قیام گزیں رہا تھا۔ فقیہ عمارۃ الیمنی اپنی کتاب النکت العصریہ فی اخبار الوزراء المصریہ میں اس کی مدح و ثنا کرتا ہے۔

قاضی فاضل سلطان الملک الناصر صلاح الدین کا وزیر تھا ساری زندگی کمال حشمت و ثروت سے بسر کی انشاء و ادب میں بڑی مہارت اور شہرت رکھتا تھا حتی کہ متقدمین سے تفوق لے گیا تھا ایسی علمی یادگاریں عجیب و غریب اور بکثرت چھوڑی ہیں۔ ابن خلکان نے واقف حال فضلائے ثقات سے سنا تھا کہ اس کے رسائل کے مسودات بھی بہت سی جلدوں میں اور تعلیقات اوراق میں تھے جمع کئے جاتے تو سو مجلد سے کم شمار میں نہ آتے۔ با ایں ہمہ کثرت وہ "مجید" (بڑے پایہ کے) تھے۔ باوصف تعلقات معاصرانہ عماد کاتب اصفہانی نے کتاب الخریدہ میں اس کی شان میں بڑے عظمت و احترام کے الفاظ استعمال کئے ہیں۔ "رب القلم والبیان واللسن واللسان. والقریحۃ الوقادۃ والبصیرۃ النقادۃ والبدیھۃ المعجزۃ والبدیعۃ المطرزۃ فھو کالشریعۃ المحمدیۃ التی نسخت الشرائع ورسخت بھا الصنائع" "قاضی کا کمال اور انشاپردازی دکھانے کے لئے ایک لطیف رسالہ بھی نقل کر دیا ہے جو خطیب عیذاب کے لئے صلاح الدین کو لکھکر بھیجا تھا اور جس میں اس کو خطابت کرک پر مقرر کرنے کی سفارش کی تھی۔ قلعہ کوکب کی تعریف میں ایک رسالہ ہے جسمیں لکھتا ہے وھذہ القلعۃ عقاب فی عقاب ونجم فی سحاب۔ "ایک اور رسالہ کے دیباچہ میں قاضی نے لکھا ہے "وقد کبر والمملوک قد وھت رکبتاہ وضعفت الیتاہ وکتب لام الف عند قیامہ رجلاہ وبریق من نظرہ الا نقابتہ ومن حدیثہ الا خرافۃ..."

نظم بھی اسی شان سے لکھتا اور تمام محاسن و لطائف شاعری پر نگاہ رکھتا تھا۔ ابن مکنسہ ابو طاہر اسمٰعیل بن محمد بن حسین قرشی اسکندری کو اپنا کلام اکثر سناتا اور داد سخن لیتا تھا

کہ انسان آج ایک بات لکھتا ہے تو دوسرے دن کہتا ہے کہ اگر اس طرح بدل دیا جاتا تو بہتر ہوتا اور اگر یہ چھوڑ دیا جاتا تو کیا خوب ہوتا اور یہی ایک بڑی عبرت اور مضبوط دلیل اس امر کی ہے کہ انسان کی طبیعت پر ناقص ہونے کی صفت غالب ہے۔"
اس صاف و سادہ جواب کی بیساختگی و صداقت چشم حقیقت بیں سے پوشیدہ و مخفی نہیں۔

ملک العزیز اپنے باپ صلاح الدین کی حیات میں قاضی فاضل سے بہت میل (یا عربی محاورہ میں میل) رکھتا تھا۔ باقتضائے بشریت عزیز کو ایک کنیز جاریہ سے بے حد محبت و شغف ہو گیا جس کے باعث سے وہ مصالح و معاملات ملکی پر توجہ نہ کرتا تھا۔ باپ کو خبر پہونچی تو اُس کو ترک کر دینے اور قاضی کی صحبت سے علحدہ رہنے کا حکم دیا ملک العزیز پر بہت شاق گذرا، مگر یہ جسارت نہ کر سکا کہ اُس سے ملے اور باپ کے حکم سے سرتابی کرے۔ کنیز جب طول فراق برداشت نہ کر سکی تو عنبر کا ایک گولہ بنا کر خادم کے ہاتھ بھیجا۔ توڑا گیا تو اندر سے زر خالص نکلا۔ شاہزادہ نے غور و فکر کیا مگر مطلب تک نہ پہونچ سکا موقع پاکر قاضی سے اس کا تذکرہ کیا اور صورت حال بتائی۔ قاضی نے یہ دو شعر لکھکر بھیجدیئے ؎

اهدت لك العنبر في وسطه ۔۔۔ درمن التبر دقيق اللحام
فالسر في العنبر معناهما ۔۔۔ در هكذا مستتراً في الظلام

اس کی ولادت ۱۵ جمادی الآخرہ ۵۲۹ھ (۳۔ اپریل ۱۱۳۵ء) کو شہر عسقلان میں ہوئی تھی
سلطان صلاح الدین کی وزارت میں جو عروج و اعتماد اسکو نصیب تھا اُس کی وفات کے بعد اُسکے بیٹے ملک العزیز کے زمانہ میں بھی حاصل رہا۔ جب عزیز نے وفات پائی اور اُس کا بیٹا ملک المنصور اپنے چچا ملک الافضل نور الدین کے حسن تدبیر سے مملکت پر قابض ہوا تو بھی قاضی کا اعتبار و احترام و اختیار بدستور قائم رہا۔ حتی کہ ملک العادل پہونچا اور اس نے ملک مصر فتح کر لیا۔ جس روز وہ قاہرہ میں داخل ہوا ہے اُسی دن یعنی شب چہارشنبہ ۷۔ ربیع الآخر ۵۹۶ھ (۲۶ جنوری ۱۲۰۰ء) میں قاضی نے قاہرہ میں ناگہاں وفات پائی دوسرے دن قرافہ صغرےٰ کے سفح مقطم میں دفن ہوا قبر کے گرد سنگ رُخام کا کٹہرہ نصب تھا جس پر تاریخ کندہ تھی۔ اس کو ابن خلکان نے دیکھا تھا۔ قاضی کی نسبت لکھتا ہے "وكان من محاسن الدهر وهيهات ان يخلف الزمان مثله" قاہرہ کے بازار طوغیہ میں اس نے مدرسہ بنوایا تھا اُسکا افتتاح اور تعلیم و تدریس کا آغاز روز شنبہ یکم محرم ۵۸۰ھ (۱۴۔ اپریل ۱۱۸۴ء) کو ہوا
لقب کے متعلق کسی قدر اختلاف ہے۔ اہل خاندان کہتے تھے کہ محی الدین تھا۔ قاضی ابن خلکان نے خود ایک مراسلت دیکھی تھی جس میں شیخ شرف الدین عبد اللہ بن ابی عصرون نے اسکو مجیر الدین سے مخاطب کیا تھا
قاضی فاضل کا بیٹا قاضی اشرف بہاء الدین ابو العباس احمد تھا۔ اس کی قدر و عزت بھی ملوک و

كُلُّ اَمْرٍ مَرْهُوْنٌ بِاَوْقَاتِهٖ وہ وقت بھی قریب آنے والا ہے کہ جب تذکرۂ آزاد میرے پنجہ سے آزاد ہو کر خلعت طباعت پہنے گا۔ اس کا وقت آچکا تھا کہ میں نے اپنی فرصت قلیل کے لمحے میر عبد الجلیل بلگرامی کے حالات کے فراہم کرنے میں صرف کیے اور اس اندیشہ نے مجھ کو

سلاطین بہت کرتے تھے، سماعت حدیث و تحصیل کتب کا بڑا شایق تھا
قاضی فاضل کا عربی دیوان نہایت خوشنما چھوٹی تقطیع پر مدراس کی گورنمنٹ مینسکرپٹ لائبریری میں موجود ہے۔ یہاں بہت سی نادر کتابیں سلطان صلاح الدین اور بعض یمنی سلاطین کے خاندان کی پہونچی ہیں، اور مخطوطات قلمی کتابوں کا یہ سرکاری ذخیرہ نہایت عمدہ اور قابل قدر ہے۔
۵۳ ابو الفیض السید محمد بن محمد بن محمد بن عبد الرزاق الشہیر بہ مرتضی الحسینی الحنفی الواسطی البلجرامی الزبیدی کا پرائے نام حال ایڈورڈ ولیم لین نے اپنی عربی انگریزی کی لغت مدّ القاموس کی تمہید میں لکھا اور اُس احسان و اعانت کا تشکر و اعتراف کیا ہے جو ان کو اپنی کتاب کی ترتیب میں تاج العروس سے پہونچی تھی۔
مزید تحریر کے لیے میں تاج العروس کے مصری طابع و ناشران کا سپاس گذار ہوں
اُن کو اقرار ہے کہ سید اصل میں بلگرام کے رہنے والے تھے جو قنوج سے پانچ کوس پر دریائے گنگ کے اُس طرف ہندوستان میں واقع ہے۔ اصلہ من قصبۃ البلجرام علی خمسۃ فراسخ من قنوج وراء نهر جنج بالهند۔
مائۃ سالہ کا نامور مصری مورخ علامہ شیخ عبد الرحمن الجبرتی عجائب الآثار فی التراجم والاخبار میں لکھتا ہے کہ سید مرتضیٰ کا سال ولادت ۱۱۴۵ ہجری تھا جو ۱۷۳۲ء عیسوی کے مطابق ہوتا ہے۔ ابتدائی تربیت و تعلیم کے مدارج وطن میں طے ہوئے صاحب ترجمہ نے تین سو سے شیوخ و اساتذہ کے نام تحریر کیے ہیں جن سے سید مرتضیٰ نے افادہ کیا تھا۔ محدث علامہ محمد فاخر یحیی الہ آبادی متخلص بہ زائر اور شیخ ولی اللہ دہلوی صاحب حجۃ اللہ البالغہ اور مولوی خیر الدین سورتی کے نام نامی ان میں ممتاز ہیں
خانوادۂ قادریہ میں سید یٰسین حموی کے مرید تھے شیخ جعفر علوی مدنی سے بھی سند اجازت پائی تھی۔ یہ بزرگ دمشق سے ہندوستان آئے تھے
علم کا شوق بلکہ عشق سید مرتضیٰ کو وطن سے یمن لے گیا، وہ زبید (بفتح زاء) میں عرصہ تک رہے جو یمن میں ساحل عربی کے قریب ایک مشہور و قدیم شہر ہے۔ وہاں اتنی مدت گذاری کہ خود زبیدی مشہور ہوگئے۔ یہی ولولہ و شوق ان کو بارہا بلد الامین کو کھینچ لے گیا۔ اور وہ ہر بار اس کی بدولت اجر بے مزد یا شرف حج کی سوغات

استقلال و استعجال پر آمادہ رکھا کہ مبادا تذکرہ آزاد کی طرح تذکرہ میر عبدالجلیل بھی غیر مختتم و غیر مطبوع نہ رہ جائے۔ بایں ہمہ کہ سامان مشورت و اصلاح خاطر خواہ میسر و مہیّا نہ تھا اور یہ نقش بھی حسب مرضی عمل پیرانہ ہوا تھا، یہی ناقص تحریر ناظرین اولی الالباب کے حضور میں پیش کیجاتی ہے۔

ساتھ لیکے لوٹے۔

۱۱۶۷ھ (۵۳-۱۷۵۴ عیسوی) میں مصر گئے، وہیں شادی کی۔ مگر یہ تاہّل و پابندی اُن کی آزادہ روی کو روک نہ سکی وہ ممالک روم کو بھی گئے۔ وہاں کے اعیان و سلاطین نے ان کے شایانِ شان عزت و توقیر کی شیخ الشیوخ اور محدث کے نام سے مشہور تھے

قاہرہ کی مسجد کُردی میں (جو ان کے مسکن کے سامنے تھی) بعد نماز جمعہ طاعون میں مبتلا ہوئے۔ دو روز بیمار رہکر شعبان ۱۲۰۵ھ (مئی ۱۷۹۱ء) میں یکشنبہ کے دن رحلت فرمائی۔ وہیں مشہد معروف بہ سیدہ رقیہ میں دفن ہوئی قبر اپنے لئے پہلے سے تیار کرالی تھی، کوئی اولاد نہیں چھوڑی۔ ان کے معاصرین لکھتے ہیں کہ بڑے علم دوست و وسیع الاخلاق منکسر مزاج صاحب کیف وحال تھے

تصانیف شریفہ کا شمار سو سے متجاوز ہے، اکثر شرح و حواشی نہایت سنجیدہ و پسندیدہ لکھے ہیں، صاحب بحر الزخار نے بعض کے نام بھی بتائے ہیں:-

۱ - اتحاف الصفا فی صلوٰۃ المصطفیٰ،
۲ - اتحاف الاصفیا فی سلاسل الاولیا،
۳ - اتحاف السادۃ المتقین لشرح احیاء علوم الدین۔ دس جلدیں عجیب و غریب چیز ہے مصر میں طبع ہو چکی ہے۔
۴ - کتاب الرجا والخوف من المنجیات،
۵ - الابتہاج بختم صحیح مسلم بن الحجاج،
۶ - اقرار العین بذکر اولاد الحسن والحسین،
۷ - اکلیل الجواہر الغالیہ فی روایۃ الحدیث العالیہ،
۸ - تفسیر سورۂ یونس فی الامالی الحنفی،
۹ - حدیقۃ الصفا فی الدین المصطفیٰ،
۱۰ - الدرۃ المضیۃ فی الوصیۃ المرضیۃ،

توقع ہے اور آرزو کہ میری لغزشیں اور خطا کاریاں چشم عفو و نگاہ مکرمت سے دیکھی جائیں

ابو الفیض محمد مرتضیٰ حسینی واسطی جس کا خمیر اسی بلگرام کی خاک سے تھا مگر زبید (یمن) میں رہا اور مصر میں جا کر پیوند زمین ہوا میرا مدعا اپنی زبان میں ادا کر گیا ہے۔ ۵

۱۱ - ربع الاستشفاء من مناقب بسم اللہ،

۱۲ - المقاصد العبدیہ فی المشاہد النقشبندیہ

۱۳ - عقد الجواہر الثمین فی شرح حدیث اطلبوا العلم ولو کان بالصین،

۱۴ - الفیض الجاری فی اسانید البخاری،

۱۵ - عقد الجمان فی شعب الایمان،

۱۶ - عقد الجمان المنتظم فی ذکر امہات النبی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم،

۱۷ - کشف الغطاء فی الصلوٰۃ الوسطیٰ،

۱ - النفحۃ القدوسیہ بواسطۃ البضعۃ العیدروسیہ،

۱۹ - الازہار المتناثرہ،

علامہ الجبرتی اور نواب صدیق حسن خاں نے بھی کم و بیش انہیں حالات کو نقل کیا ہے،

خیال رہے کہ تاج العروس و قمع النفوس ایک اور مختصر رسالے کا نام بھی ہے جو مواعظ و اخلاق میں ابن عطاء اللہ السکندری نے لکھا ہے

سید مرتضیٰ نے تاج العروس شرح قاموس کی تالیف قاہرہ میں شروع کی تھی - قلمی نسخہ کی ایک یاد داشت میں لکھتے ہیں کہ چودہ سال دو ماہ کامل اس میں صرف ہوئے - عرب و عجم کو تسلیم ہے کہ تاج العروس فن لغت، اس کے اصول و تاریخ اور اشتقاق کی تشریح و توضیح میں لاثانی ہے - لین Lane کہتا ہے کہ " وہ اہم ترین مطول و مکمل تالیف ہے جس میں لغات عربیہ کو ایک رواں اور سہل الفہم شرح کے طور پر قلمبند کیا ہے جس میں کوئی پہلو ضروری خورده گیری اور نکتہ بینی کا اٹھا نہیں رکھا گیا ہے جس میں امثال و نظائر اور حوالے اصلی ماخذوں سے اور صرف مشاہیر ادبا و شعرا کے کلام سے دیئے گئے ہیں ... جس میں قاموس اور دیگر لغات کے بعض اغلاط کی تصحیح بھی کر دی ہے " با ایں ہمہ عزیزان مصر کی ایک قلیل جماعت اسکے بارہ میں متشکک و متامل ہے - اس کا زعم یہ ہے کہ تاج العروس کو سید مرتضیٰ نے نہیں بلکہ کسی اور اہل علم (شخص نامعلوم) نے ترتیب دیا تھا - وہ بزرگ افریقۃ المغرب سے ادائے حج کیلئے قاہرہ ہو کر مکہ کو جا رہا تھا اس اندیشہ سے کہ صحرائے اعظم میں سادی زندگی کی

یا ناظراً فی کتابی حین تقرؤہٗ	اقرء ھدیت بلا ریب ولا شطط
ان مر سھو فلا تعجل بسبّک لی	واعذر فلست بمعصوم من الغلط

محنت رائگاں نہ ہوجائے اُس غریب الدیار نے یہ گنج شائگاں سید مرتضی کے حوالہ کردیا، اور راضی برضاء اللہ ہوکر خاک میں ملگیا۔ اہل درایت کو اس روایت کے ماننے سے قطعاً انکار ہے پہلے تو اُس پاک طینت جاں مار کا نام ہی نہیں بتایا جاتا ہے پھر سید مرتضی کے علم و تبحر اور جامعیت و کمال کو دیکھکر ایسی بے سرو پا حکایت کو کون باور کر سکتا ہے سُبْحَانَكَ هٰذَا بُهْتَانٌ عَظِيْمٌ۔

سید نے لسان العرب (مولفہ امام جمال الدین محمد بن علی الافریقی المعروف بہ ابن منظور ۲۰ جلد) اور المحیط (مولفہ صاحب بن عباد متولد ۳۲۶ھ و متوفی ۳۸۵ھ بہ ترتیب حروف ہجا سات جلد) کے سوا ایک سو سے زائد اُن کتب لغت کے نام بتائے ہیں جن سے تاج کی ترتیب و ترصیع میں مدد ملی تھی۔ یہ جامع کتاب (تاج العروس) مصر میں بڑی تقطیع کی دس جلدوں میں طبع ہوئی ہے

تاج کی تکمیل کے ساتھ ہی صاحب تاج کی قدر تاجداروں کی طرف سے ہونے لگی۔ سید مرتضی نے ایک نسخہ اپنے قدیم محسن منعم و مرتبہ شناس بادشاہ صنعاء کے حضور میں تحفۂ نیاز مندانہ بھیجا۔ شیخ الجبرتی ناقل ہیں کہ ایک نسخہ محمد بای ابو الذہب نے اپنے جامعہ میں رکھنے کیلئے لیا تھا اور ایک لاکھ درہم نقرہ سید کی نذر کئے تھے یہ ۱۸ ضخیم جلدوں میں تھا جسکی تصحیح اور حاشیہ نویسی خود اپنے قلم سے سید نے فرمائی تھی۔ ایک تیسرا نایاب نسخہ جسے ۲۴ ضخیم جلدوں میں والا العین صاحب نے الازہر میں دیکھا تھا جس کی نقل شیخ ابراہیم الدسوقی کے قلم سے تین سال میں ختم ہوئی تھی

ان کے علاوہ خود سید مرتضی کے قلم کے لکھے ہوئے کئی نسخے سنہ ۱۲۶۲ھ تک مصر میں موجود تھے ایک تو جامع الازہر الشریف کے رواق شامی میں رکھا تھا چودہ جلدوں میں تھا کچھ حصے محفوظ تھے باقی غائب یا تلف ہو چکے تھے۔ دوسرا یحییٰ افندی الحکیم کے یہاں تھا جو سرکار خدیوی کے حکم سے مصر کی سالانہ تقویم مرتب و شائع کرتے تھے۔ یہ دو بڑی بڑی جلدوں میں تھا سید مرتضی کا خط باریک گٹھا ہوا اور گھنا تھا۔ اس نادر خزینہ کو وزیر اعظم نے سعی مفرط سے حاصل کر کے قسطنطنیہ روانہ کیا تھا۔ حسرت ہے کہ منزل مقصود اور قدر شناس ہاتھوں تک نہیں پہونچا ؎

ہر چہ دل کرد فراہم ہمہ از دیدہ بباخت	اللہ اللہ کہ تبہ کرد کہ اندوختہ بود

مخطوطات مبارک میں سے حدیث ام زرع کی تاویل بطور تصوف (سید مرحوم کے ہاتھ کی لکھی ہوئی) مولانا ابوالحسن ذو الفقار احمد صاحب قدس اللہ سرہ نے بھوپال میں دیکھی تھی،

معجم المشائخ خود انکے قلم کی لکھی ہوئی شیخ الاسلام عارف حکمت بے کے کتبخانہ واقع مدینہ منورہ میں موجود ہے۔

اِنَّ هٰذِهٖ تَذْكِرَةٌ

اسلاف کرام کا معمول تھا کہ صحیفۂ آثار میں احوال رمانی کو حوادث مکانی پر تقدیم دیتے تھے۔ میر عبد الجلیل کے حالات، واقعات سے پیشتر اس تذکرہ یا عام تبصرہ کے ملمسد کرنے میں راقم عاجز نے سنت الاولین کا اتباع کیا ہے

میر عبد الجلیل نے جس وقت عرصۂ ہستی میں قدم رکھا ہے طبقۂ اوسط کے نام اُس وقت لمبے چوڑے القاب سے پاک ہوتے تھے، نہ مولوی[1] کا دورہ دورہ تھا نہ مولانا کا زور و شور۔ مولوی اور ملا زیادہ تر اہل علم معلم پیشہ کے لئے استعمال ہوتے تھے، مولانا اکابر دین و مقتدایان ملت کیلئے

---

[1] مَوَلوِی کو اہل لغت فتح میم و فتح لام کے ساتھ مَولا (یعنی حدا و مدد آزاد کمندہ) سے منسوب بتاتے ہیں۔ یائے نسبت کے الحاق سے مولا کا الف جو چوتھا حرف تھا حسب قاعدۂ نحویہ واؤ سے بدل گیا۔ سر رایت یہ دلیپر ترکوں میں مَولِوی کا تلفظ مَولَوِی اور مَولا کا مُولا (بکسر میم) ہے وہاں "درویشان رقصان" کا ایک مستقل فرقہ مَولوی کے نام سے قائم ہے، جو خود کو مولانا جلال الدین رومی سے منسوب کرتے اور حضرت مولوی کو اپنا مولا (آقا) اور مقتدی بتاتے ہیں

علمائے کرام کا قول ہے کہ عربی زبان میں مولے کا استعمال چھ معانی کے ساتھ پایا گیا ہے اور خود مصحف ناطق میں مختلف معانی کے ساتھ وارد ہوا ہے۔ (۱) کبھی اولٰے کے معنی ہیں جیسا کہ منافقین کے حق میں ارشاد ہوا ہے مَاوٰىكُمُ النَّارُ هِيَ مَوْلٰىكُمْ ط اَوْلٰى بِكُمْ تم سب کا ٹھکانا ہے دوزخ۔ وہی تمہاری رفیق ہے (جزء ۲۷ سورۃ الحدید ع ۲-۸) یعنی تمہارے مناسب حال ہے۔ اور

(۲) کبھی بمعنی ناصر و یاور۔ جیسے قولہ تعالیٰ ذٰلِكَ بِاَنَّ اللّٰهَ مَوْلَى الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَاَنَّ الْكٰفِرِيْنَ لَا مَوْلٰى لَهُمْ اٰى لَا نَاصِرَ لَهُمْ (یہ اس سبب سے کہ مسلمانوں کا مددگار تو اللہ ہے اور اس سبب سے کہ کافروں کا کوئی مددگار نہیں (جزء ۲۶ سورۂ محمد ع ۱-۵) یعنی ناصر و حامی نہیں۔

(۳) کبھی بمعنی وارث، جیسے آیہ کریمہ وَلِكُلٍّ جَعَلْنَا مَوَالِيَ مِمَّا تَرَكَ الْوَالِدٰنِ وَالْاَقْرَبُوْنَ طاسی ورثہ (اور

خصوصیت تھا۔ ایک اور بھی کبھی کبھی نظر آتا ہے یعنی علامہ[۳۲]۔ مگر ہندوستان میں مسلمانوں کے دو بادشاہ ایسے ہوئے ہیں کہ عہد حکومت اور نشر علوم و فضائل میں اس کی ہمہ گیری و تصرف کی بدولت ان کے مصاحب علامی کے خطاب سے مخصوص پائے اور مانے گئے ہیں۔ پہلا اکبر کا مشہور اہل علم اور صاحب سیف و قلم وزیر ابو الفضل[۳۳] علامی تھا۔ دوسرا جہانگیر کا مایہ نازش امیر اور شاہجہاں صاحب قران

---

(۳) ... ماں باپ اور رشتہ دار چھوڑیں تو ہم نے ہر ایک (مرنے والے کی میراث) کے حق دار ٹھہرا دیے ہیں۔ جزو ۵ سورۃ النساء ع ۲-۸) یعنی وارث۔ اور

(۴) کبھی بمعنی عصبہ کما قال اللہ تعالیٰ وَاِنِّیْ خِفْتُ الْمَوَالِیَ مِنْ وَّرَآئِیْ ای عصبتی (اور اپنے بعد مجھکو بھائی بندوں سے خوف ہے۔ جزو ۱۶ سورۃ مریم ع ۱-۴) یعنی اپنے عصبہ سے

(۵) بمعنی دوست، جیسے یَوْمَ لَا یُغْنِیْ مَوْلًی عَنْ مَّوْلًی شَیْئًا ای صدیق عن صدیق (جس دن کوئی دوست کسی دوست کے کچھ کام نہ آئیگا۔ جزو ۲۵ سورۃ الدخان ع ۲-۱۵)۔ اور

(۶) سید بمعتق کے معنی میں بھی کبھی کبھی آتا ہے (یہ بحث نور الابصار میں ملاحظہ طلب ہے) جیسے حضرت عمر نے غیر در سلام ... سے کہا تھا۔ احسن الی مولاک واتق اللہ (اپنے سردار کے ساتھ بھلائی کر اور خدا سے ڈر)

[۳۲] علامہ و علامی دونوں لفظ عین کے فتح اور لام کی تشدید کے ساتھ ہیں یعنی "بہت بہت جاننے والا"۔ ان دونوں لفظوں کے آخر میں تا اور یا تانیث و نسبت کے لیے نہیں بلکہ مبالغہ کے واسطے ہے۔ گویا ان دونوں لفظوں میں سے ہر ایک میں دو دو علامتیں مبالغہ کی موجود ہیں

[۳۳] ابو الفضل شیخ مبارک ناگوری کا منجھلا بیٹا اور ملک الشعراء ابو الفیض فیضی فیاضی کا بھائی تھا۔ شیخ صاحب ناگور کے رہنے والے تھے لیکن ان دونوں بھائیوں کا مولد اکبر آباد ہے۔ ابو الفضل ۹۵۸ھ (۱۵۵۱ء) میں پیدا ہوا۔ پندرہ سال کا تھا کہ تمام علوم معقول و منقول سے فارغ ہو گیا۔ کئی سال عزلت و تجرد میں بسر کئے، پھر بعض خیر خواہوں کے اصرار سے اکبر اعظم کے دربار میں حاضر ہوا۔ آیۃ الکرسی کی تفسیر لکھ کر پیش کی۔ بالطاف خسروانہ سربلند ہوئے۔ پہلے منشی گری کی خدمت پر پھر عہدۂ وزارت پر ممتاز و سرفراز ہوا۔ بعض ممالک کی فوج کشی و فتح کے لیے بھیجا گیا۔ قلیل عرصہ میں بادشاہ کے دل میں اتنی جگہ پیدا کر لی کہ امرا اور شاہزادے بھی حسد کرنے لگے۔ ۱۰۱۱ھ (۱۶۰۲ء) میں دکن سے آگرہ حسب الطلب جا رہا تھا کہ شاہزادہ سلیم کے ایما سے راجہ بیر سنگھ دیو بوندیلہ والی اوڑچھہ کے ہاتھ سے انتری (ریاست گوالیار ضلع نرور) میں ۴ ربیع الاول (۱۳ اگست) روز جمعہ کو مارا گیا۔ تریپن سال کی عمر تھی۔ اعظم خاں وزیر نے بطریق تعمیہ تاریخ نکالی ؎ یفعل اللہ ما یشاء بحکم اللہ ما یرید ۔ تیغ اعجاز نبی اللہ سر باغی برید ۔ دونوں مصرعے تاریخی ہیں دوسرے

ثانی کا مدبر و فلسفی وزیر افضل[۲۳۴] خاں علامی تیسرا تاجِ شاہجہانی کا بے نظیر الماس، وزیر السلطنت سعد اللہ[۲۳۵] خاں جو تھا اُسی دور یا قرآن کا لعل شب چراغ (سعد اللہ کا بیٹا) لطف اللہ[۲۳۶] خاں [۲] آزاد مرحوم

میں سر ماعی یعنی ب کے دور کر دینے سے باقی حروف کے اعداد سے تاریخ نکل آتی ہے صحیح تاریخ نکالنے کے لیے پہلے مصرعہ کو بفضل اللہ ما یشاء بحکم ما یرید پڑھنا چاہیے۔ مشہور ہے کہ شیخ نے خواب میں آ کر کہا تھا کہ "تاریخ فوت من بندۂ ابو الفضل" اس کی ضخیم و عظیم الشان تصانیف میں جامع اللغات و مکاتیبات علامی و عیار دانش (۹۹۶ھ مطابق ۱۵۸۸ء) اور اکبر نامہ ۱۰۰۲ھ یعنی ۱۵۹۳ء) و رسالہ مناجات (۹۹۳ھ مطابق ۱۵۸۵ء) اور آئین اکبری (۱۰۰۶ھ یعنی ۱۵۹۷ء) ہیں۔ آئین اکبری کا ترجمہ کلکتہ میں فرانسیس گلیڈوین نے ۱۷۸۳ء میں شائع کیا تھا۔ امور سلطنت ہند میں انگریزوں کو اس سے ابتداءً بڑی مدد ملی۔ اکبر نامہ کا ترجمہ انگریزی میں مستشرق نامور مسٹر ایچ۔ بیوریج H Beveridge نے کیا ہے اور شائع ہو گیا ہے۔

۲۳۴ نواب افضل خاں علامی کا اصلی نام شکر اللہ (ولد عبد الحق) اور لقب ملا تھا۔ جہانگیر کے عہد میں شیراز سے دکن آئے۔ عبد الرحیم خان خاناں سے کمال موافقت حاصل ہوئی۔ اسی کی معرفت بارگاہ جہانگیری میں رسائی ہوئی۔ منصب ملا۔ جوہر قابل دیکھ کر شاہجہاں نے ۱۰۳۷ھ (۱۶۲۸ء) میں ارادت خاں برادر آصف خاں جعفر بیگ کی جگہ وزارت کل پر مقرر کر دیا۔ "سند فلاطوں وزیر اسکندر" (۱۰۳۷ھ) تاریخ ہے آخر میں ہفت ہزاری منصب اور چار ہزار سوار کے رتبہ تک پہونچ گیا تھا ستر سال کی عمر میں ۱۲ رمضان ۱۰۴۸ھ (۷ جنوری ۱۶۳۹ء) کو لاہور میں انتقال کیا۔ "ز خوبی برد گوئے یکتائی" تاریخ ہے۔ دوسری تاریخ "علامی از دہر رفت" ہے۔ چینی روضہ آگرہ میں دفن ہے صاحب مفتاح التواریخ نے علامی کو علامی پڑھا اور علامی کو نواب کا تخلص بتایا ہے افضل خاں بڑا مزاج داں اور موقع شناس تھا۔ شاہزادہ دارا شکوہ اپنے منشی چندر بھان برہمن تخلص کو شاہجہاں کے سلام کے لیے لے گیا، بادشاہ نے حکم دیا کہ اپنا کوئی شعر پڑھے برہمن نے عرض کیا ؎

مرا دلے است بکفر آشنا کہ چندیں بار | بکعبہ بُردم و بازش برہمن آوردم

بادشاہ نہایت ناخوش ہوا اور پوچھا اس کا کوئی جواب دے سکتا ہے؟ افضل خاں حاضر تھا۔ بڑھ کر شیخ سعدی کا یہ شعر پڑھا ؎

خرِ عیسیٰ اگر بمکہ رود | چوں بیاید ہنوز خر باشد

بادشاہ نے تبسم فرمایا اور پھر کچھ نہیں کہا۔

۲۳۵ نواب سعد اللہ خاں چنیوٹی شاہجہاں کے منصب داران کبار سے تھا۔ پیشگاہ سلطانی سے جملۃ الملک ...

دربار اکبری میں لکھتے ہیں کہ ابوالفضل کے بعد علامہ کا خطاب سلاطین تیموریہ میں سعد اللہ خاں چنیوٹی کے سوا کسی کو نصیب نہیں ہوا کہ وزیر شاہجہاں کا تھا۔ اودھ کی کم عمر و ناپایدار امارت یا مملکت نے بھی اپنے ایک رکن تفضل حسین[۵۳۵] خاں کشمیری کو یہ عزت بخشی تھی اور محققین کی ایک جماعت اعتراف کرتی ہے

تھا، اہل علم و کمال کے متفقہ فتوے سے "علامی فہامی" کہلاتا ہے انگریز مورخین (جن میں نواب کا معاصر اور چشمدید شاہد ڈاکٹر برنیر اور دوسرا انیسویں صدی کا تاریخ نویس و گورنر الفنسٹن خاصکر قابل ذکر ہیں) لکھتے ہیں کہ "سرزمین ہند پر سعد اللہ خاں سے بڑھکر کوئی مدبر کوئی قابل کوئی راستباز وزیر پیدا نہیں ہوا۔ اس کی ذات پر ہندوستان جس قدر فخر کرے بجا ہے۔" وہ ایشیائی وزراء کا بہترین نمونہ بتایا جاتا ہے۔ شاہجہاں کے ہر ایک ملکی و انتظامی کام میں وہ پیش پیش نظر آتا ہے۔ دہلی کی مسجد جامع شاہجہانی مشہور بہ مسجد جہاں نما کی بنیاد بادشاہ کے حکم سے ۱۰ شوال سنہ ۱۰۶۰ھ (۲۸۔ اکتوبر سنہ ۱۶۵۰ء) کو ڈالی جاتی ہے تو دیوان اعلیٰ (سعد اللہ) اور خان ساماں (فاضل خاں ملا علاء الملک تونی) کی موجودگی حضرت سلطانی کے جانب سے کافی سمجھی جاتی ہے۔ عالمگیر بھی اپنے مراسلات میں برابر اس کا حوالہ دیتا اور مدح و ستایش کے ساتھ متواتر ذکر کرتا ہے سعد اللہ خاں نے درد قولنج میں ۲۲۔ جمادی الثانی سنہ ۱۰۶۶ھ (۹۔ اپریل سنہ ۱۶۵۶ء) کو اڑتالیس برس کی عمر میں وفات پائی

[۵۳۶] سعد اللہ خاں کا بیٹا لطف اللہ خاں (باپ کے مرنے کے وقت) گیارہ سال کا تھا شاہجہاں نے اسکی سرپرستی کی منصب دیا، خاندان کے مرتبے کے مناسب اعلیٰ تعلیم و تربیت فرمائی۔ عالمگیر کے عہد میں پایۂ والائے وزارت پر ممتاز ہوا۔ ۱۰ شعبان سنہ ۱۰۹۸ھ (۲۰۔ دسمبر سنہ ۱۶۸۷ء) کو بزمانہ تسخیر قلعہ گنداوہ غلبۂ استسقاء سے عالم بقا و دانی کو رحلت فرمائی۔ اکتالیس سال عمر پائی 'صد افسوس ز لطف اللہ خاں' میں سنہ ۱۰۹۸ھ تاریخ نکلتی ہے

[۵۳۷] خان علامہ نواب آصف الدولہ کے عہد میں نائب الریاست اور مدار کل تھے۔ بڑے صاحب تصانیف تھے۔ ایک کتاب ہیئت حکمائے فرنگ میں دوسری صناعت جبر و مقابلہ میں یادگار رنا در چھوڑی ہیں، نواب وزیر علی خاں کی معزولی اور اسکو صحیح النسب تسلیم نہ کرنے میں یہ بھی شریک تھے اور اسی لئے شعرا اور اہل غرض نے انکو ناشایستہ الفاظ سے یاد کیا ہے، سعادت علی خاں کے عہد میں لکھنؤ واپس آر ہے تھے کہ مابین کلکتہ و مرشد آباد کے ۱۵۔ شوال سنہ ۱۲۱۵ھ (۲۸۔ فروری سنہ ۱۸۰۱ء) کو وفات پائی۔ میر انشاء اللہ خاں نے دریائے لطافت میں ان (کے ایک شاگرد) کی گفتگو سے روزمرہ اور ایک دہقانی خادم ما دام سنگھ سے طرق مکالمت کا یہ نمونہ نقل کیا ہے "اس مردک بدرگ نے خود کو کیا قرار دیا ہے کہ رُذ بس غطار فہت دم شادی مارتا ہے اور حقائق امور سے بے اندیشہ محض ہو کر طوالت کلام لاطائل سے سماخ سامعین پریشان کرتا ہے۔ یہ نہیں جانتا کہ احوال زمانے کا عنی بحاء

کر خان علامہ اپنے تبحر علمی میں فریدِ عصر تھا۔ حکمائے فرنگ کی ہیئت جدیدہ، جبر و مقابلہ اور بہت سے علوم و فنون غریبہ میں جو نادر کتابیں اُس نے یادگار چھوڑی ہیں، اُس عصرِ عشرت و عیش میں اُن کی مثال پائی نہیں جاتی۔ میر عبدالجلیل کو اُن کے بعض معاصرین و اخلاف نے اُن کا فضل و کمال اور تقدس

مستحق ہے۔ غایت مافی الباب یہ کہ سفہا و بُلہا و وہابیین کے اذہان قاصرہ میں مرتسم ہو کہ یہ شخص اپنے اکفاء و اماثل و اقران میں طرار طلیق و ذلیق، لوذعی، المعی لا یکل لسانہ فی الکلام ہے لو فرض و سلم کہ کوئی اپنے افراط اخلاق سے اس کی خرافات و طامات بیجا پر راضی نہ ہوا تو بھی تساوی جس کی اذہان اشخاص رفیع القدر کے ساتھ مابونی کے رہ او ہتیین کی طرح ساقیں سے تا مت نہو سکے گی۔"

۵۳۸ شاہ میر عبدالجلیل بن میر عبدالواحد قدس سرہ پنجشنبہ ۲۴ ماہ رجب ۹۷۲ھ (۲۴ فروری ۱۵۶۵ء) کو پیدا ہوئے جذبات قویہ اور کیفیات عالیہ رکھتے تھے۔ آغاز شباب میں وحشت دل دامنگیر ہوئی سب کو چھوڑ چھاڑ کر جنگل کو چل دیے، بارہ سال باہر رہے۔ دلق درویشی میں اقصائے عالم کی سیاحت کی، مدتہائے دراز صحرا و بیابان میں بسر فرمائیں۔ درختوں کے پتے اور خودرو نباتات قوت لایموت بہم پہونچاتے، خلق اللہ سے اجتناب و گریز رہا۔ ایک زمانہ تک ان کی خیر خیریت نہیں ملی، اقربا مایوس و نا امید ہو چکے تھے۔ بارہ سال کے بعد حضرت بدیع الدین شاہ مدار رحمۃ اللہ علیہ کا موسم عرس آیا جن کی زیارت کے لئے اطراف و اکناف دور دست سے خلائق اُمڈی چلی آتی تھی۔ تو زائرین کی ایک جماعت کے ساتھ آپ بھی وارد بلگرام ہوئے۔ یہاں سے شاہ مدار کا مرقد منور واقع مکن پور بارہ کوس رہ جاتا ہے۔ اتفاقاً شاہ عبدالجلیل کا گذر اُس کوچہ سے ہوا جہاں آپ کی حقیقی ہمشیر رہتی تھیں۔ میر صاحب اُس وقت اکثر بیخودی کے عالم میں رہتے اور نعرے لگایا کرتے تھے۔ جب بہن کے مکان کے سامنے پہونچے تو وہاں بھی نعرہ لگایا۔ بہن نے باوجود طول ایام جدائی اور اُن کی حیات سے مایوس ہو جانے کے بھائی کی آواز پہچان لی اور یہ کہتی ہوئیں کہ "یہ آواز تو عبدالجلیل کی معلوم ہوتی ہے" بے اختیار ڈیوڑھی (دہلیز خانہ) تک دوڑی چلی آئیں اور بھائی سے لپٹ کر زار زار روئیں۔ شاہ صاحب نے ہر چند ناآشنا بنا اور کنارہ کرنا چاہا لیکن صلۂ رحم غالب آیا اور وحشت مہر و الفت سے بدل گئی۔ پھر وہ عفیفہ ان کو گھر میں لے گئیں رفتہ رفتہ لباس پہنایا۔ میر صاحب نے بعد چندے شادی بھی کی۔ صاحب اولاد ہوئے۔ آخر عمر میں بلگرام سے قصبہ مارہرہ (ضلع ایٹہ) کو تشریف لے گئے اور قیام فرمایا۔ وہیں دوشنبہ کے دن آٹھویں ماہ صفر ۱۰۵۷ھ (۵ مارچ ۱۶۴۷ء) کو رحلت فرمائی۔ آپ کا مزار خانقاہ برکاتیہ مارہرہ میں زیارت گاہ انام اور سجادۂ ہدایت باعث فیضان خاص و عام چلا آتا ہے (آثار الکرام)

والقا تسلیم کرنے پر بھی عموماً صرف "میر" کے لقب سے یاد کیا ہے۔ البتہ اُن کے فرزند ارجمند میر سید محمد شاعر اور اُن کے مایۂ نازش نواسہ میر غلام علی آزاد نے کبھی کبھی "علامہ" بھی لکھا ہے جو بادی النظر میں محض اُن کے حسن عقیدت اور شرف انتساب پر محمول ہو سکتا تھا مگر دیدہ حقیقت بیں اسکی وجہ اور بھی بتاتا ہے

۵۴ ہندوستان کے مغل بادشاہ تیمور یا تمرلنگ کی نسل سے براہ راست تھے، اسی نے ہندوستان فتح کیا تھا لیکن اس کی لو دہ بودہ سمرقند The Maracanda of Quint-Curtius میں رہی سمی اور بڑھی۔ اُس کے پر پوتے بابر کو یہ خیال سب سے پہلے پیدا ہوا کہ اُس نے اپنے ممالک و جاگیر کو جو اوربک تاتاری (عُروا تودالن) میں واقع تھی چھوڑ کر اُس سے کم دشوار طلب اور زیادہ زرخیز ملک (ہندوستان) میں قیام اختیار فرمایا

۵۵ یہ تخت نادرۂ روزگار اور شاہجہاں کی دولت وحشمت کا بہترین اور مشہور یادگار تھا۔ اس کی سقف اندر سے بیشتر مینا کاری اور کچھ جڑاؤ۔ باہر سے لعل و یاقوت اور الماس بہا گہروں سے مرصع تھی۔ اس کا چتر بالکل مرصع و مغرق بنایا گیا تھا جو زمرد کے بارہ ستونوں پر قائم تھا اس کے اوپر طاؤسوں کے دو پیکر جو جواہر و لآلی آبدار سے مکلل تھے لگائے گئے تھے ان دونوں طاؤسوں کے درمیان ایک درخت مرصع لعل و الماس اور زمرد و مروارید سے تعبیہ کیا گیا تھا۔ اس پر چڑھنے کے لیے تین پایوں کی ایک سیڑھی جو آبدار جواہر سے مرصع تھی بنائی گئی تھی یہ تخت سات سال کے عرصہ میں ایک کرور روپیہ سے زائد کی لاگت میں تیار ہوا تھا۔ مشہور سیاح ٹیورنیر Tavernier جس کا موروثی پیشہ زرگری و جواہر فروشی تھا لکھتا ہے کہ اس میں تقریباً ساڑھے چھ ملین اسٹرلنگ (ساڑھے چھ کرور روپیہ) سے کم صرف نہ ہوا ہوگا اس تخت میں جو جواہر نصب کئے تھے اُن میں صرف ایک لعل ایک لاکھ روپیہ کا تھا جس کو شاہ عباس صفوی نے زنبیل بیگ کی معرفت جہانگیر بادشاہ کو تحفتاً بھیجا تھا۔ جہانگیر نے فتح دکن کے صلہ میں اسے شاہجہاں کو دیدیا تھا۔ وزن میں بارہ مثقال تھا (ایک مثقال اٹھائیس رتی کا ہوتا ہے) یہ لعل خاص مرزا الغ بیگ کی ملکیت تھا مرزائے مذکور نے اُس پر خط نسخ میں الغ بیگ ابن مرزا شاہرخ بہادر ابن امیر تیمور گورگان کندہ کرا دیا تھا گردش روزگار سے یہ لعل منتقل ہو کر خاندان صفویہ میں پہونچا تو شاہ عباس نے اُس پر خط نستعلیق میں "بندۂ شاہ ولایت عباس" کندہ کرایا۔ جب جہانگیر کے پاس آیا تو اُس نے اپنا نام مع اپنے آباء کے ناموں کے اُس پر لکھایا۔ پھر شاہجہاں نے اپنا نام اضافہ کرا کے اُس کو تخت کے وسط میں جڑوا دیا۔ شاہ جہاں نے اُس تخت کے اندر حاجی محمد جان قدسی کی ایک مثنوی بیس شعر کی مینائے سبز سے لکھائی تھی اورنگ شاہنشاہ عادل اور سریر ہمایوں صاحبقرانی (سنہ ۱۰۴۴ھ مطابق سنہ ۱۶۳۵ء) اس کے تاریخی نام تھے۔

کشمیر کے پہلے سفر سے واپسی کے بعد شاہجہاں نے اس تخت پر مستقر الخلافہ اکبر آباد میں جلوس فرمایا اور نو دن جشن

بزرگانِ بلگرام اور مشاہیر زمانہ میں ایک اور بزرگ بھی سیر عبدالجلیلؒ گزرے ہیں ان کا نام نامی اور شہرۂ مشیخت و عظمت اہل وطن میں سے ہر ایک کی زبان پر تھا۔ اس لئے ان دونوں ہم وطن وہم نسب حضرات میں تمیز کرنے کے لیے یہ کلمہ (علامہ) اُس بزرگ کے لیے استعمال کرنا ضروری ولابد سمجھا گیا تھا جو اپنے اوصاف عالمانہ اور فضل و تبحر کے لحاظ سے حقیقتاً اس کا اہل بھی تھا۔ بہرکیف اس قدر معلوم ہے کہ "میر علامہ" کے لقب نے باوجود سبقت زمانہ "خان علامہ" (تفضل حسین) کے

منایا تھا، یہ تخت دودمان تیموریہ میں محمد شاہ بادشاہ کے زمانہ تک چلا آیا جب نادر شاہ نے ہندوستان فتح کیا تو یہاں کے غنائم وامتعہ گرانمایہ کے ساتھ اسکو بھی لیکر ایران چلا گیا

۱۳۷) عمر بن عبدالعزیز بن مروان رضی اللہ عنہ۔ ابو حفص کنیت۔ سلیمان بن عبدالملک کے عہد میں مصر کے گورنر رہے تھے۔ یونانی علوم اور فنون سے خوب آگاہی رکھتے تھے اُن کی تحقیقات و اشاعت میں کمال رغبت و دلچسپی کا اظہار فرماتے علوم و فنون کے بڑے شائق اور سچے قدر دان تھے۔ بعض کتابیں عبرانی و سریانی سے ترجمہ کرائی تھیں اور ایک اچھا خزانۃ الکتب مجتمع و فراہم کر دیا تھا۔

سلیمان کی جگہ مسند آرائے حکومت ہوئے تھے۔ تمام مورخین نے خواہ عرب کے ہوں خواہ عجم، خواہ فرنگ کے ان کا ذکر نہایت ادب و تکریم کے ساتھ کیا ہے۔ آپ نہایت زاہد و متقی تھے، ان کے اعمال خیر کی تفصیل سے ان کی سیرت و تذکروں کے اوراق معمور ہیں۔ مسٹر براؤن اپنی تاریخ ادبیات ایران میں لکھتے ہیں کہ "ناخداترس، حریص و خود پرست فرمانروایان خاندان امیہ میں عمر بن عبدالعزیز تنہا ایک روشن اور شریف استثنا نظر آتے ہیں۔ یہ صحیح ہے کہ اُن کی حکمرانی تمام و کمال عالم معاد کے مفادات و لحاظات پر مبنی تھی نہ کہ اس دنیائے دنی کے، لیکن وہی (حکومت) آمنی (دنگذاری) سلطنت کی تباہی کا باعث ہوئی۔ انھوں نے نہایت وفاداری و پابندی کے ساتھ اُنھیں طریقوں کی نقل و تقلید فرمائی جو اُن کے جلیل الشان و عظیم القدر ہمنام عمر بن الخطاب کے زمانِ خلافت میں رائج تھے۔"

براؤن پر کچھ منحصر نہیں، خود مورخان اسلام اور سیرت نویس خلفا عمر بن عبدالعزیز کے پیشروؤں کو "امیر، جور اور خلفائے تغلب و مطامع" بتاتے ہیں

اکابر سلف ان کو عموماً "عمر ثانی" اور "شیخ بنی امیہ" کے لقب سے یاد کرتے ہیں، اور عہد حاضرہ کے مورخین و مصنفین "مولوی خلیفہ" کے نام سے ان کا شمار خلفائے راشدین میں (خامس) ہوتا ہے تحت نشیں ہوتے ہی

مقابلہ میں زیادہ شہرت و بقا نہیں پائی۔ شاید اسکی وجہ یہ ہی رہو کہ سید موصوف وکالت مطلق، وزارت یا کسی بالا منصب تک نہ پہونچے تھے۔ بے شبہ میر عبدالجلیل ایک نہایت باکمال شخص تھے، اور ہر ایک شعبۂ کمال اور جملہ اصناف فنون میں ممتاز دخل رکھتے تھے۔ اُن کا ذکر اُن کے معاصرین اور بعد کو آنے والے تذکرہ نویسوں نے فضلا، اہل لغت، شعراء اور صلحا کے ذیل میں کم و بیش ضرور کیا ہے مگر اس کو کیا کیا جائے کہ زمانہ ناموافق پایا تھا اور اقبال نامساعد۔ میرنے سات بادشاہوں کا

انھوں نے اصطبل شاہی کے سب گھوڑے فروخت کرکے ان کی قیمت بیت المال میں جمع کرادی، ان کی نیک خصال و متقیہ بی بی فاطمہ خاتون نے جو خلیفہ عبد الملک کی ناز پروردہ بیٹی اور دو بادشاہوں ولید اور سلیمان کی بہن تھیں اپنے تمام جواہر و زیور بیت المال میں بھیج دیے۔ یہ تقویٰ اور خشیت الٰہیہ کی کیفیت اُس شخص کی تھی جو ایام شاہزادگی میں بڑی امارت و عیش و تنعم کی زندگی گزار رہا تھا اور جس نے گورنر مدینہ ہوتے اور اختیار حکومت پاتے ہی یک قلم زہد و درویشی اختیار کرلی۔ حضرت انس بن مالک خادم رسول اللہ صلعم متوفی بصرہ ۹۳ھ) کی موعظت اور تعلیم صلوٰۃ و اسرار دین کا جناب عمر کی پاکیزہ طبیعت پر زیادہ اثر پڑا تھا۔

تحریر و تدوین سنن اور اخبار نبوی بھی آپ ہی کے آثار شریفہ سے ہے۔

آپ نے سمح بن مالک خولانی کو حاکم اندلس مقرر کیا جس نے جنوبی فرانس کے علاقہ اور ناربونہ فتح کئے۔

افریقہ کے بربروں نے محض عمر کے فضائل اور حسن خصائل کو سنکر اسلام قبول کیا تھا، پھر تونس و طرابلس کے باشندوں نے بھی ان کا ساتھ دیا، سندھ اور بعض ممالک ترکستان کے رہنے والے آپ ہی کی دعوت و اعلائے حق سے حلقہ بگوش اسلام ہوئے۔ بعض گرجاؤں کی زمینیں عیسائیوں کو واپس دلادیں، دمشق کے گرجا کا وہ حصہ جسکو عیسائیوں کی مرضی کے خلاف انھیں کی تیز مزاجی و بدزبانی کی وجہ سے ولید نے جامع مسجد میں شامل کرلیا تھا، عیسائیوں کو واپس کردینے کا حکم دیا، پھر جب عیسائیوں اور مسلمانوں میں باہم صلح ہوگئی تو اس مصالحت کے موافق انہدام مسجد کو منع کردیا، اور عیسائیوں کو غوطۂ دمشق کے تمام گرجے واپس و حوالہ کردئیے۔

مولانا شبلی اپنے رسائل میں بہ ذیل حقوق الذمیین لکھتے ہیں کہ "ایک عیسائی نے ہشام بن عبد الملک پر جو بڑی عظمت و اقتدار کا خلیفہ گزرا ہے ایک جایداد کا دعویٰ کیا، اور حضرت عمر بن عبد العزیز کے دربار میں مقدمہ پیش ہوا، تو حضرت عمر نے ہشام کو عدالت میں طلب کیا، اور کہا کہ مدعی کے برابر کھڑے ہوکر جواب ہی کرو۔ ہشام نے وکیل مقرر کرنا چاہا حضرت نے کہا نہیں تم خود سامنے کھڑے ہوکر جواب دو۔ ہشام نے عیسائی کے ساتھ

زمانہ دیکھا، اُن کے درباروں میں رسوخ بھی حاصل کیا سلطنت کے اہل حل وعقد او رامرائے دولت سے برابر کا رابطہ و سابقہ رکھا لیکن اُس وقت تیموریہ کے اخلاف کا تاج ہوا میں اُڑ رہا تھا، ملک میں منازعات و انقلابات عظیم رونما تھے۔ اکبر وجہانگیر کا ارث جاہ و جلال تختِ طاؤس کے ساتھ ساتھ بیرونی واندرونی حملہ آوروں کی ہیبت وجلاوطنی سے تھرا رہا تھا۔ بیچارے میر عبد الجلیل کی قدر اُن کے مرتبہ کے موافق کون کرتا۔ ملک الشعرا، یا تاج العلما کون بناتا، علامہ کون کہتا۔

اب رہے امرائے دولت اور اعیانِ سلطنت۔ ایک تو وہ بجائے خود متردد و پریشان تھے، ہر ع بر کرع

سخت کلامی شروع کی، حضرت عمر نے نہایت سختی سے ڈانٹا اور کہا کہ دوبارہ یہ حرکت سرزد ہوئی تو تعزیر سزا دیئے بغیر نہ چھوڑوں گا۔ چنانچہ رویدادسے عیسائی کا حق ثابت تھا اُسکو ڈگری دلائی اور حکم دیا کہ ہشام کی دستاویز جو اُس نے پیش کی تھی چاک کر دی جائے۔

مساجد کے منبروں پر جو حضرت علی کرم اللہ وجہہ کی بُرائی خطبوں میں کی جاتی تھی اُسکو آپ نے بند کر دیا۔ آل رسول کو مالِ فدک نذر کر دیا

حضرت عمر بن عبد العزیز ذریت طیبہ وعترت اطہار کی بڑی تعظیم و توقیر فرماتے تھے ایک بار حضرت عبد اللہ بن حسن رضی اللہ عنہا کسی کام سے اُن کے پاس گئے عمر نے کہا کہ "جب آپ کا کوئی کام ہوا کرے تو آدمی بھیجکر مجھے بلوا لیا کیجئے میں حاضر ہوں گا یا مجھے رقعہ لکھ بھیجا کیجئے مجھے اللہ سے شرم آتی ہے کہ وہ آپ کو میرے دروازہ پر دیکھے"

ایک بار آقائے مومنین مولائے رحمۃ للعالمین اسامہ بن زید کی صاحبزادی عمر بن عبد العزیز کے پاس گئیں، عمر نے اُن کو بڑی عزت و تکریم کے ساتھ اپنی جگہ پر بٹھایا خود اُن کے سامنے بیٹھے اور اُن کا ہر کام پورا کر دیا

اسوۂ صحابہ میں بحوالہ اسد الغابہ مرقوم ہے کہ ایک بار حضرت عمر بن عبد العزیز شام میں لوگوں کا وظیفہ تقسیم فرما رہے تھے ایک شخص اسی غرض سے حاضر ہوا اور کہا کہ "میں قریش سے ہوں" انھوں نے پوچھا "قریش کی کس شاخ سے ہو" بولا "بنو ہاشم سے" فرمایا "بنو ہاشم کے کس خاندان سے" بولا "میں علی بن ابی طالب کا غلام ہوں" انھوں نے سینہ پر ہاتھ مار کر کہا کہ "میں بھی علی کا غلام ہوں" پھر اپنے خزانچی سے دریافت کیا کہ غلاموں کو کیا وظیفہ دیا جاتا ہے۔ اُس نے کہا کہ "سو سے دو سو درہم تک" فرمایا "یہ علی بن ابی طالب کا غلام ہے، اس کو ساٹھ دینار دو۔" پھر کہا کہ "اپنے ملک میں جاؤ ہر سال تم کو اس قدر رقم بھیجی پہنچیگی جتنی

کے مصائب و آفات میں مبتلا، دوسرے حکمار کا قول ہے کہ جس شغل کی طرف سلاطین کے طبائع مشغول ہوتے ہیں زمانہ کے لوگ بھی اُسی کو پسند کرتے اور انھیں کی پیروی و تتبع کرنے لگتے ہیں۔ تجربہ اور عادات عقلی سے بھی یہ کلیہ درست ثابت ہو چکا ہے۔ امام غزالی فرماتے ہیں کہ عمر بن عبدالعزیز کے عہد میں لوگ جب ایک دوسرے سے ملتے تھے تو نماز، روزہ نوافل و اذکار و اوراد کی بات چیت اور سوال و جواب ہوتا تھا۔ سلیمان بن عبدالملک کے زمانہ میں نکاح و عشرت، عشق بازی اور الوان طعام کا چرچا تھا اور گفتگو ہوتی، یہ اور اسی قسم کی بہت سی حکایتیں اور واقعات دانشمندان عرب کے اس قول کی

غلاموں کو ملتی ہے"

آپ کے عہد میں حب جدار قبر مطہر حضرت پیغمبر علیہ الصلوٰۃ والسلام درست کی گئی تو بقدر ایک بسبر (بالشت) مُسنّم مُرتفع کردی گئی، ائمہ اربعہ اس کی اجازت دیتے اور استحباب فرماتے ہیں، بخلاف مسلک قدمائے شافعیہ کے جو تسطیح کو مستحب بتاتے ہیں

دو سال پانچ ماہ خلافت کرکے رجب ۱۰۱ھ (۷۱۹ء) میں راحلہ پرداز بقا ہوئے یا بقول مستشرقین فرنگ آپکی وفات پہلی صدی اسلامی کے خاتمہ کے ساتھ ساتھ ہوئی

کہ ۱۵ سلیمان بن عبدالملک خلفائے بنی امیہ سے تھا اپنے بھائی ولید کی جگہ ۹۶ھ (۷۱۵ء) میں سریر امارت پر بیٹھا اور دو سال سات (یا آٹھ) ماہ حکمرانی کرکے ۲۰ صفر ۹۹ھ (۳۔ اکتوبر ۷۱۷ء) کو وفات پائی۔ خراسان و دیگر ممالک و اقطاع فارس میں اسلام اس کے بھائی اور بیٹے ولید کے اور خود اس کے عہد میں پھیلا۔ یزید بن مہلب حاکم کوفہ نے طبرستان اور جرجان فتح کیا، اس کے بھائی مسلمہ بن عبدالملک نے قسطنطنیہ پر لشکر کشی کی، اور عرصہ تک محاصرہ کئے پڑا رہا۔ بالآخر حضرت عمر بن عبدالعزیز کے حکم سے فوجیں واپس بلالی گئیں

یہ بادشاہ نیک نیت اور معتدل مزاج سمجھا جاتا ہے اس نے اختیار پانے پر حجاج کے اسیر ستم کئی ہزار قیدیوں کو مخلصی دیدی

شعرار اور اہل کمال کا بڑا قدردان اور سرپرست تھا۔ فرزدق اس کا درباری شاعر تھا۔ ایک بار مجلس خاص میں اپنا قصیدہ پڑھ رہا تھا جب اس شعر پر پہونچا ؎

فبتن بجانبی مصرعات — وبت افض اغلاق الختام

تائید کرتے ہیں کہ الناس علیٰ دین ملوکھم بادشاہ وقت یا حکمران قوم کے شیمُ واخلاق حسب ہنرمندی و ہنرپروری پر رہبری و دلالت کرتے ہیں تو ارکان دولت اور اکابر مملکت بھی اکتساب فضائل میں پیش پیش اور استحصال فنون و کمالات میں سرگرم ہوجاتے ہیں۔ فرخ سیر اور محمد شاہ کی عادات و خصائل کو دیکھکر اہل علم و صاحبان کمال کی سرپرستی اور عزت افزائی کی توقع کس سے ہوسکتی تھی

مرزا غالب نے ایک موقع پر کہا ہے ؎

جاہ زعلم بے خبر، علم زجاہ بے نیاز   ہم محک تو زر ندید، ہم زر من محک نخواست

یہ محض ادّعائے سخنورانہ نہ تھا بلکہ "موئینہ پوش" شاعر کی سرگزشت تھی لیکن فلسفۂ ارتقا کا سبق یہ ہے کہ علم اور جاہ توام ہیں دوش بدوش رہنا چاہیئے، بلا مساعدت یکدگر شہرت و عروج نصیب نہیں ہوتا۔ انھیں زندۂ جاوداں ہستیوں کو دیکھ لیجئے جن کے نام ابھی لے چکا ہوں۔ ایک امیر زادہ

(تو انھوں نے میرے پہلو میں پڑے پڑے شب گزاری اور میں نے یوں رات کاٹی کہ بند دروں کی مہروں کو توڑتا رہا) تو خلیفہ بولا "ارے کمبخت فرزوق! تو میرے سامنے اقرار زنا کر رہا ہے۔ تجھپر حد شرعی لابد ہوگئی"۔ فرزوق نے عرض کیا کہ "مجکو تو کتاب اللہ حد سے محفوظ ہونے پر آگاہ کرتی ہے" پوچھا "کہاں اور کیسے" کہا کہ خداوند عزاسمہٗ فرماتا ہے وَالشُّعَرَاءُ يَتَّبِعُهُمُ الْغَاوُونَ (اور شاعروں کی پیروی وہ کرتے ہیں جو گمراہ ہیں۔ جزء ۱۹۔ سورۃ الشعراء ع۔ ۱۱-۱۵) الیٰ قولہ تعالیٰ اَنَّهُمْ يَقُولُونَ مَا لَا يَفْعَلُونَ (بیشک وہ کہتے ہیں جو کرتے نہیں۔ جزء ۱۹۔ الشعراء ع ۱۱-۱۵) سلیمان ہنس پڑا اور چھوڑ دیا۔

فخرالدین محمد رازی صاحب تاریخ حدائق الانوار لکھتے ہیں کہ سلیمان نہایت پرخور شخص تھا۔ ہر روز ایک من کے قریب کھانا کھا جاتا تھا۔ جامع التواریخ میں مرقوم ہے کہ اسکو طعام و نکاح سے کمال رغبت تھی، اسی لئے اسکے زمانہ میں لوگوں کی خواہش بھی انھیں دو چیزوں پر منحصر تھی۔

اہل تاریخ نے اسکی بسیار خوری کے متعلق عجیب و غریب روایات نقل کی ہیں۔ اپنے زمانۂ خلافت میں ہی حج کرنے ۹۷ھ (۷۱۶ء) میں گیا۔ مدینہ منورہ پہونچا تو بڑی سیر چشمی سے اہل شہر کی دعوت کی۔ چوراسی دُنبے ذبح ہوئے۔ ان سب کے سکتے پائے اور گُردے بھون بھون کر دعوت سے پہلے ہی ہضم کر گیا۔ پھر مہمانوں کے ساتھ بیٹھ کر شکم سیر ہو کر کھایا۔ طائف شریف میں ابن ابی زہیر ثقفی نے ضیافت کی۔ یہاں اس نے ایک دنبہ، چھ مرغیاں

لطف اللہ خاں) کو چھوڑ کر باقی سب نے جھونپڑوں میں پرورش پائی تھی، زوایا و مساجد کے صحن میں چٹائیوں پر بیٹھکر یا درختوں کے نیچے کسب علم کیا تھا۔ لیکن شہرت و نام نے اُس وقت قدم چومے کہ جب تخت و تاج کے سایہ و سرپرستی میں آگئے۔

اپنی جامعیت کمالات و مہارت السنۂ اربعہ و تبحر علمی کے لحاظ سے میر فرد فرید تھے اور ورع و تقویٰ میں ممتاز۔ اُن کو خزینۂ غیب سے دولت جمعیت دارین نصیب تھی وَاٰتَیْنٰهُ فِی الدُّنْیَا حَسَنَةً وَّاِنَّهٗ فِی الْاٰخِرَةِ لَمِنَ الصّٰلِحِیْنَ۝ (اور ہم نے اُن کو دنیا میں بھی بہتری دی تھی اور آخرت میں بھی وہ صد ورنیک بندوں میں ہوں گے۔ جزو ۱۴۔ سورۃ النحل ع-۱۶-۲۲)

میر تقی میرؔ کا یہ شعر بعینہٖ میر جلیل کے حسب حال تھا ؎

پیدا کہاں ہیں ایسے پراگندہ طبع لوگ   افسوس! تمکو میرؔ سے صحبت نہیں رہی

سینچ رقاق (نان تنک) اور ایک سو ستر انار نوش جان فرماتے تھے۔ حج کے لیے بھی بڑے تزک و احتشام اور سامان و اہتمام کے ساتھ گیا تھا۔ صرف اس کی ذات خاص کی پوشاکیں سات سو اونٹوں پر بار تھیں

یادِ خیر پُورب

سلامٌ علیٰ شرقٍ وَمَن حَلَّ فی شرقٍ سلامٌ علیٰ سکانہ قل عن حق

پورب کی تاریخ قدیم سے علم و علماء کے دامن سے وابستہ اور یہ سرزمین اُن کی بدولت معدن فضل و شرف رہی ہے سید محمد کرمانی جو سلطان المشائخ نظام الدین دہلوی کے مرید رشید تھے سیر الاولیا میں لکھتے ہیں کہ "مولانا فریدالدین شافعی، اودھ کے شیخ الاسلام تھے۔ جن کے روبرو بڑے بڑے علمای متبحرین نے زانوے ادب تہ کیا تھا۔ مولانا علاء الدین نیلی[۳۳] اودھی، کشاف کے قاری ہوتے تھے۔ اور مولانا شمس[۳۴] الدین یحییٰ سے نامور، اور دیگر فضلاے اودھ سامع" پایۂ تخت خلافت کے حصار کو چھوڑ کر جو قسم کے اہل کمال کا مرجع اور مرکز ہو رہا تھا اور ہونا چاہیئے تھا، صوبۂ اودھ و الٰہ آباد کو جو خصوصیت حاصل تھی اور کسی قطعۂ مملکت ہند میں پائی نہیں جاتی۔ یہاں والوں نے ہر زمانہ میں اپنے تراکم افکار و اجتماع عقول سے جملہ کمالات نفسی کو علماً، عقلاً اور نقلاً انتہاے ترقی پر پہونچا دیا تھا۔ اودھ کے پورے صوبہ اور الٰہ آباد کے اکثر حصہ میں پانچ کوس تک شرفا و نجبا کی آبادی تھی جن کو سلاطین و حکام نے وظائف و زمین مدد معاش میں دے رکھی تھیں مساجد، مدارس، خانقاہیں تعمیر کی تھیں جن کے دروازے اہل تلاش کے لیے کھلے ہوئے تھے۔ علما ہر جگہ مشغول افاضہ و تدریس تھے۔ اطلبوا العلم کی صلاے عام کانوں میں گونج رہی تھی۔ طلبہ جوق جوق ایک شہر سے دوسرے کو جاتے اور موافقت مزاج و مذاق پاکر معرفت

---

[۳۳] ابن ابی الحجاج شاعر کے ترجمہ میں قاضی ابن خلکان لکھتا ہے کہ "نیل" در اصل ایک نہر کا نام ہے جو حجاج بن یوسف نے کھدوائی تھی اور نیل مصر کے نام پر اُسکا نام رکھا تھا

قاضی نور اللہ کی تحقیق یہ ہے کہ "نیل" رود فرات کے کنارے بغداد اور کوفہ کے درمیان ایک شہر تھا،

[۳۴] سألت العلم من احیاک حقا فقال العلم شمس الدین یحییٰ یہ مبالغہ شاعرانہ نہیں بلکہ اظہار حقیقت ہے جو مولانا شمس کے نام آور شاگرد شیخ نصیر الدین محمود اودھی الدہلوی کے معجز رقم قلم سے بے ساختہ ادا ہو گیا ہے اہل علم نے متفقاً تسلیم کیا ہے کہ اس ملک میں علم کے جسم بے جان میں مولانا ہی نے جان تازہ ڈالی۔

تحصیل ہو جاتے، ہر بستی کے صاحب توفیق، طالبان علم پر نظر رکھتے اور اس جماعت کی خدمت کو سعادتِ عظمیٰ جانتے تھے صاحب قران ثانی شاہجہاں کو ناز تھا کہ "پورب شیراز مملکت ما است"۔ ۱۱۳۰ھ (۱۷۱۸ء) تک علم و علماء کا یہ ہنگامہ اس گل زمین پر گرم رہا تا آنکہ برہان الملک [۴۴] سعادت خاں نیشاپوری آغاز جلوس محمد شاہ میں صوبہ اودھ کا حاکم مقرر ہو کر آیا اور صوبۂ الہ آباد کے اکثر اچھے شہر مثل جونپور و بنارس و غازی پور و کڑہ مانک پور و کوڑہ جہان آباد وغیرہ کے ضمیمہ حکومت ہو گئے تو قدیم و جدید خانوادوں کے وظائف و پنشنیں یک قلم ضبط کر لیں۔ شرفاء و نجباء پریشان ہو گئے۔ اضطرار معاش نے کسب علم سے باز رکھا۔ سپہ گری کی طرف توجہ کرنا پڑی۔ تدریس و تحصیل علوم کا اُس درجہ رواج نہ رہا۔ پرانی پرانی مشہور درسگاہیں تباہ ہو گئیں اور اربابِ کمال کی مجلسیں برہم۔ اِنَّا لِلّٰهِ وَاِنَّا اِلَيْهِ رَاجِعُوْنَ

وہ اودھ (یا اجودھیا۔ دار الامارۃ پورب) کے رہنے والے تھے، اور مولانا ظہیر الدین بکری اور مولانا فرید الدین شافعی کے تلمیذ رشید، خرقۂ خلافت سلسلۂ عالیہ چشتیہ میں سلطان المشائخ حضرت نظام الدین بدایونی دہلوی سے پہنا تھا اپنے مرشد کے وصال کے دو سال بعد ۷۲۷ھ (۱۳۲۷ء) میں رحلت فرمائی

۴۵ محمد امین نام، سادات موسوی نیشاپور سے تھا شاہ عالم بہادر شاہ کے زمانہ میں ایران سے ہندوستان آیا، ابتداءً کچھ روز نواب سربلند خاں نائب صوبیدار گجرات کے ساتھ گذارے پھر محمد فرخ سیر بعد ازاں محمد شاہ کے حضور میں پہونچا ترقی کی رسوخ حاصل کیا نواب برہان الملک سعادت خاں خطاب مرحمت ہوا صوبہ داری اودھ پر سرفراز کیا گیا ہفت ہزاری منصب پایا محاربۂ نادر شاہی میں موجود تھا۔ جنگ کے بعد مگر قتل عام سے ایک شب پہلے ۲۹۔ ذیحجہ ۱۱۵۱ھ (۱۰ مارچ ۱۷۳۹ء) کو اس جہانِ فانی سے رخصت ہوا۔ وجہ موت درد کی شدت اور زخم کی کلفت تھی کئی ماہ سے ایک ہل نے ستا رکھا تھا۔ بعض مورخین کا بیان ہے کہ "برہان الملک" امیر الامرا ہونا چاہتا تھا اسمیں ناکامی ہوئی تو آزردہ خاطر ہو کر نادر شاہ قہرمان ایران سے مل گیا۔ اور بدگوئی و سعایت کی۔ جنگ کے آغاز میں مجروح و اسیر ہوا پھر صلح کے لئے سلسلہ جنبانی اور پیغام رسانی کی۔ نادر شاہ محض اُسی کی تحریک و اشارہ سے بہ بہانۂ ضیافت کرنال کے میدان جدال سے شاہجہاں آباد آیا، اور قلعہ میں داخل ہو گیا تھا۔ ورنہ در اصل اُس کا ایسا ارادہ نہ تھا۔ زر موعودہ مع تحفہ پہونچنے میں دیر ہوئی۔ نادر شاہ نے سختی کی اور برہان الملک کے مونھ پر تھوک دیا۔ میر محمد قاسم عبرت نامہ میں لکھتے ہیں کہ برہان الملک اسی وجہ سے زہر کھا کر مر گیا تھا۔ تاریخ وفات "بے سعادت نمک حرام بمرد"

برہان الملک کی رحلت پر اُس کا بھانجہ ابو المنصور خاں[۲] صفدر جنگ حکمران ہوا، اُس کے وقت میں بھی وظائف و اقطاعات بدستور ضبط رہے۔ محمد شاہ کے اَواخر عہد یعنی ۱۱۵۹ھ (۱۷۴۶ء) میں صوبہ داری الٰہ آباد پر بھی صفدر جنگ کا تقرر ہو گیا تو رہے سہے وظائف جو اس صوبہ میں اب تک ضبطی سے محفوظ تھے اُنکی بھی شامت آگئی۔ احمد شاہ کے زمانہ میں صفدر جنگ نے پایۂ وزارتِ اعلیٰ پر ترقی و سرفرازی پائی۔ نائب صوبہ نے ارباب وظائف کو نہایت تنگ اور پریشان کیا اور ان صوبجات میں حوادث روزگار سے یہ پامالی حد انتہا تک پہونچ گئی

اس داستانِ الم یا سرگذشت عہد گل کو میر غلام علی بلگرامی کے حول چکاں و خونیں نوا قلم نے مآثر الکرام کے صفحات پر خوب ادا کیا ہے ع

عندلیب آشفتہ تر گفتست ایں افسانہ را

۱۱۵۲ھ ہے۔ ۱۱۵۱ھ ہونا چاہیئے تھا، ایک عدد زیادہ ہے۔

عمدۃ الملک نواب امیر خاں (متخلص بہ انجام) سے لوک جھوک ہوتی رہتی تھی۔ ایک روز دونوں نواب دربار شاہی میں حاضر تھے سعادت نے طنزاً کہا ؎ بسیر نوح با بداں بہ نشست خاندان نبوتش گم شد
طعن یہ تھا کہ شاہ نعمت اللہ ولی کی اولاد ہو کر تم نے یہ شیوۂ ناشایاں اختیار کیا ہے اور مسخرہ و مذاق کیا کرتے ہو
امیر خاں نے فی البدیہہ جواب دیا کہ صحیح ہے ؎ سگِ اصحاب کہف روزے چند پئے نیکاں گرفت مردم شد
یعنی آپ گمنام تھے یہ شہرہ و مرتبہ پا گئے۔ سعادت خاں دہلی میں اپنے بھائی سیادت خاں کے مقبرہ میں مدفون ہیں
والہ داغستانی نے مرثیہ لکھا تھا ؎

دُور از تو سپہر داتر گوں می گردید   بنگر کہ زمانہ بے تو چوں می گردید
رفتی رہماں و لیکن تمشیر شکست   با قامت خم ہمیشہ خوں می گردید

میر غلام علی آزاد نے خزانۂ عامرہ میں برہان الملک کی زندگی کے ہر پہلو کو پاک اور خوشنما بنا کر دکھایا ہے مگر حقیقت یہ ہے کہ وہ مورخ نہ تھے۔ شاعر تھے اور شاعروں کی طرح تذکرہ نویس یا یوں کہئے کہ بلگرام کی سکونت و تعلقات اور نواب شجاع الدولہ کی حکمرانی اودھ سے مجبور تھے ؎

حافظ بخود نپوشید ایں خرقۂ مے آلود   اے شیخ پاک داماں معذور دار ما را

پورب کی تعریف میر آزاد تحفۃ المرجان میں فرماتے ہیں کہ "وہ دہلی سے جانب شرق ایک وسیع ملک ہے جس کے متعلق تین صوبے، اودھ، الہ آباد اور عظیم آباد ہیں" اور "صوبہ زمین وسیع و محدود کو کہتے ہیں کہ جس میں دار الامارۃ واقع ہو اور دیگر شہر بھی متعلق ہوں"۔ "ہر شہر کے تابع چند قصبے ہوتے ہیں جو اُس کی طرف مضاف کر دیے جاتے ہیں" "پورب کے قصبے بھی شہروں کے برابر ہیں، ان میں عالیشان عمارات اور شرفا و نجبا، مشائخ و علما اور مختلف اقوام اور انواع و اقسام کے پیشہ وروں کے مکانات اور مساجد و مدارس و پرستش گاہیں موجود ہیں۔ وہاں کی مسجدیں جمعہ و جماعت کی نمازوں سے آباد ہیں اگر ان کو شہر کہیے تو بجا ہے"۔

صوبۂ اودھ کے مردم خیز قصبات نے جس قدر اور جس پایہ کے اہل علم و فضل پیدا کئے ہیں مجموعاً سارے ملک ہند نے بھی ایسے باکمال پیش نہیں کیے مولانا شیخ سعد الدین خیرآبادی، ملا قطب الدین شہید سہالوی، مولوی قطب الدین شمس آبادی، شیخ نظام نقشبند لکھنوی، شیخ احمد ملا جیون امیٹھوی، مولانا بحر العلوم فرنگی محلی، ملا حمد اللہ، ملا حسن، ملا کمال، قاضی مبارک، ملا نظام الدین صاحب درس نظامیہ، میر عبد الجلیل بلگرامی، میر غلام علی آزاد، اسی خاک سے اُٹھے تھے جو علم و شہرت کے آسمان پر شمس و قمر ہو کر چمکے۔

۴۶؎ اصلی نام مرزا مقیم، ابو المنصور خاں کنیت و لقب وزیر الممالک نواب منصور علی خاں صفدر جنگ خطاب تھا سعادت خاں کا بیٹا برہان الملک سعادت خاں کا بھانجا اور داماد تھا ماموں کے مرنے کے بعد شروع سال ۱۱۵۲ھ (اپریل ۱۷۳۹ء) میں دو کروڑ روپیہ بطریق پیشکش نادر شاہی خزانہ میں داخل کر کے محمد شاہ کے حضور سے صوبۂ اودھ کا خلعت حاصل کیا۔ ۱۱۶۱ھ (۱۷۴۸ء) میں احمد شاہ بادشاہ کے تخت نشین ہونے پر عہدۂ وزارتِ اعلیٰ پر سرفراز ہوا سات سال تک تمام انتظامات سلطنت اور اختیارات شاہی اپنے ہاتھ میں رکھے ۱۱۶۶ھ (۱۷۵۳ء) میں وزارت سے معزول ہوا۔ پایۂ سریر سلطنت سے رخصت ہو کر اپنے مستقر حکومت صوبۂ اودھ و الہ آباد کو جا رہا تھا کہ لکھنؤ سے تین منزل اس طرف پاپڑ گھاٹ میں ۱۷ ذی الحجہ (۱۱۶۷ھ۔ ۵ اکتوبر ۱۷۵۴ء) کو جادہ نوردِ منزل بقا ہوا برہان الملک کی طرح اس کا خاتمہ بھی ایک بڑے دانہ کے نکلنے اور درد کی شدت سے ہوا تھا اس کی لاش پہلے پہلے گلاب باڑی فیض آباد (اپنے دار الحکومت) میں امانتاً سپرد زمین رہی بعد ازاں

سلام، اے پورب کی سرزمین سلام!! تجھ پر اور اُن قدسی ہیکروں پر رحمت اور سلام!! جو تیری پاک آغوش میں راحت گزیں اور محوِ خواب نوشیں ہیں جن کے اعمال حسنہ اور حسنات جاریہ کی برکات اب تک عالم پر سایہ فگن ہیں جن کی یاد میرے اور تیرے سینہ میں موجزن ہے اس تار و تنگ دنیا کے در و دیوار شاہد ہیں کہ کبھی تو نے اپنی تجلیوں سے اُسکو بقعۂ نور بنا دیا تھا۔ اہل دل اور اہل نظر کے لیے تو محبت کی چیز ہے ۵

ومن شیمتی حب الدیار لاھلھا　　　وللناس فیما یعشقون مذاھب

شاہجہاں آباد بھیجی گئی شاہ مرداں کی درگاہ کے متصل اس کا رفیع الشان اور منیع البنیان مقبرہ مع ایک وسیع و پُر فضا باغ کے اب بھی نہایت اچھی حالت میں موجود ہے تیس لاکھ روپیہ اس کی تعمیر میں صرف ہوا تھا۔ اُس کی بجائے اُس کا بیٹا نواب شجاع الدولہ صوبہ داری اودھ پر مامور ہوا۔

صفدر جنگ کے زمانۂ وزارت میں بہت سے تنازعات برپا ہوگئے تھے۔ وزارت سے ہٹایا گیا تو مقابلہ و مقاتلہ کے لئے مستعد و آمادہ ہوگیا چند امرائے با اقتدار سے سازش کرکے اپنے مخالفین سے جنگ و پیکار شروع کردی۔ اس کے رفیق اور مدار مہام سورج مل جاٹ نے کشتوں کے پشتے لگا دیے دہلی کا یہ مختصر حزن سانحہ 'جاٹ گردی' کے نام سے مشہور ہے۔ ہر ند اس کی جاگیر کے محالات کا محصل و مہتمم اور راجہ اندر گوسائیں ملتزم خدمت و نگران کار تھا۔ اس کی فرد جرائم کی ایک دفعہ یہ بھی ہے کہ بہ حیلۂ ضیافت دہلی اس نے نواب بہادر جاوید خاں کو بلوا کر مروا ڈالا تھا اور دغا کی تھی

ہ دیکھئے

دار السلام بلگرام

بلگرام کا نامور شاعر شاعرؔ تخلص جس کا تذکرہ مختصراً پایان کتاب ہذا میں بھی آئیگا، اپنے وطن کی مدحت و ستائش میں نوا سنج ہے:۔

سیر باید کرد یاراں نو بہار بلگرام — برزمرد تازہ دارد سبزہ زار بلگرام
ہر نفس عطر گلستان یمن بومی کنند — خوش دماغاں از نسیم مشکبار بلگرام
خلعت از فردوس می سازد عنان دیدہ را — چشم بینائے کہ می گردد دوچار بلگرام
اہل معنی کسب انوار سعادت می کنند — از سواد اعظم دولت مدار بلگرام
شش جہت تنگ است بر جولان حسن عشق تو — بر فراز عرش نازد شہسوار بلگرام
یاد ہندوستاں کجا از خاطر طوطی رود — میکند شاعر بجا وصف دیار بلگرام

شاعرؔ سخنور پر منحصر نہیں، خود اُسکے پدر گرامی قدر (صاحب تذکرہ ہذا میر عبد الجلیل) نے ایک پوری مثنوی "امواج الخیال" نام لکھکر وطن پسندی اور وطن دوستی کی داد دی ہے۔ "حب الوطن من الایمان" کا حق بلگرام کے اور بھی بہت سے اہل کمال نے ادا کیا ہے۔ امواج الخیال کی چند طریں اپنی رو میں قارئین محترم تک آجائیں گی لیکن اوروں کے نغمہ و نشید کی ان معدود اوراق میں گنجایش نہیں۔ اسی الفت کا اقتضا کہئے یا سویت طویت و حسن عقیدت کا جاذبہ کہ بزرگان بلگرام، بلگرام کا نام بھی ہمیشہ کمال عظمت و حرمت کے ساتھ لیتے رہے ہیں۔ میر غلام علی نے اسکو "دار السلام" کے لقب سے یاد کیا ہے۔ وزن و قافیہ کی رعایت سے یہ نازک خیالی قابل داد ہے!

حسب تحریر محققین متاخرین (و روایت مآثر الکرام) بلگرام کا طول البلد ایک سو سولہ درجہ پندرہ دقیقہ اور عرض البلد چھبیس درجہ پچپن دقیقہ سمت قبلہ ہے اور پچپن دقیقہ مغرب سے جانب شمال مسافت مابین مکہ و بلگرام پینتیس ۳۵ درجہ ترپن دقیقہ ہے اور باعتبار شمار فراسخ ساٹھ سو نواسی کوس۔ مساحت جدیدہ۔

اگرینویچ واقع انگلستان کے مطابق بلگرام کا عرض البلد ستائیس درجہ دس دقیقہ تیس ثانیہ شمالاً اور طول البلد اسی درجہ چار دقیقہ تیس ثانیہ شرقاً بتایا جاتا تھا مگر اب ستائیس درجہ گیارہ دقیقہ شمالاً اور اسی درجہ دو دقیقہ شرقاً ثابت ہوتا ہے۔

بلگرام کی وجہ تسمیہ کی نسبت رواۃ اور افسانہ خوانان کہن کا بیان ہے کہ یہ نام ایک دیو "بل" نامی سے منسوب ہے بعض "الال پسر بلال" سے اس کا انتساب ظاہر کرتے ہیں جسکو شہسار کے متبرک و مرتاض رشیوں کے ایما سے سری کرشن جی کے بھائی بلرام نے قتل کیا تھا ایک روایت یہ بھی ہے کہ "بل" وہ دیو تھا جس کو بتدائے زمانہ اسلام میں شیوخ نے ہلاک کیا تھا شیوخ بلگرام کا دعویٰ ہے کہ ان کے اسلاف نے جو محمود غزنوی کی رفاقت و ہمرکابی میں یہاں آئے تھے ۴۱۶ھ میں راجپواروں کو خارج البلد کرکے قصبہ کا نام بلگرام رکھا تھا جس کی تائید و تصدیق میں اشعار ذیل پیش کرتے ہیں:-

مسلماں رسیدہ بہ ہندوستاں	ز تُوراں ہمی بود صد لقیاں
جنود و جلیس بود انصاریاں	ترکمان و اعوان بو صاریاں
ز چار و صد و خمس ہجری تمام	سری نگر را نام شد بلگرام

آزاد لکھتے ہیں کہ اکابر طریقت میں سے خواجہ عماد الدین[۶۴] و سید محمد صغرا[۶۵] نے سب سے پہلے بلگرام کو بلگرام بنایا اور اپنے مقدم گرامی سے شرف و اکرام بخشا تھا۔ چنانچہ سر سید محمد خواجہ صاحب کی شان میں فرماتے ہیں ؎

[۶۴] خواجہ عماد الدین، حضرت شیخ قطب الدین بختیار کاکی (اوشی) دہلوی کے مرید اور اسی مقام کے صاحب ولایت تھے حسب روایت مآثر الکرام خضر علیہ السلام سے ملاقات تھی فقر و تصوف میں مقامات عالیہ طے کر چکے تھے اولیائی تحت قبائی لا یعرفھم غیری کا نقاب ڈالکر ایک خاموش زندگی بسر کرتے رہے کبھی کسی کو خلیفہ حتیٰ کہ مرید بھی نہیں کیا سید شریف بن سید عمر حسینی واسطی بلگرامی نے کتاب مرآت المقتدین میں آپ کے حالات کمال عظمت و احترام کے ساتھ لکھے ہیں۔ ۔ وجہ دیگر قنوج اور بلگرام کے مابین دریائے گنگ حائل ہے لیکن بحالت طالب علمی روزانہ

خواجۂ کامل عماد الدین قطب الاولیا — حلقۂ باب حریم او حصارِ بلگرام
از ورودِ موکب این خسروِ عالیجناب — سرمۂ چشمِ ملک باشد غبارِ بلگرام
آستانِ اشرف او بوسہ گاہِ آسماں — بارگاہ اقدس او افتخارِ بلگرام

دسویں صدی کے پیشتر کی تاریخ تو بہت کم معلوم اور کم قابل اعتماد ہے، تاہم بلگرام کے متعلق کچھ افسانے یا حوالے بھوبنیت کرت اور اس کے ترجمہ پریم ساگر میں ملتے ہیں۔ یا کچھ قصے کہانیاں بعض زبانوں پر باقی ہیں۔ البتہ دریائے گنگا کے فراخ و دراز کنارے اور بلند پہاڑیاں اُن خونریزیوں کی شاہد ہیں جو اس زرخیز و مردم آفریں خطہ کی فتح و تسلط کے لئے ازمنۂ ماضیہ میں وقوع میں آئی تھیں۔ کہا جاتا ہے کہ یہ مقام ٹھٹیرا قوم کی حکومت و قبضہ میں مدت ہائے دراز سے چلا آتا تھا کبھی اس کا تعلق ہستنا پور کی غربی سلطنت سے ہو جاتا (جس کا تذکرہ مہابھارتہ میں ہے) اور کبھی اجودھیا کی شرقی بادشاہت سے (جس کے کارنامے رامائن میں مرقوم ہیں) پھر پچھم سے راجپوتوں نے قدم بڑھایا۔ ریکوار راجہ سری رام نویں یا دسویں صدی عیسوی میں دریائے گنگ کو عبور کر کے قنوج سے مع اپنے رفقا و عساکر کے یہاں آیا اور اس کے بلند ٹیلہ پر قصبہ آباد کیا، قلعہ و شوالہ تعمیر کیا۔ ایک وسیع تالاب یا ساگر بنا کر شہر کا نام سری نگر رکھا۔ بعد ازاں ۶۱۴ھ (۱۲۱۷ء) میں بسر کردگی قاضی یوسف جو امرا و سالاران افواج محمود سے تھے فتح مند عثمانی شیوخ آئے اور ریکواروں کو شکست دیکر پورے راج کو فتح کر لیا۔ مشہور ہے کہ مصالح ملکی کے اقتضا سے یا اپنے راج کے استحفاظ کے لئے راجہ سری کا بھائی بھی مشرف باسلام ہو گیا تھا اُس کا نام مختار الدین اور اُس کے بیٹے کا اختیار الدین رکھا گیا۔ "شرائف عثمانی" کی تالیف

صبح کو قنوج جاتے اور سبق پڑھکر شام کو واپس آجاتے تھے۔ کبھی کسی کو ایسی کیفیت سے آگاہ نہ ہونے دیا۔ آخر ایام زندگی میں ایک امر خارق عادت سرزد ہو گیا تھا جس نے سارا راز فاش کر دیا سلطان شمس الدین التمش کو بھی حقیقت حال سے خبر ہو گئی۔ اعتقاد دالعباد کا شرف لا لایا۔ اس کے کچھ ہی دن بعد خواجہ نے ۲۔ شوال ۶۳۲ھ (۲۷۔ جون ۱۲۳۵ء) کو عالم ارواح کو انتقال فرمایا مرتے وقت وصیت فرمائی تھی کہ فلاں بلندی پر مجھے دفن کرنا۔ وہ پریوں اور دیووں کی جگہ ہے۔ ان کا آسیب شہر سے دور ہو جائے گا۔

کے وقت تک قاضی یوسف موصوف کا ایک سجل[۴۹] مرقومہ ۳۳۸ھ (۹۴۹ء) میر سید عزیز الدین معروف بہ لال پیر گوپاموی کے احفاد و اخلاف کے قبضہ میں موجود تھا میر غلام علی آزاد بھی اس روایت کی تائید کرتے ہیں لیکن انگریز مورخین اسکو تسلیم نہیں کرتے۔ انکی تحقیقات کا ماحصل اسکو مشتبہ کرتا ہے اُن کے خیال کے مطابق یہ تو ممکن ہے کہ محمود کی فوجیں بلگرام سے گزری ہوں اور لوٹ مار ہوئی ہو کچھ شیوخ یہاں رہ گئے ہوں مگر نظر بہ واقعات مابعد مسلمانوں کا قبضہ اور مستقل قیام تسلیم نہیں کیا جاسکتا ایلیٹ صاحب (Sir H. M. Elliot) نے اپنی تاریخ ہندوستان جلد دوم میں اس کا تذکرہ کیا ہے مرآت مسعودی سے اسی قدر معلوم ہوتا ہے کہ سید سالار مسعود قنوج سے ستر کھ جاتے ہوئے اس طرف سے (۴۲۳ھ یا ۱۰۳۲ء میں) گزرے تھے

بہرحال جب بہ عہد شہاب الدین محمد غوری اُسکے سپہ سالار قطب الدین ایبک نے ۵۸۹ھ (۱۱۹۳ء) میں راجہ جے چند پر حملہ کرکے قنوج فتح کیا اور قرب و جوار کے تمام رؤسا و راجگان کی قوت، حکومت و سطوت کو خاک و برباد کر دیا تو اُسی سلسلہ بلکہ اُسی سال میں بلگرام پر مسلمانوں کا قبضہ بھی مسلسل و مستقیم ہو گیا اس کے ایک قرن بعد سلطان شمس الدین التمش نے اپنے عساکر قاہرہ پھر قنوج نیز ان اطراف میں تسلط و تنظیم حکومت کے لئے بھیجے، چنانچہ اُس کے دو سردار شیخ محمد فقیہ عراقی اور سید محمد صغریٰ نے (جو بااتفاق خراسان کی جانب سے ہندوستان آئے تھے) ۶۱۴ھ (۱۲۱۷ء) میں سری نگر اور اس کے مضافات کو ریگواروں سے چھین لیا اور رعایا و باشندگان کو مطیع و منقاد کیا تاریخ فتح "خداداد" ۶۱۴ھ ہے انہیں دونوں حضرات (شیخ و سید) کی اولاد یہاں آباد و اقامت گزیں ہو گئی اور پرگنہ بلگرام کے مختلف مناصب و خدمات، چودھری و قانونگو و قاضی پران کا تقرر اُس وقت بالذات عمل میں آیا مگر بعد چندے یہ عہدے

[۴۹] سید محمد صغریٰ۔ بلگرام کے تمام سادات حسینی واسطی کے جد اعلیٰ ہیں ان کا لقب دراصل صاحب الدعوۃ الصغریٰ تھا۔ آپ بھی خواجہ قطب الدین دہلوی کے مرید اور فضائل صوری و معنوی میں فرد فرید تھے اعلائے کلمۂ دین اور احیائے سنت سنیہ میں ہمیشہ راسخ قدم اور استوار رہے۔ بحسب ظاہر سلطان التمش کی ملازمت میں بسر کرتے اور خود کو نظر خلائق سے پوشیدہ و متواری رکھتے تھے ۶۱۴ھ (۱۲۱۷ء) میں غازیان اسلام کی ایک جماعت کے ساتھ بلگرام آئے راجہ سری

ان کے خاندانوں اور قبیلوں میں موروثی اور مستمر کر دیے گئے۔

سید محمد صغریٰ فاتح بلگرام نے جب بحکم سلطانی یہاں قیام فرمایا تو ۶۲۷ھ (۱۲۳۰ء) میں وسط شہر میں ایک بلند ٹیلہ پر ایک قلعچہ حاکم نشیں تعمیر کرایا۔ سنگ کتابہ پر یہ عبارت منقوش تھی۔[۱۵]

حامی البلاد راعی العباد، ذی الامان لاہل الایمان وارث ملک سلیمان، صاحب الخاتم فی ظل العالم ظل اللہ فی الخافقین ابو المظفر التمش السلطان ناصر امیر المومنین ادام اللہ تمکینہ فی شہور ۶۲۷ھ سبع و عشرین و ست مأتہ۔

اس کے بعد کی تاریخ بھی دلچسپ واقعات اور اہم معرکوں سے معمور ہے لیکن راقم اوراق اپنے تذکرہ کی تنگ دامانی سے معذور۔ ضروری و مختصر یہ ہے کہ جب سنہ ۶۷۹ھ (۱۲۷۷ء) میں صوبہ اودھ کی حکومت ملک حسام الملک کو تفویض ہوئی تو اُس نے سلطنت کے اس حصہ پر بھی توجہ کی اور تاسیس و استحکام ملک داری و امن کی تدابیر عمل میں لایا۔ سنہ ۷۹۶ھ (۱۳۹۴ء) میں ملک الشرق خواجہ جہاں کا قبضہ ہوا۔ باوجود متواتر و متوالی معرکہ آرائیوں کے حسین شاہ کے وقت تک اودھ شاہان جونپور کے حدود مملکت میں داخل رہا۔ سنہ ۸۸۳ھ (۱۴۷۸ء) میں حسین شاہ کو شکست ہوئی اور یہ قطعہ پھر سلطنت دہلی کے متعلق ہو گیا۔ ظہیر الدین بابر نے سنہ ۹۳۳ھ (۱۵۲۷ء) میں فتح کیا۔

تاج و تخت دہلی کے دو رقیب دعویداروں میں سنہ ۹۴۷ھ (۱۵۴۰ء) میں اس جگہ معرکہ آرائی و قوت آزمائی ہوئی۔ مغل تاجدار ہمایوں نامدار کی رفاقت میں نوے ہزار نبرد آزما جوان تھے، اور حوصلہ مند شیر خاں سوری کے زیر فرمان پچاس ہزار آزمودہ کار سپاہی۔ ان شیر دل جوانمردوں

نے مقابلہ و مقاتلہ کیا۔ جو مع اقارب و اعیان سپاہ کے تہ تیغ ہوا۔ آپ نے مع فرستوری شیوخ اور ترکمانوں کے یہاں قیام اختیار فرمایا۔ اور ایک ہی مقام پر اکتیس سال بسر کر دیے۔ ۱۴ شعبان ۶۴۵ھ (۱۰ دسمبر ۱۲۴۷ء) کو عالم قدس میں راحت فرمائی۔ مزار پر ایک لوح سنگیں نصب تھی جس پر آیۃ الکرسی اور تاریخ وفات منقش تھی پتھر گر گیا۔ ۱۱۵۱ھ (۱۷۳۸ء) میں قبر کی درستی و مرمت از سر نو ہو گئی

کے حون کی بو خاک بلگرام سے اب تک آجاتی اور اس موقع کا نشان دیتی ہے جہاں نا ہمایونی و نامساعدت بخت سے ہمایوں کو ناکامی و شکست ہوئی تھی۔

آئین اکبری[۵۳] میں بلگرام کو "بلگرانو" لکھا ہے سو ایسے ناموں کے تلفظ و املا کا قدیم طریقہ تھا۔ بلگرام اس وقت سرکار قنوج متعلق صوبۂ اودھ میں شامل تھا۔ جامع آئین لکھتا ہے کہ "بلگرام قصبہ ایست خوش ہوا۔ بیشتر مردم آں خوش فہم و سر و د سرا۔ و در آنجا چاہے است کہ ہر کہ چہل روز آب از و آشامد شناسائی و حسن منظر افزاید" "قلعہ از خشت پختہ دارد" ۔ سنہ ۹۹۰ھ (سنہ ۱۵۸۲ء) یعنی آئین اکبری کی تالیف کے زمانہ میں اس قلعہ میں ایک ہزار فوج پیادہ اور بیس سوار رہتے تھے۔

اکبر کی وفات سے لیکر اودھ کی جداگانہ امارت یا سلطنت کے قائم ہونے تک ان اطراف کے متعلق تاریخوں میں بہت کم حالات پائے جاتے ہیں لیکن بلگرام اور اہل بلگرام کی تاریخ اس سے مستثنیٰ ہے۔ یہ مقام ہمیشہ ممتاز و معروف رہا ہے۔ بلگرام والوں نے اپنے شہر کا نام ہر صورت و عنوان سے روشن کیا ہے اس شہر کی اہمیت کسی وقت اس قدر تھی کہ اس سرزمین پر سلطان اورنگ زیب نے بھی قدم رکھا تھا۔

میر غلام علی آزاد ماثرالکرام میں تحریر فرماتے ہیں کہ "در صوبۂ اودھ محروسہ بلگرام از قدیم منشار فضلار کرام و مظہر علماے عظام است و فراواں دانشمند ازیں شہر برخاستہ مجلس افادہ و استفادہ بہ کمال خوبی آراستہ"

آرایش محفل (تاریخ ہندوستان) میں بلگرام کی نسبت مرقوم ہے کہ "۔۔ ایک بڑا قصبہ ہے۔ اکثر وہاں کے لوگ قابل و شاعر، صاحب طبع ہوئے ہیں۔ قصبہ مذکور میں ایک کنواں ہے جو کوئی

---

[۵۳] سجل، بکسر سین و جیم و تشدید لام، چک جس پر مہر ہو یا کوئی تحریر جس پر قاضی کی مہر و دستخط ثبت ہوں۔ قبالۂ شرعی یا قاضی کا حکمنامہ

[۵۴] قلعہ کی عمارت مرور دہور سے جب گرنے لگی تو ڈھائی سو برس ہوئے یہ پتھر سیدمیاں کی مشہور مسجد واقع محلہ سیدواڑہ کی دیوار میں نصب کر دیا گیا۔ اللہ اللہ رے انقلاب محل ہٰذہٖ قصر کہ پتھر فقط عمارت شاہی کا رہ گیا

چالیس دن متصل اُس کا پانی پیئے، خوب گانے لگے، سوائے اس کے اکثر اہل کمال گذرے ہیں" محفل میں یہ لے غالباً آئین کی بلند آہنگی سے پہونچی ہے۔ مسٹر جے سی ولیمس نے پہلی رپورٹ مردم شماری میں اسکو نقل و ترجمہ کرکے اس قدر اضافہ کیا ہے کہ "بزرگان بلگرام کے علم و فضل کا شہرہ مدتہائے دراز سے چلا آتا ہے، تاریخ و فلسفہ و منظومات میں تالیفات عالیہ یہاں کے لوگوں نے فرمائی ہیں"

موسٹیر ریمان فرانسیسی معروف بہ حاجی مصطفےٰ سیر المتاخرین کے ترجمہ (جلد اول صفحہ ۳۵۲) کے تحت میں لکھتا ہے کہ "باشندگان بلگرام بھی اپنی شجاعت و دلاوری کے لئے ہندوستان میں شہرت رکھتے ہیں"

فی الواقع خاک بلگرام سے بڑے بڑے نام آور اُٹھے اور نام کرکے پیوند ہو گئے ہیں۔ علم و ادب کے عَلَم بردار بھی اور تیغ و تفنگ کے دھنی، مردمیدان بھی۔ تفصیل کے لئے ایک دفتر درکار ہے۔

سلطان اورنگ زیب عالمگیر کے مقرب و مزاجداں امیر نعمت خاں عالی[۵۲] نے، جو اپنی ظرافت، دخوش طبعی، شوخ نگاری و معاملہ بندی سے شہرت تام رکھتا ہے، ایک موقع پر لکھا تھا کہ "سادات بلگرام فی الواقع ذوی الاحترام اندچوں تختۂ مسجد و ورق قرآن نہ لایق سوختنی نہ قابل فروختنی۔ باید کہ سنگ شدید مثل ابن زیاد و یزید بر سر ایشاں گمارند تا ز رباقی بہ معرض وصول درآرند" سادات کی اس سے زیادہ توصیف و تکریم کیا ہو سکتی تھی؟

اھ گلیڈون Gladwin نے اپنے انگریزی ترجمہ آئین اکبری میں اس کو Belgrong لکھا ہے۔

۵۲ مرزا محمد شیرازی، عالی تخلص۔ طبابت پیشہ حکمائے شیراز کے خاندان سے تھے۔ ان کے والد حکیم فتح الدین بھی ہندوستان آئے تھے۔ حکیم محسن خاں چچا تھے، جو عہد شاہزادگی میں شاہ عالم بہادر شاہ کی مصاحبت کا اعزاز رکھتے تھے۔ حکیم حاذق خاں اُن کے بیٹے تھے جنکو اپنی حیات کے آخر سال میں عالمگیر نے حکیم الملک کا خطاب دیا تھا۔ بعد ازاں عہد محمد شاہ میں شش ہزاری منصب اور حکیم الملوک کے خطاب سے عزت پائی۔ مرزا محمد ہندوستان میں پیدا ہوئے صغیر سن میں پدر بزرگوار کے ہمراہ شیراز گئے اور کسب کمال کیا تھا۔ ملا شیغائی یزدی مخاطب بہ دانشمند خاں سے بھی تلمذ تھا۔

اکبر کے درخشاں جواہر میں ایک بے نظیر الماس، شیخ میر عبدالواحد[55] بلگرامی شاہدی نام تھا جس نے بہت سے رسائل و کراسات مختلف فنون و علوم میں لکھے تھے۔ اصطلاحات و مسائل تصوف کو نہایت خوب سمجھا اور سمجھایا تھا۔ ابوالفضل علامی میر علاؤالدولہ قزوینی اور شیخ عبدالقادر بدایونی و دیگر معاصرین نے آپ کا ذکر کیا ہے۔ آئین اکبری کے انگریزی ترجمہ جلد اول جزو ششم صفحہ ۵۴۷ میں بلاک مین Blochmann نے بھی آپ کا حوالہ دیا ہے۔

شیخ نظام[55] نگرامی متخلص بہ میرہ جو ان سے کچھ پہلے گذرے تھے جو علم و عمل اور زہد و فضل میں یکتا تھے اور شیخ سلیمان[56] عمری کے ماموں اور سرپرست تھے جن کے زیر باز بہت ہمایوں بادشاہ تھا۔

لکھنؤ کا اکبری دروازہ قاضی محمود[57] بلگرامی کی یادگار ہے جو اسی عہد راسن و جاح کے آخر میں یہاں نائب صوبہ دار تھے۔ جنھوں نے چوک کے متصل دائیں طرف محمود نگر اپنے نام سے اور بائیں جانب شاہ گنج بادشاہ کے نام سے آباد کیا اور یہ (اکبری) دروازہ تعمیر کرایا تھا۔

مرزا خلد مکاں کے سلسلۂ ملازمت میں داخل تھے سنہ ۱۰۹۷ھ (۱۶۸۶ء) میں جب قلعہ حیدرآباد فتح ہوا تو تاریخ فتح "شد فتح بہ جنگ حیدرآباد" حضور شاہی میں پیش کی اور خلعت پایا سنہ ۱۱۰۵ھ (۱۶۹۳ء) میں نعمت خاں خطاب اور داروغگی نعمت خانہ (باورچی خانہ) کا عہدہ پایا۔ اسکی تاریخ "شکر نعمت واجب" واجب نکالی۔ اواخر عہد میں مقرب خاں خطاب ملا اور داروغہ جواہر خانہ مقرر ہوئے۔

عالمگیر کے انتقال کے بعد جب اعظم شاہ اپنے بھائی شاہ عالم کے مقابلہ کے ارادہ سے دکن سے ہندوستان کی جانب روانہ ہوا تو میرزا اسکے ہمرکاب تھے، دونوں فوجوں کے آمنے سامنے ہونے کا موقع قریب آیا تو اعظم شاہ نے بنگاہ کو گوالیار میں چھوڑا جواہر خانہ کی حفاظت کے لئے مرزا گوالیار میں رہے۔ اعظم شاہ کے مارے جانے پر مرزا شاہ عالم کے ملازم ہوگئے اور نواب دانشمند خاں عالی خطاب پایا۔ شاہنامہ کی تحریر پر مامور ہوئے مگر سرہنگ اجل نے اتنی مہلت نہ دی کہ اس کو پورا کر لیتے۔ سنہ ۱۱۲۱ھ (۱۷۰۹ء) یا سنہ ۱۱۲۲ھ میں نسخہ حیات کا ورق الٹ گیا۔ حیدرآباد دائرہ میر مومن میں دفن ہیں۔

مرزا کو نظم و نثر دونوں پر قدرت عالی حاصل تھی۔ بالخصوص نثر میں حیرت انگیز طلسم بندی کرتے تھے۔ ان کے دیوان میں ہر قسم کے قصائد و غزلیات موجود ہیں۔ مشاعرات و منشورات بھی مدون تھے۔ سخن عالی نام مثنوی لکھی تھی دیگر تالیفات

حافظ محمود قرآن خواں کا ذکر شیخ عبدالصمد بن افضل محمد (خواہر زادہ فیضی و ابوالفضل) نے کتاب اخبار الاصفیاء میں ان الفاظ میں کیا ہے:-

حافظ محمود قرآن خواں ممتاز وقت و سرآمد عصر بود گویند از آں روز کہ او بہ روحانیاں پیوستہ ہر شب جمعہ نکتہ پیوشان خدا شناس از مرقد منور او آواز قرآن خواندن می شنوند و من بہ زبان آں حق گویاں کہ خود بہ گوش ہوش شنودہ اند نوشتہ ام آرام گاہ بلگرام۔

قاضی کمال کا حال صاحب مرآت المبتدین نے لکھا ہے، یہاں نقل کی گنجایش نہیں۔

میر عبدالواحد کے پرپوتے سید برکت اللہ ملقب بہ صاحب البرکات تخلص بہ عشقی نے بھی بڑی شہرت پائی تھی درویش کامل تھے، سجادۂ کالپی سے اجازت و خلافت پائی تھی۔ آخر ایام میں اپنے جدّ امجد شاہ میر عبدالجلیل کے مرقد منور پہ مارہرہ میں اقامت گزیں ہو گئے تھے بروز عاشورا ۱۱۴۲ھ (۲۶ جولائی ۱۷۲۹ء) فردوس اعلی میں قدم رکھا۔ ہندی و فارسی میں شعر کہتے تھے "ریاض عشق" دیوان اسم با مسمی چھوڑا تھا۔

حسن و عشق، محاصرہ گلکنڈہ، وقائع نعمت خاں عالی، خوان نعمت، باورچی خانہ، جنگ نامہ وغیرہ مشہور ہیں۔ خان عالی کی وضع احتیاط و حقیقت نگاری کا ایک واقعہ رائے رایاں انند رام مخلص لکھتے ہیں کہ جب دونوں شاہزادوں کی معرکہ آرائی کے متعلق خان نے جنگ نامہ تحریر کرنا شروع کیا تو ذوالفقار خاں کی نسبت لکھا تھا:-

"اول کسے کہ مقدمہ جنگ یک رو ناشدہ پشت داد اسماعیل ملقب بہ ذوالفقار خاں بود" ذوالفقار خاں نے ہر چند منت و سماجت کی، پانچ ہزار روپیہ بھی پیش کیا تاکہ یہ فقرہ نکال دیا جائے مگر خان عالی نے نہ مانا اور نہ نکالا۔ اللہ اللہ اُس وقت اہل قلم کا کس قدر وقار و اختیار تھا۔ اُن کا ایک ایک حرف نقش صداقت بنکر صفحۂ روزگار پر باقی رہجاتا تھا۔

۵۳ میر عبدالواحد حسینی واسطی شاہدی تخلص۔ شیخ صفی سائی پوری کے بھتیجا ن خاص اور شیخ حسین سکندرہ کے خلفائے بیعت قدم سے تھے۔ رَوَّحَ اللہ روحہم۔ ایک مدت دراز تک مسند ارشاد و ہدایت پر زیب افزا رہے۔ اہل حق کو حق شناسی و حق پرستی کے سبق دیئے، تصانیف شریفہ سے سنابل (سنہ ۹۶۹ھ مطابق ۱۵۶۱ء) حل شبہات، شرح کافیہ ابن حاجب (بطور تصوف) حقائق ہندی شرح قصہ چار پر ادر، شرح مصطلحات دیوان خواجہ حافظ شیرازی

میر عبد الواحد ترمذی، واحد و ذوقی تخلص (پسر سید اشرف درگاہی) ہندی و فارسی میں بڑے پایہ کے شاعر و سخن شناس تھے۔ "گلستان خیال" نظم میں آپکی بڑی پر لطف اور دلچسپ تصنیف ہے، جسمیں ہر قسم کی مٹھائیوں اور حلووں کا بیان ایک انداز خاص سے کیا ہے جمعہ ۱۲ محرم ۱۳۳۸ھ (۳۱ اکتوبر ۱۹۱۹ء) کو حوالی موضع راہون ملک پنجاب میں شہادت پائی۔

میر عبد الجلیل اور اُن کے نواسے میر غلام علی آزاد کے علمی وادبی و تاریخی کارناموں کے لیے ایک دفتر درکار ہے، ان صفحات پر صرف ایک دھندلا سا خاکہ کھینچا گیا ہے

میر عظمت اللہ بیخبر کا تذکرہ "سفینۂ بے خبر" مشہور اور کسی تعریف و تعارف سے بے نیاز ہے۔

موجود ہیں سید محمد گیسو دراز کے رسالہ عجیبہ (تصوف) کی شرح نہایت عمدہ لکھی ہے۔

شرح نزہتہ الارواح نے کسیوقت زیادہ شہرت پائی تھی اصطلاحات صوفیہ میں بہت سے رسائل لکھے تھے۔ شعر کم کہتے تھے مگر جب اور جس قدر کہتے تھے نہایت خوب کہتے تھے۔ کسی سے تلمذ نہ تھا۔ الشعراء تلامیذ الرحمٰن حل بتمات میں فرماتے ہیں" در ابتداء حال بعضے مشکلات علم شریعت و طریقت از علماء کبار و مشائخ نامدار می پرسیدم و جواب شافی نمی یافتم۔ بخاطر قرار دادم کہ اقصائے عالم را بگردم تا مگر بامردے ملاقات شود کہ حل ایں مشکلات نماید

شیخ عبد القادر بدایونی منتخب التواریخ میں لکھتے ہیں کہ "شیخ عبد الواحد بلگرامی بسیار صاحب فضائل و کمالات یافتہ و عبادات است و اخلاق سنیہ و صفات رضیہ دارد و مشرب او عالی است" میر علاؤ الدولہ بن میر یحییٰ سیفی قزوینی نفائس المآثر میں تحریر کرتے ہیں" میر عبد الواحد از اکابر سادات قنوج است۔ وخالی از نشاء فقر و درویشی نیست وسلیقۂ شعر خوب دارد" شیخ محمد غوثی سندوی کتاب گلزار ابرار میں رقم طراز ہیں" سید عبد الواحد بن سید ابراہیم قنوجی خداوند مجاہدہ و مشاہدہ، صاحب صحت حال و فصاحت مقال بر نزہتہ الارواح شرحے لائق متین برنگاشتہ زاوان توجیہ و تاویل بکار بردہ، جمیع مقاصد عبارات را متوجہ سمت حقیقت گردانیدہ است"

حضرت سید قنوج میں کد خدا ہوئے تھے اور کچھ روز وہاں قیام بھی رہا تھا اسی لئے ان دونوں مورخوں نے ان کو قنوجی لکھا ہے مولانا مداری کی تحریر سے بھی سید صاحب کے قیام قنوج کا پتہ چلتا ہے۔

شب جمعہ ۳۔ رمضان ۱۰۱۷ھ (۱۰ دسمبر ۱۶۰۸ء) میں وصال ہوا غزلوں کا دیوان چھوڑا تھا۔

اکبر بادشاہ نے آپ کو کمال تمنا کے ساتھ ملاقات کے لیے بلایا تھا، جب درگاہ سلطانی میں پہونچے تو بادشاہ۔ نہایت اعزاز و اکرام کے ساتھ پیش آیا اور بطریق سیورغال (مدد معاش) بلگرام میں پانسو بیگہ زمین نذر کی

شیخ غلام حسن صدیقی ثمین تخلص ایک بلند پایہ سوانح اور وقائع نگار تھے شرائف عثمانی کے سوا کئی تاریخیں اور سوانح نامے لکھے ہیں۔ ان کا تذکرہ پھر مناسب موقع پر آئے گا۔

ہندی شعر گوئی کے فن میں مرزا جانجاناں مظہرؔ شہید درویش اور شاعر کا استاد ایک بلگرامی سید زادہ میر غلام نبی تھا جس کا حال بقدر مقدور آئندہ لکھا جائے گا۔

بندگی سید محمد حسن تخلص بہ ایجاؔ، شاہزادہ عظیم الشان بن شاہ عالم کے ملازم خاص اور معتقد علیہ تھے۔

مفتی امیر حیدر کا نام عالم علم و عمل میں شہرۂ خاص اور وقعت و امتیاز رکھتا ہے جنھوں نے عہدِ اکبری کی ایک جامع تاریخ "سوانح اکبری" نام لکھی اور اس کی تکمیل و تہذیب تمامی ذرائع معلومات

۵۴ شیخ نظام بلگرام محلہ قاضی پورہ کے رہنے والے تھے۔ ضمیری تخلص تھا، صغر سن میں یتیم ہو گئے تھے۔ شیخ سلیمان ماموں نے جو اکبر شاہ کے معتبر درباری تھے بہن کی عزیز یادگار اپنی آغوش عاطفت میں لے لی اور کمال شفقت و سلیقہ سے تربیت کی۔ شیخ نے علوم متعارفہ کی تحصیل کے بعد شعر سخن کی طرف توجہ فرمائی اور اس فن میں بھی رشد و کمال حاصل کر لیا، قصیدہ خوب لکھتے اور تاریخ گوئی میں ملکۂ خاص رکھتے تھے میر عبدالواحد نے کتاب سنابل میں شیخ کے حالات مع آنکی روداد دردِ عشق کے درج کئے ہیں۔

شیخ امرائے عہد کے ساتھ مساویانہ داعیہ و انداز سے ملتے اور رہتے اور نہایت اعزاز و اکرام کے ساتھ بسر کرتے تھے۔ آخر زندگی میں تجرد و انفراد اختیار کر لیا تھا قصبہ سفیدون تابع دار الخلافہ دہلی میں وارد تھے کہ ۱۰۰۳ھ (۱۵۹۴ء-۹۵ء) میں نزہت کدۂ آخرت کی گلگشت پسند فرمائی، "آہ، آہ نظام" تاریخ وفات مبارک خاں دہلوی نے لکھی۔ دیوان پندرہ ہزار شعر کا چھوڑا تھا۔

۵۵ شیخ سلیمان بلگرامی محلہ قاضی پورہ کے باشندے تھے ہمایوں بادشاہ جب شیر شاہ سے شکست کھا کر بلگرام پہونچا تھا تو شیخ صاحب نے بقدر وسعت و مقدرت اسکی بڑی خدمت و تکریم کی تھی، بادشاہ اُنکو اپنی انگوٹھی دیکر کہہ گیا تھا کہ یہ میری نشانی ہے اسکو احتیاط سے رکھنا، اور اگر میں پھر بادشاہ ہوکر ہندوستان آؤں تو میرے پاس آنا چنانچہ جب ہمایوں دوبارہ بادشاہ ہوکر ہندوستان آیا تو شیخ مذکور پایۂ تخت کو گئے اُسی انگشتری کے وسیلہ سے شرف ملازمت حاصل کیا صاحب دولت ہوگئے۔ مولانا ضمیری اپنے بھانجے کو بھی ہمراہ لیتے گئے تھے۔ دونوں صاحب پایۂ تخت میں برابر موجود رہے۔

اور وسائل مختلفہ سے کی تھی۔ اکبرنامہ، طبقات بدایونی، تاریخ فرشتہ، اکبرنامہ شیخ الہداد سرہندی، مکاتیبات علامی (ابوالفضل۔چہار دفتر) وغیرہ سے کی تھی۔ بلاک مین اس کا ذکر بڑے قابل قدر اور قیمتی الفاظ میں کرتا اور تمام تاریخ نگاران مابعد کو اسکے تتبع اور تقلید اور اس سے اخذ و روایت کا مشورہ دیتا ہے۔ اُس کا دعویٰ ہے کہ اس کے ذرائع معلومات و استناد بالکل جدید اور نہایت واثق و معتبر ہیں، اس سے قبل کسی مورخ نے اس اہتمام و جامعیت کے ساتھ واقعات کا تفحص و تبصرہ اور استکمال نہیں کیا تھا۔ فی الواقع وسیع النظر مؤلف کو اسکی تالیف میں عہد مذکور کی ہر قسم کی تاریخوں پر نگاہ ڈالنا اور اُن کے اوراق و صفحات کو چھاننا پڑا ہوگا۔ یہ تالیف ولیم کرکپیٹرک William Kirkpatrick کے نام نامی سے منسوب کی گئی تھی۔ بلاک مین نے اس کے متعلق نہایت نکتہ بینی و دریدہ وری سے کام لیا اور اس کی ستائیش و مدحت میں اتنا لکھا ہے جس کا ایک یورپین ماہر و ناقد کے قلم سے نکلنا حیرت و استعجاب سے خالی نظر نہیں آتا۔

شیخ سلیمان نے اکبر شاہ کے عہد میں ۹۹۷ھ (۱۵۸۹ء) میں وفات پائی

۵۶ قاضی محمود بلگرامی، پسر اوسط قاضی ابوالفتح عرف قاضی کمال، اکبر بادشاہ کے عہد میں پایہ امارت پر پہونچے تھے۔ شاہجہاں کے عہد تک زندہ تھے۔ شاہجہاں نے ان کو اپنا ایلچی مقرر کرکے شاہ ایران کے دربار میں بھیجا تھا، وکفی بذالک فضلاً و فخراً۔

۵۷ میر عظمت اللہ، بے خبر میر سید لطف اللہ خلف الصدق تھے۔ ان کا درجہ تصوف اور شاعری دونوں میں بہت بلند تھا، اداے حقوق میں امتیاز و شہرت خاص رکھتے تھے خط شکستہ خوب لکھتے تھے موسیقی میں بھی دخل تھا۔ ان کے حسن اخلاق اور رنگینی صحبت سے ملنے والے بہت لطف اُٹھاتے تھے اور بقدر ظرف و استعداد متمتع ہوتے تھے

مرزا عبد القادر بیدل سے راہ و رسم خاص تھی جسکا تذکرہ اپنے تذکرہ میں کیا ہے میر غلام علی آزاد کا ساتھ بہت رہا تھا۔ بے خبر، کسی مجلس میں اپنا ایک مطلع پڑھا، ایک دوسرے بزرگ نے جنکو اپنی شاعری کا دعویٰ اور اپنی ذہانت و مضمون آفرینی پر ناز تھا جو اپنا مطلع پیش کیا جو معنی و مطلب سے مطلقاً معریٰ تھا کسی بے تکلف دوست نے کہا کہ بیخبر کے مطلع کا لطف تو ظاہر ہے مگر آپ کے مطلع کا لطف سمجھ میں نہیں آیا؟ جواب دیا کہ ابھی

سید غلام مصطفیٰ اور شیخ نوازمحی الدین، نواب مبارز الملک سربلند خاں تونی کے درباری اور حضور رس اور باہمہ اعزاز دنیوی و وجاہت و حشمت ظاہری درویش کامل اور خداشناس و خداپرست تھے۔

سید عبداللہ قابل کی، اُن کے فضل و کمال اور سپہگری و دلاوری کی وجہ سے، نواب موصوف بڑی قدر کرتے تھے پہلے عدالت معسکر کی خدمت پر ممتاز کیا پھر صوبہ گجرات احمد آباد کا منصب صدارت تفویض فرمایا تھا۔

سادات بلگرام نے بعہد اورنگ زیب عالمگیر خاصکر شہرت و ترقی پائی تھی۔ محمد فاضل بلگرامی نے ۱۰۸۸ھ (۱۶۷۷ء) میں پرگنہ باون فتح کیا اور جاگیر سیر حاصل حاصل کی تھی۔ ارباب دانش و خبرت میں سے سید دادر اور محمد ماہ اورنگ زیب اور شاہ عالم کے دربار میں مناصب جلیلہ و خدمات معززہ پر مامور رہے تھے۔ رکن عالم خاں گجرات کی صوبہ داری تک پہونچ گئے تھے۔

سید احمد احمدی، سید عظیم الدین اور سید غلام نبی محب، نواب صفدر جنگ کے مصاحب و معتمد و مشیر خاص تھے جن کا انکے زمانہ کی تاریخوں اور وقائع میں بار بار نام آیا ہے۔

حسب تحریر سیر المتاخرین سید نورالحسن خاں بلگرامی اس عہد کے تمام اہم امور ملکی اور معاملات سیاست میں کافی دواقی دخل رکھتے تھے۔ راجہ بنارس اور نواب وزیر (شجاع الدولہ) اور حکام انگریز کے مابین ۱۱۷۷ھ (۱۷۶۳ء) میں انھیں نے فیصلہ کرایا تھا۔ اس سے پہلے جب ۱۱۶۳ھ (۱۷۵۰ء) میں نواب احمد خاں بنگش اور عساکر مغلیہ و وزیر کے باہم لڑائی ہوئی تھی تو یہ ہی فوج ہراول کے سردار تھے اور کارہائے نمایاں انجام دیے تھے۔

گزشتہ صدی کی تاریخ و سرگزشت پر نظر ڈالنے سے چند اشخاص اور ممتاز و قابل ذکر نظر آتے ہیں

اس میں لطف ڈالنا باقی ہے! بروز دوشنبہ ۴؍ ذلیقعدہ ۱۱۴۲ھ (یکم جون ۱۷۳۰ء) دہلی میں رحلت فرمائی۔ جوار مرقد سلطان المشائخ میں دفن ہوئے۔ سفینۂ بیخبر تذکرہ شعرا ۱۱۴۱ھ کی تالیف ہے۔

بعہد شجاع الدولہ ...... باقر علی چکلہ دار بانگر۔ اور
بزمانہ آصف الدولہ .... حشمت علی و چراغ علی، و قدرت علی مختلف مقامات پہ چکلہ دار
اور بہادر علی خاں لکھنؤ میں کوتوال یا پولیس کے افسر اعلیٰ تھے۔
بعہد غازی الدین حیدر . شیخ محمد عطا چکلہ دار جلال آباد اور
بزمانۂ واجد علی شاہ ...... محمد عسکری چکلہ دار رسول پور تھے

اس ذیل میں شیخ الہ یار خاں بلگرامی اور اُن کے خلف الصدق شیخ مرتضیٰ حسین مصنف حدیقۃ الاقالیم کا نام بینا باقی ہے۔ شیخ الہ یار مخاطب بہ رستم زماں خاں مبارز الملک کے بخشی اور سردار فوج تھے۔ ششش ہزاری منصب ہو گیا تھا، بعہد فردوس آرام گاہ محمد شاہ راجہ ابھے سنگھ فرمانروائے مارواڑ کے معرکے میں دسہرہ کے دن ۰، ربیع الثانی ۱۱۴۳ھ مطابق ۵۔ اکتوبر ۱۷۳۰ء کو شہید ہوئے۔ تسخیر قلعہ احمد آباد میں کارہائے نمایاں کئے تھے۔ روح الامین خاں پسر قاضی شیخ محمد سعید شیخ الہ یار کے عزیز قریب (بہنوئی) تھے ششش ہزاری منصب مع جاگیر اور دو ہزار سوار کے پایا تھا۔ بڑے معاملہ فہم اور خوشگو شاعر تھے۔ ۱۵۔ ذیقعدہ ۱۱۵۱ھ (۱۳۔ فروری ۱۷۳۹ء) کو انتقال کیا۔ بعض تحالات اودھ میں بھی حکمراں رہے تھے۔

بارھویں صدی ہجری میں عربی شاعری اور عربی ادب و زبان میں تبحر کی وجہ سے حسان الہند میر غلام علی آزاد نے جو شہرت عربستان اور دیگر ممالک اسلامی میں پائی تھی وہی شہرت و نام ڈاکٹر سید علی بلگرامی اور نواب عماد الملک سید حسین بلگرامی کو قرون حاضرہ میں حاصل ہوا ہے۔ یہ دونوں بھائی زبان انگریزی اور دیگر السنۂ یورپ کے جیسے مسلم الثبوت ماہر اور انشا پرداز تھے، ویسے ہی وہ مشرقی فنون میں کامل اور قدیم علوم کے زبردست فاضل تھے۔ ان کے احیاؤ قیام میں ہمیشہ ساعی رہے۔ دکن کی بزم علم و ادب کو ان ہی شمعوں کی روشنی نے منور کیا تھا۔ نواب صاحب کی ادبی قابلیت اور اعلیٰ خدمات و اوصاف کا اعتراف سرکاری تاریخ نویس نے بھی (تتمہ گزیٹر ضلع ہردوئی مطبوعہ ۱۹۱۵ء میں) کیا ہے نواب صاحب کا انتقال حال میں ہوا ہے۔ اُن کی

رحلت پر قدیم وجدید (دونوں) ہم دوست طبقوں نے یکساں ماتم کیا ہے ؎

نعاۃ الفضل والعلیاء والنسب | ناعیہ الارض والاملاک والشھب
نوائب الدہر اوحت للنوائب من | قانی حزن وقلب فیہ لہ یجب
لعم الارض نیعی والسماء علی | فقید کم یا سراۃ المجد والحسب

نواب مرحوم کے سلسلہ میں ان کی ایک برمحل روایت یاد آئی جو لطف و دلچسپی سے خالی نہیں
فرماتے تھے کہ ان کے خاندان کے متوسل بھاٹ (باد فروش) نے ایک دہ مجلس، ہندی بھاشا میں
لکھی تھی۔ اس کا شہرہ نواب وزیر کے دربار تک پہونچا اور وہ لکھنؤ بلایا گیا۔ اس کو پشتہا پشت کی
نمکخواری دوفاشعاری کا کرشمہ کہیے یا اپنے مخادیم کا جذبۂ احترام کہ وہ شاہی شوکت و شان سے
مرعوب نہیں ہوا اور اس نے سب سے پہلے اپنے ججمانوں یعنی سادات بلگرام کی مدح وثنا کے گیت گائے
اس کے بعد بادشاہ کی تعریف و توصیف کی

ان افراد فرید کے ذکر خیر کے بعد بلگرام کی گزشتہ علمی و ملکی صحبت، زمین کی سرسبزی و زرریزی
کی نسبت بعض مشرق نوازان و سیاحان فرنگ کے اقوال و تحریرات یادہا ئے رہ آورد و حالات
چشم دید نقل کئے جاتے ہیں۔

مشہور عالم اور اہل قلم مسٹر بلاک مین J. H. Blochmann (جلد دوم صفحہ ۱۰۱،
جرنیل میں) رقمطراز ہے کہ "عہد اکبر سے لے کر موجودہ صدی تک بلگرام مسلمانوں کے علوم و فنون
کا ایک بڑا مرکز رہا ہے۔" یہاں کے اہل کمال کے متعلق وہ اپنے قلمی نسخہ 'سرو آزاد' کا حوالہ دیتا اور
اس سے استنباط لگاتا ہے۔

بشپ ہیبر Rt Revd. Reginald Heber, D D., Lord Bishop of Calcutta سنہ ۱۸۲۴ء میں بلگرام
آیا تھا، اس قصبہ کے متعلق اس کی یادداشتیں، اس کے سیاحت نامۂ صوبجات بالائی ہند،
واقع سنہ ۱۸۲۴ء و سنہ ۱۸۲۵ء

Narrative of a journey through the Upper Provinces of India from Calcutta to Bombay in 1824-25 London, 1828

نقل کی جاتی ہیں۔

"ہماری منزل آج ملانواں سے سات کوس چلکر بنگرام تھی وہی ہموار زمین سرسبز و شاداب اشجار و درختان میوہ دار برابر یہاں تک چلے آئے ہیں۔ اس مقام کو یہ امتیاز بھی حاصل ہے کہ سب سے پہلے انگریزی فوج جو اُس وقت برٹش ایڈوانسڈ فورس British Advanced Force کہلاتی تھی یہیں مقیم رہی تھی بعد کو کانپور منتقل کر دی گئی تھی۔ اب تک رستہ میں بہت سے نشانات باقی ہیں جن سے پتہ چلتا ہے کہ اس جگہ بادشاہی سواروں کی فرودگاہ تھی اور اُس جگہ افسران فوج کے بنگلے ضرور تھے مگر اب تو وہاں صرف تیدہ پرانو کا ایک [illegible] شکستہ [illegible] ہے

"قصبہ چھوٹا ہے مگر آثار کہتے ہیں کہ کسی وقت بڑا ہوگا چنانچہ اب بھی بہت سے بڑے اور اچھے سے اچھے کہنہ مکانات، نیز تحصیلدار و کوتوال وغیرہ کے مساکن یہاں موجود ہیں۔ ایک مدت دراز کے بعد میں نے یہاں بھی بہت سے متفرق درخت تاڑ اور کھجور کے دیکھے۔ اور درختان انبہ تو ہر سمت نہایت عالی اور شاندار نظر آتے ہیں

"گماشتہ نے کہا کہ اودھ کی اراضی دنیا کی بہتر سے بہتر زمینوں میں شمار ہوتی ہے۔ ہر چیز خواہ بنگالہ میں پیدا ہوتی ہو خواہ ایران میں یہاں بھی پیدا ہوتی اور خوب بڑھتی ہے۔ یہاں ایک ہی وقت میں چانول، نیشکر، روئی اور کھجور ہوتی ہیں اور گندم، جو، جوار اور تمام دالیں بھی۔ ہوا اچھی، پانی اچھا، اور گھانس مویشی کے لیے بالخصوص مفید اور پرورش کرنیوالی بافراط میسر ہے۔ مگر قانون و آئین اچھے نہیں ہیں حکام برے ہیں، زمینداران بدتر، ایلیان (عاملان) بد سے بد۔ ہر چیز رعیت سے چھین جاتی ہے۔ بادشاہ نہ دیکھتا ہے نہ سنتا ہے نہ خبر رکھتا ہے۔ میں نے پوچھا کہ اراضی کا لگان فی بیگہ کیا ہوگا۔ جواب دیا کہ عموماً چار روپیہ اور بعض جگہ چھ روپیہ۔

یہاں سے ہم لوگ شلغم اور آلو کے ایک عمدہ اور صاف قطعہ میں پہونچے۔ اُس نے آلوؤں کی نسبت کہا کہ پہلے تو لوگ ان کو نہایت ناپسند اور ان سے احتراز کرتے تھے مگر اب یہ چیز مرغوب و مقبول ہوتی جاتی ہے خصوصاً مسلمان ان کو کار آمد اور اپنی ثقیل روغندار غذاؤں کے لیے لابد سمجھتے ہیں"

ٹیفن تھیلر مشہور سیاح اور اہل نظر جس Des Pater J Tieffenthaler
نے بلحاظ میرے تقریباً ساڑھ سال پیشتر بلگرام کو دیکھا تھا اپنے وقائع نامہ Beschreibung
von Hindustan, I P 193 1785 میں لکھتا ہے کہ "یہ قصبہ بہت سے باغات
و مرغزاروں کے وسط میں واقع ہے۔ کوچے تنگ ہیں بہت سے مکانات پختہ اینٹ کی تعمیر ہیں۔ ایک قلعہ
خام بھی ہے جس کے چاروں گوشوں پر چار مدور اور بلند برج بنے ہوئے ہیں"۔
ایک دوسرا نامور سیاح اور مورخ ٹنانٹ Tennant جو یہاں ۱۷۹۹ء میں آیا تھا اپنے
سیاحت نامہ The Indian Recreations, II.397-398 میں تحریر کرتا ہے کہ
"بلگرام ویران عمارات کا ایک ڈھیر ہے، اس میں چند خس پوش بھی نظر آتی ہیں جن کے نیچے مقتدر و متمول
اسلاف کے خلف باقی اپنا وقت مجبورانہ عسرت سے گذار رہے ہیں"۔
وہ اس قصبہ کی ویرانی و تباہ حالی کی وجہ الماس خاں خواجہ سرا کی بیداد، دہ جبر ستانی اور سخت گیری
بتاتا ہے۔ جو آصف الدولہ اور سعادت علی خاں کے عہد میں مالگذاری اودھ کا اجارہ دار تھا۔
آئین اکبری کی تحریر کو کپتان تھارنٹن نے گزیٹر مطبوعہ ۱۸۵۸ء میں نقل کیا ہے مگر وہ اسکی نسبت
کمال حیرت و استعجاب ظاہر کرتا اور کنوئیں والے حصہ کو تو بڑے اشتباہ و شک کی نگاہ سے دیکھتا ہے۔
آثار قدیمہ میں سے جتنی عمارات اب بھی یہاں باقی ہیں اطراف و نواحی کے کسی اور قصبہ میں اتنی
نہیں پائی جاتیں، نہ قدامت و استحکام و خوبی تعمیر کے اعتبار سے اپنی نظیر رکھتی ہیں۔
(۱) درگاہ قاضی یوسف۔ سالار فوج سلطان محمود غزنوی ۶۰۸ھ (۱۲۱۱ء)
(۲) سید صغری کی درگاہ واقع باغ سید مبارک۔ بلگرام کے شمال موضع پچھر میں ۶۱۴ھ (۱۲۱۷ء)
(۳) مسجد محلہ سید واڑہ ۶۲۷ھ (۱۲۳۰ء)
(۴) مسجد چوہٹہ۔ ۸۸۲ھ (۱۴۷۷ء)
(۵) درگاہ پیر عبداللہ ۹۰۹ھ (۱۵۰۳ء) واقع سوادِ جنوبی شہر طرف میدان پول۔
(۶) مسجد شیخ ڈھن (عہد اکبری) ۹۵۹ھ (۱۵۵۱ء) جسکی ۱۰۶۶ھ (۱۶۵۶ء) میں شیخ

ابو المعانی نے تجدید کرائی تھی۔

(۷) گنبد مرقد حاجی افضل ۹۸۰ھ (۱۵۷۲ء) ۵۵۸

ان کے کتابے یا قبروں کے سنگ بالیں، ان کا سال، تاریخ زبان حال سے بتاتے ہیں انکے علاوہ

(۸) مولوی پیر بخش کی مسجد ۹۵۶ھ (۱۵۴۹ء)

(۹) ویران مسجد واقع موضع نصرت نگر قریب کھجوا تالاب ۱۰۱۱ھ (۱۶۰۲ء) کتابہ فارسی موجود ہے۔ ایک کنواں بھی اسی سال کا تعمیر ہے۔

(۱۰) مسجد قاضی محمود ۱۰۱۱ھ (۱۶۰۲ء) ۵۵۹

(۱۱) درگاہ قاضی ابوالعلا عرف قاضی بڈہ۔ واقع موضع محمود نگر ۱۰۳۱ھ (۱۶۲۱ء) ۵۶۰ تحصیل کے جنوب میں، کتابہ فارسی نصب ہے۔

۵۵۸ حاجی افضل بلگرامی۔ بڑے بزرگ اور معتقد علیہ تھے۔ بلگرام میں عرصہ تک مسند ارشاد و ہدایت پر متمکن تھے۔ ان کی وفات کے بعد تردی بیگ سلطان نے ۹۸۰ھ میں انکے مرقد پر گنبد عالی شان سنگین تعمیر کرایا۔ شیخ نظام ضمیری کا یہ قطعہ نستعلیق میں نہایت خوشخط لوح سنگیں پر کندہ کر کے دروازۂ گنبد کی پیشانی پر تعبیہ کیا گیا۔ لیکن تردی بیگ کا نام کوئی نہیں جانتا سالار بیگ کے نام سے جو تعمیر کا میر اہتمام تھا یہ گنبد شہرت رکھتا ہے ؎

بدوران شہ اکبر گزشتہ | خلافت او جلال الدین محمد
چو حاجی افضل از تقدیر حق رفت | ازیں دار فنا در دار سرمد
زتردی بیگ سلطان یافت بنیاد | برای مرقدش ایں پاک گنبد
ضمیری جست سال این بنا را | بلفظ فارسی وہم بہ ابجد
بتاریخش نہاں و آشکارا | بگفتا سنہ ہشتاد و نہصد ۹۸۰ھ

"سنہ ہشتاد و نہصد" جو آخر مصرع میں آیا ہے خود بھی تاریخ ہے اور بروئے حساب ابجد بھی تاریخ نکلتی ہے

۵۵۹ قاضی محمود بلگرامی نے یہ جامع مسجد بعہد اکبر بادشاہ تعمیر کرائی تھی تاریخ تعمیر یہ ہے

گفتم ایں مسجد عالی بہ کہ نسبت دارد | بالتمام گفت ہملنے کہ بقاضی محمود ۱۰۱۱ھ

۵۶۰ قاضی ابوالعلا معروف بہ قاضی بڈہ پسر قاضی کمال، قاضی محمود کے چھوٹے بھائی تھے۔ عربی و فارسی میں دستگاہ کامل رکھتے تھے۔ قاضی محمود کی نیابت میں بلگرام وغیرہ محالات احد صدی کی حکومت انجام دہی تھی کچھ روز امور قضا میں بھی مستقل رہے تھے۔ بلگرام میں قاضی عبدالدائم کے باغ کے متصل ایک باغ نصب کیا تھا اور اس میں نفیس و پختہ تعمیرات کرائی تھیں

(۱۲) مسجد محمد زاہد ۱۰۴۲ھ (۱۶۳۳ء)
(۱۳) عیدگاہ محلہ کٹرہ ۱۰۵۹ھ (۱۶۴۹ء)
(۱۴) مسجد سید کرم اللہ، واقع وسط محلہ میدان پورہ ۱۰۸۱ھ (۱۶۷۰ء)
(۱۵) مسجد علی حسن ۱۱۱۸ھ (۱۷۰۶ء)
(۱۶) مسجد مرزا حسن علی دانا ۱۱۶۶ھ (۱۷۵۳ء) میں نواب صفدر جنگ نے از سرِ نو تعمیر کرائی۔
(۱۷) گردھر ناتھ کا مندر واقع لکنیا ٹولہ

اور بھی بہت سی پختہ عمارات اور چاہات پرانے اور فنِ تعمیر کے بہترین نمونے موجود ہیں مثلاً سجن کنواں اور امیر تردی بیگ کا کنواں جو عہد اکبری کی یادگار ہے، اور جس پر فارسی میں کتابہ موجود ہے۔ تین کنوئیں ڈھائی سو برس پرانے ہیں، دست برد زمانہ سے پرانا قلعہ جو وسعت و کہنگی میں خود اپنی مثال تھا، ویران و مسمار ہو گیا تھا کھود کر ہموار کر دیا گیا ہے۔ صنادید دیرینہ کے عوض اس پر سرسبز و شاداب قطعات زراعت لہلہاتے نظر آتے ہیں، سرکاری مدرسہ بھی اسی اراضی پر بنایا گیا ہے، پتھروں کی بڑی بڑی چٹانیں، سڈول و خوش قطع، تراشیدہ کنگر ہئیت کا ستون، مورتیں، وسیع و فراخ محلات و قصور کے نشانات، پرانے مندروں اور شوالوں کے آثار، دور دور تک اور بکثرت پائے جاتے ہیں ؎

چپہ چپہ ہے یہاں گوہرِ یکتا تہِ خاک — دفن ہوگا نہ کہیں اتنا خزانہ ہرگز

ان ویرانیوں اور حجری تاریخوں کے سوا بولتی ہوئی اور زندہ تاریخیں بھی بلگرام کی بہت سی ہیں
(۱) ماثر الکرام جس کا حوالہ صفحات آئندہ میں بارہا ملے گا خانوادہائے سادات کی تاریخ ہے اور جسکے

ایک گنبد بلند ۱۰۲۲ھ میں تعمیر کیا تھا جس میں بعد مرگ دفن ہوئے۔ قطعہ تاریخ یہ تھا ؎

خوش گنبد کہ از الطاف الٰہی — ثنائے او بہتر شہر و دہر کو
بعہد شاہ نور الدین جہانگیر — مرتب شد مثال چرخ ع بنو
چو تاریخش ز ہاتف جستم آنگہ — بگفتا گنبد قاضی بڈہ کو ۱۰۲۲ھ

معارضہ و ایراد بلکہ جواب میں شجرالفت عثمانی شیوخ کی تاریخ لکھی گئی تھی۔
(۲) تبصرۃ الناظرین۔ فارسی میں بھی سادات کے حالات ہیں، مولفہ میر سید محمد بن میر عبدالجلیل
(۳) مثنوی امواج الخیال جس کا ذکر ہو چکا اور آئندہ بھی ہوگا۔ اولیائے بلگرام کے مدائح میں ہے
(۴) جنوریہ (۵) شجرہ طیبہ، دو جلد میں سادات کے خاندانوں کے احوال و انساب ہیں۔
(۶) شجرالفت عثمانی (۷) نصرۃ الناظرین۔ تاریخ اولیائے قصبہ میں بزرگان شیوخ کے کارنامے محامد و فضائل مندرج ہیں"

ان مبسوط و مکمل مقامی تاریخوں کے علاوہ مرآۃ المبتدئین۔ کتاب سنابل، نفائس المآثر، گلزار ابرار نورس سنگھار، معارج الولایۃ اور لسان الزبان میں بھی بزرگان بلگرام کے حالات کم و بیش ملتے ہیں اسی سلسلہ میں یہ آگاہی رکھنا بھی ضروری ہے کہ سر ہنری الیٹ نے نادر قلمی کتابوں کا ایک عمدہ ذخیرہ چھوڑا تھا جس پر مشہور مشرق نواز ڈاکٹر اسپرنگر Dr. Springer نے ایک مقالہ تحریر کیا تھا جو ایشیاٹک سوسائٹی کے رسالہ جلد بست و سوم بابتہ ۱۸۵۴ء میں شائع ہوا ہے۔ اس میں خصوصیت کے ساتھ بلگرام کے متعلق (حسب ذیل) کتابوں کا تذکرہ کیا ہے۔ مسٹر اِروِن اسکو پُرانے گزیٹر میں نقل کرتے ہیں۔

"شمارہ ۔۔ ۱۹۰ مثنوی میر عبدالجلیل بلگرامی۔ ڈاکٹر اسپرنگر لکھتے ہیں کہ یہ نظم شہنشاہ فرخ سیر اور مہاراجہ اجیت سنگھ کی لڑکی کی شادی کے متعلق ہے جو ۱۱۲۸ھ یعنی ۱۷۱۶ء میں ہوئی تھی۔ اس کے نو سال بعد مصنف نے دہلی میں وفات پائی۔

شمارہ ۔ ۱۰۷ مآثر الکرام، مؤلفہ میر غلام علی آزاد۔ اس کتاب میں ممتاز مسلمانانِ ہند کے سوانح حیات مندرج ہیں۔ اس کتاب کی نسبت وسیع النظر ڈاکٹر نے نہایت پاکیزہ اور اعلیٰ خیال ظاہر کیا ہے۔ وہ لکھتے ہیں کہ اس کا مصنف شاعر مذکو الصدر کا نواسہ تھا مگر اس خلف صالح نے اپنے سلفِ محترم سے کہیں زیادہ شہرت پائی۔

شمارہ ۔۔۔ ۱۸۰ تبصرۃ الناظرین۔ مشہور اولیائے بلگرام کی یہ تاریخ فارسی زبان میں ہے کئی سو صفحات کی

ضخیم و مطول تالیف ہے۔"

سرکاری رپورٹوں اور یوروپین سیاحوں کی تحریرات میں سے بلگرام کا تذکرہ حسب ذیل میں ملتا ہے

(۱) سرکار ایسٹ انڈیا کمپنی کے ممالک محروسہ واقع کشور ہند اور ریاست ہائے ہندوستانی کا گزیٹر جو آنریبل کورٹ آف ڈائرکٹرس کے حکم سے مسٹر ایڈورڈ تھارنٹن نے انھیں کاغذات و تحریرات سے مرتب کیا تھا جو کمپنی کے قبضہ و دفاتر میں موجود تھے۔ مطبوعہ لندن ۱۸۵۴ء

A Gazetteer of the Territories Under the Government of the East-India Company and of the Native States on the Continent of India By Captain Edward Thornton. Vol. I. 1854. London. Pages 325 329

(۲) اودھ کی بادشاہت میں سفر، سر ولیم سلیمن کے۔سی۔بی مطبوعہ ۱۸۵۶ء۔

A journey through the Kingdom of Oude, by Sir W Sleeman, K C B—1856.

(واضح رہے کہ سر ولیم ۱۸۴۹ء میں یہاں آئے تھے اور اسی وقت کے حالات تحریر کئے ہیں)

(۳) تاریخ ہندوستان حسب تحریر مورخین ہند مولفہ سر ایچ ایم۔ ایلیٹ ۱۸۶۷ء

The History of India as told by its own Historians, by Sir H M. Elliot, 1867.

(۴) صوبۂ اودھ کا گزیٹر مرتبہ اے کا رل ٹپ۔ مطبوعہ ۱۸۷۷ء

The Gazetteer of the Province of Oudh. By A C Tupp 1877.

(۵) تاریخ ہندوستان حسب تحریر مورخین خود مولفہ پروفیسر ڈاوسن۔ مطبوعہ ۱۸۷۷ء

History of India by its own Historians, by Pro. Dowson, 1877.

(۶) ہندوستان کا امپیریل گزیٹر مرتبہ مسٹر ہنٹر۔ مطبوعہ ۱۸۸۱ء لندن جلد دوم

The Imperial Gazetteer of India by W. W Hunter, C I E, LL D, Vol. II, London, 1881.

(۷) ممالک ہند کا امپیریل گزیٹیر۔ جلد دوم۔ مرتبہ مسٹر ڈبلیو ڈبلیو ہنٹر۔ سی ایس آئی۔ سی آئی ای ایل۔ ایل۔ ڈی مطبوعہ لندن سنہ ۱۸۸۵ء

The Imperial Gazetteer of India by W. W Hunter C S. I, C. I. E., LL. D, Volume II, 1885, London.

(۸) آخیر رپورٹ بندوبست ضلع ہردوئی سنہ ۹۸-۱۸۹۷ء

Final Settlement Report of the Hardoi district, 1897-98, by Mr J S C Davis

(۹) منتخبات کاغذات سرکاری، محفوظہ محکمۂ فوج۔ مرتبہ جی، ڈبلیو فاریسٹ سی۔ آئی۔ ای کلکتہ سنہ ۱۹۰۲ء

Selections from State papers preserved in the Military Department, by G. W. Forrest, C I E, Calcutta, 1902.

(۱۰) گزیٹیر ضلع ہردوئی۔ جلد ۴۱۔ مطبوعہ سنہ ۱۹۰۴ء مرتبہ ایچ۔ آر۔ نیول۔ الٰہ آباد۔

The Gazetteer of Hardoi, Vol XLI, by H. R. Nevill, 1904, Allahabad.

(۱۱) ممالک ہند کا گزیٹیر صوبہ متحدہ قسمت لکھنؤ سنہ ۱۹۰۵ء۔ گورنمنٹ پریس الٰہ آباد

The Imperial Gazetteer of U P, Lucknow Division. Government Press, Allahabad. 1905

(۱۲) ممالک ہند کا گزیٹیر۔ جلد ہشتم مطبوعہ آکسفورڈ سنہ ۱۹۰۸ء

The Imperial Gazetteer of India, Vol VIII, Oxford, 1908

(۱۳) تتمہ فوائد و اعداد۔ جلد ۴۱ متعلقہ ڈسٹرکٹ گزیٹیر صوبجات متحدہ آگرہ و اودھ۔ بابتہ ضلع ہردوئی۔ مطبوعہ الٰہ آباد سنہ ۱۹۱۵ء

Supplementary Notes and Statistics to Vol. XLI of the District Gazetteer of the United Provinces of A. and O, Allahabad 1915 Hardoi District B Vol

بلگرام کی تاریخ کی چند اور کڑیاں بے لطف سہی، مگر تحریر کے قابل ضرور ہیں۔

۱؎ نواب برہان الملک سعادت خاں نے سلطنت دہلی سے اودھ کا افتراق کرکے جداگانہ سلطنت قائم کی تو سرکاروں اور محالات کا نظم و سلسلہ بحالہ قائم و برقرار رکھا

۲؎ ۱۷۷۳ء کے معاہدہ کے مطابق اودھ میں امن و اماں قائم رکھنے کی غرض سے زیر قیادت افسران برطانیہ ایک فوج کا رکھا جانا قرار پایا تھا جسکی چھاؤنی بلگرام سے ڈھائی میل پر تھی اور جہاں ابتک لشکرگاہ ہونے کے نشانات موجود اور کھیتوں کے نام فوجی تعلقات اور اصطلاحات سے منسوب چلے آتے ہیں۔ یہ موقع اُس وقت اہم اور قدیم شاہ راہ (یا بقول انگریزوں کے (King's high way) پر واقع تھا جو لکھنؤ سے سانڈی و فرخ آباد ہوتی ہوئی دہلی جاتی ہے۔ بشپ ہیبر کی تحریر اسکے متعلق نقل کر چکا ہوں۔

۳؎ سعادت علی خاں نے جب ۱۸۰۱ء میں مالگذاری کا نیا طریقہ جاری کیا تو محال[1] بلگرام لکھنؤ سے منتقل کرکے نظامت خیرآباد میں شامل کر دیا گیا۔

۴؎ فروری ۱۸۵۶ء میں اودھ کا الحاق سلطنت برطانیہ ہند سے ہوا تو بلگرام بھی اُسکے ساتھ انگریزوں کے پرچم دولت و اقبال کے سایہ میں آگیا۔

وہ بلگرام جو کبھی ایک بڑا قصبہ، علم و فضل کا مخزن اور امارت و شہریت کے لحاظ سے شہرۂ ہند تھا آج اس سے علم و عمل و دولت و اقبال تقریباً رخصت ہو چکا اور اجازت دائمی لے گیا ہے۔ علمی جوش سرد پڑگیا،

---

[1] محال اُس زمانہ میں ملک کا ایک بڑا قطعہ کہلاتا تھا۔ انگریزی عملداری کے طریقۂ بندوبست و تشخیص جمع میں ہر موضع یا اس کا جزو ایک محال لکھا جاتا ہے جسکے لئے اقرارنامہ ادائے مالگذاری سرکاری جداگانہ لیا جاوے قطعات اور دیہات کی تقسیم و ترتیب کے متعلق قدیم و جدید اصطلاحیں یہ ہیں لئے سوا ایک سو احد تھا دیہات یہ وہ قطعہ اراضی تھا جو کسی چھوٹی بیادی سمجھ اور کہ و واضح ہو یہ عموماً پرگنہ سے چھوٹا ہوتا تھا۔

	سابق	حال
۱	محال	پرگنہ
۲	دستور	ضلع
۳	سرکار	قسمت
۴	صوبہ	صوبہ

اور درس و تدریس کا چرچا جاتا رہا ہے۔ تعلیم و تعلم کے مستمر ذریعے سب مٹ گئے۔ وہ دو ڈھائی ہزار مکانات ویران و نیم آباد کا ایک مجموعہ رہ گیا ہے ؎

پھول بھی تھے پھل بھی تھے اس سرزمیں پر کیا نہ تھا ۔ آج ہے ویراں کبھی آباد و ہر دیرانہ تھا

موجودہ قصبہ بلگرام دریائے گنگ کے کنارے بلندی پہ آباد ہے۔ ہر دوئی سے جانب جنوب ۱۶ میل اور فرخ آباد سے تینتیس میل پر، قنوج سے شمال و غرب ۱۴ میل پر واقع ہے قنوج جانے کے لئے بلگرام سے کچھ دور چلکر دریائے گنگ کو عبور کرنا پڑتا ہے

صوبۂ اودھ کے سلطنت برطانیہ سے الحاق پر اودھ کی سب سے پہلی مردم شماری ۱۸۶۹ء میں ہوئی اسوقت اودھ کے شہروں اور قصبوں میں بلحاظ آبادی بلگرام کا نمبر بارھواں اور نفوس کا شمار ۱۱،۵۳۴ تھا۔

دوسری مردم شماری بارہ سال بعد ۱۸۸۱ء میں ہوئی تو یہاں کی آبادی ۱۱،۰۶۷ پائی گئی اس کے بعد ہر دسویں سال شمار ہوتا رہا ہے۔ چنانچہ ۱۸۹۱ء میں آبادی ۱۱،۴۵۷ اور ۱۹۰۱ء میں ۱۱،۱۹۰ اور ۱۹۱۱ء میں ۹،۵۰۷، اور ۱۹۲۱ء میں ۹،۱۳۱ تھی۔

بلگرام میں میونسپلٹی یکم اپریل ۱۸۷۷ء کو قائم اور اپریل ۱۸۸۹ء میں شکست ہوئی۔ ایکٹ ۲۰، ۱۸۵۶ء (چوکیدارہ) کے رو سے قصبہ (ٹاؤن) قرار دیا گیا یکم اپریل ۱۹۱۱ء سے رقبہ مشتہرہ (نوٹی فائیڈ) کر دیا گیا ہے

عمارات محدثہ میں حکیم مہدی علی خاں ناظم (عہد غازی الدین حیدر) کی تعمیر کردہ دو بازار (چھوٹی اور بڑی) ایک سرائے اور دو مسجدیں، ایک امام باڑہ اور قصبہ سے باہر بازار کفایت گنج ہے حکیم صاحب ۱۸۰۴ء سے ۱۸۱۹ء تک اضلاع محمدی و خیر آباد میں اجارہ دار رہے تھے دیگر عمائد اور اہل دولت کے بنوائے ہوئے آٹھ امام باڑے اور مساجد ہیں سرکاری عمارات میں تحصیل و منصفی و تھانہ و شفاخانہ و ڈاک خانہ و مدرسہ ہیں۔ ریل کا اسٹیشن قصبہ کے قریب ہے

ولادت

دمِ صبح از نفس بادِ صبا مشکیں شد   جلوۂ می رسد و ہم نفسے مے آید

اہل سیر کا دستور ہے کہ رودادِ ولادت کو دلفریب اسلوب اور بہترین آئین کے ساتھ باغ وبہار بنا کر پیش کرتے ہیں۔ راقم عاجز کو نہ یہ قدرت حاصل ہے نہ میرے نزدیک اسکے لیے رنگین عبارت اور پرشکوہ الفاظ کی ضرورت۔ اس واقعہ یا فاتحۃ الآثار کے متعلق مجھے اس قدر تحریر کردینا کافی ہے کہ میر عبدالجلیل نے ۱۳ ماہ شوال ۱۰۷۱ھ کو اس عالم آب و گل میں قدم رکھا تھا۔ اس تاریخ کی یادداشت خود میر جلیل کے قلم سے لکھی ہوئی اُن کے کاغذات میں میر غلام علی آزاد کی نظر سے گزری تھی۔ آبائی مسکن محلہ میدان پورہ، قصبہ بلگرام تھا وہی انکا مولد و مسقط الراس ہے۔

مسٹر بیل اپنی محققانہ تالیف بیاگرافی کل ڈکشنری میں انگریزی تاریخ ۲ جون ۱۶۶۱ء لکھتے ہیں۔ زیچ جدیدہ یعنی گریگوری کی تقویم کے حساب سے یہ تاریخ بالکل صحیح ثابت ہوتی ہے۔ دن سہ شنبہ کا پڑتا ہے۔

یہ محلہ میدان پورہ ایک وسیع اور ہموار قطعۂ زمین پر آباد ہے، جو دریائے گنگ کے بازگشت و گریز سے پیدا ہو گیا تھا۔ اسی مردم خیز خطہ کو بہت سے نامآور اہل علم اور اہل قلم حضرات کی ولادت گاہ ہونے کا فخر حاصل ہے

تسمیہ

دریائے رحمت وکرم جوش میں آیا۔ خاندان کی مُراد بر آئی۔ شکر گزار ارباب نے بارگاہِ حق سبحانہٗ عز شانہٗ میں سجدۂ نیاز ادا کیا۔ حدیث نبوی علی صاحبہ الصلوٰۃ والسلام اَحَبُّ اسمائکم الی اللہ تعالیٰ الخ نے رہنمائی و دستگیری فرمائی۔ عبدالجلیل نام رکھا گیا۔ یُمن و اقبال نے آغوش میں لیا۔ دعا دی کہ یہ بندۂ جلیل، خدائے جلیل کا سچا بندہ، جلیل القدر، جلیل العلم اور جلیل الشان ہو۔

بزرگوں کا نام روشن کرے افتخار دودمان ہو الاسماء تنزل من السماء نے آمین کہی اور تصدیق کی۔

شرف نسب و فضل نجابت و حسب

شرافت نسب اور فضیلت حسب کا مسئلہ ہمیشہ سے متنازعہ فیہ و زیر بحث رہا ہے۔ اہل عقل و نقل اور اکابر ملل و امم نے اسکے متعلق مختلف و متضاد رائیں اور خیالات ظاہر کیے ہیں۔ ہندوستان جہاں ذات پات اور چھوت چھات کا بہت زور ہے اور جس نے کثیر التعداد فرقے مختلف المراتب والدرجات پیدا کر رکھے ہیں بہ بانگ بلند کہتا ہے ؎

جات (ذات) پانت (فرقہ) پوچھے نہ کو — ہر (خدا) کو بھجے (یاد کرے) سو ہر کا ہو

رب العزت کا ارشاد خداوندی یاد دلاتا ہے۔ اِنَّ اَکْرَمَکُمْ عِنْدَ اللّٰہِ اَتْقٰکُمْ (بیشک خدا کے نزدیک تم میں بڑا شریف وہی ہے جو تم میں بڑا پرہیزگار ہے خیر ۲ سورۃ الحجرات ع ۲-۱۴)۔ اکبر کا مشہور فلسفی ندیم و کاتب ابوالفضل پایان اکبرنامہ (دفتر سوم) میں لکھتا ہے کہ "نسب سرا شدن از تہیدستی باستخوان نیاکان بازرگانی نمودن و کالائے نادانی بہ بازار آوردن است و از شوریدہ مغزی بہ ہنر دیگراں نازش کردن و آہوئے خویش نادیدن" لیکن اسی کا بڑا بھائی فیضی جب افتخار و مباہات شاعرانہ کا موقع پاتا ہے تو بے تکلف سخن سرا ہوتا ہے ؎

جائیکہ از بلندی و پستی سخن رود — از آسماں بلند تر، از خاک کمترم
با ایں چنیں بلندی[563] کہ نوشتم نگارش — در فضل مفتخر ز گرامی برادرم

---

۵۶۳ شیخ مبارک عرف، مبارک اللہ نام، شیخ خاندانی لقب تھا۔ بزرگوں کا وطن یمن تھا۔ شیخ موسیٰ ہندوستان چلے آئے اور سیوستان (سندھ) کے علاقہ میں قصبہ ریل میں قیام گزیں ہوگئے۔ دسویں صدی کے شروع میں شیخ خضر انہی ان غریب الدیار بھائیوں اور ہندوستان کے نتائج کو دیکھنے آئے اور یہیں کے ہو رہے۔ ناگور میں جا بسے۔ ۹۱۱ھ (۱۵۰۵ء) میں شیخ مبارک پیدا ہوئے۔ ابھی بچے تھے کہ باپ کا سایہ سر سے اٹھ گیا۔ ماں نے ایک شریف الطبع

اسی برادر گرامی قدر (شیخ فیضی) کا دعوی تھا۔

آنم کہ فنون ذوفنوناں دارم   انوار چراغ رہ نموناں دارم
ایں کالبدم زخاک ہند است ولے   در ہر بن مو ہزار یوناں دارم

کریم الفضل سید کے یہاں عزت و تکریم کے ساتھ ان کی پرورش و تربیت کی اور تعلیم دلائی چودہ سال کی عمر میں تحصیل علوم واکتساب فنون سے فارغ ہو گئے خواجہ عبید اللہ احرار (مدفون سمرقند) کے مرید ہوئے۔ حضرت سید احمد گیسودراز احمد آبادی سے بھی رسم عقیدت تھی۔ خطیب ابوالفضل گازرونی شیرازی نے سبقاً سبقاً معقولات طے کرا دیں اور الٰہیات و فلکیات کے تمام درجے اور رموز سکھا دیے۔ شیخ یوسف مجذوب کے کہنے سے آگرہ آئے۔ شیخ علاء الدین مجذوب نے خیر مقدم فرمایا۔ رام باغ (جسے چار باغ کہا جاتا) کے قریب اترے۔ وہیں عبادت کی شہرت بڑھی تو شیر شاہ اور سلیم شاہ نے خزانۂ عامرہ سے کچھ مقرر کر دیا جاگیر دینا چاہی نامنظور کیا

معاصرین میں سے مخدوم الملک ملا عبد اللہ سلطان پوری اور شیخ عبدالنبی اور شیخ صدر نے کبھی چین سے بیٹھنے نہ دیا۔ مگر بیٹوں نے سر اٹھایا۔ ان کے لڑکوں کے دربار میں پہونچنے سے پیشتر بڑی بڑی آفتیں ڈھائی تھیں۔ سچ تو یہ ہے کہ انکی دوشت زندگی یعنی تریسٹھ برس تک تمام تر مصائب و محن میں گزری۔

اکبر نے شیخ مبارک سے پڑھا بھی تھا۔ آخر عمر میں العبارت نے بصارت ترک کر دی تھی درس و تدریس مجبورانہ چھوڑ دیا تھا۔ اسی عالم میں ایک مبسوط و کامل تفسیر چار جلدوں میں منبع نفائس العلوم لکھی جس کو اہل الرائے اور صاحبان نظر امام فخر الدین رازی کی تفسیر کبیر کے ہم پلہ بتاتے ہیں حیٰوۃ الحیوان کا عربی سے فارسی میں ترجمہ کیا فارسی نہایت شیریں لکھتے تھے۔ ابوالفضل نے زبان کی حلاوت باپ کی میراث میں پائی ہے۔ شیخ جید عالم اور بڑے محقق و دانشمند تھے آئین اکبری میں شیخ مبارک کا نام "حدیقہ نشاتین" میں سرفہرست ہے

شیخ اپنے سعادت مند اور باشعور فرزندوں کا عروج و عز و جاہ دیکھکر نوے سال کی عمر میں ۱۷ ذیقعدہ سنہ ۱۰۰۱ھ (۴ اگست ۱۵۹۳ء) کو اس دنیا سے رخصت ہوئے گردن میں دنبل نکلا تھا جان لیکر ٹلا ملا عبدالقادر بدایونی نے شیخ کامل تاریخ کہی فیضی نے "فخر الکمل"۔ لاہور میں سپرد خاک کیا۔ وہاں سے لا کر آگرہ میں لاڈلی بیگم کے مقبرہ میں دفن کئے گئے۔ عالی شان دروازہ کا عربی کتابہ شاہد حال ہے

یہ لاڈلی بیگم شیخ مبارک کی بیٹی اعتقاد الدولہ اسلام خاں شیخ علاء الدین چشتی سے بیاہی تھی اپنے سلیقہ و حسن معاشرت اور جود و سخا سے اسلام خاں کے نام کو چار چاند لگا دیے تھے۔ شیخ کی چاروں بیٹیوں میں سے شہرت اسی نے پائی اور دنیا میں اپنی یادگار نیک چھوڑ گئی ہے۔

شیخ کے لڑکے آٹھ تھے، (۱) شیخ ابوالفیض (۲) ابوالفضل (۳) ابوالبرکات (۴) ابوالخیر (۵) ابوالمکارم

ایک دوسرا ادب آموز فرماتا ہے ؎

چو بادا نان نہ دربند پدر باش | پدر بگذار و فرزند ہنر باش
چہ دود از روشنی بنود ونشانمند | چہ حاصل زانکہ آتش راست فرزند

(۶) ابوتراب (۷) ابو حامد (۸) ابو راشد

۹۶۳ شیخ ابوالفیض فیضی فیاضی، نادرۂ روزگار شخص گذرا ہے عجائب غرائب علوم میں اپنا ثانی نہیں رکھتا تھا یہ اسی کا دعویٰ ہے اور بالکل بجا ہے

مورخین کا اتفاق ہے کہ شعر، معمّیٰ، عروض، قافیہ، تفسیر، تاریخ، خط انشا میں جہاں تک حال میں چین ملک آفاق میں اس جامعیت کا کوئی شخص نہیں گذرا

ابوالفیض ۵ شعبان ۹۵۴ھ (۲۴ ستمبر ۱۵۴۷ء) کو مستقر الخلافہ آگرہ میں پیدا ہوا اکتساب علوم اپنے باپ شیخ مبارک سے کیا صغر سنی یعنی چودہ سال کی عمر میں علوم و فنون متداولہ کی تحصیل سے فراغت پائی اور فضل و کمال حاصل کر لیا اسکی قدرت کلام اور وسعت علم نظر کی شہرت سنکر اکبر بادشاہ نے ۹۷۴ھ (۱۵۶۶ء) میں طلبی کا فرمان بھیجا فیضی دربار میں حاضر ہوا تو نفری کٹھہرے کے باہر کھڑا کیا گیا۔ اس نے بے تکلف و برجستہ یہ رباعی پڑھی ؎

با دستا ہا برون پنجرہ ام | از سر لطف خود مرا خوانده
زانکہ من طوطی شکر خایم | جائے طوطی درون پنجرہ بہ

۹۹۶ھ (۱۵۸۸ء) میں "ملک الشعرا" خطاب پایا [یہ خطاب فیضی سے پہلے سلاطین تیموریہ میں سے اکبر نے غزالی مشہدی کو دیا تھا، اُسکے بعد جہانگیر نے طالب آملی کو، اور شاہجہان نے ابوطالب کلیم ہمدانی کو عطا کیا تھا] حسن اتفاق یہ ہے کہ فیضی نے دو تین روز پہلے ایک قصیدہ لکھا تھا جسمیں لسان الغیب نے اُسکی زبان سے یہی مضمون ادا کرا دیا تھا ؎

آن روز کہ فیض عام کردند | ما را ملک الکلام کردند
ما را بتمام در ربودند | تا کار سخن تمام کردند
از بہر صعود فکرت ما | از اطلس ہفت بام کردند

فیضی کو ہر قسم کا قرب و اختصاص مصاحبت و الا میں حاصل تھا۔ اسنے بادشاہ کی مدح میں بڑے بڑے قصائد فارسی میں لکھے ہیں علمی و ادبی خدمات کے علاوہ فیضی نے بہت سی سیاسی اور ملکی ذمہ داریاں بھی اپنے سر لے لی تھیں جن کے حسن انجام سے اُسکی ذہانت ولیاقت، روشن دماغی اور خوبی تدبیر کا سکہ قدر شناس بادشاہ کے دل پر جم گیا تھا۔ وہ ۹۹۹ھ (۱۵۹۱ء) میں راجہ علی خان حاکم آسیر و برہان پور کے یہاں بسلسلہ سفارت بھیجا گیا پھر اسی حیثیت سے برہان الملک والی احمد نگر کے حضور میں پہنچا ۱۰۰۲ھ (۱۵۹۴ء) میں ان تمام خدمات کو بہ احسن وجوہ انجام دے کر پابوس سریر سلطنت ہوا

بادۂ حقیقت کا سرمست جام معرفت بدست لونسخ ہے ؎

اعتبار شرف آدمیان از حسب است　　بہر تحقیق نسب آدم و حوا کافی است

باوجود اشتغال ملازمت، و فضلا کی صحبت، شعرا کے کلام اور کتابون کی تصنیف و تالیف کا بڑا شائق تھا اسکی فضیلت کی ایک روشن دلیل، اسکی غیر منقوط اور بسیط تفسیر موسوم بہ "سواطع الالہام" ہے جسکو دیکھ کر عقل دنگ ہوجاتی ہے اور جس کو اس نے صرف دو سال مین لکھا تھا باوصف کمالات ذاتی وہ شعرا اور اہل فن کی بڑی قدر کرتا تھا جب میر حیدر معمائی کاشانی نے اس تفسیر کی تاریخ سورۂ اخلاص (پوری سورت قل ہو اللہ) سے (۱۰۰۲ھ) نکالی تو اسکو فیضی نے دس ہزار روپیہ صلہ دیا۔ اسنے ایک اور مہمل (بے نقط) رسالہ مواعظ و نکات علم اخلاق مین موارد الکلم لکھا ہے بادشاہ کے ایما سے لیلیٰ مجنون کے مقابلہ مین نلدمن، چار ہزار دو بیت کی مثنوی، صرف پانچ ماہ مین نظم کی بلاوتی کا، جو بھاسکر پنڈت متوطن بیدر کی باکمال بہر ہندسہ کی، فن مساحت و حساب مین مشہور کتاب ہے سنسکرت سے فارسی مین ترجمہ کیا۔ بیج گنت (ریاضی) کے ترجمہ سے ہندو لٹریچر بھی اسکے گوشۂ چشم التفات کا ممنون گذار ہے بھگوت گیتا کا بھی سنسکرت سے ترجمہ کیا تھا۔ جیسا کہ خود پسند اہل کمال اور نازک مزاج لوگون کا شیوہ ہے فیضی کو بھی اساتذہ ماسلف کے کلام کا جواب دینے کا بڑا شوق تھا۔ چنانچہ خمسۂ نظامی مین سے مخزن اسرار کے مقابلہ مین مرکز ادوار لکھی تھی تبییض کی نوبت نہین آئی تھی فیضی کی وفات کے بعد شیخ ابوالفضل نے مسودہ کو صاف کرایا۔ اسنے شیرین خسرو کے پہلو بہ پہلو سلیمان و بلقیس کو جلوہ گر کرنا چاہا اور کر گذرا۔ اسیطرح سکندر نامہ کے مقابلہ مین اکبر نامہ لکھا تھا، ہفت پیکر کا جواب ہفت کشور لکھ رہا تھا کہ پیغام اجل آپہونچا اور تمام نہ کر سکا مہابھارت کا فارسی ترجمہ درست کر رہا تھا اور ضروری کامون مین لگا دیا گیا تھا گوت اور اتھرون وید کی طرف بھی توجہ کی تھی بعض تسلیم کرتے ہین اور بعض انکار۔ ان کے علاوہ اور رسائل بھی عربی و فارسی مین یادگار چھوڑے ہین۔ وہ اپنے معاصرین و متقدمین پر بھی طعن و تعریض کرنے میں بے باک تھا فَاللّٰهُ يَحْكُمُ بَيْنَهُمْ يَوْمَ الْقِيَامَةِ فِيمَا كَانُوا فِيهِ يَخْتَلِفُونَ ۝ (تو جس بات مین یہ لوگ جھگڑ رہے ہین قیامت کے دن اللہ ان مین اس کا فیصلہ کردے گا الجزء الاول سورۃ البقرۃ - ع ۱۴-۱۴)

ما این ہمہ ہم عصر شعرا نے دل کھول کر اسکی ستایش و ثنا کی ہے شیخ علی نقی کمرہ نے پینتیس شعر کا قصیدہ اصفہان سے لکھ کر ہندوستان بھیجا تھا حکیم عین الملک شیرازی کے بیٹے نور الدین محمد عبد اللہ نے شیخ کے مکتوبات جمع کئے اور انشای فیضی و لطیفۂ فیاضی کے نام سے ۱۰۳۵ھ مین ترتیب دئے تھے ملا طہوری ترشیزی نے ایک لطیفہ نثر شیخ کی مدح مین لکھ کر بھیجی تھی اسکو بھی مکتوبات کے اخیر مین درج کر دیا ہے۔ مرزا صائب ہمیشہ شیخ کو بڑی عظمت سے یاد کرتے اور لکھتے ہیں ؎

این آن غزل کہ فیضی شیرین کلام گفت　　در دیدہ ام خلیدہ و در دل نشستہ است

شیخ نے آخر عمر مین چھوٹے بھائی کی تدمی کے موازنہ و مناسبت سے فیضی کی بجائے فیاضی تخلص اختیار کیا تھا

ایک دوسرے موقع پر سبق ملتا ہے ؎

بندۂ عشق شدی ترکِ نسب کن جامیؔ | کہ درین راہ فلان ابن فلان چیزی نیست

وہ کہتا ہے ؎

زین پیش کہ سکّۂ سخن بود | فیضی رقمِ نگین من بود
اکنون کہ شدم بعشق مرتاض | فیاضی ام از محیط فیاض

شیخ کو یہ تخلص راس نہ آیا۔ دو تین مہینے کے اندر دنیا سے رخصت ہو گیا۔ دسوین صفر ۱۰۰۴ھ (۵ اکتوبر ۱۵۹۵ء) کو ضیق النفس (دمہ) سے رحلت کی اور اپنے باپ شیخ مبارک کی قبر کے پاس اکبرآباد مین دفن ہوا۔

فیضی کی کلیات میں ہر قسم اور ہر درجہ کا کلام ملتا ہے۔ پندرہ ہزار شعر کا مجموعہ ہے۔ دیوان خود ترتیب دیا تھا "طباشیر الصبح" نام۔ قصائد بڑے جوش سے لکھے ہین۔

مسٹر بیل اس کی تصانیف کی تعداد ایک سو ایک بتاتے ہین۔ ڈاکٹر براؤن اپنی تاریخ ادبیات فارسی کی جلد خاتم میں لکھتے ہیں کہ ضیا پاشا مشہور ترکی شاعر و مصنف نے اپنے "مجموعۂ خرابات" کے دیباچہ میں جہاں شعرائے فارسی کے متعلق بحث کی اور جامی اور اسکے کمال و کلام کی داد دی ہے وہاں عرفی و فیضی کو بھی قابل صد مدحت و ستائش شمار کیا ہے۔ اسکے ایک قصیدۂ غرّا میں فیضی و عرفی میدان سخن میں ہمدوش نظر آتے ہین۔

اسی کے ساتھ اہل وطن اور بعض معاصرین کا طرز عمل بھی قابل لحاظ ہے۔ اُس جماعت نے فیضی و ابوالفضل پر لعن و طعن کا کوئی دقیقہ نہ اُن کی حیات مین اٹھا رکھا تھا نہ بعد ممات۔ فیضی کی وفات کی تاریخ ان الفاظ مین نکالی ہین

(۱) بود فیضی ملحدے

(۲) ؎ فیضی بیدین چو مُرد سال وفاتش فصیح | گفت "سگے از جہان رفت بحال قبیح"

۹۵۴ فیضی خود آگرہ مین پیدا ہوا لیکن بزرگ باپ کا مولد و مسکن ناگور تھا۔ اُس نے ناگور کو ہمیشہ یاد رکھا اور دلی تعلق و محبت سے ذکر کیا ہے۔ یہ ناگور (اجمیر کے شمال و مغرب) اب ریاست جودھپور مارواڑ (راجپوتانہ) مین ایک ضلع ہے۔ عالمگیر کے عہد میں ایک سرکار صوبۂ دارالخیر اجمیر کے متعلق تھا۔ شہر کی آبادی ۱۹۰۱ء مین ۱۳۳۷۷ نفوس تھی، جو بیس سال بعد ۱۲۲۷۷ رہ گئی۔ اس کے بانی ناگا راجپوت تھے۔ یہی وجہ تسمیہ ہے۔ پرتھوی راج چوہان اور محمد غوری وغیرہ سلاطین کے زیر حکومت رہا۔ اکبر نے راجہ بیکانیر کو جاگیر مین دیا تھا۔ شاہجہان نے ایک راٹھور خاندان کو عنایت کیا۔

شہر پناہ طول میں چار میل ہے۔ برج فصیل اور دروازوں پر عربی و فارسی کے بہت سے کتبے لگے ہوئے ہین۔ بے پروائی اور محاصروں سے اسکی حالت خراب ہونے لگی۔ راجہ بخت سنگھ نے مساجد کو منہدم کرا کے اس کی مرمت کرادی اور انہی پتھروں سے دیوار پر نصب کرا دیا۔

حضرت عیسیٰ علیٰ نبینا و علیہ السّلام سے پوچھا گیا کہ انسانوں میں اشرف کون ہے۔ آپ نے سامنے کی خاک سے دو مٹھیاں بھر لیں پھر فرمایا کہ ان دونوں میں شریف تر کون ہے؟ بعد ازاں دونوں کو یکجا کر دیا پھر پھینک دیا اور فرمایا کہ انسان سب مٹّی ہیں ان اکرمکم عند اللہ اتقاکم

حضرت سلمانؓ فارسیؓ صحابی رسول صلعم کی حالات شان و مرتبت معلوم ہے۔ ایرانی النسل تھے اور آب الملک کی اولاد سے لیکن ایک مرتبہ جب خود آپ سے نسب پوچھا گیا تو آپ نے "سلمان بن اسلام"

قلعہ کی دیوار دُہری ہے۔ اس میں اب بھی بعض محلات، فوّارے اور چشمے، عہد اکبری کی یادگار ہیں شاہجہاں کی تعمیر کردہ ایک مسجد بھی باقی ہے۔

اس قطعہ کے (ناگوری) بیل بڑی حد تک بس کے ہوتے اور سارے شمالی ہند میں شہرت رکھتے ہیں

اکبر نے اپنی بہن بخشی بیگم کے شوہر شرف الدین حسین مرزا کو ناگور مع متعلقات ناگور کے جاگیر میں دیا تھا۔ اجمیر سے واپسی ناگور میں مقام ہوا تو بادشاہ نے شہر کی عرض پر گیلانی تلاؤ اور شمس تلاؤ، (گوکر تلاؤ) کو صاف کرا دیا۔ گوکر تلاؤ ایک سوداگر نے اپنے کتے کی محبت اور اسکی یادگار میں بنوایا تھا انہیں دونوں تالاؤں کے پانی پر رعایا اور جانداروں کی زندگی منحصر تھی۔

شیخ مبارک کے سوا (خود مبارک کے اُستاد) شیخ عطن ترک نژاد اور شیخ سالار اسی ناگور کے رہنے والے تھے قاضی شیخ حمید الدین کے علاوہ سکونت کا شرف و شہرہ بھی اسکو حاصل ہے

۵۶۵ مولانا نور الدین عبد الرحمن بن احمد جامی کے فضائل و کمالات آفتاب سے زیادہ روشن ہیں۔ ان کے دادا صاحب مولانا شمس الدین محمد اصفہانی محلہ دشت کے رہنے والے تھے۔ نوائب زمانہ سے وطن چھوڑ کر خراسان چلے آئے اور قصبہ جام میں متوطن ہوئے۔ ان کے والد مولانا نظام الدین احمد دشتی اصفہانی تھے۔ مولانا جامی جام میں ۲۳ شعبان ۸۱۷ھ (۷ نومبر ۱۴۱۴ء) کو متولد ہوئے اسی لئے جامی تخلص اختیار کیا تھا بعد ازاں دار السلطنت ہرات میں سکونت گزیں ہو گئے خواجہ عبید اللہ احرار سے بہت اخلاص و اتحاد تھا۔ مولانائے کاشغری کے خلیفہ تھے۔ چھیاسی سے زیادہ تصانیف یادگار چھوڑی ہیں شرح کافیہ، شواہد النبوۃ، یوسف زلیخا، نفحات الانس، سلسلۃ الذہب اور تفسیر القرآن زیادہ مشہور ہیں۔

ستّر برس کی عمر میں ۸۸۹ھ (۱۴۸۴ء) میں یوسف زلیخا لکھی تھی۔ اکیاسی برس کی عمر میں جمعہ ۱۸ محرم ۸۹۸ ہجری (۹ نومبر ۱۴۹۲ء) کو رحلت فرمائی تمام بادشاہان ہرات کے یہاں مقبول و محترم تھے سلطان بابر مدحان نے بمنت و اصرار اسے یہاں بلایا۔ ہدایائے گراں بہا بھیجے مگر پائے قناعت نے جنبش گوارا نہ کی عذر کر دیا۔ بعض اہل طریقت تاریخ وفات "ایت الماس" ۸۹۸ھ بتاتے ہیں (۲۷ جنوری ۱۴۹۲ء) بتاتے اور اسی حساب سے عرس و وصال مناتے ہیں ہرات میں مزار ہے۔

بتایا یہ صدمہ شیفتگی اسلام کا تھا کہ غیر ملک کے شاہزادے اسکی عظمت کے سامنے اپنے خاندان اور شرف سلف کو تحقیر و بے وقعتی سے دیکھنے لگتے تھے۔

ایک روایت خالد بن عبد اللہ القسیری[۵۶۷] سے ہے۔ آپنے واصل بن عطا[۵۶۸] سے اُن کا نسب دریافت کیا

مصنف نصار الارب نے سال وفات ۹۲ھ تحریر کیا ہے

۵۶۶ حضرت سلمان فارسی کا ایرانی نام دمایہ تھا شرے خاندانی اور صاحب نسب عالیہ تھے رام ہرمز (علیج فارس) وطن تھا حضرت عبد اللہ بن عباس سے فرمایا تھا کہ حوب جانچ پڑتال کرکے اور صداقت اسلام سے مطمئن ہوکر ایمان لایا ہوں اور جستجو کرتا ہوا آستانۂ رسالت پر پہونچا ہوں۔ اُنکے مسلک صدق کھودے وقت مہاجرین و انصار میں حجت پیش آئی انصار ان کو اپنا بناتے تھے اور مہاجرین اپنا۔ رحمت دو عالم کی زبان صدق ترجمان نے بیچ میں پڑکر یوں قصیہ چکا دیا کہ سلمان منا اهل البیت" سلمان ہمارے اہل بیت سے ہے" کسی صاحب نظر کا قول ہے سہ

کانت مودۃ سلمان لہ نسبا ولم یکن بین نوح وابنہ رحم

اہل عقیدت لکھتے ہیں کہ ڈھائی یا تین سو سال کی عمر میں ۱۰ رجب ۳۳ھ (۵ فروری ۶۵۴ء) کو وفات پائی اور مدائن میں دفن ہوئے۔

۵۶۷ ابو یزید و ابوالہیثم خالد بن عبد اللہ القسیری کا پورا نام و نسب قاضی احمد بن خلکان نے خالد بن عبد اللہ بن یزید بن اسد بن کرز البجلی ثم القسیری لکھا ہے اسی کو مزید تفصیل کے ساتھ ہشام بن الکلبی نے بھی کتاب جمہرۃ النسب میں نقل کیا ہے [قسری (بفتح قاف و سکون سین نہملہ بعدا ال را) قسر بن عبقر کیطرف منسوب ہے جو بجیلہ کا ایک قبیلہ ہے]

طبری اپنی تاریخ کبیر میں لکھتا ہے کہ خالد ۸۹ھ (۷۰۸ء) میں والی مکہ رہا تھا پھر ہشام بن عبد الملک اموی (تخت نشین ۱۰۵ھ متوفی ۱۲۵ھ) نے شوال ۱۰۵ھ (مارچ ۷۲۴ء) میں عمر بن ہبیرہ کو معزول کرکے خالد کو عراقین کا والی (گورنر) مقرر کردیا۔ جمادی الاول ۱۲۰ھ (مئی ۷۳۸ء) میں ہشام نے اُسکو بھی برطرف کردیا اور اسکی جگہ یوسف بن عمر الثقفی (حجاج کے برادر عم زاد) کو دی

خالد کے دادا یزید کو رسول اکرم صلعم کا شرف صحبت نصیب ہوا تھا مگر اسکی ماں نصرانیہ (عیسائی) تھی۔ خود خالد کی دینداری کی نسبت شبہ کیا جاتا اور اتہام لگایا جاتا تھا لیکن ہمیں شک نہیں کہ وہ مذہبی تعصبات سے بیگانہ تھا۔ اپنی ماں کے لئے اُس نے خود کلیسا (گرجا) بنوا دیا تھا جہاں وہ عبادت کرنے جاتی تھی۔ اسی بنا پر فرزدق نے

اُس کی ہجو کی تھی۔

اسی غیر ملتزم الدین خالد کی دینداری کا ایک تاریخی واقعہ یادگار ہے۔ جعد بن درہم جسکی طرف خاندان اموی کا سب سے آخری خلیفہ مروان ابن جعدی منسوب ہے صفات الٰہیہ کا منکر اور عقیدۂ "تعطیل" کا بیباک مُعلِم تھا مسلمانوں میں اس فتنہ کا آغاز اسی نے کیا۔ خالد نے اس (جعد مُعطِّل) اور اسکے متبعین کا استیصال کیا تھا۔ وہ منبر پر گیا اور مسلمانوں سے مخاطب ہوا "اے معاشر اسلام! قربانی کرو خدا تمھاری قربانی قبول کرے گا میں جعد بن درہم کی قربانی کرتا ہوں وہ کہتا ہے کہ نہ خدا تعالیٰ نے ابراہیم علیہ السلام کو خلیل بنایا اور نہ موسیٰ علیہ السلام سے کلام کیا" پھر منبر سے اُتر کر جعد کو ذبح کر دیا۔ ائمۂ اسلام (حسن بصری وغیرہ) نے اُسکے اس عمل کی ستایش کی اور شکر گذار ہوئے۔

خالد کا شمار عرب کے ممتاز لوگوں اور نامور خطیبوں میں ہوتا ہے جو فصاحت و بلاغت کے معرکوں میں بقائے دوام کی سند پا چکے ہیں وہ نہایت سخی اور کثیر العطا تھا ہفتہ میں ایک دن مخصوص شعرا کے لئے، دربار کرنے، اُن کا کلام سننے، داد سخن دینے اور بخشش و اکرام کے لئے مقرر کر رکھا تھا۔ اُسکی داد و دہش کے کئی واقعات طبری نے بیان کئے ہیں اُس نے بہت سی نادر کتابیں ترجمہ کرائیں اور قابل دل و دماغ والوں کو اپنے گرد جمع کر لیا تھا جو گروہ یا فرقے کسی حکمران یا امیر کی سخت گیری یا مذہبی پاسداری سے بے در و بے کس پھرتے تھے، اُن کی سرپرستی و دستگیری کرتا پناہ دیتا اور مراعات کرتا۔ خالد اپنے مشاغل علمی اور دلچسپ ادبی صحبتوں کے لئے ہمیشہ مشہور رہے گا جس وقت کہ قید و بند میں تھا اُس وقت بھی شعرا اُسکی مدح کرتے اور وہ حسب حال صلہ بھیجتا تھا

معزولی کے بعد بدنصیب خالد کچھ مدت تک قید و حبس میں رکھا گیا اور پھر بڑی بے رحمی و بے دردی سے ہلاک کر دیا گیا۔ اُسکے ضبط و تحمّل کی یہ کیفیت تھی کہ باوجود تکلیف پانے اور اذیت سہنے کے وہ نہ زبان سے کچھ نکالتا اور نہ آہ و زاری کرتا۔ اُس کا دردناک خاتمہ ذی قعدہ ۱۲۵ھ (دسمبر ۷۴۲ء) یا محرم ۱۲۶ھ (نومبر ۷۴۳ء) میں ہوا شب میں ناحیہ حیرہ میں دفن کر دیا گیا۔ حیرہ کوفہ سے ایک فرسخ ہے۔ کبھی ملوک عرب آل النعمان بن المنذر کا تخت گاہ رہا تھا

قاضی ابن خلکان کے سوا ابو الفرج اصفہانی نے بھی کم و بیش یہی واقعات تحریر فرمائے ہیں

۵۹۵ واصل بن عطاء الغزال الفارسی (ابو حذیفہ کنیت) بڑا زبان دان اور قادر الکلام گذرا ہے بدنصیبی سے وہ الثغ (توتلا) واقع ہوا تھا حرف را کو بول نہ سکتا تھا غین کی آواز نکلتی تھی۔ بات اس طرح کرتا تھا کہ اُسکے کلام میں "رے" نہ آنے پاتی اور اُسکے لقمہ (روٹی) میں کاعیب سامعین پر مخفی رہا۔ حتی کہ اس قدرت زبان اور احتیاط اظہار مطالب سے وہ ضرب المثل ہو گیا تھا شعرا اور مورخین نے اسکا تذکرہ کیا ہے

کر دیا اور جس نے اُس کو محفوظ رکھا اُسے اپنا نسب بھی محفوظ رکھا۔ خالد بولے "واقعی عبد (بندہ) کا جوہر اور مرد آزاد کا کلام ایسا ہی ہوتا ہے"!

ابو عمار ابراہیم النخعی سے (جو مشاہیر علمائے تابعین سے ہیں اور امام ابوحنیفہ کے اُستاد تھے) کسی نے پوچھا کہ "آپ کا نسب کس شخص تک پہونچتا ہے" فرمایا "تم کو میرے نسب کے جاننے سے کیا حاصل ہوگا

ابو العباس المبرد کتاب الکامل میں لکھتا ہے "کان واصل بن عطاء احد الاعاجیب وذالک انہ کان الثغ قبیح اللثغة فی الراء فکان یخلص کلامہ من الراء ولا یفطن لذالک لاقتدارہ علی الکلام وسهولة الفاظہ"

صاحب بن عباد وزیر کی ہجو میں ابو محمد خازن لکھتا ہے ؎

نعم تجنب لا یوم العطاء کما | تجنب ابن عطاء لثغة الراء

ایک دوسرا شاعر کہتا ہے ؎

وجعلت وصلی الراء لم تنطق بہ | وقطعتنی حتی کانک واصل

ملا نور اللہ شوستری، جو اسی کا ہمعصر شاعر تھا اور جس کا حال سید علی معصوم نے سلافة العصر (تذکرہ شعرائے عرب) میں بڑے بسط سے لکھا ہے اور عربی بھی خوب کہتا تھا اسی واصل کی نسبت اشارتاً کہہ رہا ہے ؎

لا عذر ان لم تفصح الایام لی | الا ہر ابن عطاء ابی الراء
وبدا احری طبع الزمان واہلہ | دق الکلام واہلہ احیاء

یہ وہ سیر ابن اپنی تاریخ ادبیات میں لکھتے ہیں اور جسکو مورخین اسلام نے بھی نقل کیا ہے کہ یہ واصل حضرت حسن بصری کا شاگرد تھا جو ائمہ تابعین اور اکابر متکلمین عراق سے تھے۔ اُستاد سے اس بات پر اختلاف ہوگیا کہ آیا مومن ارتکاب گناہ کبیرہ کے بعد بھی مومن کہلانے کا مستحق رہتا ہے یا نہیں۔ خود واصل کا خیال یہ تھا کہ ایسا آدمی، نہ تو مومن کہا جاسکتا ہے نہ غیر مومن (یا کافر) بلکہ منزلة بین المنزلتین ہے۔ تو کو وہاں سے چونکہ پسند کر واصل مسجد جامع کے ایک دوسرے گوشہ میں چلا گیا تاکہ وہاں اپنے ہم سبق طلباء سے گفتگو اور اپنی رائے و خیال کا اظہار کسی قدر شرح و بسط سے کرے خصوصاً اُن سے جو اسکے ہم آہنگ ہو رہے تھے شیخ حسن بصری نے سنا تو اُن لوگوں سے جو اُن کے گرد تھے فرمایا "اعتزل عنا" ہم سے علیحدہ ہوگیا" واصل کی جماعت اسوقت سے معتزلہ کہلانے لگی۔ عراق و دمشق میں اسے بڑی شہرت پائی القلہ فرقہ کا یہ پیشوا و مقدم تھا۔ اسکے پیرو اور ہم خیال خود کو اہل العدل والتوحید کہتے تھے اس فرقہ کا عقیدہ یہ ہے کہ دنیا و آخرت میں حق تعالیٰ کا دیدار ممکن نہ ہوگا۔ ان کا قول یہ ہے کہ نیکی خدا کی طرف سے ہے اور بدی خود اپنے نفس سے۔ واصل نفی اثبات اور قدر کا قائل تھا۔ مرتکب کبائر کے لئے خلود فی النار کو تسلیم کرتا تھا۔

بیچارے حسن بصری اپنے تلامذہ کی ناسعادتمندی و کج روی کا ہمیشہ شکار رہے ہیں انکا ایک اور

میر اجداعلے اپنے نام سے خود آگاہ ہے::
فخر المتاخرین مولانا شاہ عبدالعزیز محدث دہلوی فرماتے ہین کہ حقیقت حسب کسی شخص کے خاندان کی

ستاگرد اس ابی العوجاء تھا جو مرکز توحید وخدا شناسی سے منحرف ہوگیا تھا لوگون نے پوچھا کہ اپنے استاد کے مذہب کو کیون چھوڑ دیا اور ایک بے اصل وحقیقت عقیدت اختیار کرلی۔ جواب دیا کہ میرا استاد ایسی باتیں کرتا تھا جو سخت توہم وپریشان ہوتی تھین۔ کبھی قدریہ کے آئین پر چلتا اور کبھی جبریہ کے طریق پر۔ میرے پندار مین تو کبھی ایک مذہب پر وہ قائم نہ تھا

واصل نے تصانیف کی ایک تعداد کثیر چھوڑی ہے کتاب اصناف المرجئہ۔ کتاب فی التوبہ۔ کتاب فی المنزلۃ بین المنزلتین۔ کتاب معانی القرآن۔ کتاب طبقات اہل العلم والجہل وغیرہ۔ اسکے خطبون کی بھی کتاب ہے جسکی خصوصیت یہ ہے کہ حرف را اسمین آنے نہین پایا ہے۔

سنہ ھ (سنہ ۶۹۹ع) مین مدینۃ الرسول مین پیدا ہوا اور سنہ ۱۳۱ھ (سنہ ۷۴۹ع) مین رحلت کی

۶۹ ابو عمار مشاہیر فقہائے تابعین سے تھے۔ آپ کے والد یزید بن الاسود النخعی اور والدہ ملیکہ دختر یزید بن قیس تھیں۔ سنہ ۴۶ یا سنہ ۴۷ھ (سنہ ۶۶۶ یا سنہ ۶۶۷ع) میں جس شب مین کہ حکم بن عیینہ فقیہ تابعی کی ولادت ہوئی آپ بھی پیدا ہوئے تھے۔ ایام رشد دستار مین شوق علم بدرجہ غالب تھا۔ پہلے اپنے دونوں ماموں عبدالرحمن اور اسود پسران یزید بن قیس سے تلمذ واکتساب کیا پھر علقمہ بن قیس النخعی سے جو ان دونون صاحبون کے چچا اور فقہائے سبعہ کے معاصر تھے استفادہ فرمایا اور ہر علم وفن کو سیکھا۔ ابو زرعہ نے آپکی نسبت لکھا ہے ابراہیم النخعی من اعلام الاسلام یعنی ابراہیم نخعی علمائے دین حنیف سے ہے حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ تعالی عنہا کی زیارت بھی کی تھی نخعی کے حالات خصوصیات مین مروی ہے کہ نوامیس الٰہیہ اور شرائع مقررہ کے سوا دوسری طرف توجہ نہ فرماتے تھے بلکہ اسکو بیہودہ ولغو جانتے تھے اور قطعاً التفات نہ کرتے۔ اگر کوئی اس قسم کے سوال کر بیٹھتا تو جواب مین تعرض نہ فرماتے بلکہ تعریض میں لب کھولتے۔ آپ کے ملنے والون مین سے کسی نے پوچھا "آپ کے حالات شب وروز کیسے گذرتے ہین؟" جواب دیا "اگر آپ کی یہ رائے ہو کہ میری پریشانی کو مجتمع (رفع) کرین یا قرض کو ادا فرما دین یا عریانی مین مجھے پوستک پہنا دیں تو اپنا حال بار بار عرض کرسکتا ہون ورنہ میری حالت آپکی حالت سے زیادہ عجیب نہ ہوگی کہ میرا حال تو پوچھ رہے ہین اور خود بدولت اپنی کیفیت نہین دیکھتے!" کسی نے پوچھا کہ "آپ کب متولد ہوئے تھے اور اس عالم میں کب قدم رکھا؟" فرمایا کہ "جس وقت میری ہستی کی حاجت ہوئی مین نے عرصۂ ہستی مین قدم رکھا"

آپکی جلالت قدر اور رفعت شان اس حد تک تھی کہ امام اعظم کوفی نے آپ کے درک حضوری پر فخر کیا ہے۔ اُنچاس سال تک زندہ رہکر سنہ ۹۵ یا سنہ ۹۶ھ (سنہ ۷۱۴ یا سنہ ۷۱۵ع) مین دار فانی سے رخصت ہوئے۔ جب

بزرگی ہو بشرطیکہ آبائے قریبہ یعنی سات پشت کے اندر پائی جائے مثلاً کوئی شخص سلاطین یا اُمرائے کبار یا کسی اچھے شیخ کی اولاد سے ہو یا کسی مشہور عالم کی نسل میں نسب کی حقیقت کسی شخص کے خاندان کی بزرگی آبائے بعیدہ کے سلسلہ سے مانی جاتی ہے جیسے حسینی و ہاشمی ہونا یا قریشی ہونا یا ابراہیمی ہونا علیٰ ہذا القیاس بعض اشخاص میں یہ دونوں تفوق موجود ہوتے ہیں مثلاً حضرت غوث اعظم کی اولاد جو سیّد بھی ہیں اور انھیں ایسے بزرگ جلیل القدر کی اولاد ہونے کا شرف بھی حاصل ہے

آفتاب عمر معرض غروب میں پہنچا اور سکرات کے آثار لبوں میں مشاہدہ کرنے لگے تو اضطراب سخت و جزع شدید طاری ہوا۔ لوگوں نے پوچھا۔ کیا حال ہے۔ آپ ایسے آشفتہ و پریشان کیوں ہو رہے ہیں۔ کہا کہ "میری کیفیت جو اس وقت ہے اس سے زیادہ سخت اور کون حالت ہوگی اسلئے کہ رب العزۃ کی جانب سے قاصد کا انتظار کر رہا ہوں کہ آیا جنات نعیم کی بشارت دیتا ہے یا درکات جحیم کی خبر۔ خدا کی قسم کھاتا ہوں کہ میری آرزو یہی ہے کہ قیامت کے دن میری حالت یہ ہو کہ میرے حنجرہ (گلے) میں گردش کرے اور اس کالبد سے باہر نہ جائے تاکہ جو ہولناک عقوبتیں ہر شخص دیکھے گا میں نہ دیکھوں"

فائدہ۔ فقہائے سبعہ کا ذکر یہاں آگیا اسلئے کسی قدر تفصیل کر دینا ضروری سمجھتا ہوں۔ فقہائے سبعہ جنکو کتب رجال میں قلمبند کیا ہے فرقہ تابعین سے تھے۔ جو مدینہ طیبہ میں احکام الٰہیہ و احادیث نبویہ و علوم شرعیہ کو اصحاب رسول اکرم صلعم سے حاصل کر کے مسلمانوں کو تعلیم و تلقین فرماتے تھے۔ کتب معتبرہ میں انکے نام نامی یہ لکھے ہیں (۱) سعید بن مسیّب بن حزن (۲) عروہ بن زبیر بن العوام (۳) قاسم بن محمد بن ابی بکر الصدیق (۴) عبد الرحمٰن بن الحارث بن ہشام (۵) عبید اللہ بن عبد اللہ بن عتبہ ہذلی (۶) خارجہ بن زید بن ثابت (۷) سلیمان بن یسار اہل التشیع خصوصاً ثقۃ الاسلام کلینی صاحب کافی، اسحق بن جریر سے حکایت کرتے ہیں کہ حضرت امام جعفر صادق نے فرمایا ہے کہ سعید بن مسیّب، قاسم بن محمد بن ابی بکر اور ابو خالد کابلی کو علی بن الحسین زین العابدین رضی اللہ عنہما کے حضور مبارک میں وثوق و اعتماد حاصل تھا۔

۵۷ مولانا شاہ عبد العزیز محدث دہلوی حافظ قرآن و امام عصر و مقتدائے سکلین زمانہ تھے۔ سالہ علم و عملائیں پیدا ہوئے اپنے والد ماجد شاہ ولی اللہ سے تمام علوم معقول و منقول پندرہ سال کی عمر میں حاصل کر لئے۔ کمالات باطنی کی تکمیل فرمائی۔ پدر بزرگوار کی رحلت پر اپنے آباء و اجداد کی مسند افادہ و ارشاد پر متمکن ہوئے۔ اسّی سال کی عمر میں صبح یکشنبہ، شوال ۱۲۳۹ھ (۵ جون ۱۸۲۴ء) کو وفات پائی۔ فنون مختلفہ میں تصانیف کثیرہ چھوڑی ہیں۔ تفسیر میں فتح العزیز، مناظرہ میں تحفہ اثنا عشریہ، مجموعہ فتاویٰ۔ وغیرہ بہت

بعض میں حسب ہوتا ہے نسب نہیں ہوتا۔ جیسے تیموریہ اور راجپوتان۔ اور اولاد حضرت امام اعظم رحمۃ اللہ
علیہ کی بعض میں صرف نسب ہوتا ہے حسب نہیں ہوتا جیسے قدوائیان جاہل و سادات بارہہ شرافت
نجابت عرف عام میں بزرگی نسب کے مقام پر استعمال ہوتی ہے۔ واللہ اعلم بالصواب "

اہل لغت حسب کو شرف و بزرگی بلحاظ مال و جاہ و دین بتاتے ہیں اور لکھتے ہیں کہ یہ لفظ اکثر
نسب کے ساتھ مستعمل ہوتا ہے۔ نسب کے معنی نسل و نژاد کے ہیں۔ ابن السکیت[۵۵] کہتا ہے "الشرف

منقول اور مستند کتابیں ہیں۔ سال ولادت ۱۵۹ھ (۷۷۶ء) تھا

لکھ ۵۵ ابو یوسف یعقوب بن اسحاق السمی۔ المعروف بابن السکیت نحوی کی نسبت قاضی احمد بن خلکان لکھتے ہیں کہ اس کا باپ اسحاق اصل میں دورق خوزستان (خراسان) کا متوطن صالح نیک کردار۔ علم دوست و عالم نواز تھا۔ آستان مقدس حضرت رضا کی حضوری اور امامین کرام تقی و نقی علیہما السلام کی زیارت و صحبت سے بھی مستفیض ہوا تھا۔ چنانچہ ان حالات و واقعات و اقوال و احادیث کو کتاب عیون اخبار الرضا میں نقل کیا ہے۔ یعقوب اپنے باپ کے ساتھ مدت تک بغداد میں تعلیم و تربیت اطفال میں مشغول رہا۔ باپ نے کسی وقت خانۂ کعبہ میں دعا مانگی تھی کہ لڑکا فن نحو میں امام ہو۔ چنانچہ یہ دعا بارگاہ الٰہی میں قبول ہوئی اور یعقوب فن نحو (کوفیین) اور لغت میں یکتائے عصر ہوا۔ اس نے ان فنون کو اساتذہ و ماہرین مثل فراء، ابی عمر، اسحاق بن مرار شیبانی، اثرم، ابن اعرابی وغیرہم سے تحصیل کیا تھا۔ بعد فراغ کچھ عرصہ تک بطور خود عام لڑکوں کو پڑھاتا رہا۔ حتے کہ اسکے علم و فضل کا شہرہ بڑھا اور محمد بن عبد اللہ بن طاہر خزاعی قائد و سپہ سالار عباسیہ نے اسکو اپنی اولاد کی تعلیم کے لئے پانچسو دینار سالانہ پر مقرر کر لیا پھر ہزار دینار سالانہ تک ترقی کر دی۔ رفتہ رفتہ خود خلیفہ متوکل کی صحبت و دربار میں پہونچگیا اور معتز و موید دونوں شاہزادوں کی تربیت پر مامور ہوا۔ بارہا انعام و اکرام پائے۔ اکثر بار خلیفہ نے پچاس ہزار درہم عطا کئے تھے۔ تقدیر الٰہی تھی کہ اسی قدر شناس و نکتہ نواز سرپرست کے حکم سے اپنے عقائد کے اظہار کی بدولت یا کسی گستاخی و بدزبانی کی سزا میں مارا گیا۔ متوکل نے اسکے فرزند یوسف کو دس ہزار درہم بھیجے اور کہلا بھیجا کہ تمہارے باپ کا خون بہا ہے۔ ابو العباس ثعلب کہتا ہے کہ ابن سکیت تمامی علوم میں مہارت رکھتا تھا اور بالاجماع ابن اعرابی کے بعد علم لغت میں یعقوب سے زیادہ کوئی مستند و معتبر شخص نہیں گزرا۔ کتب تاریخ و سیر میں ابو الحسن علی لحیانی کے ساتھ یعقوب کا جوانی اور طالب العلمی کے زمانہ میں مناظرہ، اور ابو الحسن کا ناکام و شرمندہ ہونا اور پھر باہمہ تبحر و کمال ایک وقت پر یعقوب کا ابو عثمان مازنی سے وزیر محمد بن عبد الملک زیات کی محفل میں مغلوب و خجل ہو جانا منقول ہے۔ ابن السکیت نے اٹھاون سال کی عمر میں ۵ رجب ۲۴۴ھ

والمجد یکونان بالآباء ۔ یقال رجل شریف ماجد، لہ آباء متقدمون فی الشرف ۔ والحسب والکرم یکونان فی الرجل وان لم یکن لہ آباء لہم شرف "

بلاش[2] بن ہرمز کا قول ہے "حسب زیور است ونسب جامہ ۔ چنانکہ زیور صاحب جمال را درخور است حسب اہل نسب را لائق تر "

اب ہادیان کرام ومقتدایان عظام کے اقوال نقل کرتا ہون جو استحفاظ نسب وحسب اور نگہداشت مراتب اقربا کے بارہ مین تقریبًا متفق ویکسان ہین ۔

حضرت علی کرم اللہ وجہہ فرماتے ہین کہ "اپنے خاندان کی تکریم کرو یہ تمھارے بازو ہین جن سے تم اڑتے ہو یہی تمکو ملاتا اور یہی تمکو بڑھاتے ہین یہی مصیبت کے وقت آڑے آتے ہین ۔ ان مین کے کریم کا اکرام کرو جو بیمار ہو اسکی عیادت کرو اپنے معاملات مین انکو شریک کرلو اور انکی مشکلات وتکالیف مین انکو آسانی بخشو "

ایک بزرگ کا ارشاد ہے کہ اگر کوئی تمھارا قریب ہو اور تم پانون سے چل کر اسکے پاس نہین گئے

(۱۸ رجب یا ۱۹ اکتوبر ۸۵۸ء کو دوشنبہ کے روز وفات پائی بہت سی نافع اور جامع تالیفات یادگار چھوڑین ۔ اس کی کتاب اصلاح المنطق کی تعریف مین علما کا متفقہ فیصلہ یہ ہے کہ "در ارجسر بغداد کتابے در علم لغت مانند او نہ گذشتہ است ۔ " "ہر تصنیف کہ در رسائل کتب بدست می آید با اصلاح المنطق رجوع می کردند " ایڈورڈ ولیم لین Edward William Lane بھی اسکی نہایت تعریف کرتا اور لکھتا ہے کہ ابن السکیت نے عروہ بن الورد بن زید العبسی شاعر جاہلی کے دیوان کی نہایت عمدہ شرح لکھی تھی

[2] یہ تحریر مسلمان اہل قلم کی ہے انھین نے یہ نام بھی لکھا ہے ۔ لیکن دانایان پارس کو اسکی اصلیت مین کلام ہے ۔ میرے واجب الاحترام مکرم اور زردشتیون کے مقتدائے اعظم شمس العلما ڈاکٹر جیوانجی جمشید جی مودی کی تحقیق یہ ہے کہ طبقۂ حکمائے باستانی مین کسی بلاس کا بلاس بن ہرمز کے نام سے پتہ نہین چلتا ہے ۔ البتہ ایران مین ایک بادشاہ 'بلاس یا بلاش' نامی تھا جو ۴۸۴ء سے ۴۸۸ء تک فرمانروا رہا اسکے سکے بھی ملتے ہین مگر اسکا عہد چندان ممتاز رہا ۔ اسی وجہ سے بعض مورخین نے اسکا نام بھی نہین لیا نہ ذکر کیا ہے ۔ بعض کا قول ہے کہ وہ ہرمز پسر یزدجرد دوم کا بھائی تھا ۔ بعض کہتے ہین کہ نہین وہ ہرمز کا بھتیجا یعنی فیروز برادر ہرمز کا بیٹا تھا ۔ رومانی مورخین اسی کو Balaas بتلاتے اور لکھتے ہین

اور اپنے مال سے اُسے کچھ نہیں دیا تو ضرور رحم نے اُس سے قطع تعلق کیا

ایک صاحب کہتے ہین کہ اقارب کا حق یہ ہو کہ چھوٹا اپنے بڑے کی تعظیم کرے اور بڑا چھوٹے

پر شفقت"۔ رحمت عالم و عالمیان صلعم نے فرمایا ہو کہ بھائیوں میں سے بڑے کا حق اپنے چھوٹوں پر اتنا

ہی ہے جتنا باپ کا اپنے بیٹے پر

حضرت عمر رضی اللہ عنہ فرماتے ہین کہ اپنے انساب کا علم حاصل کرو۔ اس سے تم اپنی اصل و

فاصل ڈاکٹر نے اسکے متعلق اپنی تالیف "ایشیاٹک پیپرس حصۂ دوم مین لکھا ہے بر اُس مضمون مین جو خوارزم (خیوا) کے سعید ہُن لوگوں (ہنو۔ مزدکیان۔ ایران) کی قدیم تاریخ پر رائل ایشیاٹک سوسائٹی ساخ مئی کے رسالہ میں ۱۹۱۶ء میں شایع کیا تحج تجاسی میں لکھا ہے کہ بلاس بہرام گور کا بیٹا تھا۔

یہ بھی ممکن ہے کہ سکندر کے نامور ندیم حکیم بلیناس کا اس روایت سے کچھ تعلق ہو۔

۵ خلیفہ ثانی حضرت عمر بن الخطاب رضی اللہ عنہ کی کنیت ابو حفص تھی لقب فاروق تھا۔ بڑے جلیل القدر صحابی اور سیر اسلام و اسلامیان تھے علی الراجح نبوت کے سال ششم مین ستائیس [27] برس کی عمر مین ایمان لائے تھے (الذہبی) آیہ پاک یَاَیُّھَا النَّبِیُّ حَسْبُکَ اللّٰہُ وَمَنِ اتَّبَعَکَ مِنَ الْمُؤْمِنِیْنَ (اے پیغمبر اللہ اور مسلمان جو تمھارے تابع فرمان ہیں تمکو کافی ہیں۔ جزو ۱۰ سورۃ الانفال ع ۸-۴) کا نزول مفسرین انکی شان مین بتاتے ہین اور مَنِ اتَّبَعَکَ سے مراد دستار فاروق اعظم کو لکھتے ہین۔ جامع ترمذی اور مستدرک حاکم مین مناقب عمر مین جو احادیث مروی ہین اُنسے آپکے علو مرتبت اور جلالت شان کا اندازہ ہو سکتا ہے لو کان نبی بعدی لکان عمر بن الخطاب۔ لو کان بعدی نبی لکان عمر۔ ما طلعت الشمس علی رجل خیر من عمر رحمۃ و عالم نے آپکے حق مین دعا فرمائی تھی اللھم اعز الاسلام بہ۔ اللھم اید الاسلام بعمر بن الخطاب یہ دعا بر آئی (دار قطنی)

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے نسب سے آپکا نسب کعب ابن لوی پر ہو کر ملتا ہے۔ حضرت کے مولد شریف سے تیرہ سال بعد پیدا ہوئے آپکی شادی سات بار ہوئی تھی۔ حضرت علی کرم اللہ وجہہ کی صاحبزادی حضرت ام کلثوم بھی آپکی زوجیت مین تھین۔ آپ کی بیٹی حضرت حفصہ زوجہ رسولؐ اور ام المؤمنین تھین ایام جاہلیت مین جب قریش کے قبیلوں مین لڑائی ہوتی تھی تو آپ سفیر ہو کر جایا کرتے تھے۔ اکثر مناظرہ (حسب ونسب کے فیصلہ) کے جلسوں مین بھی پیش ہوتے تھے۔ حضرت ابوبکرؓ کی وفات پر بروز سہ شنبہ ۲۳ جمادی الاخر سنہ ۱۳ھ (۲۵ اگست سنہ ۶۳۴ء) کو مسند آرائے خلافت ہوئے سب سے پہلے آپ ہی امیر المومنین کہلائے

دشمنیاں بڑھ گئیں۔ ہم سب ڈر گئے پھر صلۂ ارحام تک ہو چکے گئے۔ یہ بھی کہا جاتا ہے کہ اگر انساب سے
آگاہی نہ ہوتی تو دشمنوں کی صولت سے اعزا اور برادروں سے تنازع برپا رہتا اسکا سکھانا

مورخین لکھتے ہیں چونکہ حضرت ابو بکر خلیفہ رسول اللہ کہلاتے تھے۔ اسلئے جب حضرت عمر خلیفہ ہوئے تو فرمایا کہ اگر لوگ
مجھے خلیفہ خلیفہ رسول اللہ کہنے لگیں گے تو یہ بڑا لمبا خطاب ہو جائیگا۔ مغیرہ بن شعبہ کھڑے
ہوئے اور بولے کہ آپ ہمارے امیر ہیں اور ہم مومن ہیں تو آپ امیر المومنین ہیں یہ تمام حاضرین اصحاب
دار الخلافہ میں کو ایسا خطاب پسند آیا اسی وقت سے آپ امیر المومنین کہلانے لگے اور خلفا آپ کے بعد آنیوالوں
سے بھی اسی لقب سے ملقب ہوتے رہے۔ تاریخ ہجری کی ابتدا ۱۶ھ میں آپکے عہد میں ہوئی ہے
پہلے آپ ہی نے تاریخ لکھی اور حضرت ابو بکر کو مصحف قرآنی کے جمع و یکجا کرنے پر آمادہ کیا تھا۔ ماہ رمضان المبارک
کو قیام لیل یعنی تراویح آپ ہی کی بدولت ہوئی۔ شریر لوگوں کے لئے دُرّہ آپ ہی نے مقرر فرمایا تھا
حضرت عمر نے تمام ممالک شام وغیرہ کو ہرقل قیصر روم کے ہاتھ سے چھینا۔ یروشلم یعنی بیت المقدس
کو سخت محاصرہ کے بعد صلحاً سنہ ۱۵ یا ۱۶ھ میں فتح کیا جسکی کنجیاں لینے کے لئے حضرت عمر کو
مدینہ سے وہاں تشریف لیجانا پڑا۔ ہجرت کے سولہویں سال مسلمان ملک عجم پر بھی مستولی ہوگئے سلطنت
کسریٰ برباد ہوئی۔ یزدجرد یعنی کسریٰ یزدجرد سے فارس لے لیا گیا کیونکہ اسلام کی ابتدائی ترقی مصر و اسکندریہ
آپکے عہد میں فتح ہوا۔ کتب خانہ اسکندریہ کے جلا دینے کی جھوٹی روایت جو معاندین حضرت عمر رضی اللہ عنہ
سے منسوب کی ہے ایک مدت تک مشہور کر رکھی تھی اب یورپین محققین نے نہایت قوی و واثق ذرائع و دلائل سے
اُس کی تردید کر دی ہے۔ آپ کے زمانہ خلافت میں شہر ... اور دریائے نیل کے درمیان نہر جاری کی گئی۔
چھتیس ہزار شہر اور قلعے مع بلاد حمص حلب۔ انطاکیہ۔ تبریز۔ آذربیجان۔ ہرات۔ جرجان وغیرہ
مسلمانوں نے فتح کئے۔ چار ہزار مساجد تعمیر کیں۔ بروایت حدائق الانوار و دیگر کتب معتبرہ آپ کی مدت خلافت
دس سال پانچ ماہ ... روز رہی۔ بڑے عادل اور منصف، صاحب عظمت، مدبر خلیفہ
تھے۔ رات کے وقت شہر کی پاسبانی فرماتے۔ کسی گھر سے گانے بجانے کی آواز آتی یا شرابیوں کا
شور و غل سنتے تو احتساب شرعی فرماتے۔ توبہ کر لیتا تو درگزر کرتے ورنہ سزا دیتے۔ ... رات کے لئے چوکیدار
مقرر کئے۔ دفتر مرتب کیا گیا۔ شہروں میں قاضی بھیجے۔ رمضان کے مہینے میں مسجدوں میں قندیلیں جلائیں
تقدیر الٰہی تھی کہ چہار شنبہ ۲۵ ذوالحجہ سنہ ۲۳ھ (۳ نومبر ۶۴۴ء) یا بروایت مجالس المومنین ۲۶ ذوالحجہ
کو ابو لؤلؤ فیروز نامی مجوسی یا یہودی غلام مغیرہ نے بحالت اشتغال نماز مسجد نبوی واقع مدینہ
منورہ میں آپ کو خنجر سے مجروح کیا۔ پھر سات اور آدمیوں کو قتل کر کے خود بھی ہلاک ہوگیا۔ حضرت
عمر نے اسکے تین دن بعد وفات پائی۔ بروایت واقدی روز یکشنبہ یکم محرم سنہ ۲۴ھ (۷ نومبر ۶۴۴ء)

بھی نہایت ہوشمندی اور انتہائے ثواب کی بات ہے حضرت شعیب علیہ السلام کی قوم کا قول یاد رکھنے کی چیز ہے۔ وہ بولی وَ لَوْلَا رَهْطُكَ لَرَجَمْنٰكَ (اور اگر تمھاری برادری کے لوگ نہ ہوتے تو ہم تم کو سنگسار کر چکے ہوتے جزء ۱۱ سورہ ہود ع ۸-۰) ظاہر ہے کہ خاندان والوں کی بدولت بچ گئے تھے۔ حضرت عمرؓ نے بھی فرمایا ہے ۔ عربیت سکھاؤ ۔ اس سے جوانمردی

کو دفن کیے گئے۔ ترسٹھ سال عمر تھی ۔ اہل ایران نے اس واقعہ کی یادگار حسن طریقہ پر قائم کی اور جشن و صدیوں سے منانے چلے آتے ہیں۔ اُس کو نامور فرنگی سیاح وارنگ Warng نے اپنے سفرنامہ شیراز ۱۸۰۲ء مین بتفصیل لکھا اور اُن کی بدعات و مراسم کو بیان کیا ہے۔ اُنھین حرکات ناپسندیدہ کو قاضی نور اللہ شوستری نے اہل کاشان سے منسوب کر کے اپنی کتاب مجالس المومنین مین میر مخدوم شریفی تبرازی کی کتاب (نواقض الروافض) کے حوالہ سے نقل کیا ہے

آپ بڑے سخن شناس اور سخنور تھے ۔لیکن احتیاط واوب کا یہ پایہ تھا کہ کوئی شخص حدود معینہ شرعیہ سے تجاوز یا کلام مین مبالغہ نہین کرنے پاتا تھا

آپ کے حالات و کرامات و عادات کو حیوٰۃ الحیوان، فوائد ابو القاسم بن بشران، کتاب العظمۃ لابی الشیخ، ریاض النضرۃ، دلائل النبوۃ لابی نعیم، شرح السنۃ للالکائی، کرامات الاولیا لابن الاعرابی، اصابۃ لحافظ ابن حجر، تلقیح فہوم الاثر لابن الجوزی، المستطرف للابشیہی نے نقل کیا ہے شاہنامہ اسلام پر جمہرد کے آغاز مین فردوسی کہتا ہے ؎

جہان شد بکام سر فراز عرب | کہ از تیغ او روز گشتے چو شب
عمر آنکہ شد مومنان را امیر | نمودہ وُرا خالق بے نظیر

۵۷ حضرت شعیبؑ انبیائے کرام اور اولاد حضرت صالح علیہ السلام سے تھے خدا کے نہایت برگزیدہ اور صالح بندے بڑے فصیح اللسان تھے۔ رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم آپکو پیغمبروں کا خطیب فرمایا ہے۔ خدائے عزوجل نے اپنے کلام پاک کے بارھوین پارے (وَمَا مِن دَآبَّةٍ) سورۂ ہود مین آپ کا ذکر خیر فرمایا ہے۔ آپ کی بددعا سے آپکی ناحدا ترس قوم پر ہلاکت اور آگ کا عذاب نازل ہوا تھا۔ مدین میں قیام تھا مصر سے نکلنے کے بعد حضرت موسےٰؑ نے آپ کی آغوش تربیت مین ۱۲ بارہ سال بسر کیے تھے اور فرعون کے تاج و تخت کو تاخت و تاراج کرنے نہین سے تشریف لے گئے تھے اس عالم فانی مین بارہ سال تک بصارت ظاہری سے محروم مگر دعوت حق اور اعلاے کلمۃ اللہ مین مشغول رہے

بڑھتی ہے اور نسب بتاؤ بہت سے ارحام ایسے مجہول تھے جو اپنے نسب کے پہچان لینے سے واصل ہو گئے۔

یاد رہے کہ عرب کی صحت نسب کی تصدیق نہ صرف نسب ناموں اور تاریخی وخاندانی روایات سے ہوتی تھی بلکہ سب سے معتبر عیار ان کی روایات وحکایات کا ان کے اشعار تھے۔ وہ اُمّی تھے اسلیے مدون آمیزش وتحریف پائے کے ان کے کلام وقصص اباً عن جدٍ محفوظ چلے آتے تھے

شرافت پر نظر مختلف پہلوؤں سے

اسلام نے علوانساب وشرف قبائل کی بزرگی وفضیلت کو دور کر کے اخلاقی زندگی کو ایک برتر وبہتر معیار قرار دیا اور اس کا مکمل نمونہ پیش کیا اور نوع بشر کی مساوات اور تمام کلمہ گویان اسلام کی سواخا کا بلا فرق مرتبت اعلان کیا ہر نسب اور سلف کا امتیاز مٹا کر صرف تقوی کو وجہ فضیلت قرار دیا اِنَّا خَلَقْنَاكُمْ مِّنْ ذَكَرٍ وَّاُنْثٰى وَجَعَلْنٰكُمْ شُعُوْبًا وَّقَبَآئِلَ لِتَعَارَفُوْا اِنَّ اَكْرَمَكُمْ عِنْدَ اللّٰهِ اَتْقٰكُمْ [ہم نے تم سب کو ایک مرد اور ایک عورت سے پیدا کیا اور پھر تمھاری ذاتین اور برادریان ٹھہرائین تاکہ ایک دوسرے کو شناخت کر سکو (ورنہ) اللہ کے نزدیک تم مین بڑا شریف وہی ہے جو تم مین بڑا پرہیزگار رہے (جزو ۲۶ سورہ الحجرات ع ۲-۱۴)]

ایک دوسرے موقع پر ارشاد ہوا ہے کہ قیامت مین نسب کا حصہ بکسر اٹھا دیا جائے گا نہ قرابت مندی کام آئے گی نہ کوئی کسی کی مدد کر سکے گا چنانچہ (جزو ۱۸ سورہ مومنون ع ۶-۷ مین) وارد ہوتا ہے فَاِذَا نُفِخَ فِی الصُّوْرِ فَلَاۤ اَنْسَابَ بَیْنَهُمْ یَوْمَئِذٍ وَّلَا یَتَسَآءَلُوْنَ [پھر جب صور پھونکا جائے گا تو اُس دن نہ تو لوگون مین رشتے داریان (باقی) رہین گی اور نہ ایک دوسرے کی بات پوچھین گے]

اپنے حبیب ورسول صلعم سے اللہ جل شانہ خطاب فرماتا ہے وَاَنْذِرْ عَشِیْرَتَكَ الْاَقْرَبِیْنَ [اور (خاص کر) اپنے قریب کے رشتہ دارون کو (عذاب خدا سے) ڈراؤ جزو ۱۹ سورۃ الشعراء ع ۱۱-۱۵]

صحیح مسلم مین ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ سرور عالم نے فرمایا مَنْ اَبْطَاَ بِهٖ عَمَلُهٗ لَمْ یُسْرِعْ

بہ نسبت (جسکے ساتھ اسکے عمل نے ویرانگی اختیار کی ہو) اس کا نسب کچھ مدد نہ کر سکے گا

انھیں پاکیزہ تعلیمات کے روشن نتائج وہ اوصاف حمیدہ اور اخلاق حسنہ تھے جو جماعت اسلامی کے ایک ایک فرد میں نظر آنے لگے

یہ صحیح ہے کہ بارگاہ خداوندی میں کوئی لحاظ انساب وخاندان واقوام وقبائل کا نہیں رکھا گیا ہے وہاں دولت وافلاس آزادی وغلامی، رنگ اور روپ، ملک وزبان کی پرستش نہ ہوگی - وہاں جنس گرانمایہ متاع اور کمیاب جنس کی قدر ہوگی وہ فقط وہی تقویٰ ہے لیکن اس کے ساتھ سرور دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم اور اکابر ملت وائمہ دین کی اولاد امجاد وآل اطہار کے دنیوی اعزاز اور اخروی احترام کو نظر انداز نہیں کیا جا سکتا - امامت وخدمات شرعیہ کی انجام دہی کے لئے بھی اچھے نسب والے مستحق اشخاص کو ترجیح دی گئی ہے یعنی امام کے لئے لازم کر دیا ہے کہ حسب ترتیب افضل در نسب اشرف ہو

نماز کی امامت کے بارہ میں جو حقیقتاً نیابت رسالت ہے فقہائے اسلام کا متفقہ فتویٰ یہ ہے

الاولیٰ بالامامة الاعلم بالسنة ثم الاقرء ثم الاورع ثم الاسن ثم الاحسن خلقا ثم الاشرف نسبا ثم الاصبح وجها ثم الاحسن صوتا ثم الانقی ثوبا

اتقیٰ اُسکو کہتے ہیں جو حرام سے بچتا ہو مگر جو شخص شبہات حرام سے بھی پرہیز کرے وہ اورع ہے اور اُسکا درجہ اتقیٰ سے بالاتر - اسلئے احکام سنت کے جاننے تجوید وقرأت کی واقفیت اور قرآن مجید کے یاد رکھنے اور خدا ترسی اور اخلاق پسندیدہ میں بھی جب لوگ برابر ہوں تو جو زیادہ عمر رسیدہ ہو امامت کے لئے اُسکو ترجیح وفضیلت حاصل ہوگی اگر سن میں بھی مساوی ہوں تو جو شخص نسب میں سب سے زیادہ شریف ہو وہی امام مقرر ہوگا - توجیہ کی ضرورت نہیں یہ اصل کہ فضائل مخصوص ذاتی ہیں جو انسان کی ذات سے جدا نہیں ہو سکتے یعنی فضائل خلقیہ صریح مقدم ہوں گے بہ نسبت فضائل خلقی، ان میں نسبی شرافت کے سبب سے تفوق وبرتری ملحوظ رہے گی علمائے کرام شریف النسب کو امام بنانے کی وجہ بتاتے ہیں لاحترامه وتعظيمه یہ بھی محتاج دلیل نہیں کہ شریف النسب

شخص سب لوگوں کی نظروں میں محترم اور معظم ہوتا ہے اسی لئے منصب امامت جو ایک مکرم اور معزز عہدہ ہے عموماً انکے سپرد ہوتا ہے تاکہ امر جماعت کی تمکین و وقار کا باعث ہو۔

جیسا امام علی رضا رضی اللہ تعالیٰ عنہ کا یہ قول فصل الخطاب میں مرقوم ہے کہ ہم میں سے جو کوئی نیکی کرے وہ دونا ثواب پائے گا۔ اسی طرح جو بدی کرے اسکو عذاب بھی دونا ہوگا۔ ہم میں سے جو کوئی خدا کی بندگی نہ کرے وہ ہم میں داخل ہی نہیں ہے اے مخاطب جب تک تو اطاعت الٰہی نہ کرے گا ہم اہل بیت رسول میں شمار نہ ہوگا۔ کسی نے امام ہمام سے عرض کی کہ آپ خدا کی قسم سب سے بہترین اولاد آدم ہیں۔ فرمایا کہ اے شخص ہرگز قسم نہ کھا جو کوئی زیادہ پرہیزگار اور خدا تعالیٰ کی اطاعت و بندگی کرنے والا ہے وہ مجھ سے بھی بہتر اور زیادہ اچھا ہے۔ خدا کی قسم کھاتا ہوں کہ یہ آیت منسوخ نہیں ہوئی ہے ان اکرمکم عند اللہ اتقٰکم۔ کسی نے امام علی نقی سے کہا کہ روئے زمین پر کوئی شخص باپ دادا کے لحاظ سے آپ سے زیادہ فضیلت نہیں رکھتا۔ فرمایا کہ ہمارے آبا کو تو بھی تقویٰ ہی نے شرف بخشا ہوا تھا۔

عموم فضائل کے اعتبار سے ایک گروہ بزرگی و شرف کا مستحق صرف ان لوگوں کو سمجھتا ہے جن سے جماعت الصافی لفظ پہنچے خیر الناس من ینفع الناس۔ بنا بریں خلیفہ ہارون الرشید عباسی کا عقیدہ تھا کہ بنی آدم میں سب سے بہتر وہ ہے جو اہل علم و فضل میں ہے یا جنکے ہاتھ سے خلق کو لازوال منفعت و برکت پہنچتی رہتی ہے جن کے نفوس نے اپنی سعی استطاعت کو اپنے ہی نوع کے سود و بہبود کے لئے وقف کر رکھا ہے

ایک دوسری جماعت اگرچہ تمام افراد فضائل اور بہترین فضائل کی معتقد ہے مگر سادات کو باقی سب سے اس بنا پر افضل سمجھتی ہے کہ ان کی اولاد کو آپ ہی بشارت (اسکے ساتھ لئے یا شان) قرآن حزب ۸ سورۃ الطور ع ۱۳ انہیں کے لئے نازل ہوئی ہے جیسا انبیاء علیہم السلام اور العلی الشافی اور الاعین حدیث نبوی ان اللہ جعل ذریۃ کل نبی فی صلبہ وجعل ذریتی فی صلب علی بن ابی طالب۔ بیشک خدائے عزوجل نے ہر ایک نبی کی ذریت اسی کی پشت سے قرار دی درحالیکہ میری ذریت علی بن ابی طالب کی پشت سے پیدا کی۔

والبداہتہ اور مناقب السادات مین منقول ہو کہ بنی فاطمہ کے سوا اور کسی طبقہ کی شرافت نسبی پر اہل حق کا اجماع نہین ہو۔ انکا فضل و شرف تمام قبائل پر مجمع علیہ اور متفقاً مسلّم ہے محمد بن سیرین کہتے ہین کہ آیۂ کریمہ وَهُوَ الَّذِي خَلَقَ مِنَ الْمَاءِ بَشَرًا فَجَعَلَهُ نَسَبًا وَصِهْرًا [اور وہی قادر مطلق) ہے جسنے پانی سے آدمی کو پیدا کیا۔ پھر اُسکو کسی کا بیٹا بیٹی اور کسی کا داماد بہو بنا ۔ جز ۱۹ سورۃ الفرقان ع ۵-۳] نسب و صہر سے مراد خود حضرت اور علی ہین جو ابن عم نبی اور زوج فاطمہ بنت الرسول تھے محاضرۃ الابرار و مسامرۃ الاخیار مین شیخ اکبر محی الدین محمد بن عربی نے ابن عباس سے نقل فرمایا ہو کہ آیت يُوفُونَ بِالنَّذْرِ وَيَخَافُونَ يَوْمًا كَانَ شَرُّهُ مُسْتَطِيرًا (یہ جو منتین پوری کرتے ہین

---

۵۷۵ اہل سنت وجماعت کے یہان نسب و صہر سے مراد علی و فاطمہ ہونے کیلئے کوئی حدیث اس ہیچمدان کی نظر سے نہیں گذری مگر یہ قول متفقاً مسلمانون کی ایک جماعت یعنی اکابر مفسرین اہل التشیع کا ہے اور خازن وغیرہ نے اس کو نقل کیا ہے

[شیخ علاء الدین بن علی بن محمد بن ابراہیم بغدادی صوفی معروف بہ خازن کو تفسیر اللباب فی معانی التنزیل کی تالیف سے چہارشنبہ دسوین رمضان ۷۲۵ھ (۱۲ اگست ۱۳۲۵ء) کو فراغت ہوئی تھی ۔ خود لکھتے ہین کہ امام بغوی محی السنہ ابو محمد حسین بن مسعود فراء شافعی (متوفی ۵۱۶ھ) کی تفسیر معالم التنزیل ہر وجوہ مکمل اور متصف بہ جمیع اوصاف حمیدہ تھی مگر اسکی طوالت اُسکے استفادۂ کامل سے مانع رہتی تھی ۔ لہذا اسکی تلخیص و مختصر کر دی گئی اور بعض فوائد مثل شرح غریب وغیرہ کے اپنی طرف سے اضافہ کر دیئے بحذف اسناد احادیث کا ایراد کیا گیا ۔ اسکی دو باتین قابل گرفت ہین ایک مسائل وغیرہ فقہیہ کی تکثیر ۔ اسکو محدثین صاحب اصلی سے زیادہ پاتے ہین ۔ دوسرے قصص کا مدون تصحیح و تضعیف ایراد جسکی وجہ سے کتاب بڑھ گئی ہے ۔ مصر مین چار جلدمین چھپی ہے ۔ واضح رہے کہ خازن کے بعد شیخ تاج الدین ابو نصر عبد الوہاب بن محمد حسینی (متوفی ۸۷۵ھ) نے بھی اسی تفسیر بغوی کا اختصار کیا تھا ۔]

۵۷۶ اوحد الموحدین محی الدین محمد بن علی العربی الطائی الحاتمی الاندلسی خاندان حاتم طائی سے تھے آپ کی سی جامعیت علوم و فضائل و کمالات والے بزرگ دنیا مین بہت کم پیدا ہوے ہین ۔ آپ کے خرقہ کی نسبت حضرت خضر تک ایک واسطہ سے پہونچتی ہے ۔ شاعر بھی تھے ۔ مدائح اہل بیت مین آپکے اشعار کتاب الاحیا مین موجود ہین ۔ حضرت شیخ وحدت وجود کے قائل اور شہود کے طرف کرنے والے تھے ۔ باوجود سیوست فقیہانہ شیخ علاء الدولہ سمنانی نے فتوحات کے بہت سے

اور اُس روز سے ڈرتے ہین جسکی مصیبت پھیلی ہوئی ہوگی جز ۲۹ سورۃ الدہر ع ۱-۹ اعلیٰ و فاطمہ
کے حق مین اتری ہے۔

ایسے دستریات النسب حضرات کی تکریم و تبجیل اسلام کے اصول مساوات کے بھی منافی نہین
ہوسکتی - بے شبہ احکام الٰہیہ و شرعیہ خواہ عبادات سے متعلق ہوں خواہ معاملات و معاشرات سے
ان کا عمل و اتباع تمام مسلمانون پر یکسان واجب و لازم ہے - جسکے لئے استثنار کی کوئی صورت نہین

جوانی مین شیخ کی بزرگی کا اقرار و اعتراف فرمایا ہے اور ایہا المدقق، ایہا المقرب ایہا الولی،
ایہا العارف الحقانی کہکر خطاب کیا ہے علاء الدولہ کی اور تصانیف مین بھی یہی حق پسندی انصاف
کوشی کیفیت شیخ ابن عربی کی نسبت نظر آتی ہے وہ رسالہ اقبالیہ مین لکھتے ہین کہ شیخ سعدالدین حموی سے
پوچھا گیا کہ شیخ محی الدین عربی کو کیسا پایا - فرمایا بحرٌ مَوَّاجٌ لَا نِہَایَۃَ لَہٗ یافعی نے آپکے مدائح مین
شیخ عزالدین عبدالسلام بہشتی وغیرہ کے بہت سے اقوال نقل کئے ہین

اس معنی مین کہ ابن عربی نے حضرت حق کو وجود مطلق بتایا ہے - اکثر اہل ظواہر آپکی خطا سمجھتے ہین
ولیس ھذا اول قارورۃ کسرت فی الاسلام اسی لئے ایک بڑی جماعت علمائے شام کی ان کی تکفیر
و تضلیل پر مائل ہے تعالی اللہ عن ذلک علوا کبیرا [اصطلاح صوفیہ مین شطحیات ایسے ہی اقوال
کا نام ہے جو ظاہر العقائد اسلام اور شریعت بیضا کے موافق نہون - اگرچہ ایسے کلمات مستی و ذوق مین
بے اختیار نکل گئے ہون اسی لئے منصور کے مقولے انا الحق اور جنید کے لیس فی جبتی سوی اللہ کہنے
اور بایزید کے سبحانی ما اعظم شانی کہنے پر اعتراض کیا جاتا ہے - معدن المعانی مین تحریر ہے
کہ مشائخ ایسے کلمات خلاف شرع کو تمامے ہین رد کرتے ہین]

اکابر شیعہ بھی شیخ کو بڑی عظمت و احترام سے یاد کرتے ہین صاحب مجالس وغیرہ نے ہر جگہ "شیخ اعظم
قدس اللہ سرہ" لکھا ہے

عرصۂ عالم مین ۱۷ رمضان ۵۶۰ھ (۷ ارمی ۱۱۶۵ء) کو قدم رکھا جوار قدس کو بتاریخ جمعہ ۲۲ ربیع الآخر ۶۳۸ھ
(۱۳ نومبر ۱۲۴۰ء) مین رونق بخشی - قبر ظاہر دمشق کے ایک موضع مین ہے جو صالحیہ سے موسوم و مشہور ہے۔
بعض مورخین نے سال ولادت ۵۶۱ھ (۱۱۶۶ء) اور سال وفات ۶۳۰ھ (۱۲۳۲ء) تحریر کیا ہے

تصانیف عالیہ (۱) فتوحات مکیہ (۲) فصوص الحکم (۳) رسالہ عقیدہ (۴) کتاب الاحیار (۵)
محاضرات و مسامرات وغیرہ ہین شیخ نے ایک بڑی تفسیر اہل تصوف کے طریقے پر لکھی تھی جو تفسیر ابن عربی کہلاتی
ہے - اسکی ساٹھ جلدین تھین اور صرف سورہ کہف تک پہنچنے پائی تھی - ایک دوسری تفسیر جو تفسیر صغیر کے

کسی بزرگ یا اشراف کی اولاد ان احکام کی پابندی سے معاف و مستثنیٰ ہو سکتی ہو۔ اسی طرح جو بھیانک
شرع میں ان سے باز رہنا بھی ہر مسلمان پر معروف للنسب یا الحسب سے مستثنیٰ بات ہو ... تمام
کے لئے جو سزا مقرر ہے دونوں پر یکساں عائد ہوگی

لیکن اس کے معنی یہ نہیں ہو سکتے کہ اہل بیت کبار و آل اطہار یا بزرگان دین کی اولاد
سے ... حضرت ... کی تحقیر میں ان کے ساتھ عوام الناس کا برتاؤ و سلوک کیا جائے ... خیال ...

نام سے مشہور ہے۔ آنحضرت ... کے احادیث ... کی ترتیب دی گئی تھی

ان اقتباسات ... ایک شیخ محی الدین عربی ... تصوف ... کے ... بزرگ شیخ ... یافتی تھے ... لوائح اور ... الارواح کی ... ہیں اور جن کی روحانی یادگار دستگرد تاج السالکین شیخ ... الدین ... احمد ... کے ... مشہور ...

مشائخ اہل ہند سے ... بزرگ اور بھی قابل ذکر ہیں جنہوں نے شیخ اکبر کے اقوال و ارشادات احیاء ... ان کی تصانیف و کتب کے مطالعہ و تشریح پر ... عظیم فرمایا ہے۔

۱ مولانا شیخ عبدالرشید جونپوری ... صاحب ... کتاب ... (مصنف شیخ اکبر) ترجمہ ... کلام شیخ (یہ ترجمہ الحکم المربوطہ کے نام سے مشہور ہے)

۲ حضرت مولانا شیخ محب اللہ الٰہ آبادی مصنف رسالہ تسویہ (متوفیٰ ...) اور شارح فصوص بزبان فارسی

۳ مولانا نورالدین بن شیخ محمد صالح احمد آبادی صاحب الطریق الامم شرح فصوص الحکم

۴ شیخ محمد حسین کلیم جنہوں نے ... صدی کے آخر میں فصوص کا ترجمہ ہندی زبان میں کیا تھا

۵ شیخ محمد علی حزیں اصفہانی نژاد و بنارس مدفن نے بھی شیخ اکبر کے اقوال و تحریرات سے استفادہ کیا تھا۔ لکھتے ہیں "آنچہ از شیخ ابن عربی رحمہ اللہ در فصوص و دیگر کتاب فصوص الحکم ذکر کردہ مرا محقق و معلوم شدہ و آخر مرحلے ... کلام ... است امر"

شرق پسندان یورپ کی شیخ کو تکریم و تعظیم ... تفسیر ... وغیرہ کا ادب و احترام مناسب موقع پر ذکر کیا گیا
ہسپانیہ کا مشہور فاضل ... میڈرڈ یونیورسٹی میں عربی زبان و ادب کا استاد علوم اسلامیہ کا
ماہر و محقق پادری آسین Rev Miguel Asin اپنی تازہ تالیف Islam and the Divine Comedy میں لکھتا ہے کہ یورپ کا قرون وسطیٰ کا مسلم الثبوت دانشمند ریمانڈ لل Raymond Lull مسلمان علماء و حکماء کی تحقیقات اور فلسفیانہ تخیلات سے زیادہ مستفید و متمتع ہوا ... لل کی زبان قلم سے جو کچھ نکلا ہے شیخ اکبر ابن عربی کی تعلیمات کا اثر نظر آتا ہے۔ دانتے Dante of Florence (Italy) جو فلارنس (واقع اٹلی) کا نامور شاعر تھا اور جس کا درجہ باعتبار کمال و کلام یورپ میں دوسرا

کہ یہ وہی گروہ پاک ہے جسکی شان میں حق سبحانہ وتعالیٰ ارشاد فرما چکا ہے قُلْ لَّآ اَسْـَٔلُكُمْ عَلَيْهِ اَجْرًا اِلَّا الْمَوَدَّةَ فِي الْقُرْبٰى اے رسول کریم امت مرحومہ سے فرما دیجئے کہ میں تم سے اس تبلیغ احکام الٰہی و تعلیم اخلاق اسلامی کا کوئی عوض نہیں چاہتا مگر یہ کہ تم میرے قرابت داروں سے محبت ومودت رکھنا (ترجمہ سورۃ شوریٰ پ ۲۵ ع ۳)

یہ تفسیر صرف شیعوں ہی کی نہیں بلکہ اسکو قاضی بیضاوی نے بھی نقل کیا ہے (روی انّہا لما نزلت قیل یا رسول اللہ من قرابتک ہؤلاء الذین وجبت علینا مودتہم قال علی وفاطمہ وابناھما (صفحہ ۲۳۶ جلد ۲ تفسیر انوار التنزیل مطبوعہ مصر) اور اسکے بعد کی آیت کو حضرت ابوبکر کی شان میں بتایا ہے۔ نواب صدیق حسن خان فتح البیان میں لکھتے ہیں کہ جب یہ آیت اتری قل لا اسئلکم تو حضرت سے پوچھا گیا کہ آپ کی وہ کون قرابت ہے جنکی مودت ہم پر واجب ہے فرمایا علی وفاطمہ وابناھما

قرآن مجید کی کوئی تفسیر احادیث پاک سے زیادہ صحیح و مستند نہیں ہو سکتی۔ اسلئے جلال الدین سیوطی رحمہ اللہ تعالیٰ کے رسالہ احیاء المیت سے دو حدیثیں نقل کی جاتی ہیں

اول۔ اخرج سعید بن منصور فی سننہ عن سعید بن جبیر فی قولہ تعالیٰ قل لا

یعنی ہومر کے بعد مانا جاتا ہے۔ اسکی نسبت اسپین کا دعویٰ ہے کہ دانتے نے ایک فلسفی متصوف کے عالم افلاک پر جانے اور سیر کرنے اور دوزخ کے احوال مطلع ہونے کے احوال جنت کے تذکرے اور سیر کے متعلق جو کچھ لکھا ہے وہ اسلامی روایات متعلق معراج نبوی اور سیر عرش و کرسی کی ایک نقل ہے۔ اس تمام حالات و تخیلات کو نہایت ہی سلاست سے علیس ال ستیر شیخ اکبر نے اپنی تقریر و تحریر سے عیاں کیا تھا۔ ان ہی کی تمام ترتیبات و ترکیبات دانتے کی نظم میں جلوہ گر ہیں

افادہ — یہ ان کا رسالہ حی بن یقظان حکیم روشن خیال کا ہے جو اسپین کے ایک مشہور فلسفی کا نام تھا جو ۱۲۳۵ء میں پیدا ہوا اور ۱۲۰۱ء میں رخصت ہو گیا

۲ — اس شاعر کی ولادت کا سال ۱۲۶۵ء اور وفات کا ۱۳۲۱ء ہے

۳ گروہ مخالف سے بھی ایک صاحب تصنیف قابل تذکرہ ہیں۔ محمد طاہر بن محمد حسین الشیرازی النجفی القمی جو گیارھویں صدی ہجری کے مشاہیر اہل علم و مصنفین سے تھا ایک کتاب تحفۃ الاخیار قصیدہ مؤنس الابرار

اسئالکم علیہ اجراً الا المودۃ فی القربیٰ قال قربیٰ رسول اللہ صلی اللہ علیہ والہ وسلم

ثانی اخرج ابن المنذر وابن ابی حاتم وابن مردویہ فی تفاسیرھم والطبرانی فی المعجم الکبیر عن ابن عباس قال لما نزلت ھذہ الآیۃ قل لا اسئلکم علیہ اجراً الا المودۃ فی القربیٰ قالوا یا رسول اللہ من قرابتک ھؤلاء الذین وجبت علینا مودتھم۔ قال علی وفاطمہ وولدھا

مودت قرابت اور محبت آل محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم میں اور بھی حدیثیں موجود ہیں

ثالث۔ اخرج ابن ابی حاتم عن ابن عباس فی قولہ تعالیٰ ومن یقترف حسنۃ قال المودۃ لآل محمد

رابع۔ اخرج احمد والترمذی وصححہ والنسائی والحاکم عن المطلب بن ربیعۃ قال قال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم واللہ لا یدخل قلب امرئ مسلم ایمان حتی یحبکم للہ ولقرابتی

بزرگان دین رحمہم اللہ اجمعین کے اقوال وارشادات بھی اس بارہ میں قابل عمل وتقلید ہیں

امام شعرانی منن کبری میں لکھتے ہیں ومما من اللہ بہ علی محبتی للشرفاء واھل البیت ولو من قبل الام فقط ولو کانوا علی غیر قدم الاستقامۃ لانھم بیقین یحبون اللہ ورسولہ ومن احب اللہ ورسولہ لا ینبغی بغضہ ولا سبّہ الی قولہ ولا یلزم من اقامۃ الحدود علی الشرفاء انا نبغضھم بل اقامتنا الحد علیھم انما ھو محبۃ فیھم ولتطھیر لھم

شیخ اکبر ابن عربی فرماتے ہیں کہ ذنوب اہل بیت صورتاً ذنوب ہیں حقیقتاً نہیں۔ اللہ جل شانہ نے بسابقۂ عنایت انکے گناہ معاف فرما دیئے ہیں جسکی دلیل آیۂ تطہیر موجود ہے۔ اور ذنوب سے بڑھکر

کی شرح میں لکھی تھی۔ اس میں تصوف اور اصول تصوف اور مشائخ اکابر صوفیہ پر نہایت زبردست حملے کئے ہیں جناب شیخ کی شان بھی اسکی گستاخی اور زبان درازی سے محفوظ نہیں رہی۔ آغاز یوں ہوتا ہے

سجل دیدہ نوشتیم بر در و دیوار   کہ چشم مردمی از اہل روزگار مدار

ص ۲ رکھتا اور عظمت کرتا تھا۔ ان کا کلام زیادہ تر فتوحات، الکنہ، المحکم المربوط، الدرۃ الفاخرۃ، مطالع النجوم وغیرہ میں میری نگاہ سے گزرا تھا۔ لیکن ان کے مقصود کی حقیقت پر مجھے بعد کو اطلاع و آگاہی ہوئی تو پھر میں نے فصوص وغیرہ کا مطالعہ نہیں کیا۔

کوئی ہرج نہیں ہے۔ ان سے اگر ہمکو کچھ ایذا پہونچے تو ہم پر واجب ہے کہ ہم اسکو مقادیر الٰہیہ کے شنبیہ مثلاً مرض وغیرہ سمجھ کر راضی رہیں اور صبر کریں۔ اگر وہ ہمارا مال چھین لیں اور ہمکو بدین تو ہمکو شایان ہے کہ انکو حبس نہ کریں یا اُن کے مقدمہ کو حکام تک نہ پہونچائیں۔ اسلئے کہ یہ بضعۂ رسول ہیں

سادات

سلامٌ علیٰ آلِ طٰہٰ ویٰسٓ سلامٌ علیٰ آلِ خیرِ النّبییّن

سادات کرام کے متعلق اس ہیچمیرز ہیچ مدان کا عزم کچھ زیادہ لکھنے کا تھا جسکی معلومات بقدر مقدور حاصل ہیں اہل البیت اور بہی ماقیہ مریدان وغیرہ کتابیں قلمی بھی مہیا ہیں یہ ناچیز متشکر نعمت بھی انھیں ہادیان حق اور ائمہ دین رضوان اللہ علیہم اجمعین کا نام لیوا ہے۔ انھیں کی بدولت فقر کی نعمت اور دنیا کی سلطنت ہمارا حق ہے اور ہمارے جد اور اجداد کا ورثہ۔ ائمہ اثنا عشر میں سے سات امام اباً عن جدٍ میرے نسب میں داخل و شامل ہیں جد اعلیٰ علیہ وعلیٰ آلہ التحیۃ والثنا ہندوستان میں مشہد اقدس سے آئے تھے۔

سلامٌ علیٰ روضۃٍ حلّ فیہا اِمامٌ یُباہی بہِ المُلکُ والدِّینُ

نمبر۵ مشہد مقدس رضوی، نیشاپور سے دس فرسخ پر واقع ہے جو نیشاپور، خراسان کا دارالملک اور مدینۃ العلم رہا ہے اور اپنی قدامت اور بزرگی کے لحاظ سے اُس مرزبوم خیر خطہ کا اُمّ البلاد سمجھا جاتا ہے۔ ایران کے قدیم شہر یا قریہ سناباد یا سناق نام، توابع طوس کے ویرانہ پر مشہد کی بنیاد پڑی تھی ہارون کے گورنر حمید بن قحطبہ نے عظیم الشان محل اور مکانات سائے پُر فضا باغ لگایا۔ ہارون نے جب اسی سرزمین پر اس عالم آب وگل کو خیرباد کہا تو اسی ایوان حمیدی کا صحن اُس کا آرام گاہ اخیر قرار پایا مامون الرشید نے اس بُرقعہ کو روضہ بنوایا جب ۲۰۳ھ [illegible] میں امام ہمام نے اس بہشت گاہ قدس میں قدم رکھا اور اس قطعہ خاک کو مرقد پاک کہلانے کا شرف حاصل ہوا تو مشہد قلیل مدت میں خراسان کے اعاظم بلاد سے ہوگیا حتی کہ اُسنے خود طوس کی رونق و شہرت کو منسوخ بلکہ مندرس و معدوم کردیا۔ مضجع منور کی برکت اور سادات رفیع الدرجات موسوی و رضوی کے شرف قدوم و ظل عاطفت سے وہاں کے باشندے اور آستانہ والا کے مجاور، فراغ و فلاح کیساتھ بسر کرنے لگے۔ امیر سبکتگین نے اسکو ویران

اور امام ثامن ابو الحسن علی رضا ابن موسیٰ کاظم علیہما السلام

امام بحق شاہ مطلق کہ آمد — حریم درش قبلہ گاہ سلاطین
شہ کاخ عرفان گل باغ احسان — دُرِ درجِ امکان مہ برج تمکین
علی بن موسیٰ الرضا کز خدایش — رضا شد لقب چون رضا بودش آئین

ویران و تباہ کیا یہ خرابی و بربادی کچھ سال تک قائم رہی سلطان محمود غزنوی نے اسکی آبادی پر توجہ کی اور پھر رونق بڑھی سلطان سنجر سلجوقی کے عہد میں شرف الدین قمی نے اسکی رونق کو اور ترقی دی مگر تاتاریوں نے تباہ کیا اور جو شہر حول بہانے والے حملوں سے پھر برباد ہوا مغلوں کے عہد میں یہ پھر سنبھلا ہلاکو خان کے پوتے سلطان غازان نے تعمیر کی اسکی سلامتی و تجدید کی ابن بطوطہ ۷۳۴ھ (۱۳۳۳ء) میں طوس سے گذرا تھا اپنے سفرنامہ میں عمارات و آبادی شہر کا حال لکھا ہے اسکے بعد سے اس کی آبادی ترقی پر رہی ہوتی رہی حتیٰ کہ سلطان مرزا شاہرخ گورگانی نے ۸۲۱ھ (۱۴۱۸ء) میں یہاں متعدد عمارات سوائے حرم کے بنوائیں اور مشہد کی رونق و رواج حد کمال پر پہنچ گئی اور اسکی عظمت رہی اور دولت و ثروت کا شہر اطراف و اکناف میں پھیل گیا ۱۵۸۹ء (۹۹۷ھ) میں ازبکوں نے اس پر دفعۃً حملہ کیا اور شہر میں قتل عام کر ڈالا ملا عبد اللہ حلبی طوسی نے اُن کا استیصال کیا چنانچہ صفوی سلطان عباس خان کو اسکے حملے کے جواب میں لکھا تھا۔

مشہد درست ماہ ربیع الاول — بنا کرد خود مسجد و خانقاہ
بعطیم و تکریم ہشتم امام — علی ابن موسیٰ علیہ السلام
طواف درش ہست بقول رسول — برابر بہ ہفتاد حج قبول
تو کردی چنین روضۂ اطہرے — رسول خدا راعہ تو کی جوابے
مُدّنیا شر کار و بار روزگار — تقاضی شدہ بے نامۂ شرع [illegible]

صفویوں کے ضعف اور زوال پر ۱۱۳۵ھ (۱۷۲۳ء) میں نادر شاہ نے ملک کا مالک ہوا جہاں ہو گیا وہ قتل ہوا تو اسکا بھتیجا علی قلی خان ۱۱۶۰ھ (۱۷۴۷ء) میں قابض ہوا ۱۱۶۱ھ میں نے شاہرخ کو اندھا کر کے مشہد سے اخراج کیا۔ کچھ عرصہ تک طوائف الملوکی رہی تیرھویں صدی ہجری کی ابتدا میں قاچاریوں کا علم تسلط بلند ہوا اور اس وقت سے مشہد کی رونق و ترقی کی کیفیت تقریباً یکساں رفتار کے ساتھ قائم اور باقی ہے

مشہد کے تاریخی حالات نزہۃ القلوب، زینۃ المجالس، مجالس المومنین، ہفت اقلیم، ریاض الجنۃ اور جام جم میں بہ تفصیل ملتے تھے لیکن صنیع الدولہ محمد حسن خان نے اپنی تحقیق و تفحص کو انتہا تک پہنچا دیا

کے آل عترت ہونے کا شرف رکھتے تھے مگر یہ خیال دامنگیر ہوا کہ اُن کی شرافت و نجابت (جو عالم اسلامی میں آفتاب سے زیادہ روشن ہے) کی حقیقی و واقعی تعریف بھی کہیں اپنی خودستائی اور نیاکان سرائی

اور سنہ ۱۳۰۳ھ (۱۸۸۶ء) میں تاریخ "مشہد خراسان" کے نام سے دو ضخیم جلدیں مرتب کرکے قدر شناسان علم و ادب کے نذر کیں۔

یورپ کے نامور مورخین اور سیاحین میں سے "الوی"، "جورج ناتھینل کرزن"، "سرجان میلکم"، "سائکس"، "ونیل کیسر"، "سوکوبی" اور "میسیو دیپرے" یہاں کے حالات تاریخی، جغرافیائی اور اقتصادی لائق قدر مقالہ و تحریر فرماتے ہیں۔ مسٹر فریزر ایک انگریز سیاح گذشتہ صدی عیسوی کے وسط میں یہاں آیا تھا۔ بعض مصالح کے اقتصادیات و سیاسی ضرورتوں سے اسنے لیے اسلام کا اظہار بھی کر دیا تھا جس سے ہر حلقہ و جماعت میں اُسنے رسوخ و رسائی پیدا کرکے کامل واقفیت و آگاہی حاصل کرلی تھی۔ اسی عصر میں ایک روسی عالم "نیکولا خانیکوف" اسطرف آیا اور معلومات و تحقیقات کا ایک قابل قدر ذخیرہ فراہم کرکے اہل عالم کو تو بدلقادے گیا

مشہد اقدس (زنگاہس) ایک مربع عمارت عین وسط شہر میں ہے۔ ضریح مبارک دس ذراع مربع ہوگی۔ قبہ بیس ذراع بلند ہے۔ اسکے احاطہ یا چہار دیواری میں بارہ دروازے ہیں۔ ان دروازوں پر بہت سی آیات شریفہ و احادیث کریمہ نبویہ و کلمات علیہ و اشعار عربی و فارسی لکھے ہوئے ہیں۔ بعض دروازے سونے کے پتروں سے اور بعض چاندی کے اوراق سے مڈھے ہوئے ہیں۔ نہایت روشن اور درخشان سونے سے قبہ کی تلمیع کی گئی ہے۔ اسکی زیارت کیلئے سنہ ۱۰۱۰ھ (۱۶۰۱ء) میں شاہ عباس اعظم نہایت خلوص عقیدت کے ساتھ دارالسلطنت اصفہان سے چلکر یہاں آیا تھا اُسی کے حکم سے قبہ کی تزیین و تذہیب کی گئی جو چھ برس میں تکمیل کو پہونچی اس قبہ پر بھی بہت سی عبارات عربی میں تحریر ہیں۔ سنہ ۱۰۸۴ھ (۱۶۷۳ء) کے زلزلہ سے جب اس عمارت کو صدمہ پہونچا تو شاہ سلیمان صفوی نے سنہ ۱۰۸۶ھ (۱۶۷۵ء) میں اسکی مرمت درستی اور قبہ پر طلاکاری کرادی جو ابتک نظر کو خیرہ کرتی ہے

ضریح شریف میں متعدد طاقچے ہیں۔ سب سے پہلا اور بڑا فولاد کا ہے۔ باقی رکھی ہیں یہ تیل پر گہرا سنہرا کام کیا گیا ہے۔ ان میں کثیر التعداد بیش بہا جواہر کامل صیانت و حفاظت کے ساتھ رکھے ہیں

مشہد مبارک کے اندر مختلف مقامات میں بہت سے کتبے ہیں سب عربی زبان میں ہیں۔ بعض محرابوں کے پاس کے خط کوفی میں ہیں بعض طغریٰ لکھے ہیں بعض خوب قلم اور اعلیٰ خطاطی کا نمونہ ہیں۔ بلحاظ قدامت و لحن سالے بعض ساتویں صدی ہجری تک کے ہیں۔ یہ نہایت سبق آموز اور اسلام کی پاک اور مقبول تعلیمات اور رب الارض و السموات کے احکام و ارشادات کا اقتباس ہیں۔ ایک موقع پر پوری سورۂ توحید نہایت خفی قلم سے سنہ ۶۱۳ھ (۱۲۱۶ء) کی لکھی ہوئی ہے۔

محمول نہ کی جاے۔ اسی اندیشہ سے شبدیز ہمت نے قدم اور دست قدرت نے قلم روک لیا۔ اہل نظر جانتے ہین کہ وہ کون سی روایات اور واقعات ہین جو ان کے مدائح و احوال مین علمائے اعلام نے

مشہد کی عمارات کے مقابل و اطراف مین متعدد عمارات واقع ہین

(۱) دار الحفاظ، ایک بلند مربع عمارت ہے۔ اسمین کاشانی پتھر کی چوڑی چوڑی گوناگون اینٹون کا فرش ہے (شاہرخ مرزا امیر ہرات و خراسان کی بیگم) ملکہ گوہر شاد نے اسکو تعمیر کرایا تھا۔ چند شاہان ایران اور امراء و وزراء بھی یہان راحت گزین ہین

(۲) دار السیادۃ یہ مستطیل عمارت بھی اسی درۃ التاج امارت کی یادگار ہے۔ زلزلہ سے اسکو بھی نقصان پہونچا تھا مگر شاہ سلیمان صفوی کے حکم سے فوراً مرمت و درستی کردیگئی۔ آب شیرین و خنک کی ایک نہر اس عمارت کے اندر روان ہے۔ دیوارون پر اکثر اشعار فارسی مندرج ہین جو بہت کتنے قدیم ہین۔ اس عمارت کی تاسیس چھٹی صدی میں ہوئی تھی۔

(۳) قبۃ اللہ یار خان مختلف الالوان اور بدیع الصنائع احجار کی بہایت مستحکم و منیع اور شاندار و رفیع مشہور آفاق عمارت، وضع مین ہشت پہلو ہے۔ اندرونی حصہ میں آٹھ صفین ہین۔ ائمہ اثناعشر علیہم التحیۃ والثنا کی تواریخ ولادت و وفات اسمین مندرج ہین۔ احادیث ماثورہ اور اشعار فارسی بھی ما فراط نقوش ہین۔ دائرہ بالائی مین سورۂ جمعہ و دیگر سور قرآنی مکتوب ہین۔

(۴) مشہد مبارک کے شمال مین ایک نہایت قدیم اور وسیع و فراخ صحن، سلاطین صفویہ کی یادگار ہے ایک صحن جدید، فتح علی شاہ قاچار کے عہد کا ہے۔ اس کا فرش سنگ رخام کا ہے۔ دیوار نہایت پر تکلف اور خوشنما کاشانی پتھرون سے مستور ہے

(۵) گوہر شاد کے آثار باقیہ مین ایک مسجد بھی ہے۔ یہ عمارت ایسی خوبی و دلکشی و حسن و جمال، استواری و استحکام مین نظیر نہین رکھتی مختلف رنگ اور وضع کے کاشانی پتھر اسمین لگے ہین۔ قبہ بلند ہے ماذنہ ایک اونچا چبوترہ ہر مسجد مین چار دروازے ہین۔ اسمین پہلا کتبہ اوائل شہر رجب المرجب سنہ ۸۲۱ھ (اواخر اپریل سنہ ۱۴۲۸ء) کا ہے اسکے بعد جو اصلاحات یا اضافے سلاطین صفویہ و قاچاریہ کے دست کرم سے ہوے اُن کی تفصیلات سنگ رخام یا سنگ کاشان پر کندہ ہین۔

یہان کے دیگر آثار قدیمہ مین رودخانہ طوس کے کنارے ربیع بن خثیم توری کوفی مشہور تابعی کا مزار پر رونق ہے۔ شاہ طہماسپ صفوی، عباس مرزا پسر فتح علی شاہ قاچار اور بادشاہون، و زرا اور صدور کے مقابر ہین

شاہ طہماسپ صفوی کی بنوائی ہوئی شہر کی ایک ناتمام چہار دیواری ہے اسکا محیط تقریباً ایک فرسخ

سپرد قلم نہین فرمائے ہین۔ اُن کی تحقیقات انساب و تحریر حالات کا دفتر بے پایان ہے
عباسیہ و علویہ کے معارضات و مناقشات کو نہ دیکھیے۔ یہ تو صفحات تاریخ پر یادگار رہین گے
اور اُن کی خودستائیان اور زبان آرائیان اوراق زمانہ پر باقی۔ دربار خلفائے بغداد کا مشہور
و طلیق اللسان شاعر اور آل عباس کا ممتاز رکن عبداللہ بن معتز عرصہ پیکار مین آمادہ

ہوگا ۱۴۱ اسروج مین اور چھ دروازے شہر کے وسط مین ہو کر آبادی کو نصف نصف کرتی ہوئی ایک طویل
سڑک بائیس گز چوڑی نکل گئی ہے۔ آبادی دو لاکھ کے قریب ہوگی۔
ایران کے تمام شہرون سے زیادہ مشہد مین مدارس و تعلیم گاہین ہین۔ بیس مدرسے تو اپنی شاندار
عمارت اور طلبہ کی کثرت اور جمعیت کے اعتبار سے اصفہان کے مدارس سے بھی گوے سبقت لے گئے ہین
مدرسہ بالین سب سے پرانا ہے شاہرخ گورگانی کے عہد فرمانروائی مین ۸۴۳ھ (۱۴۳۹ء) مین قائم ہوا تھا
صفویون کے بابرکت زمانہ کی یادگار بھی کئی مدرسے ہین۔
سکنۂ شہر قبائل مین سے چھ بڑے اور نہایت بارسوخ و ذی اثر ہین اور دس چھوٹے سرائین کارد
اور حمام تیس سے زیادہ ہین بڑے بڑے برنالے اور آب رو زمین کے نیچے نیچے بہتے ہین
۹۷ مناقب السادات، دستور الحقائق والہدایۃ، مناقب المحبوبین، مرأۃ الاسرار، روضۃ الاسلام
سیر الاقطاب، خزینۃ الاصفیاء، تذکرۃ العاشقین، اقتباس الانوار، روضۃ الشہداء، فصل الخطاب
(از خواجہ محمد پارسا) فضائل ائمہ اہل بیت (از شیخ عبد الحق محدث) شجرۃ الانساب، اخبار الاخیار
(جمال الدین محمد بکری شافعی) کتاب صفوۃ الصفوہ (لابی الفرج عبد الرحمٰن ابن جوزی) درر الاصداف
(از شیخ عبد الجواد شیربینی) وہ کتابین ہین جن سے دنیائے اسلام کا ہر گوشہ منور و معطر ہے۔
ان کے علاوہ ابن مغازلی شافعی کی مطالب السئول فی مناقب آل رسول، امام جلال الدین سیوطی کی احیاء المیت
بفضائل اہل البیت جس مین صحاح سے اٹھاون حدیثین نقل کی ہین شیخ شلنجی عرف سید مومن کی نور الابصار
ابن الخشاب کی موالید اہل البیت، حافظ جلال الدین محمد بن یوسف زرندی کی درر السمطین فی فضائل
المصطفیٰ والمرتضیٰ والسبطین، شیخ جمال الدین طاہر بن حسن بن عبد الرحمٰن اول کی کتاب بغیۃ الطالب
لمعرفۃ اولاد علی بن ابی طالب، ابن الجوزی کی شذور العقود، سید جمال الدین عطاء اللہ الدشتکی الشیرازی
کی روضۃ الاحباب فی سیرۃ النبی والآل والاصحاب، سید مرتضیٰ حسینی بلگرامی یمنی زبیدی کی اقرار العین
مذکر اولاد الحسن والحسین بالخصوص پڑھنے کے قابل ہین
مائۃ حاضرہ (چودھوین صدی) کی سادہ و مختصر تالیفات مین سے نواب صدیق حسن خان کی تشریف البشر

نحن بنی العم اولیٰ بہا' کہہ کر علم مقابلہ بلند کرتا ہے۔ اُس کی زبان پر ایک طرف بنی العباس
کے مفاخر و دعاوی ہوتے ہیں تو دوسری طرف سادات فاطمی کی تخفیف و تحقیر کے نعرے

مذکرۃ الائمۃ الاثنی عشریۃ معتمد و مستند ہے

۶۹ - ابن المعتز، ابو العباس عبد اللہ بن المعتز بن المتوکل بن المعتصم العباسی کی شرافت نسب اور جلالت قدر، دودمان سلطنت اور خاندان خلافت میں ہونے سے روشن ہے۔ اسکو کسب کمالات ظاہری اور حصول فوائد معنوی نے اور بھی زیب و زینت دی تھی۔ فن لغت، صرف و اشتقاق، نحو، معانی، بیان، عروض و قوافی، ترسیل خطوط و رسائل، اور قرض اشعار، فہم تاریخ اور علم موسیقی میں یکتائے روزگار تھا۔ کتاب الاغانی میں ابو الفرج اصفہانی لکھتا ہے کہ اسکے زمانہ میں فضل و ادب و شعر و حسب و شرافت و دیگر ادبیات کے لحاظ سے اہل عصر میں کوئی اُس سے تفوق و تقدم نہیں رکھتا تھا۔ اسی طرح وفیات الاعیان میں قاضی ابن خلکان نے بڑی عظمت و امتیاز کے الفاظ سے اس کو اور اسکے کمالات ذاتی و اضافی کو یاد کیا ہے۔ سید صدر الدین شیرازی المعروف بہ سید علی خان عنوان کتاب انوار الربیع میں لکھتے ہیں کہ علم بدیع کو اسی عبد اللہ بن معتز نے اختراع کیا تھا، اور اس علم کا نام 'بدیع' بھی اسی نے رکھا تھا۔ ابن معتز بھی اپنی کتاب کے آغاز میں اسکا تذکرہ کرتا ہے جو ۲۷۴ھ (۸۸۷ء) کی تالیف ہے۔ صاحب تاریخ مجالس، ابن المعتز کو شعراء میں امیر ابو فراس الحارث التغلبی پر ترجیح دیتا ہے جسکا زمانہ اس سے مؤخر ہے۔

مؤلف قصار الارب من ذکر علماء النحو والادب ابن معتز کو غزیر الفضل بارع فی الادب فائق حسن الشعر وکبیر الشعر لکھتا اور اسکے اعجابات ادبیہ میں سے -

اخذت من شباب الایام　　وتولّی الصبا علیہ السلام
وارعوی باطلی وما ان حدیث بعد　　مس منی وعفت الاحلام

کو نقل کرتا ہے۔ صلاح الدین کتبی نے کتاب فوات الوفیات میں تحریر کیا ہے کہ ابن معتز شعبان ۲۴۹ھ (اکتوبر ۸۶۳ء) میں پیدا ہوا۔ احمد بن سعید دمشقی، ابو العباس مبرد، اور ابو العباس ثعلب سے علم ادب اور قواعد عرب کو سیکھا اور نادرۂ روزگار ہوا حتیٰ کہ بعض اہل ادب اسکو فصحائے جاہلیت و مخضرمین اور اسلامیین سے بھی برتر بتاتے ہیں۔ صنعت موسیقی میں بھی مہارت تامہ رکھتا تھا۔ اس فن میں ایک رسالہ لکھ کر عبید اللہ بن عبد اللہ بن طاہر کے پاس بھیجا تھا جسکے جواب میں عبید اللہ نے بھی ایک رسالہ لکھا اور اس میں ابن معتز کے کمال کی بے حد ستائش و ثنائیں کیں۔ نامۂ دانشوران ناصری میں اس کے بعض اشعار جو دوسروں کی تخفیف یا توصیف میں ہیں نقل کئے گئے ہیں اور اُس سیاسی گزاری

یا نا موجہ باتین وہ اپنا قصیدۂ الفیہ پڑھتا ہے

الا من لعین ونسکابہا   تشکی القذی وبکاہا بہا

وشا گستری کا بھی ذکر کیا ہے جو بکمال مہارت ابن معتز کی کی تھی۔ ابن معتز کہا کرتا تھا کہ شعرا میں سے چار شخص يقولون بالسنتهم ما ليس في قلوبهم (کہتے ہیں اپنی زبان سے جو نہیں انکے دل میں) حزب ۲۶ سورۃ الفتح ع ۲ (۱۲) کے مصداق گذرے ہیں۔ پہلا ابو العتاہیہ جو اشعار زہد و اتقا کے کہا کرتا مگر خود ملحد و الحاد کا قدم زن تھا۔ دوسرا ابو نواس جس کی زبان نوجوانان ماہرو کی حرکات اور ہرزہ گی کے بیان کے لیے وقف تھی مگر خود سب مردوں سے زیادہ بدکار تھا۔ تیسرا ابو حکیم کاتب احمد سا شہرت سے ہجو و تقدی مائین تھا مگر معاشرت کے لیے حرص و ہیجان بڑے سے بھی زیادہ رکھتا تھا چوتھا اشعر تمام جو اپنے کلام میں عصر قناعت کی اقلیس کرتا لیکن خود کتے سے بڑھکر حریص تھا۔

ابن معتز کے نسبت سے نوادر و ظرائف اوراق روزگار پر باقی ہیں۔ جعفر بن قدامہ کہتا ہے کہ میں ایک دن ابن معتز کی مجلس میں حاضر تھا نمیری بھی وہاں موجود تھا۔ جب نماز فریضہ کی بجا آوری کا وقت آیا تو نمیری نے کھڑے ہو کر بکمال سرعت و خفت سے نماز ادا کرڈالی کچھ اوراد و دعائیں بھی پڑھیں پھر سجدہ میں گیا اور اسکو اتنا طول دیا کہ تمام حاضرین کسل و ملگین ہوگئے۔ ابن معتز بھی اسکو تعجب و حیرت سے دیکھ رہا تھا۔ جب نمیری نے سجدہ سے سر اٹھایا تو ابن معتز نے اُس کی نسبت یہ دو شعر پڑھے

صَلوتُكَ بَيْنَ الوَرٰى نَقْرَةٌ   كَمَا اخْتَلَسَ الجُرْعَةَ الوَالِغُ
وَتَتْبَعُهَا مِنْ بَعْدِهَا سَجْدَةً   كَمَا خَتَمَ المِزْوَدَ الفَارِغُ

تیری نماز خلق کے درمیان ایسی ہے جیسے کوئی کتا اطراف زبان سے سرعت کے ساتھ پانی کا گھونٹ پی لیوے۔ اور نماز پوری کرنے کے بعد تو سجدہ ایسا کرتا ہے جیسے کوئی شخص توشہ دان پر مہر لگا دیوے

ابن معتز کی عمر ... سال کی بھی نہ تھی کہ ایک روز ابو عیسی بن متوکل کے یہاں قاضی علی بن محمد بن ابی الشوارب آئے اور اپنے تردد ات اور خاندان کی ایک لڑکی کے ساتھ اسکے شوہر کی بیوفائی و بے مہری بلکہ بے دردی و جفاکاری کا شکوہ کرکے دستگیری کے خواہان ہوئے۔ اعانت کا وعدہ اور ہمدردی کا جواب پاکر رخصت ہوگئے ابو عیسی نے حاضرین کی طرف متوجہ ہو کر کہا "کتنے بڑے تعجب کی بات ہے کہ ایسا بزرگ شخص ایسے فضل و دستگاہ لیاقت والا کس ورطہ میں پھنسا ہوا ہے۔ خوشا حال اُس شخص کا جسکے لڑکی نہ ہو۔ ابن معتز بولا کہ اس نادان نے اس بارہ میں کچھ عرض کیا ہے پھر لوگوں کے اصرار سے یہ دو شعر پڑھے۔ ہر طرف سے تحسین و

ونحن ورثنا ثیاب النبی   فکم تجذبون باهدابها
لکم رحم یا بنی بنته   ولکن بنی العم اولی بها
به نصر الله اهل الحجاز   وابراءها بعد اوصابها
ویوم حنین فدا اعیتکم   وقد ابدت الحرب عزابها

افسردین ہونے لگی۔

وبکر قلت موتی قبل بعل   وان اثری وعد من الصمیم
اامزج باللئام دمی ولحمی   فما عذری الی النسب الکریم

مین نے اپنی دختر دوشیزہ سے کہا کہ ایسے شوہر کے وصال تک پہونچنے سے پہلے جو بڑا با ثروت اور صاحب نسب و اصالت ہو تم اس جہان سے رخصت ہو جانا۔ کیا مین اپنا خون اور گوشت ناکسون سے مخلوط کرون گا تو میرا عذر نسب کریم کے جاتے رہنے کی نسبت کیا ہو گا

عبداللہ بن معتز کا ایک غلام نشوان نام تھا ملاحت صورت اور حلاوت سیرت مین یکتا غنا و سرود مین فتنۂ روزگار تھا۔ یہ اسکے بادۂ صحبت و وصال سے ہمیشہ سرمست رہتا۔ اتفاقاً وہ غلام مرض چیچک مین مبتلا ہوا چہرہ آبلون سے بھر گیا عبداللہ نے سنا تو نہایت قلق ہوا۔ کچھ روز بعد نشوان نے صحت پائی اور چیچک کے نشان رخسارون سے بالکل ہٹ گئے بلکہ اسکا حسن سوا ہو گیا۔ ابن معتز اسکی شان مین کہتا ہے۔

لی قمر جدر لما استوی   فزاده حسنا فزادت همومی
اظنه غنی لشمس الضحی   فنقطته طربا بالنجوم

میرا چاند مرض آبلہ مین گرفتار ہو گیا تھا جب مرض کا زور کم ہوا بیماری کی شدت گھٹ گئی۔ تو اسکی خوبصورتی اور بھی بڑھ گئی اور میرے اندوہ افزون ہو گئے۔ میرا گمان یہ ہے کہ اسنے آفتاب نیمروز کے لیے گایا تھا جسپر سورج نے مسرت و طرب سے دانہائے انجم اسکے رخ پر نثار کر دیے۔

حسب روایت نامۂ دانشوران اسی مضمون کو بہ تغیر الفاظ کسی شاعر ہندی نژاد نے ابن معتز کے کلام سے اقتباس کر کے لکھا ہے ؎

ماہ من آبلہ روی است دلے عیبش نیست   روی بر آبلہ تیغی است کہ جوہر دارد

ابن معتز کے معاصرین اور قدر شناسون نے اسکی مدح و ثنا مین نادر اشعار و قصائد لکھے ہین۔ خود ابن معتز بھی اورون کے کلام کی داد دینے مین بیحد سخی تھا۔ اسکے تذکرۂ شعرا کا ایک ایک ورق جسکی شہادت دے رہا ہے سید ابو ہاشم اسمٰعیل الحمیری کے ایک قصیدہ کے جو اپنی انتہا درجہ کی نفاست کی وجہ سے

قتلنا امية في دارها ونحن احق باسلابها
اذا ما دنوتم تلقيتم زبونا اقرت بجلابها
فمهلا بني عمنا انها عطية رب حبانا بها
واقسم انكم تعلمون انا بها خير اربابها

"مُنْ هَبَّہ" کہلاتا ہے۔ اس نے بہت سے شعر نقل کیے ہیں اور لکھا ہے کہ قصیدہ بہت مشہور ہے اسلئے ان ہی اشعار پر اقتصار کرتا ہوں۔ ایک قصیدہ نونیہ کا بھی انتخاب درج کیا ہے اور لکھا ہے کہ "ہیچ چیز در عذوبت برابر با این ابیات نیست۔"

ابن معتز سُنّی اور امام ابوحنیفہ کا پیرو تھا شیعی مورخین کا خیال ہے کہ اسکو سلسلہ علوی بلکہ ذریت نبوی سے انحراف تھا۔ آل فاطمہ سے تنفر کرتا تھا۔ انکے مطاعن اور اپنے مفاخر میں مبالغہ کرتا تھا چنانچہ اسکا یہی قصیدہ بائیہ شاہد ہے

مکتفی باللہ کے مرنے پر آل عباس میں اختلافات اور سلطنت میں بعض انقلابات پیدا ہو گئے۔ ایک سال تک برابر تخت خلافت کے لئے مناسب اشخاص کی تلاش ہوتی رہی تھی۔ بالآخر ارکان حکومت و اہل حل و عقد نے ابن معتز کو انتخاب کیا۔ اور ۱۸ ربیع الاول سنہ ۲۹۶ھ (۲۷ دسمبر سنہ ۹۰۸ء) کو مقتدر کو خلع (جدا) کرکے عبداللہ بن معتز کے پاس پہونچے اور اسکی بیعت کی۔ المرتضی باللہ۔ الراضی باللہ۔ الغالب باللہ۔ المنتصف باللہ لقب پائے۔ عنوان مراسلت یہ ہوتا تھا "از امیر المومنین المرتضی باللہ ابی العباس عبداللہ بن معتز باللہ کذا و کذا" اُدھر مقتدر اور اُسکے تابعین و ہواخواہوں کی جماعت قوت پا گئی جس نے ابن معتز کے مقابلہ و قتل کا تہیہ کر لیا تھا۔ ابن معتز کو مجبورانہ یکہ و تنہا راہ گریز اختیار کرنا پڑی۔ بغداد میں ایک تہلکہ عظیم اور بد امنی شدید برپا ہو گئی۔ ابن معتز ایک معتمد امیر کے گھر میں پناہ گزین ہوا۔ اُسی امیر کے غلام نے مخبری کی۔ ابن معتز پکڑ لیا گیا دن بھر قید رکھا گیا۔ شب کو اتنی اذیت پہونچائی گئی کہ روح عالم بالا کو پرواز کر گئی۔ ایک روایت یہ بھی ہے کہ گلا گھونٹ گھونٹ کر اُس کا کام تمام کیا گیا تھا۔ لاش ایک بورے میں لپیٹ کر اُسکے اقربا کے پاس بھیجدی گئی۔ علی بن محمد بن بسام شاعر نے مرثیہ لکھا۔ یحییٰ بن علی نے ہجویں کہیں مرثیے کے دو شعر یاد رکھے گئے ہیں

لِلّٰهِ دَرُّكَ مِنْ مَيْتٍ بِمَضْيَعَةٍ نَاهِيكَ فِي الْعِلْمِ وَالْآدَابِ وَالْحَسَبِ
مَا فِيهِ لَوْ وَلَا لَوْلَا فَتَنْقُصُهُ وَإِنَّمَا أَدْرَكَتْهُ حِرْفَةُ الْأَدَبِ

خدا اُس مرنے والے کو خیر دے کہ جو مراتب علمی اور آداب و حسب میں تم کو اور لوگوں سے کافی ہو۔ لو اور لولا (جو کلمات شرط ہیں) اُس میں نہ تھے یعنی اگر تم کہتے کہ ایسا ہوتا تو ایسا ہو جاتا اور اگر ایسا نہ کرتا

صفی الدین عبد العزیز بن سرایا الحلی ابن معتز کا جواب دینے میدان میں آتا ہے۔ انکی نسبت یہ
اسیر تاج الدین آدی نقیب النقبا کے شرف عراق کا سبب کرم ہوتا ہے اور انکی زبان سے آل عباس
کی ہجا و تذلیل کرنیوالے شعرا سے ایک گستاخ بے ادب کا جواب وہ بھی کمال زیادتی سے دیتا ہے

تو اس طرح ہوتا بلکہ حریف اب نے اسکو پالیا تھا

ابن معتز سیاہ چہرہ گندم گون تھا۔ چہرہ خوب اکثر دو رخشان۔ داڑھی میں سیاہ خضاب کرتا تھا
اُس کا قول تھا اَلبَلَاغَةُ بُلُوغُ المَعنیٰ۔

اُس کا دیوان چھپ گیا ہے۔ اسکی اور سی ۲ تالیفات و تصنیفات شہرت رکھتی ہیں۔ کتاب الزہر والریاض
کتاب البدیع۔ کتاب مکاتبات الاخوان بالشعر۔ کتاب الجوارح والصید۔ کتاب السرقات۔ کتاب اشعار الملوک
کتاب الآداب۔ کتاب حلی الاخبار۔ کتاب طبقات الشعرا۔ کتاب الجامع فی الغنا۔ کتاب ارجوزة فی
ذم الصبوح وغیرہ ۵

سخن الف قدان راہمہ عمر ہمی توان گفت ۔۔۔ کہ سخن روایت چون مدہل دراز کردن

سنہ ۷۵۰ھ مولانا صفی الدین ابو المحاسن عبد العزیز بن ابا ابن ابی القاسم الحلی السنبسی سحر بیان شاعر و صدر ادب کے کامل ماہر تھے۔ اُن کا قصیدہ بدیعیہ مشہور ہے ملوک دیار بکر کے معاصر و متوسل تھے۔ ان کی مدح میں بعض نفیس قصائد لکھے ہیں۔ اُن کے دیوان سے واضح ہوتا ہے کہ انکے باپ دادا حلہ کے ماروین (ملک عراق) کے رئیس اور بزرگان روزگار سے تھے۔ دیوان میں کہیں کہیں اپنے باپ اور ماموں (دادا نانا) کی بزرگی اور علو شان پر افتخار کیا ہے۔ جا بجا حسب شیوہ شاعرانہ کمال بے نیازی و استغنا سے اپنی ستائش بھی فرمائی ہے

شیخ مجد الدین فیروزآبادی بھی کہ اکابر متاخرین فن حدیث اور ائمہ لغت میں داخل ہیں اُنکی صحبت سے محظوظ ہوئے تھے۔ اپنی کتاب مجموعات میں لکھتے ہیں کہ سنہ ۷۴۷ھ میں ادیب شاعر صفی الدین عبد العزیز بن سرایا الحلی سے شہر بغداد میں ملاقات ہوئی۔ دیکھا کہ شیخ کبیر السن تھے اُن کو نظم و نثر پر قدرت تامہ حاصل تھی۔ علوم عربیہ اور شعر سے نہایت ماہر تھے۔ اُن کی غزل نہایت پاکیزہ و شیرین ہوتی تھی۔ شیعی تھے حالت زاہدانہ و درویشانہ تھی۔ ہیئت البتہ خراب تھی عمامہ نہایت میلا۔ چہرہ اور بھی قبیح اور بدنما تھا۔ اُن کی صورت دیکھ کر کبھی کوئی شخص یہ گمان نہ کرتا کہ وہ ایسے لطف اشعار نکالنے پر قادر ہیں جیسے صدف میں سے گوہر آبدار۔

اُن کے دیوان میں حمد و نعت و مناقب آل اطہار میں بہت سے بے مثل قصائد موجود ہیں حق یہ

ألا قل لشر عبيد الإله | وطاغي قريش وكذابها
وباغي العباد وباغي العناد | وهاجي الكرام ومغتابها
أأنت تفاخر آل النبي | وتجحدها فضل أحسابها
بكم باهل المصطفى أم بهم | فرد العداة بأوصابها
أعنكم نفى الرجس أم عنهم | لطهر النفوس وألبابها
أما الرجس والخمر من دأبكم | وفرط العبادة من دابها
وقلتم ورثنا ثياب النبي | فكم تجذبون بأهدابها
وعندك لا تورث الأنبياء | فكيف حظيتم بأثوابها
فكذبت نفسك في الحالتين | ولم تعلم الشهد من صابها
أجدك يرضى بما قلته | وما كان يوماً بمرتابها
وقولك أنتم بنو بنته | ولكن بنو العم أولى بها
بنو البنت أيضاً بنو عمه | وذلك أدنى لأنسابها
فدع في الخلافة فصل الخلاف | فليست ذلولاً لركابها
وما أنت والفحص عن شأنها | وما قمصوك بأثوابها
وما ساورتك سوى ساعة | فما كنت أهلاً لأسبابها
وكيف يخصونَ يوماً بها | ولم تتأدب بآدابها
ودع ذكر قوم رضوا بالكفاف | وجاؤوا الخلافة من بابها

اس باکمال نے انواع و اقسام کے صنائع اور اسالیب سخن کا کمال دکھایا ہے دیوان دمشق مین سنہ ۲۹۰ھ مین طبع ہوا تھا۔

امیر تاج الدین آوی نقیب النقبا نے اشراف عراق کے کہنے سے مولانا صفی نے معتز کے قصیدہ بائیہ کا جواب دیا تھا ان کے گمان کے موافق بسبب رسالت کے ساتھ ہونے ادبی عصر کے کی تھی یا وہ امور جو انکی زبان سے سرزد ہوئے تھے انکے ایراد مین ایک طولانی قصیدہ علی سبیل الارتجال کہہ ڈالا تھا

هم الزاهدون هم العابدون — هم الساجدون بحرابها
هم الصائمون هم القائمون — هم العاملون بآدابها

سیادت و شرافت

سیادت کے معنی عربی زبان میں بزرگی و سرداری کے ہیں۔ اسی سے سیّد (فتح سین، یای مشدد مکسور بوزن جیّد) بنا ہے جو پیشوا اور سردار و مہتر قوم کو کہتے ہیں۔ اس لفظ (سیّد) کا استعمال بتخفیف تحتانی (بروزن قید) بھی اسی معنی میں آتا ہے حسب قواعد صرفی یائے مشدد کی تخفیف جائز ہے۔ جیسے میّت کو بتخفیف یا میت بروزن بیت بولتے ہیں سیّد کو یائے مشدّد مفتوح کے ساتھ سیَّد بولنا غلط ہے سائد بھی سیّد کے ہم معنی ہے۔ سائد اور سیّد کی جمع 'سادة' اور جمع الجمع 'سادات' آتی ہے

اس عہد عروج و ارتقا میں جب کہ بدون پابندی کسی قانون بین الانساب الاقوام کے مسلمانوں کی اکثر قومیں پستی سے عروج و فراز کی طرف بڑھ رہی ہیں اور سادات عظام کی مردم شماری بلا سعی تولید و تخلیق محض تبادلہ 'ذات' کے اثر سے خود بخود افزایش پا رہی ہے۔ چند روایات و حقائق کا نقل کر دینا مناسب سمجھتا ہوں۔

شرف و فضل کو آل فاطمہ سے متعلق و منحصر کرنے کے بارہ میں بہت سی آیات کریمہ اور احادیث شریفہ وارد ہیں وَاعْتَصِمُوا بِحَبْلِ اللّٰهِ جَمِيعًا (اور سب مل کر اللہ کی رسی کو پکڑے رہو جزء ۴ سورۂ آل عمران ع ۱۱-۲) کی تفسیر میں سیدنا جعفر صادق علیہ السلام نے فرمایا ہے کہ نَحْنُ حَبْلُ اللّٰهِ (خدا کی رسی ہم ہیں) آیۂ عظمہ اَمْ يَحْسُدُونَ النَّاسَ عَلٰى مَا اٰتٰهُمُ اللّٰهُ مِنْ فَضْلِهٖ (یا خدا نے جو اپنے فضل سے لوگوں کو نعمت عطا فرمائی ہے اس پر جلے مرتے ہیں جزء ۵ سورۃ النساء ع ۸) کی نسبت امام محمد باقر علیہ السلام نے کہا ہے کہ اَهْلُ الْبَيْتِ هُمُ النَّاسُ (لوگوں سے مراد اہل بیت ہیں)

ارشاد باری عزاسمہ اِنَّ الَّذِینَ اٰمَنُوا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ سَیَجعَلُ لَھُمُ الرَّحمٰنُ وُدًّا ہ
دجو لوگ ایمان لائے اور انھوں نے نیک عمل کیے رحمٰن عنقریب اُنکی محبت پیدا کردے گا رجزء ۱۶
سورۂ مریم ع ۶-۹) کے متعلق محمد بن حنفیہ رضی اللہ عنہ نے کہا ہے کہ لَا یَبقٰی مُؤمِنٌ اِلَّا وَفِی
قَلبِہٖ وُدٌّ لِعَلِیٍّ وَاَھلِ بَیتِہٖ دباقی نہ رہیگا کوئی مومن بغیر اسکے کہ اُسکے دل میں علی اور اُنکے اہلبیت
کی محبت ہو) حضرت نقاش کہتے ہیں کہ اس آیہ کا نزول علی مرتضیٰ کرم اللہ وجہہ کی شان میں
ہوا ہے اِنَّ الَّذِینَ اٰمَنُوا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ اُولٰئِکَ ھُم خَیرُ البَرِیَّۃِ دبے شک جو
لوگ ایمان لائے اور انھوں نے نیک عمل کیے یہی لوگ بہترین خلائق ہیں دجزء ۳۰ سورۂ البینۃ
ع ۱-۲۳)

امام جلال الدین سیوطی لکھتے ہیں کہ تمام بلاد وامصار میں حقیقتاً اشراف وہی لوگ ہیں
جو اہل بیت کی اولاد وازواج اور حسن وحسین وعلیؑ کی اولاد ہیں، آل علی کے ساتھ شرف کی
تخصیص خاص اہل مصر کی اصطلاح وتجویز ہے۔

علی خواص فرماتے ہیں کہ شریف کا حق ہم پر یہ ہے کہ ہم اپنی جان اُن پر قربان کردیں
کیونکہ اُن میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا لحم ودم کریم ساری وجاری ہے اور وہ آنحضرت کا
ایک پارۂ گوشت ہیں، بعض اہل علم صاحبان بصیرت کا ارشاد یہ ہے کہ "ہم پر شرفا کے حقوق
اگرچہ وہ نسب میں بعید ہوں، یہ ہیں کہ ہم اُن کی رضا کو اپنی ہوا پر اختیار کریں اور اُن کی تعظیم
وتوقیر بجا لائیں، وہ زمین پر ہوں تو ہم سریر پر نہ بیٹھیں" امام شعرانی اپنی کتاب المنن میں
لکھتے ہیں "ادب یہ ہے کہ ہم میں سے کوئی کسی شریفہ سے اُس وقت تک نکاح نہ کرے جب تک کہ
اپنے نفس سے اطمینان وعہد نہ کرلے کہ اُسکے تابع حکم رہے گا۔ اُس کے اشارے پر کام کرے گا
حتیٰ کہ اُس کی جوتیاں سیدھی کرکے رکھدے گا جب وہ آئے تو اُسکے لئے کھڑا ہوجائے اور
اُسپر دوسری عورت نہ لائے۔ اُس پر معیشت کی تنگی نہ کرے۔ اور اگر وہ اجنبی ہو تو اُس کی
طرف آنکھ اُٹھاکر نہ دیکھے ونحو ذالک"

امام مالک رضی اللہ عنہ فرماتے تھے کہ جو کوئی شرف (شریف یعنی سید ہونے) کا جھوٹا دعویٰ کرے تو اس کو خوب مارا اور ایک مدت تک قید رکھنا چاہیئے۔ یہان تک کہ توبہ کر لیوے اسلیئے کہ اسمین آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا استخفاف ہوتا ہے باین ہمہ ارشاد موعظت جس کے نسب مین طعن کیا جاتا امام صاحب اُسکی بھی تعظیم کرتے اور کہتے کہ شاید وہ فی نفس الامر مین شریف ہو لیکن قول اول منسوخ ہے اور فعل ثانی تقویٰ۔

میر غلام علی آزاد نے ایک کتاب سند السعادات فی حسن خاتمۃ السادات[۵۸] لکھی ہے۔ اسمین خصوصًا اور اپنی دیگر تصنیفات مین عموماً انھون نے سادات کے متعلق وہ تمام حالات و روایات وصاحت بالتفصیل نقل کر دیے ہین جو میر عبد الجلیل اور ان کے دودمان شریفیہ کی خصوصیات و مآثر قدیمہ مین داخل تھے اور جن پر انکے اسلاف کو وثوق اور انکا اساس عمل تھا

علم الانساب یعنی قبائل کے نام و نسب اور خاندانون کے پچھلے سلسلون اور بزرگون کے تعلقات کا جاننا اور یاد رکھنا اس خاندان کا آبائی و شریا خاندانی علم تھا جو پشتہا پشت سے سینہ بہ سینہ چلا آتا تھا۔ میر عبد الجلیل خود بڑے ماہر اور اس فن مین کامل تھے۔ ان کے گھرانے کی بڑی بوڑھیان بھی سادات کے بہت سے خاندانون کے متعلق خاص معلومات اور وسیع آگاہی رکھتی تھین جن کا بے تکلف حوالہ دیا جاتا اور استناد کیا جاتا تھا۔ ان کو اپنی شرافت اور خالص سیادت پر ناز و فخر تھا۔

دنیا پر روشن ہے کہ سادات حسینی کا نسب ایک طرف رسول عرب (سید ولد آدم) سے ملتا ہے اور دوسری طرف تاجداران ایران سے۔ لیکن آل حسین کو اپنے نسب مادری کا شرف اور ننہالی اسلاف کا علو مرتبت ثابت کرنے کے لئے سرزمین ہند سے فارس جانے کی ضرورت نہین ہے وہ تجلّیان جو کوہ بے ستون اور دماوند کان پر نظر آتین اور ہی پہاڑ کی چوٹیون سے نکھر کر

---

[۵۸] سند السعادات طبع ہو چکی ہے بمبئی مین مرزا محمد شیرازی ملک الکتاب کے یہان ملتی ہے۔

ہو سکیں گی۔ مہاراجگان اودے پور کی[۵۸۴] جن کا لقب مہارانا[۵۸۳] چلا آتا ہے عظمت و شان ہندوستان میں مسلم ہے۔ راجپوتانہ کے تمام راجگان پر اُن کو تفوق حاصل تھا

[۵۸۳] اہل ہند پر اس خاندان کی عظمت و احترام روشن ہے۔ انھوں نے بھی اپنی شرافت و شجاعت سے اپنی یکتائی اور خوبیوں کو حتی المقدور قائم رکھا۔ بادشاہان اسلام نے باوجودیکہ ان راجاؤں سے سخت مقابلے ہوئے ان کی بہادری اور حفظ ناموس کی ہمیشہ داد دی ہے۔ زمانہ سلف میں دستور یہ تھا کہ جب کوئی راجہ کسی گدّی پر بیٹھتا تو پہلے دربار میواڑ میں حاضر ہوتا۔ فرماں روا رانا اپنے پاؤں کے انگوٹھے سے تھوڑا سا خون نکالتا اور نئے راجہ کی پیشانی پر تلک (ٹکا) لگا دیتا۔ مسند نشینی کی رسوم آگے چل کر ادا ہوتیں۔

بابر اپنے واقعات میں لکھتا ہے کہ اُس (بابر) کا مقابلہ سنگھ رام (راناسانگا) سے ہوا۔ رانا اسّی ہزار سوار، سات راجہ مہاراجہ، نو راو، ایک سو چار راول اور راوت، پانسو ہاتھی لیکر میدان میں آیا۔ سیکری (فتحپور) میں مقابلہ ہوا ترکوں کے اقبال نے یاوری کی۔ رانا رن سے بھاگا رانی نے زہر دیدیا، اودے سنگھ سب سے چھوٹا بیٹا گدّی پر بیٹھا۔ اس سے اکبر نے چتوڑ اور رنتھمبور اور میرٹھ فتح کئے۔ مااینہمہ اُودے سنگھ نے نہ اطاعت قبول کی نہ دربار میں حاضر ہوا۔ ملکہ ملک کی حفاظت اور راج کی بقا کے لئے پُرپیچ گھاٹیوں میں اُودے پور آباد کیا اور راجدھانی مقرر کی۔ کئی طرف بند باندھے، اودے ساگر جھیل بنائی۔ اسکا بیٹا پرتاب مسند پر بیٹھا۔ اس نے بھی بزرگوں کی آن بان قائم رکھی اور مغلوں کے سامنے گردن نہیں جھکائی۔

۹۷۴ھ (۱۵۶۶ء) میں اکبر نے حسین قلی خاں، خان جہاں کو رانا کی مہم پر بھیجا اُسنے اودیپور لے لیا اور رانا بھاگ کر پہاڑوں میں چلا گیا۔

۹۷۵ھ (۱۵۶۷ء) میں اکبر نے بذات خود قلعہ چتوڑ کا محاصرہ کیا۔ یہ قلعہ تین کوس لمبا اور آدھ کوس چوڑا نہایت مستحکم و استوار تھا۔ قدرتی چشمے بہتے تھے۔ غلہ مدتوں کے لئے بافراط جمع رہتا تھا۔ اسی طرح سامان حرب و ضرب بھی۔ یہ قلعہ اس سے پہلے دوبار مسلمان فتح کر چکے تھے۔ مگر راجپوت اغیار کے قبضہ میں اپنے راج کے قدیم و متبرک مقام کو دیکھنا کب گوارا کر سکتے تھے۔ اتفاق سے رانا اُودے سنگھ کا لڑکا سکت سنگھ باپ سے بگاڑ کر کے اکبر کے یہاں چلا آیا اُس نے اکبر سے بہت سے وعدے اور قول و قرار کئے مگر پھر بھاگ کر باپ کے پاس پہنچا اور اکبر کی چڑھائی کی خبر دی۔ اکبر پہنچا۔ محاصرہ نے طول کھینچا۔ محصور ہو کر سر نکیں لگا دی گئیں۔ توپ اور گولے دہین چھاؤنی میں ڈھالے جاتے تھے نہایت خونریز بہادرانہ معرکہ تھا ہولناک

اِن میں سے جو کوئی مسند نشین ہوتا اُس کے لئے قشقہ صندلین راجہ اودے پور کے یہاں سے آتا تھا جسکو وہ بڑے افتخار و احترام سے اپنی پیشانی اور ماتھے پر جگہ دیتا تھا میر غلام علی آزاد (خزانۂ عامرہ صفحہ ۳۹ میں) اس پر یہ اضافہ کرتے ہیں کہ رانائے اودے پور اپنا نسب نوشیروان

سُرنگیں اُڑائی گئیں سوا چار مہینے کے محاصرہ کے بعد قلعہ فتح ہوا "دل گفت کہ بکشا دز دودی چتور" تاریخ ہوئی۔

علاء الدین خلجی نے سوا سات مہینہ کے محاصرہ کے بعد ۳ محرم ۷۰۳ھ (۷ اگست ۱۳۰۳ء) کو چتور کو فتح کیا تھا۔ اِسی واقعہ کے ساتھ وہ دلچسپ افسانہ یا افسون جنون وابستہ ہے جسکو ملک محمد جائسی اور ہندی بھاشا کے دیگر باکمال شعرائے اپنی سخن سنجی، بلندی خیال، طرز ادا اور حسن کلام سے شہرت و بقا کی سند دے رکھی ہے اور اپنی مشہور بے نظیر مثنوی میں پدماوت یا پدمنی کی دلآویز داستان نظم فرمائی ہے۔ پدماوت کے حسن بے مثال کا ذکر ایک طوطی کی زبانی سنکر رتن سین والی چتور نادیدہ عاشق ہو جاتا ہے۔ ایک دریوزہ گرد لاابالی با سادھو کے بھیس میں اپنے کعبۂ مقصود لنکا (جزیرہ سیلان) پہونچتا ہے۔ کامیاب ہوتا اور پدماوت کو بیاہ کر لاتا ہے۔ اِس کا شہرہ علاء الدین کے کانوں تک پہونچتا ہے تو نسیم صبا کی معرفت پیام محبت بھیجتا ہے ؎

بامن ناصبور رایش خود از وفا طلب　　یا چو تو پاک دامنی صبر من از خدا طلب

آخر رانی کے عشق یا شوق دیدار سے مغلوب ہو کر چتور آتا ہے (تکلفات شاعرانہ اور تخیلات نازک سے دور ہو کر بھی یہ قصہ پُر لطف ہے) رانی نہیں ملتی سلطان حصول مرام سے محروم رہتا ہے۔ رتن سین کو قید کر کے دہلی لے آتا ہے۔ ماہ سیما پدمنی اگر علاء الدین کے پنجہ میں پھنسنے سے بال بال بچ جاتی ہے تو اپنے جمال جاں ستان کی بدولت راجہ دیوپال کے تعشق اور ناوک افگنی کا ہدف بنتی ہے۔ رتن سین اپنی مہر لقا لڑکی کی کرشمہ سازی و عشوہ بازی سے (جسکو مورخین دغا و حیلہ سے تعبیر کرتے ہیں) جب خلاصی پاتا ہے تو سب سے پہلے دیوپال پر حملہ کرتا اور اُس کو عشق بازی و دلداری کا مزہ چکھاتا، شربت فنا پلاتا ہے۔ حسن و عشق کے اس معرکہ میں غیور رتن سین سخت مجروح ہوتا ہے حتیٰ کہ چتور پہنچکر اس محبوب دُنیا اور اپنی محبوب رانی سے ہمیشہ کے لئے رخصت ہو جاتا ہے۔ وفا پیمان اور فدائی پدمنی اپنے شیدا اور بہادر شوہر کے ساتھ ستی ہونے کے لئے چتا میں بیٹھتی ہے۔ علاء الدین کے پیام اُلفت کا جواب آج اُسکی زبان حال پر یوں تھا ہے ؎

آنکہ دائم ہوس سوختن ما می کرد　　کاش می آمد و امروز تماشا می کرد

ناگہاں علاء الدین صاعقۂ برق کی طرح چتور کے دروازے پر نظر آتا ہے شہر اور قلعہ کو مسخر و مفتوح کر لیتا ہے لیکن نازنین و ناز پیکر پدماوت کی جگہ ایک مشت خاکستر پاتا ہے۔

کسریٰ تک پہونچاتے ہیں جب سعد وقاص[۵۵] نے ایران کو فتح کیا تو نوشیروان کی اولاد آوارہ و منتشر ہو گئی۔ انھیں میں رانا کا ایک دادا بھی تھا جو ہندوستان آیا اور راجہ کے مرتبہ پر پہونچا جب شہربانو

دربار اکبری میں لکھا ہے کہ راجپوتوں میں یہی ایک خاندان ہے جس نے مسلمان بادشاہوں کو بیٹی نہیں دی۔ شاید یہ جملہ لکھتے وقت مرحوم آزاد کو خیال نہ رہا ہوگا کہ اورنگ زیب کے آخر حیات تک کی رفیقہ ایک اودے پوری شاہزادی تھی جسکی خدمت گزاری و وفاشعاری کا اعتراف اُسنے دم نزع بھی کیا ہے۔ ادب و انشائے فارسی کے اکثر قدر شناسوں نے مطبوعہ رقعات عالمگیری کو دیکھا ہوگا۔ میرے پاس بھی ایک نہایت قابل قدر قلمی مجموعہ خدیو خدا آگاہ خلد آرام گاہ محمد اورنگ زیب عالمگیر کے رقعہ جات کا موجود ہے جو وقتاً فوقتاً شاہزادگان والا تبار اور امرائے ذوی الاقتدار کے نام صادر و ارسال ہوئے تھے۔ بادشاہ مبرور کے رسائل و رقعات اکثر مقربان حضور نے جمع کیے تھے مگر سب سے مکمل اور صحیح نسخہ وہی ہے جو راجہ آیا مل نے ۱۱۵۶ھ (۱۷۴۳ء) میں ترتیب دیا اور "دستور العمل آگہی" نام رکھا تھا۔ میرے نسخے کے ساتھ "وصایائے اورنگ زیب بادشاہ برائے بہادر شاہ" بھی شامل ہیں۔ اسکی کتابت ۲۲ ربیع الاول ۱۲۳۴ھ (۲ جنوری ۱۸۱۹ء) کو ختم ہوئی تھی۔ یاد ہوگا کہ ہنگام واپسیں بادشاہ مغفور نے شاہزادہ اعظم شاہ کو تحریر فرمایا تھا۔ "بیگم اگرچہ بظاہر ملول ست لیکن نیک دلہا خدا است کوتہ اندیشی مو شگاف جز ناکامی ثمرہ ندارد" اسی مجموعہ میں وہ رقعہ خاص بھی ہے جو پانچویں شاہزادے سلطان محمد کام بخش کو خلد مکاں نے وقت مرگ لکھا تھا۔ "حال بیگم، بیگم داند۔ اودے پوری کہ والدۂ شماست در بیماری با من بودہ ارادۂ رفاقت دارد" اورنگ زیب کی اور بیگموں کو آج کوئی جانتا بھی نہیں لیکن یہ نیک نہاد ہندو نژاد ملکہ اپنے حق شناس و ستی گزار سرتاج کے دو لفظوں کی بدولت بقاء و دوام کا خلعت پہنے کھڑی ہے۔ فطرت انسانی کا اقتضا ہے کہ رخصت ہونے والا زیادہ باتیں پسند نہیں کرتا نہ کہ اورنگ زیب سا کم حروف، خوددار اور کم سخن لیکن اس بیگم کے بارہ میں احسان مند دل کی بات زبان تک آئے بغیر نہ رہی۔

ہندوستان کے دیگر والیان ریاست اور مہاراجگان والا شان کی طرح اودے پور کے مہارانا بھی بادشاہان مغلیہ کے مطیع و تابع فرمان رہے ہیں۔ شاہی مراسلات و فرامین میں وہ مطیع الاسلام لکھے جاتے تھے۔ ایک ہندو مذہب برادر انشا پرداز پنڈت چندر بھان متخلص بہ برہمن بادشاہ کا فرمان لیکر اودے پور گیا تھا۔ وہاں کے احوال میں جو عرائض اُس نے بھیجے ہیں پڑھنے کے قابل ہیں۔ وہ مہارانا کے حسن سلوک، نیک رزبہ اور سویت طویت و عقیدت کی تحسین و ستایش کرتا ہے۔

۵۳ موشیو ریمان عرف حاجی مصطفےٰ لکھتا ہے کہ رانا راجہ سے کسی قدر زیادہ مرتبہ و امتیاز کا خطاب ہے

شاہ دختر یزدگرد (نبیرۂ نوشیرواں) اسیر ہوکر امام حسین رضی اللہ عنہ کے حبالۂ نکاح میں آئیں تو اُن (شاہزادی) کے بطن سے امام زین العابدین رضی اللہ عنہ متولد ہوئے سادات حسینی کی نسل امام ہمام پر منحصر ٹھہری تو ایسی صورت میں قبائل و عشائر سادات حسینی کے راجہائے اودے پور کے ماموں (اخوال) ہوئے اور اس طور پر ان راجگان والا شان اور دیگر امرا و قبائل (مثلاً مرہٹہ وغیرہ) کو جو خود کو خاندان اودے پور سے منتسب یا متوسل مانتے ہیں صلہ رحم کا حق ادا کرنا اور سیدوں

اگرچہ مخرج دونوں کلموں کا ایک ہی ہے۔

۹۶۴ قشقہ فارسی سے معرب لفظ ہے مگر اس ملک میں بہت زیادہ مستعمل سنسکرت میں تلک اور ہندی میں ٹیکا کہلاتا ہے قشقہ ایک چھوٹے سے مصفّے پتھر یا مجلّے سنگ مرمر پر گھسا جاتا ہے جو ایک کالی یا چائے کی طشتری کے برابر یا اُس سے کسی قدر بڑا ہو۔ اس میں کچھ چوب صندل ہوتی ہے اور کچھ دیسی زعفران اور کبھی چونا اور ہلدی۔ یہ چیزیں سُرمہ کی طرح باریک پیس لی جاتی ہیں اور بوقت ضرورت تھوڑا سا گلاب یا پانی ڈال کر سب کو ملا لیا جاتا ہے۔ لازم ہے کہ گھسنے سے پہلے گھسنے والا اسکو اپنے داہنے انگوٹھے سے مَس کرے یا بے والا اسکو بڑی مسرت و انبساط اور ادب و احترام کے ساتھ لیتا ہے پھر اپنی انگلی کا پورا اسمیں ڈبوتا اور اُس محلول مرکب یا اُس کے کسی جزو سے اپنے ماتھے پر چند لکیریں یا دھاریاں بالوں کی جڑ سے لیکر ناک کی نوک تک دراز کھینچ لیتا یا دونوں ابرؤں کے مابین نشان لگا لیتا ہے یا صرف کان کی لو پر۔

دیبی کے پوجنے والے اکثر پوری پیشانی پر ایک بناگوش سے دوسری بناگوش تک قشقہ لگاتے ہیں لیکن جو رام کے بھگت ہیں وہ سر کے بالوں کی جڑ سے ابرو تک لکیریں کھینچ لیتے یا نشان لگا لیتے ہیں

۹۶۵ حضرت سعد بن وقاص رضی اللہ عنہ عشرہ مبشرہ سے ہیں۔ نام سعد، کنیت ابو اسحاق، باپ کا نام مالک ابی وقاص، لقب فارس الاسلام تھا۔ اپنے قبیلہ بنی زہرہ میں مقتدر و محترم اور اشراف مکہ میں معزز و ممتاز تھے۔ دنیوی وجاہت و امارت بھی حاصل تھی۔ رشتہ میں رسول مقبول صلی اللہ علیہ وسلم کے ماموں ہوتے تھے سابقین اولین یعنی ایمان لانے والوں میں آپ ساتویں شخص تھے۔ سترہ [۱۷] (یا بروایت دیگر انیس [۱۹]) سال کی عمر میں مشرف بہ اسلام ہوئے اور اُس وقت سے برابر مکہ معظمہ اور بعد ہجرت مبارک مدینہ منورہ میں بارگاہ رسالت میں حاضر اور باریاب رہے۔

بعد اعلان رسالت صحابۂ پاک کو جن مشکلات کا سامنا کرنا پڑا اُن میں سے بعض کو سہیلی نے روض الانف میں لکھا ہے جو حضرت سعد کا بیان ہے کہ ایک دفعہ رات کو سوکھا ہوا چمڑا ہاتھ آگیا اُسکو میں نے پانی سے دھویا

کے ساتھ مراعات و مدارات سے پیش آنا لازم ہے"۔
اس بارہ میں آزاد دہلوی بھی آزاد بلگرامی کے ہم نوا پائے جاتے ہیں اور دربار اکبری میں لکھتے ہیں کہ راجگان اودے پور میواڑ اپنا سلسلہ نسب نوشیروان کسریٰ سے ملاتے ہیں

پھر آگ پر بھونا اور پانی میں ملا کر کھایا۔
آپ رواۃ حدیث اور ائمہ رجال کے طبقہ سوم میں شمار ہوتے ہیں۔ دو سو پندرہ حدیثیں آپ سے مروی ہیں۔ رسول مقبول روحی فداہ کے خدمت گزاران خاص سے تھے۔ صاحب حیوٰۃ الحیوان لکھتا ہے کہ آپ نازک مواقع پر حراست و نگہبانی نبی محترم صلی اللہ علیہ وسلم کی فرماتے تھے حتیٰ کہ فرمان باری وَاللّٰہُ یَعۡصِمُکَ مِنَ النَّاسِ (اللہ آپ کو لوگوں (کے شر) سے محفوظ رکھے گا۔ جزو ۶ سورۃ المائدہ ع ۱۱) نازل ہوا اور اس خدمت سے سبکدوش کر دیا۔
آپ تمام غزوات اور اکثر سرایا میں شریک تھے۔ اعلائے کلمۃ اللہ کے لئے اسلام میں پہلا خون جو بہایا اور خدا کی راہ میں پہلا تیر جو پھینکا گیا وہ آپ ہی کے دست حق پرست سے تھا۔ آپ مع چند مخلص مومنین کے بعض شعاب کے اندر مصروف نماز تھے۔ مشرکین نے اطلاع پائی تو ان پر عیب لگائے اور حملہ و جدال سے پیش آئے۔ حضرت سعد نے انہیں سے ایک شخص کے سر مارا۔ اس کا سر زخمی ہو گیا۔ چنانچہ خود فرماتے ہیں اِنِّی لَاَوَّلُ الْعَرَبِ رَمٰی بِسَہْمٍ فِیْ سَبِیْلِ اللّٰہِ۔ یہ واقعہ ۱ھ (۶۲۲ء) کا ہے۔
اُحد کے دن (۱۴ شوال ۳ھ مطابق ۲۹ مارچ ۶۲۵ء روز جمعہ کو) آپ نے کارہائے نمایاں فرمائے اس پر سرور اکرم صلعم نے دعا فرمائی اَللّٰھُمَّ اَسْدِدْ رَمْیَتَہٗ وَاَجِبْ دَعْوَتَہٗ اے خدا! سعد کی تیر اندازی کو مضبوط و قوی فرما دے اور اُس کی دعا قبول کر (شرح السنہ) دوسری مرتبہ ارشاد ہوا اَللّٰھُمَّ اسْتَجِبْ لِسَعْدٍ اِذَا دَعَاکَ بار الٰہا تو سعد کو مستجاب الدعوات بنا (ترمذی) اس کا اثر یہ تھا کہ آپ جو دعا فرماتے مقبول ہوتی تھی۔ ان کے قبول دعا کے بہت سے واقعات سیر و احادیث کی کتابوں میں مرقوم ہیں۔ آپ جب امیر کوفہ تھے تو چند فتنہ پردازوں نے حضرت عمر رضی اللہ عنہ سے انکی جھوٹی شکایت کی۔ حضرت عمر نے اسکی تحقیق و تفتیش فرمائی۔ خلیفہ کا معتمد مسجد میں جا کر حضرت سعد کے بارہ میں دریافت کرتا پھرتا تھا ایک شخص ابوسعدہ نے غلط شہادت دی کہ سعد نماز ٹھیک نہیں پڑھاتے ہیں۔ آپ بے اختیار ہو گئے اور فرمایا کہ "خداوندا! اگر یہ جھوٹا ہو تو اس کو آزمائش میں ڈال" یہ دعا بارگاہ الوہیت میں قبول ہوئی اور اس شخص کا یہ مآل ہوا کہ پیرانہ سالی میں پلکیں لٹک آئی تھیں مگر بازاروں میں چھوکریوں کو چھیڑتا پھرتا تھا اور کہتا تھا کہ مجھے سعد کی بد دعا لگ گئی ہے"۔

آزادوں کی بات کا ماننا نہ ماننا تو اہل بصیرت مورخ اور محقق اسلاف و انساب کا کام ہے۔ تذکرہ نگار کو اِن تحریرات و روایات کے نقل و یکجا کر دینے سے چارہ نہیں اُسکے لیے نہ تصدیق کا موقع ہے نہ تکذیب و تغلیط کا۔ غالباً اِن سب کا ماخذ اصلی ابوالفضل علامی کی تحریر ہے۔ آئین اکبری میں چیتور کے متعلق لکھا ہے "سردار بومی را پیشتر راول گفتے وازدیرباز رانا گویند۔ از قوم گھلوت خویشتن را از نژاد نوشیروان عادل برشمارد"۔

حضرت سعد رحمت عالم صلے اللہ علیہ وسلم کے ہمرکاب مکہ معظمہ گئے وہاں سخت بیمار اور قریب مرگ ہو گئے تو حضرت صلعم عیادت کو تشریف لائے اور تین بار دعائے صحت فرمائی چنانچہ شفا پائی اور حضرت صلعم کی رحلت کے بعد چوالیس ۴۴ یا چھیالیس برس زندہ رہے۔

ترمذی نے اپنے جامع میں ایک باب مناقب سعد بن وقاص کے نام سے لکھا ہے اور روایت کی ہے کہ ایکبار رسول مقبول صلی اللہ علیہ وسلم ایک بڑے چبوترہ پر جلوہ افروز تھے اور شمع نبوت کے گرد اُسکے پروانے یعنی صحابۂ کرام نثار ہو رہے تھے کہ اس اثنا میں حضرت سعد تشریف لائے تو جناب رسالتمآب نے فرمایا کہ "یہ میرے ماموں ہیں بھلا تم میں سے کوئی بھی میرے ماموں کیسا ایسا ماموں دکھا سکتا ہے"؟

حضرت علی کرم اللہ وجہہ فرماتے ہیں ماجمع رسول اللہ صلعم اباہ وامہ اِلّا لسعد۔ قال له یوم احد ارم فداك ابی وامی ایها الغلام الحزور (رواه الترمذی)

حضرت عمر کے عہد خلافت میں یزدگرد کے مقابلہ کے لئے جو لشکر بھیجا گیا تھا آپ اُسکے سردار تھے۔ آپ نے پہلے نرمی و آشتی سے کام لینا چاہا مگر جب کام نہ نکلا تو آپ لڑے اور خوب لڑے۔ محرم ۱۵ھ (فروری ۶۳۶ء) میں قادسیہ کے تینوں معرکے اور اُن کی فتح "تاریخ اسلام میں یادگار ہیں۔ پھر بابل۔ کوثی۔ بہرہ سیر۔ مدائن (پایہ تخت ایران) پر مسلمانوں کا جھنڈا بلند کیا ۱۶ھ (۶۳۷ء) میں جلولاء کی لڑائی سے عراق اور ۱۷ھ میں جزیرہ کا سارا علاقہ فتح ہو گیا سب سے پہلے مفتوحہ ممالک کی مردم شماری کرائی پھر بصرہ و کوفہ کو آباد کرایا بعض شکایات کی بناء پر حضرت عمرؓ کے زمانہ میں آپ گورنری کوفہ سے معزول اور آپ کے بجائے عمار بن یاسر مامور ہوئے لیکن حضرت عثمانؓ کی خلافت میں دوبارہ وہی خدمت پھر سپرد ہوئی۔ پہلے ۲۴ھ (۶۴۵ء) سے ۲۵ھ (۶۴۶ء) تک چند مہینے۔ پھر دوسری بار ۳۰ھ (۶۵۱ء) سے ۳۴ھ (۶۵۴ء) تک انجام دی

باایں ہمہ کہ حضرت عمر نے باقتضائے مصالح آپ کو ولایت کوفہ سے سبکدوش کیا تھا لیکن اُنکے دل میں آپ کا احترام اور آپ کی دیانت کا وثوق باقی تھا حتی کہ اپنی وفات سے پہلے جن چھ صحابیوں کو اپنے میں سے خلیفہ تجویز کر لینے کا اختیار دیا تھا اُن میں سعد بھی تھے لیکن آپنے خلیفہ ہونا منظور نہ فرمایا۔

ڈاکٹر ولیم ہوئی William Hoey, M A., D. Lit (بحوالہ تاریخ فرح بخش مولفہ محمد فیض بخش) اپنی کتاب "تذکرہ دہلی و فیض آباد Memoirs of Delhi and Faizabad. (جلد اوّل مطبوعہ ۱۸۸۹ء) میں مرہٹوں کی اصل و نسل کے متعلق لکھتے ہیں کہ "مورخین نے سنتا ایسر سیواجی کے اجداد و اسلاف کی نسبت بہت کچھ لکھا اور اسکے سلسلہ نسب کا پتہ نوشیرواں تک چلایا ہے۔ رانایان اودے پور، سنتا کے رشتہ دار ہیں۔ سنتا کا پردادا اپنے بھائیوں سے جھگڑ کر اودے پور سے چلا آیا تھا۔ دکھن میں بمقام قصبہ مرہٹ قیام گزین ہوا۔ اسی لئے "مرہٹہ" کہلاتا ہے"۔

اور حضرت عبدالرحمٰن کو ان کا حق دیدیا۔

حضرت عثمان کے آخر زمانہ خلافت میں جو سازشیں اور شورشیں رونما ہوئیں انکی اصلاح و انسداد میں آپنے بقدر مقدور سعی مبذول فرمائی اور ناکام رہے وَكَانَ أَمْرُ اللَّهِ مَفْعُولًا (اور خدا کا حکم ہو ہی کر رہا۔ جزء ۲۲ سورۃ الاحزاب ع ۵-۲)۔ اُنکی شہادت سے نہایت ملول و دل شکستہ ہو کر گوشہ گزیں ہو گئے تھے۔ حضرت علی اور امیر معاویہ کے مناقشات و معاملات سے بھی دور دور رہے۔

۵۵ھ (۶۷۵ء) یا ۵۸ھ (۶۷۸ء) میں اسی یا نوے سال کی عمر میں موضع عقیق میں رحلت فرمائی آپ کا جنازہ (دو میل کے فاصلہ پر) مدینہ منورہ لایا گیا۔ مروان بن حکم نے جو مہاجرین رضی اللہ عنہم اجمعین سے اُس وقت تنہا زندہ اور والی تھے مسجد نبوی میں نماز پڑھائی۔ بقیع پاک میں سپرد خاک کیا۔

عمر بن سعد وقاص (آپکا بیٹا) بڑا شاعر اور مرثیہ شناس اہل بیت اطہار تھا۔ جسکے بعض اشعار قاضی نور اللہ شوستری نے فاتحہ کتاب مجالس المومنین میں نقل کئے ہیں۔

[اہل سیرت و عقیدت کو عمر بن سعد کے اوصاف و محامد میں مبالغہ و غلو کا اختیار رہے لیکن مورخ کا قلم اس الم انگیز حقیقت کے اظہار پر مجبور ہے کہ یہ ہی عمر بن سعد رے و اعمال رے کا والی تھا جسکو ابن زیاد نے امام حسین علیہ السلام کے مقابلہ و قتال کے لئے سپہ سالار بنا کر بھیجا تھا جس نے وادی کربلا میں فرات کا پانی امام اور حرب و انصار امام پر بند کر دیا تھا اور تشنگی کے ساتھ ہر قسم کی اذیات روحانی و جسمانی پہنچائی تھیں اور جب یزید بن حصین ہمدانی سمجھانے گئے اور پانی کے لئے گفتگو کی تو نامانہ کچھ جواب دیا۔ ہمدانی نے جل کر کہا هذا ماء الفرات يشرب منه الكلاب والدواب ممتنعه ابن بنت رسول الله صلى الله عليه وآله وسلم وذراريه واهل بيته والعترة الطاهرة يموتون عطشا وقد حلت بينهم وبين الماء وتزعم انك تعرف الله ورسوله تو عمر نے سر نگوں کر لیا اور کہا کہ اے اخا ہمدان! میں نہیں جانتا کہ آپ کیا کہتے ہیں میں اپنے نفس کو اس قابل نہیں پاتا کہ وہ رے کی حکومت ترک کر کے غیر کے ہاتھ میں جانے دیا گوارا کرے۔ عمر بن سعد کا یہ کارنامہ بھی

اَدَبِ سِیادَت

ایک ضروری اور نازک بات خود سادات عظام کو اپنا ادب و احترام ملحوظ رکھنے کے متعلق ہے
مولانا سید قمر الدین حسینی اورنگ آبادی سادات خجندی اور اجلہ اتقیا سے تھے ادائے فریضہ
حج کے لئے جب مکہ معظمہ پہونچے تو وہاں کے عمائد و اعیان نے اُنکی بڑی تعظیم و تکریم کی اور ضیافت

تاریخ اسلام کے اوراق پر ہمیشہ ثبت رہیگا کہ امام اور اُنکے اصحاب کے سرہائے مبارک سنان بن انس نخعی کے ہمراہ اسی نے ابن زیاد کے پاس بھیجے تھے ؎ جامی چہ لاف می زنی از پاک دامنی ✤ بر دامن تو این ہمہ داغ شراب چیست

۹۶ یزدجرد ثالث پسر شہریار و نبیرۂ خسرو پرویز ملکہ آرزم دخت Arzami Dakht کے عزل کے بعد ۱۱ھ (۶۳۲ء) میں تخت نشین ہوا اسی کو اہل یونان Isdigertes III لکھتے ہیں۔ خلیفۂ ثانی حضرت عمر بن الخطاب کا معاصر تھا۔ اپنے اجداد کی شان میں خواہ سلسلہ پدری میں ہوں خواہ مادری میں کوئی بے ادبانہ کلام زبان سے نکالنا خلاف آداب شرافت ہے، لیکن مورخین لکھتے ہیں اور مجھکو اُنکے الفاظ کے نقل کردینے سے چارہ نہیں کہ "یہ شاہزادہ جتنا بدنصیب تھا اُتنا ہی کمزور و بزدل بھی" تخت پر نو سال رہا۔ یہ زمانہ تخت نشینی سے شروع ہوکر نہاوند کی لڑائی پر ختم ہوجاتا ہے جس نے ایران کی قسمت کا فیصلہ کردیا تھا جو اُسی تاریخ یعنی سنہ ۲۰ھ مطابق ۶۴۱ء سے اہل عرب کے تحت حکومت آگیا۔ اسکے بعد یہ بادشاہ دس سال تک آوارہ و سرگرداں پھرتا رہا۔ کوئی حکومت یا اختیار کسی قسم کا نہ رکھتا تھا۔ پہلے سیستان بھاگ کر گیا پھر خراسان کو، وہاں سے مرو۔ بالآخر مرو میں ۳۱ھ (۶۵۱ء) میں قتل کردیا گیا۔ ساسانی خاندان کا وہ اخیر بادشاہ تھا۔ اس خاندان نے فارس میں چارسو پندرہ ۴۱۵ سال تک فرماں روائی کی۔ اِسی کے عہد کے آغاز سے ایرانی سال چلتا ہے جو آج تک اُس ملک میں مروج اور اُسکے نام سے منسوب "سال یزدجردی" کہلاتا ہے۔ سہ شنبہ ۲۰ ربیع الاول ۱۱ھ (۱۶ جون ۶۳۲ء) یعنی حضرت محمد مصطفےٰ صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات کے آٹھ یوم بعد سے شروع ہوتا ہے۔

نیک نفس براؤن جو عجم کی ہر ادا کا دلدادہ اور ہر فرد کا ستائشگر تھا لکھتا ہے کہ "یزدجرد جب خراسان کو بھاگا ہے تو اسکی قوت زائل ہوچکی تھی یہ یزدجرد ثالث شاہانہ اور شریفانہ نسل ساسانیان کا خاتم و آخر تھا۔ اُس نے ایک کم بخت خبیث کے ہاتھ سے جسکے دندان آز اسکے رخشندہ و درخشندہ جواہرات کو دیکھ کر تیز ہوگئے تھے یکہ و تنہا مصیبت کے ساتھ جان دی۔ اس کے پاس یہی جواہر باقی رہگئے تھے جو اس آفت رسیدہ و خستہ حال بادشاہ کے علو مرتبت اور زوال دولت کا پتہ دے رہے تھے" یزدجرد سوم اخیر ۶۳۲ء یا شروع ۶۳۳ء میں تخت نشین ہوا تھا۔ یزدجرد اوّل کا زمانہ ۳۹۹ء سے ۴۲۰ء تک

وہمانیان کین۔ اتفاقاً وہان کے سرداران مین سے ایک صاحب نے جو شریف مکہ کے مدار المہام اور سید بھی تھے مولانا سے ملاقات کا اشتیاق ظاہر کیا اور خواہش کی کہ مولانا تقدیم فرمائین۔ مولانا نے منظور کیا۔ ملے تو فرمایا کہ مین دو وجہ سے آپ کی زیارت کے لئے حاضر ہوا ہون۔ اولاً آپ حاکم ہین او حکم حاکم کی اطاعت لابدی ہے ورنہ مستحق تقدیم خود جناب تھے مشہور ہے کہ اَلقَادِمُ یُزَارُ۔ یہ بھی ظاہر ہے کہ شوق جس طرف سے ہوتا ہے کھینچ لاتا ہے نہ کہ بالعکس۔ ثانیاً سادات کو نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ دو نسبتین ہین۔ ایک خاص یعنی یہ کہ وہ حضرت صلعم کے بضعہ و پارہ ہین۔ دوسری عامہ یعنی حضرت اقدس کی اُمّت محبوبہ سے ہین پس جس طرح تمامی اُمت پر آپکے ایک پارہ کی تعظیم واجب ہے۔ اسی طرح خود اُن پر بھی لازم ہے کہ بعض کے اُمتی ہونے کی حیثیت سے بعض کے بضعۃ الرسول ہونے کی شان سے تعظیم کرین بلکہ ہر ایک پر یہ بھی واجب و لازم ہے کہ خود اپنی بھی توقیر و تکریم کرے تاکہ دونون حق ادا ہو جائین۔ مولانا نے اسی سلسلہ مین یہ بھی بیان فرمایا کہ جب میرے بدن کا کوئی جزو مثلاً ناخن یا بال جُدا ہو جاتا ہے تو مین اس کو کسی پاک جگہ مین دفن کردیتا ہون اور اُمتیت کی حیثیت سے بضعیت کا احترام کرتا ہون۔

صاحب مرآۃ المبتدئین میر سید حسین بن سید ابراہیم ملقب بہ سید السادات کے تذکرہ مین لکھتے ہین کہ گرد و پیش خانہ میر مرحوم سادات از قوم و خویشانش متوطن بودند۔ اگر پسر بدان راہ می رفت تمام قد برمی خاست۔ و اگر رضعہ طفلے را از سادات بخدمتش می آورد تا دعا خوانده بردو بدامی رپا خاستہ دعا می دمید۔ میر عمر بسیار یافت تا زندہ بود حالش

تک مورخین عرب کی تحریر کے مطابق تھا۔ عربون نے یہ تین دہلوی تا بہ شاہان سے نقل کئے ہین یہ سب پر دحر دگرگناہگار (اہل فارس بزہ گر) اور اعراب الآثم) لکھتے ہین۔۔ گوبنو Gobineu کا یہ لکھا صحیح ہے کہ اہل عجم اور بعد کے فارسی مورخین آل ساسان کی فوق البشریت یعنی اُنکی الوہیت کے قائل تھے "

۵۸۷ سبحۃ المرجان

۵۹۰ میر سید حسین بڑے عالی شان بزرگ تھے حضرت شیخ عبد العزیز دہلوی (مدفون خالفاہ بشرق) کے شاگرد و مرید و داماد اور بڑے عالم متبحر تھے۔ اُن کے سوانح نگار لکھتے ہین کہ اُن کے چہرہ پر سیادت

ہمین بود۔ ونیز در مجلس خاص وعام می فرمود کہ اولاد فاطمہ آمرزیدہ اند ہر چند مردم منع می کردند کہ سادات بسیار از عبادت باز خواہند ماند این چنین گفتن مصلحت نیست جواب می داد۔ اگر مصلحت نمی شد ہمی نوشتند بالوسشتہ اظہار آن نقل میکنیم تادم آخر ہمین کلمہ از زبانش جاری می شد"

سر سید حسین کا یہ قول کہ حضرت فاطمہ کی تمام اولاد کی شان مین جنت کی بشارت آچکی ہے حضرت شیخ محی الدین ابن العربی کے مذہب کے موافق ہے جسکو فتوحات مکیہ[۵۸] کے انتیسوین[۲۹] باب مین بیان فرمایا ہے۔ شیخ ابن حجر مکیؒ نے صواعق محرقہ مین احادیث نبویہ اور علماء کے اقوال اس بارہ مین نقل کئے ہین ان شئت ذالک فاطلب ھنالک

شیخ عبدالعزیز[۵۹] دہلوی جو خانوادہ ہائے سہروردیہ وچشتیہ کے چشم وچراغ اور تمام امراء اعیان دولت اکبری کے مقتدا تھے بحر مواج کہلاتے، اتباع سنت سنیہ مین بالکل محو ہو چکے تھے خاندان نبوت کے ساتھ اخلاص واعتقاد ہر شے سے زیادہ رکھتے تھے حتی کہ ان کے محلہ مین بعض اہل حرفہ بھی رہتے تھے جو اپنے کو سید بتاتے اور بتاتے تھے۔ شیخ صاحب جب

نجابت کے آثار و انوار نمایان تھے شیخ کو ان کے تعلق وقرابت پر بڑا فخر تھا

۵۸ فتوحات مکیہ احکام شرعیہ کے اسرار اور حکم الٰہیہ کے دقائق کے بیان مین نہایت ضخیم اور لاجواب کتاب شیخ اکبر محی الدین محمد بن عربی کی تصنیف ہے۔ سارے عالم اسلامی مین شیخ کی شہرت ایک عارف حقیقی اور حکیم الٰہیات ہونے کی حیثیت سے چلی آتی ہے مشرق پسندان فرنگ پر بھی ان کی تحریر و تقریر کا بڑا اثر ہے۔ نرائن اہمالی نے کمال عقیدت و احترام کے ساتھ آپ کو یاد کیا اور آپ کی کثیر وکبیر الحجم تالیفات کا ذکر کیا ہے وہ آپ کو مغرب کا سب سے بڑا صوفی بتاتا ہے۔ سینیار ڈان میگوئیل آسین Senor Don Miguel Asin جو ایک کیتھولک (کلیسائے روم کا پیرو) پادری اور اسپین کا مشہور عربی دان محقق و پروفیسر ہے لکھتا ہے کہ اٹلی کے عیسائی شاعر دانتے Dante نے اپنی نظم The Divine Comedy مین دنیا دون اور عالم معاد کی نسبت جو کچھ تخیل و تصور قائم کیا اور بیان کیا ہے وہ تمام تر روایات اسلامی پر مبنی اور بالخصوص حکیم ابن عربی Murcian Mystic کی تالیف فتوحات سے ماخوذ و مستنبط ہے۔ یہ معلومات دانتے نے برونیتو لاطینی Brunetto Latini اور دیگر ذرائع سے حاصل و فراہم کی ہین

درس دینے کے لئے باہر نکلتے تو طلبہ کا ازدحام ہوتا تھا۔ اسی حالت میں اگر لوگوں میں سے کوئی حرف سوال کھیلتا ہو، آپ کو نظر آجاتا تھا تو درس کو بے توقف روک کر کھڑے ہو جاتے۔ وہ لڑکا جب تک کھیلتا رہتا آپ بہ ادب تمام کھڑے رہتے اور لیے قرب سے ہٹاتے نہ تھے۔ طالب العلم نہایت تنگ آگئے تو توجہ کے سر نگاہبان مقرر کر دئے تاکہ کوئی بچہ ادھر نہ آنے پائے۔ شیخ کو جب یہ خبر پہونچی تو طلبا کو زجر و تنبیہ فرمائی۔ جبتک زندہ رہے یہی کیفیت قائم رہی[۱۹۰]

ظاہر ہے کہ مختلف ذرائع و وسائل سے مختلف جماعات و طبقات بجائے خود اپنی فلاح عاقبت کی امید کرتے اور آس لگاتے ہیں کل حزب بما لدیہم فرحون (جو جس فرقہ کے پاس ہے اسی سے خوش ہے جزو ۱۸ سورۃ المومنون ع ۴-۳)

رفع دخل مقتدایان ملت خصوصاً میر عبد الجلیل کے سلاف کا خیال سادات کی منزلت جلیلہ اور شان منصرت کی نسبت جو کچھ رہا ہو لیکن میر اپنے اخلاف و متوسلین کو ہمیشہ کارہائے خیر کی موعظت، امر بالمعروف و النہی عن المنکر کرتے رہتے ہیں۔ میر سید محمد کو مخاطب کرکے فرماتے ہیں

"و عمدہ نصیحت من بشما این ست کہ بر نماز پنج وقت مواظب باشد کہ از شخصے کہ نماز نہ کند خیر و برکت دین و دنیا مسلوب است، و ہر گاہ نماز فارق اسلام و کفر باشد اعتناء[۱۹۱]

حسرت و افسوس ہے کہ حال ہی میں سید عبد الجلیل کے کتب خانہ کی، فتوحات مکیہ کا مکمل نسخہ چار جلدوں میں سے میر واجب الاحترام مخدوم مولانا عبد العزیز میمن راجکوٹی کی نظر سے گذرا تھا جسکے آخر میں سید صاحب کے دستخط اُنکے قلم سے ثبت تھے۔ مالک کے انتقال کے بعد ان مجلدات کا شیرازہ بکھر گیا۔ دو جلدیں لاہور کے ایک اہل علم مسٹر محمد سلیم ایم اے کے حصہ میں آگئیں جن میں دستخط مذکور موجود ہیں۔ فاضل و وسیع النظر میمن کی رائے ہے کہ فتوحات کا یہ نسخہ دنیا کے بہترین نسخوں میں شمار ہونا چاہیے۔

[۱۹۰] شہ ۹۶۰ھ (۱۵۶۰ء) میں محمد اکبر بادشاہ کے عہد میں دفتر یا کی عموماً خطوط و صحائف "ذرہ ذرہ ناچیز عبد العزیز" لکھا کرتے تھے۔ اسلئے تاریخ بھی "ذرہ ناچیز" قرار پائی۔ شیخ عبد القادر بدایونی سے منصب طریقت تمام، تاریخ نکالی (خیال ہے کہ شیخ عبد العزیز دہلوی نے ۹۷۵ھ میں وفات پائی تھی اور ایک دوسرے بزرگ تھے) آئین اکبری میں شیخ کا نام دخدیولت آئین کے ذیل میں لیا گیا ہے

[۱۹۱] مراۃ المبتدین

شان صلوٰۃ ازین جا معلوم باید کرد۔ برین بمقتضائے کریمہ وَأْمُرْ أَهْلَكَ بِالصَّلٰوةِ
واجب بود کہ درین باب تاکید بشتابانہ نویسیم و در عاقبت از مداہنت درین امر برآیم
شما ہم سعادت مند اید اطاعت امر والدین کہ بنص قرآنی واجب است البتہ خواہید
کرد و برنماز پنجگانہ مواظبت خواہید نمود۔ زیادہ درین باب مبالغہ نا کجا نمودہ شود۔

شناختِ سادات

ملک العلماء قاضی شہاب الدین[٩٤] دولت آبادی دہلوی مناقب السادات مین لکھتے ہین
"امارت صحت سیادت خلق محمدی است و سخاوت ہاشمی و شجاعت حیدری۔ باید کہ صحیح النسب
ازین ملکات بہرہ وافی داشتہ باشد و احیاناً بحکم نفس امّارہ اگر مرتکب عصیانے
شود آخر کار سلبی رومی دہد کہ باعث نجات اخروی می گردد"۔
قاضی صاحب بڑے نامور عالم و فاضل اور شیخ طریقت گذرے ہین۔ مولانا محمد خواجگی[٩٥] دہلوی کے

---

[٩٢] صحابہ پاک رضی اللہ عنہم اسی نماز کو کفر و اسلام مین ذریعہ تمیز اور نشان ایمان سمجھتے تھے۔ فاروق اعظم نے فرمایا ہے کہ من ضیع الصلوٰۃ فھو لما سواھا اضیع "نماز سب سے بڑی اور بزرگ جبر ہے جسنے اسکو ضائع کردیا اس سے کسی عمل خیر کی توقع نہین"۔ خاتم الرسل علیہ الصلوٰۃ والسلام نے فرمایا ہے الصّلٰوۃ عماد الدین من اقامھا فقد اقام الدین ومن ترکھا فقد ھدم الدین (نماز دین کا ستون ہے جس نے اسکو قائم رکھا اسنے دین کو قائم رکھا اور جس نے اس کو ترک کیا اس نے دین کو منہدم کردیا) دوسرے موقع پر ارشاد ہوا ہے حبب الیّ من دنیاکم ثلاث الطیب والنساء وقرۃ عینی فی الصّلٰوۃ "حیات دنیوی مین مجھے تین چیزین پسند ہین ایک خوشبو۔ دوسری عورتین تیسری نماز جو میری آنکھوں کی ٹھنڈک ہے"۔ شریعت اسلامی نے لازم کیا ہے کہ نماز کی پابندی کیلئے ہدایت و تاکید سات سال کی عمر سے شروع کی جائے جو حضانت (ماں کا بچہ کو گود مین رکھنے) کی مدت کے ختم کا وقت ہوتا ہے۔ دس سال کی عمر مین بھی اگر پابندی نماز نہ ہو تو زد و کوب کا حکم آیا ہے۔ زمانۂ بلوغ سے مدت العمر کے لئے فرض ہوجاتی ہے۔ ادائے نماز کے لیے کوئی پہلو، کوئی گھڑی اس قسم کوئی ساعت و وقت فروگذاشت نہین ہونے پایا ہے۔ کلام پاک مین کتنی تاکیدات ادائے صلوٰۃ کے لئے وارد ہوئی ہین احادیث نبوی علی صاحبہا الصلوٰۃ والسلام مین کیسی کیسی خبر اور سرائین آئی ہے۔ اس مین تغافل و تساہل کیا۔

اَجَلّ خُلفا اور قاضی عبدالمقتدر شریحی[۹۶] اور سید میر اشرف[۹۷] سمنانی کے مایہ ناز شاگرد تھے۔ نحو و بلاغت و تفسیر و تقسیم علوم اور تقسیم صنائع میں بڑی مستند کتابیں لکھی ہیں۔ سلطان ابراہیم[۹۸] شرقی ان کا بڑا قدر شناس اور خدمتگذار تھا۔ مَلِکُ العلما خطاب بھی انہی نے دیا تھا۔ اس رسالہ مناقب السادات

روز محشر کہ جانگداز بود
اولین پرسش نماز بود

۹۳ اپنے گھر والوں کو نماز کا حکم دیجیے جز ۱۶ سورۂ طٰہٰ ع ۱۷ - ۸

۹۴ ۲۵ رجب المرجب ۸۴۹ھ (۳ اکتوبر ۱۴۴۵ء) کو جونپور میں وفات پائی۔ ان کے حالات اخبار الاخیار و حزینۃ الاصفیا میں ملیں گے۔ انھیں کی نسبت ان کے استاذ شفیق قاضی عبدالمقتدر کہا کرتے تھے یاتینی من الطلبۃ من جلدہ علم و لحمہ علم و عظمہ علم

جونپور اور سلطنت شرقیہ کے سلسلہ میں شیخ ابوالفضل آئین اکبری میں لکھتا ہے۔

دانائے ہند قاضی شہاب الدین درین روزگار ماسور گردید۔ زادگاہ او دولت آباد دہلی است
دران مصر جامع عقلی و نقلی علوم را گرد آوری کرد بہنگام رسیدن صاحقرانی بہمراہی استاد خود
مولانا خواجگی کہ خلیفہ نصیرالدین چراغ دہلی است بجونپور آمد و آنجا نشو و نما یافت و محسود ہمایان
گشت بستاہ مدار کہ از اولیائے ہند است و سرچشمۂ سلسلۂ مدار او بود و خیال بچہ بسم است کہ
دانش نشان ظاہر را ما دیدہ و ران باطن سترگرائی مانند ادیب مشرب خیرالدین ترکی داشت

۹۵ مولانا خواجگی عالم ربانی تھے عالم رویا میں شیخ نے افواج تیموری کی حملہ کی خبر پا کر دہلی چھوڑ دی اور کالپی چلے گئے تھے وہیں انتقال
۹۶ قاضی عبدالمقتدر الشریحی الکندی الدہلوی بڑے عالم و فاضل گزرے ہیں۔ قاضی رکن الدین کے بیٹے اور شیخ نصیرالدین محمود اودھی دہلوی کے تلمیذ رشید اور مرید سعید تھے۔ اشاعت سنت نبویہ میں اپنے اسلاف بزرگ کے سچے پیرو تھے۔ شیخ عبدالحق دہلوی نے ان کا قصیدۂ لامیہ اخبار الاخیار میں نقل کیا ہے۔ میر غلام علی آزاد نے تسلیۃ الفواد میں اسکے حالات تحریر فرمائے ہیں۔ ہندوستان کے اجل متبحر علماء دین میں ان کا شمار ہے۔ ۲۶ محرم مکرم ۷۹۱ھ (۲۵ جنوری ۱۳۸۹ء) کو اٹھاسی سال کی عمر میں رحلت فرمائی۔ آپ کی ضریح منور دہلی میں حوض شمسی کے قریب ہے

۹۷ خراسان کے مشہور قصبات میں سے کسی وقت سمنان بھی ایک نفیس اور مردم خیز قصبہ تھا۔ میوہ ، افزار اور انار بالخصوص بے نظیر ہوتا تھا۔ اہل تمیز سے زیادہ شعرا کے کلام اور تشبیہات میں کام آتا تھا۔ سمنان۔ بلدہ من بلاد قومس بین الدامغان و خوار الری و تریتہ من قری نساپور۔ و ذکرہ السمعانی علی بن محمد بن احمد ابوالقاسم السمنانی مشہور امام و فاضل اسی سے منسوب ہے
اسی سرزمین کو ابوالمکارم شیخ علاء الدولہ (خواجہ رکن الدین احمد بن محمد بن احمد سمنانی) کے موطن و مولد ہونے کا بھی فخر حاصل ہے۔ شیخ کا نام ان اوراق میں کئی جگہ آیا ہے۔ اسلئے مختصراً ان کا ذکر کر دینا لازم ہے۔ آپ کا خاندان امیر کبیر تھا۔ آپ کے چچا شیخ شرف الدین، سلطان ارغون خان کے ندیم و مقرب خاص تھے

میں اپنی عقیدت اور اہل بیت نبوّت کے ساتھ محبّت کا بہ اَحسن وجوہ و اسالیب بیان کیا ہے باعث تصنیف یہ تھا کہ ایک صاحب سیّد اجمل نام سے جو سادات میں سے تھے مجلس ملوکی میں تَقَدُّم وتَأَخُّر کے سبب سے کچھ نزاع ہوگئی تو قاضی نے ایک کتاب لکھی جس میں سادات پر علماء کی

اسی تعلق سے ایام شباب میں شیخ نے بھی بادشاہی ملازمت اختیار کرلی تھی۔ کچھ زمانہ تک رے کے قاضی رہے تھے۔ اسی زمانہ کی یادگار ایک بڑی تفسیر معروف بہ "تفسیر سمنانی" تیرہ جلد میں موجود ہے۔ دنیا کے دون سے دل بیزار ہوا تو نوکری چھوڑ دی طریقت میں قدم رکھا مدّت دراز تک عبادت و یاد الٰہی میں مشغول رہے۔ رسوم صوفیہ کا احیا کیا۔ مؤرخین لکھتے ہیں کہ جنید بغدادی کے بعد شیخ سے بڑھ کر کوئی بزرگ و متقی نہیں گذرا۔ محدث بھی تھے فقیہ بھی

شیخ کے اوصاف اور تواضع و فروتنی کی یہ کیفیت تھی کہ جب مولانا نظام الدین ہروی نے شیخ کی تکفیر فرمائی اور لکھ کر بھیجا کہ "تم کافر ہو" تو مولانا کا رقعہ پڑھ کر شیخ زار زار روئے اور کہا کہ "اے نفس ایں ستر برس سے تجھ سے کہہ رہا تھا کہ تو کافر ہے مگر تو باور نہیں کرتا تھا!! اب بھی کچھ شبہ رہا؟ اب تو مسلمانوں کے امام اور شرق و غرب کے مفتی نے تیرے کافر ہونے کا فیصلہ کردیا مان لے۔ اب بھی گردن جھکا دے اور مجکو بتا"

پھر یہ رباعی پڑھی ؎

نفسے ست مرا کہ غیر شیطانی نیست — وز فعل بدش ہیچ پشیمانی نیست
ایں است ہزار بار تلقین کردم — این کافر را سر مسلمانی نیست

شیخ نے ستر (۷۰) برس کی عمر پاکر شب جمعہ ۲۳ رجب ۷۳۶ھ (۸ مارچ ۱۳۳۶ء) کو بغداد میں وفات پائی صاحب مرآۃ التفسیر نے سال وفات ۷۳۷ ہجری لکھا ہے

۵۹۵ اس ناچیز تذکرہ کے حواشی میں ، ہندوستان کے سلاطین و اُمرا کے مفصل حالات لکھنے سے عموماً احتراز کیا گیا ہے کیونکہ اہل نظر اُن سے آگاہ و واقف ہیں لیکن یہ سلطان (ابراہیم) اور اس کا خاندان (شرقی) ایسا نہیں گزرا ہے جسکا مختصر تذکرہ کر دینے سے بھی دریغ کیا جائے

ملک سرور خواجہ سرا کو بادشاہ دہلی نے خواجہ جہاں (با روایت ابوالفضل، خان جہاں) خطاب دیا اور وزیر مطلق مقرر کیا تھا سلطان محمود جب تخت پر بیٹھا تو صوبجات شرقی کا گورنر بنا دیا۔ کچھ دن بعد وہ خود مختار اور سلطان الشرق بن گیا سنہ ۷۹۶ھ (۱۳۹۴ء) میں قنوج سے لے کر بہار تک یعنی جملہ ممالک محروسہ ہند کا نظم و نسق اُسکے عنان قدرت میں آگیا تو اُس نے "اتابک اعظم" کا لقب اختیار کیا۔ اس کا دارالحکومت جون پور تھا جس کو سلطان فیروز شاہ باربک مرزبان دہلی نے اپنے برادر عم زاد فخرالدین محمد جونان کے نام سے سنہ ۷۷۲ھ (۱۳۷۰ء) میں آباد کیا تھا شہر جون پور، تاریخی نام ہے۔ یہ خاندان ایک صدی کے قریب حکمران رہا۔

فضیلت کا ذکر تھا۔ یہ بھی لکھ دیا تھا کہ علماء کی فضیلت علم کی وجہ سے ہے جو عالم میں باہر و ظاہر ہوتا ہے سادات کی علویت کی فضیلت موہوم ہوتی ہے اُس کا ثابت کرنا بہت مشکل ہے۔ اس کے بعد شاہ رسالت علیہ الصلوٰۃ والتحیۃ کو خواب میں دیکھا کہ قاضی صاحب پر عتاب فرماتے اور سید اجل کے

سلطان الشرق	سولہ سال	سلطان محمود	اکیس سال چھ ماہ
مبارک شاہ	ایک سال سے زائد	محمد شاہ	پانچ مہینہ
سلطان ابراہیم	چالیس برس سے کچھ زیادہ	حسین شاہ	انیس سال
چھ کس	ستانوے سال چھ ماہ		

بادشاہان دہلی سے اِن کی مخالفت علانیہ رہی لیکن حریف قوی تھا اور زور آزمائی و مقابلہ دشوار۔ ۸۰۲ھ (۱۳۹۹ء) میں خواجہ جہان فوت ہوا۔ وہ بڑا دانشمند، منتظم، مدبر، منصف مزاج والا تھا۔ اُس کا پسر خواندہ اور وارث ملک قرنفل نام، مبارک شاہ کے لقب سے اورنگ نشین ہوا۔ اس کا عہد مختصر اور ناممتاز تھا۔ ۸۰۴ھ (۱۴۰۱ء) میں اس کا چھوٹا بھائی ابراہیم شاہ (برادر زادہ خضر خان) اس کا جانشین ہوا۔ ابراہیم اور اُسکے اخلاف بڑے صاحب خیر اور مُربی علوم و فنون اور قدردان کمال ہنر تھے۔ اپنے قلمرو میں بڑی بڑی مسجدیں، عظیم الشان مقبرے اور بلند و محکم قلعے اپنی یادگار چھوڑ گئے ہیں۔ ابراہیم کی دیرینہ آرزو ۸۱۰ھ (۱۴۰۷ء) میں بر آئی۔ اس نے قنوج سنبھل اور برن (بلند شہر) پر قبضہ کر لیا۔ دہلی پہونچنے کے قریب تھا کہ مظفر شاہ اول والی گجرات کے حملہ اور ہوشنگ شاہ فرمانروائے مالوہ کی شکست کی خبر ملی۔ یہ بھی معلوم ہوا کہ فتح مند مظفر کا قدم اب جونپور کی طرف بڑھنے والا ہے۔ چار و ناچار اپنے مفتوحات جدیدہ سنبھل و برن کو چھوڑ کر ابراہیم اپنے دار الملک کو واپس آیا۔ ۸۱۷ھ (۱۴۱۴ء) میں خضر خان کو دہلی میں اختیار کامل اور اقتدار تام حاصل ہو گیا تو ابراہیم کو اُس جانب کے خطرات اور اندیشوں سے بڑی حد تک اطمینان ہوا۔ ۸۳۱ھ (۱۴۲۷ء) میں وہ کالپی پر حملہ کرنے کے لئے روانہ ہوا لیکن مبارک شاہ نے مزاحمت کی (جو ۸۲۴ھ (۱۴۲۱ء) میں خضر خان کا جانشین ہوا تھا) اُس نے پھر ۸۳۶ھ (۱۴۳۲ء) میں حملہ آور ہونا چاہا مگر ناکام رہا۔ بنگال اور دیگر ممالک متصلہ پر بھی فوج کشی کی تھی۔ ۸۴۴ھ (۱۴۴۰ء) میں ابراہیم اس جہان ناپائدار سے رخصت ہوا۔ یہ بڑا اولو العزم صاحب حوصلہ اور قدر شناس بادشاہ تھا۔ اس کا بنوایا ہوا اٹالہ مسجد جونپور میں اب تک باقی و محفوظ ہے جو ۸۱۱ھ (۱۴۰۸ء) میں مکمل ہوا تھا۔ اسی کے عہد میں مسجد دریبہ اسکے دو امیروں نے تعمیر کرائی تھی اور جھنجھری مسجد بھی، جس کا کچھ حصہ اب باقی رہ گیا ہے۔ جونپور کی مسجد جامع (جس کا تاریخی نام 'مسجد جامع الشرق' ۸۵۲ھ (۱۴۴۸ء) ہے) کی تعمیر بھی اسی خاندان کے دست دریا نوال کی منت گزار ہے۔ اسکی تحریک خود ابراہیم نے کی تھی، نقشہ بھی بنا دیا تھا مگر یہ شرف اسکے پوتے حسین شاہ کے مقدر میں تھا کہ دادا کے ارادے کو پورا کیا

استرضا کی تحریص کرتے ہین علی الصباح، قاضی صاحب جیسے ہی خواب راحت سے بیدار ہوئے تو سید صاحب کی خدمت مین پہونچے۔ توبہ کی۔ اور اپنی کتاب دریا مین ڈال دی اور بلا خوف لومۃ لائم اپنی شرافت نفس و کرامت طبع سے اُس کے بجائے یہ رسالہ محامد و صفات سادات مین تالیف فرمایا۔

سادات حسینی کی شناخت کی نسبت ابو الحسن علی بن الحسین بن علی المسعودی نے بھی ایک واقعہ نقل کیا ہے جس کے ماننے مین دور حاضرہ کے فلسفی الطبع حضرات کو شاید تامّل ہو یا اسکو اتفاقات و واردات ہنگامی پر محمول کرین مگر یہ ایک واقعہ ہے جسکو ایسے بڑے محقق اور نقّاد مؤرّخ نے بقائے عالم تک صفحہ ہستی پر ثبت رہنے کے لئے سپرد قلم کردیا ہے۔ وہ لکھتا ہے کہ ایک عورت نے شریفہ یا سیدانی ہونے کا دعوےٰ کیا۔ خلیفہ عہد متوکل علی اللہ بن معتصم نے امام زمن علی ہادی ابو الحسن نقی العسکری سے اسکی صحت و تصدیق (یا جانچ اور تشخیص) کی درخواست کی حضرت تشریف لائے اور سریر خلافت پر متوکّل کے برابر بیٹھے۔ اور فرمایا کہ اِس کو درندون کے سامنے ڈال دیا جائے اِنَّ اللّٰہَ حَرَّمَ لَحْمَ اَوْلَادِ الْحُسَیْنِ عَلَی السِّبَاعِ اگر یہ واقعی سید زادی ہے تو اسکو جانورون سے گزند نہ پہونچے گا۔ یہ سُن کر عورت گھبرائی اور اپنے کذب کا اقرار کیا۔ حاشیہ نوسان بساطِ خلافت نے متوکّل سے عرض کیا کہ حضرت کے اِس قول کا تجربہ تو کسی طرح کرلیا جائے اِس مقصد سے چند درندے صحن قصر مین لاکر چھوڑ دے گئے۔ اور امام ہمام حسن عسکری سے تشریف آوری کی خواہش کی گئی حضرت اندر آگئے تو دروازہ بند کردیا گیا۔ جانورون کے شور و غوغا سے کانون

قنوج کی جامع مسجد بھی سید ابراہیم کے عہد ہمایون کی باقیات صالحات سے ہے۔

۵۹۹ اٹھارہوین صدی مسیحی کا مشہور مصنف و مترجم ریمان فرانسیسی عرف حاجی مصطفےٰ در ترجمہ سیر المتاخرین جلد اول مطبوعہ کلکتہ ۱۹۰۲ء حواشی نمبر ۱۰۸ و ۲۲۶ مین لکھتا ہے کہ سید و شریف دو جداگانہ اصطلاحین ہین عرف عام مین سید کا اطلاق اُس شخص پر ہوتا ہے جس کا باپ سید یعنی حسنؑ یا حسینؑ کی نسل سے ہو، ماں خواہ کچھ ہی ہو۔ اسیطرح شریف وہ کہلاتا ہے جس کا باپ غیر سید ہو مگر ماں سیدانی رسیدہ ہو۔ کم از کم ہندوستان مین (آج سے دو صدی بیشتر) ان کلمات کا یہی مفہوم تھا۔

پردے کھنچے ہوئے تھے لیکن جس وقت امام عالی مقام تشریف لائے تو بغیر برقعہ رکھائے آپ کے
سب آپ کے نزدیک آکر خاموش ہو گئے اور پاؤں پر کھڑے ہونے لگے۔ حضرت نے اپنی
آستین سے آہستہ آہستہ ہلا دیا تو وہ بیٹھ گئے۔ آپ کے ہمراہ متوکل کے پاس اٹھ کر رخصت فرما
ہوئے۔ آپ سے تو ان جانوروں کا حال دریافت کر لیا جا چکا تھا کہ آپ قصر شاہی سے
باہر تشریف لے گئے تھے۔ پھر اس واقعہ کو دیکھ کر اس نے جائزہ عظیم پیش کیا۔ اس نے
متوکل سے گزارش کیا کہ جیسا حضور کے ... عمل کیا ہے خود بھی تو آزمائش کریں۔ ایسی
جسارت کون کر سکتا تھا؟ متوکل نے فرمایا۔ بولا کہ تم مجھے ہلاک کرا دینا چاہتے ہو۔ پھر حکم دیا
کہ خبردار! یہ راز ہے فاش نہ ہو۔

بعض حفاظ و رواۃ نے اس واقعہ کو سیدنا محمد جواد بن علی رضا کے متعلق بتایا اور حضرت
کے احوال کے ذیل میں نقل کیا ہے مگر صحیح و معتبر یہی ہے کہ یہ قصہ امام علی ابوالحسن عسکریؑ کا ہے
جو آپ کے فرزند تھے۔ تاریخ شاہد ہے کہ متوکل کے معاصر امام محمد جوادؑ نہ تھے بلکہ حضرت علی ہادیؑ تھے
مؤلف کتاب سراج الخرائج کا بیان ہے کہ جمیع سباع و وحوش ائمہ معصومین علیہم السلام کے
رام و تابع احکام تھے۔

ساداتِ حسینی

میر عبدالجلیل (داکہ تمام سادات حسینی) کے نسب کے متعلق چند ضروری باتیں قابل تحریر ہیں۔
جدِّ اعلیٰ یا ابو الآبا سیدنا حسین سبط علیہ السلام ہیں جو امیر المومنین علی مرتضیٰ کرم اللہ
وجہہ کے دوسرے فرزند تھے اور ائمہ اثنا عشر میں تیسرے امام) آپ کی ولادت منتصف ماہ رمضان
۳ھ میں (۲ مارچ ۶۲۵ء کو) ہوئی یا بقول دیگر ۴ یا ۵ شعبان ۴ھ (۱۰ جنوری ۶۲۶ء) کو
حضرت کے مناقب و فضائل نہ صرف ہر مسلمان جانتا ہے بلکہ اکثر ممالک کے ادیان و ملل غیر
کے باخبر لوگ بھی ان سے آگاہ ہیں۔ دنیائے اسلام میں سال اسلامی (ہجرۃ) کے آغاز پر

کربلا کا دور وہ اک واقعہ سنایا جاتا تھا۔ اس کے خونین منظر کا نقشہ عالم کو دکھایا جاتا ہے۔ امام حسین ۱۰ محرم سنہ ۶۱ھ بروز جمعہ چھپن سال کی عمر میں شہید ہوئے آپ کی شہادت کے متعلق تفصیلات صحیح کتب مقاتل و شہادت میں موجود اور تقریباً ہر پڑھے لکھے مسلمان کو معلوم ہیں۔ نقل و اعادہ کی حاجت نہیں۔

حسین بن علی علیہما السلام کے چھ لڑکے اور تین بیٹیاں تھیں ان کے نام اہل سیر نے یہ بتائے ہیں۔

۱۔ علی بن حسین اکبر۔ ان کی ماں لیلیٰ بنت مرہ بن عروہ بن مسعود ثقفی تھیں۔ اپنے پدر بزرگوار کے ساتھ شہادت پائی۔

۲۔ علی بن حسین اوسط۔ جن کا لقب زین العابدین اور کنیت ابو محمد تھی۔ آپ شاہ زنان بنت کسریٰ نوشیروان کے بطن سے تھے۔

۳۔ علی بن حسین اصغر۔ میدان کربلا میں تیر لگا شہید ہوئے۔

۴۔ جعفر بن حسین۔ آپ کی ماں قضاعیہ تھیں۔ اپنے والد ماجد کی حیات میں وفات پائی۔ نسل باقی نہیں رہی۔

۵۔ محمد بن حسین۔ نو عمر وفات حیات پدر میں پائی

۶۔ عبد اللہ بن الحسین صغیر السن تھے باپ کے ہمراہ کربلا میں تھے کہ ایک تیر آ کر لگا اور جام شہادت پلا گیا

۷۔ سکینہ۔ ان کی (اور عبد اللہ دونوں کی) ماں رباب دختر امرء القیس بن عدی کلبیہ تھیں۔ مدینہ میں پنجشنبہ ۵ ربیع الاول سنہ ۱۱۷ھ کو وفات پائی۔ آمنہ و امینہ بھی نام تھے سکینہ ماں نے نام رکھا تھا۔

۸۔ فاطمہ۔ ان کی ماں ام اسحٰق بنت طلحہ بن عبد اللہ تیمیہ تھیں

۹۔ زینب۔

جنابِ شاہِ زنان

حضرت شہر بانو یزدجرد سوم بادشاہ اخیر ساسانیان کی دختر تھیں۔ ان کی مبارک

ذات میں تمام شاہانہ اوصاف اور شریفانہ خوبیاں مجتمع تھیں خاندان نبوت سے آپ کی قرابت دونوں میں سے کسی کی شان و عظمت سے فروتر تھی۔ اسی بانوئے محترم کی بدولت سادات حسینی کو یہ شرف حاصل ہوا کہ وہ ایک ہی وقت میں اولاد رسول بھی ہیں اور خاندان ساسان کے احفاد (نواسے) بھی۔

قاضی القضاۃ احمد بن خلکان لکھتے ہیں کہ حضرت امام زین العابدین ابن الخیرتین بھی کہلاتے تھے۔ اس لئے کہ حضرت رسول اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا قول گرامی تھا اللہ تعالیٰ

من عبادہ خیرتان فخیرتہ من العرب قریش ومن العجم فارس

قاضی نور اللہ شوستری مجالس میں تحریر کرتے ہیں۔

"مادر زین العابدین که پادشاهان علی زین العابدین فرزند ارجمند امام حسین را که از شهربانو بود فخر العرب والعجم می گفتند چه نسبت او از طرف پدر به بزرگ ترین خلق که پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وسلم بودمی رسید و از طرف مادر به نجیب ترین سلاطین روئے زمین یعنی پادشاهان عجم منتهی می گردید"

یہ مسئلہ ہنوز تحقیق طلب ہے کہ آیا حضرت شہربانو کی شادی ہوئی تھی یا نہیں شیعوں نے تو اس کی صدیوں سے تسلیم کر رکھا ہے (کہ نکاح ہوا تھا) مصنفین متقدمین میں سے صرف امام یعقوبی اس کا حوالہ دیتے ہیں جو نویں صدی عیسوی کے آخر میں ایک مشہور عربی مورخ گذرے ہیں۔ وہ حضرت امام حسین کی شہادت کا تبصرہ ہماتہ انگیز الفاظ میں کرتے ہوئے اس تذکرہ کو یوں ختم کرتے ہیں حسین کے لڑکوں میں ایک تو علی اکبر تھے جو الطف[1] میں شہید ہوئے اور کوئی اولاد

نقل از تاریخ ادبیات ایران حصہ اول — A Literary History of Persia, By Edward G Brown (1909)

[1] الطف حاست و تاحی کو کہتے ہیں اور اونچی زمین کو بھی۔ اور عرب کا وہ حصہ جو عراق کی سرزمین سے اسی کی حد پر واقع ہے یعنی کوفہ کے پاس ایک گاؤں کا نام بھی ہے۔ وہ جگہ جہاں امام ہمام شہید ہوئے طف اسی لئے

نہیں چھوڑتی تھیں۔ ان کی ماں لیلےٰ بنت ابو مرہ بن عروہ بن مسعود الثقفی تھیں۔ دوسرے علی اصغر جنکی والدہ حضرت ربابؑ سلافہؑ دختر یزدگرد تھیں اور جن کو حسینؑ [illegible] کہا کرتے تھے۔

بعض مصنفین و سیرت نویسان نے شہربانو کے علاوہ آپ کے دو لقب اور بھی لکھے ہیں (۱) سلافہ (۲) شاہ زنان یعنی ملکۃ النساء۔ اہل ایران آجکل عموماً شہربانو کہتے ہیں۔

جناب شہربانو کی محبت و عظمت نہ صرف ان کے اہل وطن بلکہ تمام مسلمانوں کے دل میں راسخ ہوگئی ہے۔ طہران کے جنوب میں تین چار میل پر ایک پہاڑ آپ کے نام سے منسوب بھی کر دیا ہے جو بی بی شہربانو سے موسوم ہے۔ اس پر کوئی مرد قدم رکھ کر اس کی بزرگی و پاکیزگی کو زائل نہیں کر سکتا۔ وہی بی بیاں انکی زیارت کرنے جاتی ہیں جن کو اپنی حاجت روائی [illegible] کیلئے بارگاہ خداوندی میں کسی کو شفیع لانے کی ضرورت ہوتی ہے۔ شہربانو اُس درجہ [illegible] مرثیہ کی جان [illegible] ہیں جو ایران کے شہروں، قصبات اور بستیوں میں سال بہ سال پڑھا کیا جاتا ہے۔ آنسو بہانے والے ماتمگساروں اور تماشائیوں کے انبوہ کثیر انکو گھیرے ہوتے ہیں۔ ایک ڈراما تعزیہ "غائب شدن شہربانو" The passing of Shahrbanu کے نام سے ۱۳۱۴ ہجری میں طہران میں شائع ہوا تھا اسکے صفحات میں آپ یوں گویا نظر آتی ہیں۔

ز نسل یزدجرد شہریارم — ز نوشیروان بود اصل و نژادم
دران وقتے کہ بختم کامران بود — بدان شہرے کہ نامم در مکان بود
شبے رفتم بسوے قصر بابم — بیامد حضرت زہرا بخوابم
بگفت ای شہربانو با صد آئین — تراہم بر حسینؑ آرم بکابین
بگفتم "من نشستہ در مدائن — حسین اندر [illegible] ہست ساکن"

کہی جاتی ہے کہ وہ فرات کے متصل ایک طرف کو تر رہتی ہے
۵۰۲ سنہ آزاد شدہ [illegible] وفات [illegible]

"محال است این سخن، فرمود زہرا — حسن آید بہ سرداری در این جا
تو می گردی اسیر، اے بے قرینہ — بہ مدت از مداین در مدینہ
بہ فرزندم حسین پیوند سازی — مرا از نسل خود خورسند سازی
ز نسلت نہ امام آید بہ دوران — کہ شد دستگیر شان در دار دوران"

درۃ التاج رسالت کا یہ ارشاد پورا ہوا اور جناب شہربانو نو اماموں کی ماں ہوئیں۔ چوتھے امام سے لے کر بارھویں امام تک آپ کے بطن مطہر سے ہیں۔ تفصیل ذیل

(۱) سیدنا علی بن حسین ملقب بہ زین العابدین پنجشنبہ (یا جمعہ) ۱۵ شعبان ۳۸ھ (۶ جنوری ۶۵۹ء) کو بمقام مدینہ اپنے جد امجد علی بن ابی طالب کی حیات میں متولد ہوئے۔ ۱۲ محرم ۹۴ھ (۱۹ اکتوبر ۷۱۲ء) کو مسموم ہو کر بعمر ۵۷ سال وفات پائی۔ مدفن مدینہ منورہ، بقیع مبارک قبہ عباس متصل قبر حسن بن علی علیہ السلام۔ ولید بن عبد الملک نے زہر دلا دیا تھا۔

(۲) سیدنا محمد باقر بن زین العابدین متولد ۳ صفر ۵۷ھ (۱۰ دسمبر ۶۷۶ء) مدینہ متوفی ۲۳ صفر ۱۱۴ھ (۲۵ اپریل ۷۳۲ء) بعمر ۵۷ سال مسموم ہو بمقام حمیمہ۔ نعش شریف مدینہ آئی اور جنۃ البقیع میں دفن ہوئی۔

---

۵۱۴ مداین، مدینہ کی جمع ہے۔ مدینہ سریانی زبان میں شہر کو کہتے ہیں۔ لیکن یہاں 'مداین' سے (Ctesiphon) یعنی ساسانیوں کا قدیم دارالملک (کلدانیہ Chaldaea کا) مراد ہے اسکی وجہ تسمیہ عرب مورخین یہ بتاتے ہیں کہ سات شہروں (مداین) کو ملا کر ان کی آبادی کو یکجا کر دیا گیا تھا اسکو ام البلاد و شیخ البلاد) رے Ray سے (جو طہران حال کے متصل قدیم Rhagae ہے) اور اصفہان سے ممتاز رکھنا چاہیے۔

یہ مداین جو کسی وقت ارض بابل کا سب سے بڑا اور قدیم شہر تھا۔ اب ویران پڑا ہوا ہے اور شہر حلہ کے توابع دیگر میں شمار ہوتا ہے۔ اس کے ویرانوں میں وہ کنواں بھی ہے جسمیں ہاروت و ماروت کا بند ہونا بیان کیا جاتا ہے۔

وہ فلک پیما قصر جس میں شاہزادی نے یہ خواب دیکھا تھا 'ایوان کسریٰ' کہلاتا ہے۔ مورخ اس اینٹ چونے کی عمارت کو رفیع الشان لکھتا اور اسکے ارتفاع و استحکام و استواری کی ستائش کرتا ہے لیکن اسکی غیر فانی شہرت دلیقا اور لازوال عظمت کا راز نکتہ شناس ہو ادب آموز فلسفی کچھ اور بتاتا ہے ۔

(۳) سیدنا جعفر صادق بن محمد باقر ولادت، مدینہ، ۸ رمضان سہ شنبہ قبل طلوع آفتاب سنہ ۸۰ھ (جو سال سیل الجحاف[۱۰۶] کہلاتا ہے)، (۹ نومبر ۶۹۹ء) - انتقال ۱۵ رجب ۱۴۸ھ (۷ ستمبر ۷۶۵ء) بعمر ۶۸ سال مسموم۔ مدفن بقیع مذکور،

(۴) سیدنا موسیٰ کاظم بن جعفر صادق۔ ولادت سہ شنبہ قبل طلوع فجر بمقام ابواء، مابین مکہ و مدینہ ۱۲۸ھ (۷۴۵ء)، وفات جمعہ ۲۵ رجب ۱۸۳ھ (۲ ستمبر ۷۹۹ء) بعمر ۵۵ سال مسموم۔ مدفن بغداد باب التبن مقابر شونیزیہ۔ خارج قبہ

(۵) حجۃ المقبول سیدنا علی الرضا بن موسیٰ کاظم۔ تولد ۱۱ شوال ۱۵۳ھ (۲۹ اکتوبر ۷۶۸ء) مدینہ۔ وفات آخر صفر ۲۰۳ھ (۷ ستمبر ۸۱۸ء) یا ۹ صفر ۲۰۵ھ (۲۶ جولائی ۸۲۰ء) مسموم بعمر ۵۵ سال مدفن قریہ سناباد رستاق از اعمال طوس، خراسان، حال معروف بہ مشہد مقدس۔

(۶) سیدنا محمد جواد بن علی رضا التقی۔ ولادت ۱۰ رمضان ۱۹۵ھ (۷ جون ۸۱۱ء) مدینہ۔ وفات آخر ذی قعدہ ۲۲۰ھ (نومبر ۸۳۵ء) مدفن مقابر قریش متصل مرقد جد خود موسیٰ کاظم شہر بغداد مسموم بعمر ۲۵ سال چند ماہ۔

(۷) سیدنا علی الہادی بن محمد الجواد بن علی رضا ابوالحسن عسکری نقی۔ ولادت ۱۳ رجب ۲۱۴ھ (۷ ستمبر ۸۲۹ء) مدینہ وفات، دوشنبہ ۲۵ جمادی الاولیٰ ۲۵۴ھ (۲۱ مئی ۸۶۸ء) بمقام سُرّ من رائے معروف بہ عسکر مسکن خود مدفن مسموم بعمر ۴۰ سال۔

(۸) سیدنا حسن خالص بن علی الہادی بن محمد جواد۔ ولادت ۸ ربیع الثانی ۲۳۲ھ (۳ دسمبر ۸۴۶ء) مدینہ وفات سُرّ من رائے۔ روز جمعہ ۸ ربیع الاولیٰ ۲۶۰ھ (۳ جنوری ۸۷۴ء) بقضائے الٰہی

جزائے حسن عمل بین کہ روزگار ہنوز — خراب می نکند بارگاہ کسریٰ را

۱۰۵ یثرب قدیم جب سے رسول پاک صلعم ہجرت فرما کر تشریف لے گئے تھے مدینۃ النبی کہلاتا ہے یا صرف مدینہ،

۱۰۶ سیل جحاف۔ جس نے زمین کو کھود ڈالا اور جو کچھ پایا بہا لے گیا تھا۔

(۹) محمد بن الحسن الخالص بن علی الہادی ابوالقاسم مہدی - آخر ائمہ اثنا عشر (حسب مذہب امامیہ)
ولادت شب جمعہ نصف شعبان ۲۵۵ھ (۳۰ جولائی ۸۶۹ء) - محرم ۲۶۰ھ (۱۰ اکتوبر ۸۷۳ء) کو بروز جمعہ
یا ۲۶۶ھ میں (۳۱ اگست ۸۷۹ء) کو بعمر نو سال سرداب سر من رأے میں غائب ہو گئے حسب روایت ابن
الازرق صاحب تاریخ یا فارقین آپ کی ولادت ۹ ربیع الاول ۲۵۸ھ (۴ فروری ۸۷۲ء) کو ہوئی تھی۔

[اعلام - ائمہ مطہرین کی ولادت و وفات کی تاریخیں عموماً مختلف فیہ ہیں - اختلافات روایات
و بیانات کو نقل کرنے کے بجائے میں نے صحیح اور زیادہ معتبر تاریخوں کو درج کر دیا ہے]

باز آمدم - پروفیسر براؤن لکھتے ہیں کہ "چند سطر آگے چل کر وہ فقرہ آجاتا ہے جس سے ایرانیوں کا
تنفر حضرت عمرؓ سے اور محبت حضرت علیؓ سے خصوصیت کیساتھ پائی جاتی ہے" اور جس کا بیان نقل کرنا
بے محل اور غیر مناسب معلوم نہیں ہوتا۔ حضرت شہربانو مدینہ منورہ میں ایک محافہ کے اندر لائی جاتی ہیں
جیسا کہ ایک بادشاہزادی کی شایان شان تھا - شجاع ابن شجاع حضرت حسن انکو ساتھ لے کر آتے
ہیں شاہزادی کی تکالیف کا دور یہیں سے شروع ہو جاتا ہے" وہ فرماتی ہیں ؎

دلے چون شد مدینہ منزل ما — غم عالم فزون شد در دل ما
یکے گفتہ کہ این دختر کنیز است — یکے گفتہ بہ شہر خود عزیز است
بمسجد مرد و زن در بام محضر — مرا نزد عمر بردند مادر
کلامے گفت کز او در خروشم — بگفت این ہمگیان را می فروشم
علی جدت چو بر آمد خروشان — بگفتا لب ببند اے شاہ دوران
نشاید بردن ای میر وفادار — بزرگان را سر عریان بہ بازار
پس آن خواری اے نور دو عینم — ببخشیدند بر بابت حسینم

اسی واقعہ کو امام ابوالقاسم زمخشری ربیع الابرار میں اور قاضی فقیر محمد فرید پوری جامع التواریخ
میں اپنے ایسے الفاظ میں تحریر کرتے ہیں کہ جب صحابہ پاک (سبی دشمنان) فارس کو عہد عمر بن الخطاب

۱۵ و ۱۶ اصل میں گستاخانہ الفاظ تھے میں نے فرط ادب و احترام سے بدل دیے ہیں۔

مین آستانہ خلافت پر لے کر آئے تو اُن مین یزدجرد بن شہریار بن خسرو کی تین بیٹیان بھی تھین۔ اور بندیان فروخت ہوچکین تو ان دختران یزدجرد کی نوبت آئی حضرت عمرؓ نے فرمایا کہ ان کو بھی فروخت کردو حضرت علی مرتضیٰ نے ٹوکا ان بنات الملوک لا یعاملن معاملہ غیرھن من بنات السوقۃ۔ حضرت عمر نے پوچھا پھر ان کا کیا کیا جائے وکیف الطریق الی العمل معھن فرمایا کہ ان کی قیمت مقرر کرادیجئے۔ قیمت ٹھہ جائے تو جو کوئی ان کو پسند کرے لے لیوے۔ چنانچہ قیمت تشخیص ہوگئی تو خود حضرت علی نے تینون کو لے لیا۔ سب سے بڑی مہربانو محمد بن ابی بکر صدیق کو مرحمت فرمائی (ان سے قاسم پیدا ہوئے) منجھلی ماہ بانو عبد اللہ بن عمر فاروق کو عنایت کی (ان سے سالم متولد ہوئے) اور چھوٹی شہر بانو حسین بن علی مرتضیٰ علیہما السلام کی دجن کے بطن سے امام زین العابدین تھے)۔ (یہ تینون حضرات بنو خالہ (خالہ زاد بھائی) ہین) چنانچہ ابن عمر بھی اس واقعہ کی تصدیق کرتے اور صحیح بتاتے ہین۔ کتاب الکامل مین مبرد نے اور کتاب المعارف مین ابن قتیبہ نے یہی روایت کی ہے۔

وسیلۃ السعادات سیدۃ السادات سلسلۂ کلام یون جاری فرماتی ہین ؎

حسین کردہ وصیت بر من زار	نمانم در میان آل اطہار
اگر مانم اسیر خوار گردم	برہنہ سر بہر بازار گردم
توچون ہستی امام و شہریارم	بدست تست مادر اختیارم
اگر گوئی روم در دشت بہ جانم	صلاحم گرنمی دانی ہمانم

مورخین اور علمائے انساب کا اتفاق ہے کہ باوجود اتنی اولاد کے (جنکے نام جدامجد کے ذیل مین گذارش کرچکا ہون) آج روئے زمین پر حضرت حسین کا نام صرف سیدنا علی بن حسین اوسط ملقب بزین العابدین امام رابع سے زندہ اور انھین کے اعقاب سے باقی ہے ولکن علی فیحا لا عقب لحسین الا من نسلہ (زین العابدین)

مقبول ناچیز بھی حضرت زین العابدین سید الساجدین کی آل سے ہے اللھم اغفر ذنوبنا

علی الایمان والاسلام

حضرت زین العابدین کی کنیت ابوالحسن و ابومحمد تھی۔ آپ کی شان مین فرزدق شاعر کا ۲۸ شعر کا فصیح و بلیغ قصیدہ شہرۂ آفاق ہے جو اُس نے طواف بیت اللہ مین استلام (بوسہ دہی) حجر اسود کے وقت ہشام بن عبد الملک کے طعن پر کہا تھا ؎

هذا الذی تعرف البطحاء وطأته | والبیت یعرفه والحلّ والحرمُ

هذا ابنُ خیرِ عبادِ اللهِ کلّهم | هذا التقی النقی الطّاهر العلم

آپ کی اولاد مین ذکور و اناث پندرہ تھی یا سولہ تھے۔ گیارہ پسر

(۱) محمد کنیت ابو جعفر ملقب بہ باقر۔ فاطمہ (ام عبداللہ) بنت امام حسن کے بطن سے۔ اسلئے ایک ہاشمی تھی دو ہاشمیین سے اور ایک علوی دو علویین سے۔

(۲) زید شہید

(۳) عمر

} ان دونون کی مان اُم ولد تھین

۱۰۹ھ حضرت زید شہید کوفیون کے وعدون اور باتون اور اُن کے دام فریب مین آگئے اور خلق اللہ کو صلائے بیعت دی تھی۔ چالیس ہزار نے بیعت کی اور پھر پھر گئے بیعت شکست کر دی، زید نے اس جماعت سے مخاطب ہو کر فرمایا تھا رفضتمونی اسی لئے بعض عوام گروہ شیعہ کو رافضی کہنے لگے۔ بالآخر اول صفر ۱۲۲ھ (۱۸ جنوری ۷۴۰ء) کی شب مین آپ نے صرف پانچ سو رفقاء کے ساتھ خروج کیا۔ یوسف بن عمرو والی کوفہ نے مدافعت کی۔ اثنائے محاربہ مین ایک تیر آپ کے آکر لگا اور درجہ شہادت پر پہونچا دیا

زید نے اپنے پدر عالی مقام امام زین العابدین سے در بارہ خروج مشورہ کیا تھا آپ نے روکا اور فرمایا "مجھے اندیشہ ہے کہ کہین تم مقتول و مصلوب نہ ہو تم کو معلوم نہین کہ سُفیانی کے خروج سے پہلے ولد فاطمہ سے جو کوئی خروج کرے گا قتل ہوگا،، فکان کما قال

حمیری نے کتاب الدلائل مین لکھا ہے کہ ایکبار زید بن حازم ہمراہ باقر علیہ السلام کے تھے۔ (وہ کہتے ہین کہ) اتنے مین امام کے بھائی زید بن علی بھی وہان سے گذرے۔ امام نے زید بن حازم سے کہا کہ تم نے ان کو دیکھا۔ یہ کوفے مین خروج کرین گے۔ لڑین گے۔ اور انکا سر گشت کرایا جائے گا چنانچہ ایسا ہی ہو کر رہا واضح رہے کہ خاندان طاہرہ نبوت مین زید نام کے کئی اور ممتاز حضرات گذرے ہین۔ ایک زید

(۴) عبد اللہ ⎫
(۵) حسن مثنی ⎬ ان سب کی ماں بھی ام ولد تھین
(۶) حسین ⎭

(۷) حسین اصغر ⎫
(۸) عبد الرحمن ⎬ ایضاً
(۹) سلیمان ⎭

(۱۰) علی۔ یہ ساری اولاد مین چھوٹے تھے — ان کی ماں ام ولد تھین

دختر ⎧
(۱۱) خدیجہ
(۱۲) فاطمہ ⎫
(۱۳) علیہ ⎬ ایضاً
(۱۴) ام کلثوم ⎭

(۱۵) گیارھوین فرزند کا نام محقق نہین ہے اکثر مورخین خاموش ہین صاحب جامع التواریخ الاشرف لکھتے ہین۔

خاندان نسب و اسلاف

میر عبد الجلیل نے اپنے نسب و اسلاف کے بیان مین ایک قصیدہ لکھا ہے اور حقیقت یہ ہے کہ اُس مین اپنے شاعرانہ کمال اور علم و بلاغت کی داد دی ہے۔ اگرچہ اس کا نقل کرنا اطناب سے خالی

بن حسن جسکے باپ امام حسن تھے اور والدہ ام بشر بنت ابی مسعود عقبہ بن عمرو بن ثعلبہ خزرجیہ تھین، حضرت زید متولی صدقات رسول اللہ صلعم تھے اور حسن سے (اور حسن کے بھائی حسن بن حسن رض سے) امام کی اولاد کا سلسلہ چلا انکا انتقال نوے سال کی عمر مین ۱۲۰ھ (سنہ ۷۳۸ء) مین ہوا تھا۔ زیدی شیعہ جنکا اعتماد امامت مین نصوص پر ہے یہ انھین کا اتباع کرتے اور بعد علی و حسن و حسین رضی اللہ عنہم کے امامت مین دعوت و اجتہاد کی رعایت کرتے ہین دوسرے زید بن موسیٰ برادر عم او حضرت علی الرضا تھے جنھون نے مامون الرشید پر خروج کرنا چاہا تھا لیکن حضرت نے روکا اور سمجھا دیا تھا یہ بھی بڑے سے اولو العزم تھے۔

تھا لیکن مناسبت محل بسلسلۂ تحریر سے اس کا ترک بھی مذاق سلیم سے مستبعد نظر آیا۔ معہذا اطلاع اسمار و احوال آبا و اجداد کے لئے یہ ایک روشن آئینہ ہے ؎

ما نیم نخل سبز ریاض پیمبری
احسان ماست بر همه از سایه گستری

نخلے که اصل ثابت او ختم انبیا است
فرعش گذشت از سر این چرخ چنبری

آن ختم انبیا که بتول است دخترش
از نسل عصمت پاکیزه گوهری

آن حضرتی که بود شهنشه حسنی
دریای فیض ساقی صهبای کوثری

فرزند اوست خامس آل عبا حسین
فرسود در محیط شهادت شناوری

سجاد آنکه آدم آل حسین بود
ایزد ضعیف دشمن او کرد ابتری

زید شهید مصحف اسرار اهل بیت
پیداست از مناقب او شان حیدری

عیسی که شد ملقب اشبال مشتهر
کردے شکار شیر ز روئے دلاوری

سید محمد آنکه جهان را ز خلق او
پیچیده در دماغ نسیم معطری

سید علی که بر در عالم پناه او
کیوان ستاده است به عنوان قنبری

سید حسین تتمۂ ایوان مکرمت
روح الامین کند بر او نقش کبوتری

سید علی عراقی که فیض مقدمش
خاک عراق یافته از عرش برتری

سید حسن که اختر اوج سیادت است
کسب سعادت از نظرش کرد مشتری

سید علی که دشمن شوریده بخت را
سازد کباب آتش خورشید محشری

ستادی بهار گلستان خلق زید
می کرد و تحفظ دلها صنوبری

سید عمر که سرور عالی مقام بود
در بزم او همیشه فلک گرم مجمری

زید سوم که خسرو اقلیم فقر بود
کردے ز روئے آئینه دل سکندری

یحیی که در ریاض صفات کمال او
یک شهر چشم حیرتیان کرد عبهری

سید حسین منتخب دودۂ شرف
باشد چراغ انجمن افروز اختری

داود آنکه دشمن فولاد جسم را / چون موم نرم ساخت ز دست بهادری
والا گهر ابوالفرح واسطی که شست / از آب ذوالفقار بسے نقش کافری
سید ابوالفراس که هنگام کارزار / آمد ز دست او همه کار غضنفری
ثانی ابوالفرح که بآئین جد خویش / رو زد بنیر دشمن نیستان صفدری
سید حسین صاحب شمشیر خونچکان / با قلب دشمنان بکمش کرد خنجری
سید علی که صارم خارا شگاف او / چون ذوالفقار دم زده از فتح خیبری
جد کلان محمد صغرے که تیغ او / بر بلگرام یافت فتح مظفری
مفتوح گشت در زمن شاه التمش / تاریخ آن ز لفظ "خداداد لشکری"
در سال ششصد و چهل و پنج فوت کرد / آسوده بر بساط معلائے عبقری
شعبان و روز چارم صحوه نشین / کرد از جهان بملک مقدس مسافری
باشد به بلگرام مزار مبارکش / بر مرقدش کنند ملائک مجاوری
سید عمر فروغ جبین محمدی / او راست بر سپهر شرف شان اختری
سید حسین از نظر التفات او / مینا ز مردی کند و سنگ گوهری
سید نصیر آنکه بمصداق نام خود / با زمره ستم زدگان کرد یاوری
سید حسین کان سخا معدن صفا / از گوهرش جمال شرف یافت زیوری
سالار از فروغ ضمیر منیر او / دریوزه شعاع کند مهر خاوری
لطف الله آنکه قطب سپهر ولایت است / مردان راه را بخدا کرد رهبری
داود که نام اوست خداداد از پدر / صاحب کرامتے ست ز تعریف بادری
جد القبیله حضرت محمود دین پناه / کردند جن و انس به حکمش مسخری
عالیجناب سید نوح آنکه عرف او / باشد نپاره سرو گلستان سروری
سید حسین خلق مجسم که ذات او / خورشید شان تمثل شده در ذره پروری

محمود در فضائل کسبی و موهبی ۔۔۔ همتای او نه زاده ز ارحام عنصری

عبداللطیف آنکه ز ابنای روزگار ۔۔۔ ممتاز بود در عمل فیض گستری

احمد که صاحب قلم و سیف قاطع است ۔۔۔ بهرام و تیر بر در او کرده چاکری

عبدالله آن برادر عبداللطیف کو ۔۔۔ احمد پسر گرفت ز لطف برادری

عبدالجلیل از پس احمد منم که هست ۔۔۔ وصفے ز من فصاحت سحبان و انوری

آنجا که نغمۂ نے کلکم شود بلند ۔۔۔ آرند سر فرو متنبی و بحتری

مقصود من تفنن طبع است از سخن ۔۔۔ ورنه سزای رتبۂ من نیست شاعری

دریائے موج خیز علوم که می کند ۔۔۔ با من خطاب جوہر اوّل زمخشری

از یُمن العلم و عمل امتیاز داد ۔۔۔ شانم بلند کرد دگر از تونگری

با وصف این فضائل صوری و معنوی ۔۔۔ گویم به نفس خویش که از جمله کمتری

در یک ہزار یکصد و یک کلکِ واسطی ۔۔۔ افشاند این لآلی بحر سخنوری

سیّد محمد صغری ؒ تمام سادات حسینی واسطی ؒ بلگرام کے جد اعلیٰ تھے سلطان شمس الدین التمش کے

ؒ۱۱۵ واسط، عراق میں مابین البصرہ و کوفہ ایک شہر ہے۔ بروایت ابن خلکان اسکی بنا ۸۴ھ (۷۰۳ء) میں حجّاج نے ڈالی تھی ۸۶ھ میں تعمیرات ختم ہوئیں لیکن کتاب سُتّ زر العقود جسمیں واقعات بترتیب سنین مندرج ہیں، میں مرقوم ہے کہ ۷۵ھ (۶۹۴-۹۵ء) میں آغاز اور ۷۸ھ (۶۹۷ء) میں تکمیل ہوا۔ شہر نہایت پُر لطف دل فضا واقع ہوا ہے۔ دجلہ کے دونوں طرف آبادی ہے۔ آنے جانے کیلئے دریا پر پُل بنا ہوا ہے بہت سبز اور شاداب زمین ہے، غلہ اور پھل ہر قسم کے یہاں بکثرت پیدا ہوتے ہیں۔ یہاں کا قلم (نیزۂ واسطی) مشہور ہے۔ میر عبدالجلیل اور اُن کے نواسوں کے کلام میں واسط اور قلم واسط کا ذکر اکثر ملتا ہے۔ صاحب تاریخ غیاثی لکھتا ہے کہ جب سید محمد بن سید فلاح جو سادات مشعشع والی حوزستان میں سے تھا، ایک سال تک جامع کوفہ میں معتکف رہا تو اپنے مسقط الراس واسط کو یاد کرتا اور ان الفاظ میں حسرت و الم کا اظہار کرتا تھا ؎

اِقَامَتُنَا بِاَرْضِ الْعِرَاقِ بِوَاسِطٍ ۔۔۔ مَدِيْنَةُ اَهْلِ الْعِلْمِ وَالْحِلْمِ وَالْبِرِّ

(واضح رہے کہ اقلیم خوزستان کو پہلے اہواز کہتے تھے آجکل محمرہ کہتے ہیں!)

تعلق ملازمت سے غازیانِ اسلام کی فوج کے ساتھ بلگرام آئے۔ راجہ سرکش سے معرکہ آرا ہوکر
اُس کو شکست دی، قتل کیا، بلگرام کو فتح کرکے جو مع بعض خاندانہائے شیوخ فرشوری
و ترکمانان کے یہیں اقامت گزین ہوگئے سلطان موصوف سے عُشر کا فرمان پایا۔ بلگرام میں
اکتیس سال بسر کرکے ۴ شعبان المعظم ۶۴۵ھ کو رحلت فرمائی۔ اُس عہد سے لے کر سلطان ابراہیم
بن سلطان لودی کے زمانہ تک پرگنہ بلگرام کا محصول (دہ یکے) برابر قائم رہا بابر بادشاہ
کے عہد میں اس کا سلسلہ شکست ہوا۔

سید محمد صغریٰ سے سید عبدالجلیل چودھویں پشت میں تھے۔

ف۱۱۱ سلطان شمس الدین التمش۔ سلطان قطب الدین ایبک کا داماد و زر خرید تھا۔ شب خسوف میں پیدا ہوا تھا۔ اس لئے التمش نام رکھا گیا

ترکی زبان میں التمش فوج کے اگلے حصہ کو بھی کہتے ہیں یعنی وہ جماعت جو سردار اور ہراول (سب سے آگے کی فوج) کے مابین ہو۔ یہ لفظ چھ کے عدد کے معنی میں بھی آتا ہے۔ اُس کو بھی کہتے ہیں جو شب خسوف میں متولد ہو

شمس الدین ۶۰۷ھ (۱۲۱۰ء) میں سلطان آرام شاہ کو جو اپنے باپ قطب الدین کی جگہ تخت دہلی پر بیٹھا تھا گرفتار کرکے خود سریر آرائے سلطنت ہوگیا۔ پھر ۶۱۰ھ (۱۲۱۳ء) میں تاج الدین یلدوز بادشاہ غزنی کو جو تسخیر کے ارادہ سے لاہور آیا تھا گرفتار کرکے قتل کرا دیا۔ غیاث الدین حاکم بنگالہ پر فوج کشی کی، وہ بھاگا اور ملک التمش کے تصرف میں آگیا۔ ۶۲۹ھ (۱۲۳۲ء) میں گوالیار کا عزم کیا۔ دیو مل والی قلعہ نے عاجز آکر شب میں راہ گریز اختیار کی۔ قلعہ بھی ۶۳۰ھ (۱۲۳۳ء) میں فتح ہوگیا اور ۶۳۱ھ (۱۲۳۴ء) میں اُجین بھی۔ ۲۰ شعبان ۶۳۳ھ (۲۹ اپریل ۱۲۳۶ء) کو رہگرائے عالم بقا ہوا۔ اس کے عہد میں بھی بہت سے فضلائے نامور گذرے ہیں بادشاہ کے وزیر نظام الملک محمد بن ابوسعید کے نام پر مولانا نورالدین محمد نے کتاب جامع الحکایات لکھی تھی۔

ف۱۱۲ سلطان ابراہیم حسین لودی، اپنے باپ سکندر شاہ کی وفات پر آخر ۹۱۵ھ (۱۵۱۰ء) میں دارالسلطنت آگرہ میں تخت پر بیٹھا۔ ہندوستان کے اکثر ممالک و قطعات اُسکے زیر نگیں تھے۔ بابر کے سیل فتوحات نے حسب ماوراء النہر بخارا، کابل، لاہور و دیپالپور سے بڑھکر ۹۳۲ھ میں دہلی کا رخ کیا۔ لو یکشنبہ سلخ جمادی الثانی (مطابق ۱ اپریل ۱۵۲۶ء) کو ابراہیم لودی اور بابر سے پانی پت کے میدان میں محاربہ عظیم شروع ہوا۔ جمعہ ۸ ماہ رجب (۲۰ اپریل ۱۵۲۶ء) کو سلطان ابراہیم لودی مع اپنے مقربان اور سرداران کے مارا گیا۔ ہندوستان دودمان لودھیہ افاغنہ سے نکل کر آل تیمور کے تابع فرمان ہو گیا۔ ابراہیم کے قتل کی تاریخ ہے "ابراہیم لودی شہید شد"

میر کے والدین

ابراہیم بن ہشام ناقل ہیں کہ جب امام یازدہم حسن خالص بن علی ہادی بن محمد جواد رضی اللہ عنہم اپنے رفیق محبّ عیسیٰ بن فتح کے پاس آئے تو اُس وقت عیسیٰ کی عمر ۶۵ سال سے زائد تھی پوچھا کوئی فرزند بھی ہے؟ عرض کیا نہیں۔ فرمایا اللّٰھم ارزقہ ولدا یکون لہ عضدا فنعم العضد الولد۔ پھر یہ شعر پڑھا ؎

من کان ذا عضد یدرک ظلامتہ ان الذلیل الذی لیست لہ عضد

اولاد کی نعمت اور پھر ایسی اہل و صالح فخرِ خاندان کی، جیسا کہ میر عبدالجلیل تھے اُس خوش نصیب باپ کے لئے مقدّر تھی جس کا نام سیّد احمد تھا۔ اِن کا خاندان "بھتہ" کہلاتا تھا جو سادات ان کے جدّ اعلیٰ سیّد محمود کلاں کے اعقاب میں ہیں اب بھی بھتہ مشہور ہیں وجہ تسمیہ ایک واقعہ ہے۔ میر غلام علی آزاد لکھتے ہیں کہ سیّد محمود کلاں بن سیّد خداداد کو تسخیر جن میں ملکہ کامل حاصل تھا۔ ایک روز حاکم شہر نے اپنے آدمیوں کو سیّد موصوف کے باغ سے آم لے آنے کو بھیجا محافظین نے روکا مگر وہ لوگ کب ماننے والے تھے زبردستی آم توڑنے شروع کئے بادافِش عمل میں خدائے عالم و عالمیان کی قدرت بالغہ سے آسمان سے پتھر برسنے لگے۔ ان سرکش سرہنگوں کے چوٹ آئی زخمی ہوئے اور جان بچا کر بھاگے۔ حاکم سے اطلاع کی۔ یہ باغ اب بھی موجود ہے اور "بُھتوں کے باغ" کے نام سے مشہور ہے۔ اُسی زمانہ سے سیّد محمود ممدوح کا خاندان اور اُن کے اخلاف "بُھتہ" کہلاتے ہیں لیکن صاحب حدیقۃ الاقالیم قصبہ سمدن اور وہاں کے سادات کے تذکرہ میں بھتہ کہلانے کی وجہ کچھ اور لکھتے ہیں میر سیّد احمد بڑے بیٹے سیّد عبداللہ بن سیّد محمود اصغر کے تھے۔ دراصل میر سیّد احمد کے والد سیّد

وغیرہ نکالی گئی تھیں مگر دیل کی تاریخ جو کسی شخص قوم بقال نے کہی تھی۔ فی الواقع خوب ہے۔

نوسے اوپر تھا ننیا ۹۳۲ بانی پت میں بھارتھ دلیا
اٹھوان رجب مارسرو ارا بابر جیتا، براہم ہارا

عبداللطیف (برادر اعیانی سید عبداللہ کے) تھے۔ سید عبداللہ کے کوئی اولاد نہ تھی اسلئے میر سید احمد کو فرزند بنا لیا تھا۔ میر احمد کا نقش نگین احمد بن عبداللہ تھا۔ اسی نسبت کے ساتھ بین الجمہور شہرت پائی صاحب فضائل و حسن شمائل تھے۔ اپنی وجاہت ذاتی اور خوبی خصائل سے اقران و اماثل میں ممتاز رہے۔ سید احمد عرف عام میں "مدّا" اور اُن کے چھوٹے بھائی سید معین الدین[۱۱۳] "مونان" کہلاتے تھے۔ دونوں بھائیوں نے تمام عمر ثروت و جمعیت سے گزاری شہر والوں میں مثل پڑگئی تھی "مداموناں سداسوناں"۔ سید احمد خط نستعلیق و شکستہ نہایت خوب لکھتے تھے اور فن سیاق (حساب) میں بھی دستگاہ قوی رکھتے تھے کچھ معمول سا کر رکھا تھا کہ ہر روز بلا ناغہ نماز صبح کے بعد دو ورق لکھ ڈالتے تھے۔ اس التزام سے بہت سی کتابیں اُن کے قلم سے نکل چلی اور مکمّل ہوگئی تھیں۔ بڑے مخیّر اور نہایت شجیع و دلیر تھے۔ نواب مکرم خان بن نواب شیخ میر عالمگیری کی طرف سے پہلے موضع پہاسو[۱۱۴] پھر موضع داسنہ[۱۱۵] وغیرہ توابع دہلی، کی حکومت پر مامور

۱۱۳ھ میر سید معین الدین بلگرامی، صوبہ ملتان میں جج تھے۔ شعبان ۱۱۰۳ھ دمی ۱۶۹۲ء میں وہیں قضائی حریم روضۂ شیخ موسیٰ جیلانی میں دفن ہوئے، جب میر احمد، نواب مکرم خان کی طرف سے بعض محالات تابع دہلی کے منتظم تھے تو میر ان کے پاس انھیں مواضع کے امین تھے۔ دونوں کا تدیّن اُن کے حکّام پر روشن تھا جب نواب مکرّم خان ملتان کے صوبہ دار ہوئے تو ان کو وہاں بُلا لیا تھا میر عبدالجلیل ان کو "عقل مجسّم" کہتے تھے۔

۱۱۴ھ پہاسو۔ یہ قصبہ تحصیل خورجہ، ضلع بلند شہر میں، بلند شہر خاص سے چھبیس میل جنوب کو ہے۔ آبادی ۱۹۲۱ء میں چار ہزار آٹھ سو چھہتر ۴۸۷۶ تھی۔ پرتاپ سنگھ سب سے پہلا بڑگوجر، رئیس اپنا وطن چھوڑ کر یہاں آیا اور اقامت گزین ہوا۔ اکبر کے عہد میں پہاسو ایک محال کا صدر مقام (یا خاص قصبہ) لکھا گیا ہے۔ اٹھارہویں صدی عیسوی کے ختم پر شاہ عالم ثانی نے پہاسو مع چوّن (۵۴) دیگر مواضع کے جاگیر کے طور پر سمرو کی بیگم کو اُس کی افواج کی پرورش و پرداخت کی غرض سے عطا فرمایا تھا۔ بیگم کی وفات (جو ۱۸۳۶ء میں ہوئی) کے بعد کچھ روز بقبضہ سرکار رہا۔ پھر ۱۸۵۱ء میں مُراد علی خان کو جو پرتاپ سنگھ کی اولاد سے تھا دیدیا گیا چنانچہ اب تک اُسکے اعقاب و اخلاف کے قبض و ملک میں چلا آتا ہے

۱۱۵ھ داسنہ (پرگنہ داسنہ) تحصیل غازی آباد ضلع میرٹھ میں اُس شاہراہ پر واقع ہے جو میرٹھ اور ہاپوڑ سے بلند شہر و گلاوٹھی جاتی ہے۔ آبادی ۱۹۲۱ء میں تین ہزار نو سو اکیس ۳۹۲۱ تھی۔ اس کی رونق زوال پذیر ہے قصبہ ویران و شکستہ حال نظر آتا ہے۔

رہے۔ شہر[۱۱۶] مراد آباد (روہیل کھنڈ) میں ۴ جمادی الاولی ۱۰۹۶ھ (۳۰ مارچ ۱۶۸۵ء) کو رحلت فرمائی۔ وہیں آپ کا جسد مبارک امانتاً سپرد خاک کیا گیا چھ ماہ بعد ان کے بھائی سید معین الدین حسب وصیت مرحوم نعش کو وطن لے آئے اور بلگرام میں دفن کیا۔ میر غلام علی آزاد نے تاریخ وفات

اس موضع کی بنیاد محمود غزنوی کے عہد میں راجہ سنگر سنگھ (ایک راجپوت) نے ڈالی تھی رفتہ رفتہ ترقی کرکے اچھا خاصہ قصبہ ہوگیا۔ احمد شاہ ابدالی کی عظیم لشکر کشی سے اس پر بھی آفت آئی اور اسکا قلعہ ۱۱۷۴ھ (۱۷۶۱ء) میں تباہ و برباد کر ڈالا گیا۔

عہد باستان کی یادگار شیخ آکر دیا مخدوم شاہ ولایت کا مزار باقی ہے جسکی زیارت و آستان بوسی کیلئے کبھی دہلی سے شاہزادے اور امرا آیا کرتے تھے۔ اب بھی ۱۰ محرم کو یہاں میلہ لگتا ہے اور شرکت عرس کا شرف دور و نزدیک سے لوگ آکر حاصل کرتے ہیں۔

دسنہ بھی منجملہ ان قصبات و مقامات ضلع میرٹھ کے ہے جنمیں عیسائیوں کی جماعت نے ترقی کی ہے اور اس کام میں کامیابی حاصل کر رہا ہے

۱۱۶ھ یہ شہر اس وقت بسا یا آباد ہوا تھا ۱۰۳۴ھ (۱۶۲۵ء) کے قریب رستم خاں شاہجہانی گورنر کٹھیر (جو روہیل کھنڈ کا پرانا نام تھا) نے مراد آباد کی بنیاد بنام شاہزادہ با دولت و اقبال مراد بخش کے نام سے ڈالی تھی وہی بد نصیب و نامراد مراد بخش تھا جس نے کچھ زمانہ بعد عہد اورنگ زیب میں جان دی۔ اسی وقت سے مراد آباد سنبھل کے بجائے صوبہ دار کا جائے قیام ہوگیا تھا۔

مراد آباد اور اسکے اطراف میں کٹھیر کی ساری سرزمین تاریخی یادگاروں سے مملو و معمور ہے۔ سنبھل جو اب بھی ضلع (مراد آباد) میں ایک بڑا قصبہ اور ایک تحصیل کا صدر رہ گیا ہے سب سے قدیم اور مشہور مقام ہے جسکے ساتھ مراد آباد کی تاریخ وابستہ ہے۔ اس لیے اسکا تذکرہ لازم آیا۔ دہلی کے آخیر ہندو فرمانروا پرتھوی راج نے پہلے تو ولی غازی سید سالار اور پھر جیچند والی قنوج سے یہاں معرکہ آرائیاں کی تھیں۔ ان کے علاوہ ابتدائے عہد اسلام کے اور واقعات بھی صفحات تاریخ پر مرقوم ہیں۔ سنبھل ہی پہلے گورنروں کا دار الصدر رہا جنکے فرائض زیادہ تر سرکش کٹھیریوں کی بغاوت فرو کرنے تک محدود و منحصر تھے۔ ۶۶۴ھ (۱۲۶۶ء) میں غیاث الدین بلبن نے امروہہ پر حملہ کیا اور قتل عام کا حکم دیا۔ ۷۶۶ھ (۱۳۶۶ء) میں فیروز تغلق نے کٹھیر پر یورش کی اور وہاں کے رئیس رائے کنگارا کو جس نے ایک مسلمان صوبہ دار کو قتل کرا دیا تھا سزا دینا چاہا۔ رائے کنگارا بھاگ کر کماؤں چلا گیا۔ سلطان نے کل ملک کو تاخت و تاراج کیا اور ملک خطاب کو وہاں کا صوبہ دار مقرر کر چلا آیا۔ جونپور کے نامور بادشاہ ابراہیم نے ۸۱۸ھ (۱۴۱۶ء) میں اسکو فتح کرلیا مگر وہ بھی اپنا نائب چھوڑ کر خود واپس چلا گیا جس کو ایک سال بعد محمود تغلق سلطان دہلی نے نکلوا دیا اور اپنے عامل وہاں مامور کئے ۸۲۰ھ (۱۴۱۷ء)

وَتَحِیَّتُھُمۡ فِیۡھَا سَلٰامٌ (اور اُن کی اُس میں دُعائے خیر سلام ہوگی۔ حر ۱۱، سورۂ یونس ع ۱-۶) ۹۶ھ نکالی۔ اِن کی استعداد و کمال اور حُسن کلام و روز بیان کے اظہار کیلئے دو مکتوب نقل کیے جاتے ہیں پہلا انھین کے نام ہے جو اِن کے ہم عمر اور مُخلص اور رابطہ دلہ

میں زیر سرکردگی سلطان حسین مُلوک جو یوں کا پھر کچھ زمانہ کے لیے سنبھل میں تسلط ہوگیا مگر ۹۰۳ھ (۱۴۹۸ء) میں سکندر لودی بادشاہ نے اس ضلع کو پھر تخت گاہ دہلی کے تابع کر لیا اور چار سال تک سنبھل میں قیام گزین رہا۔ اس زمانہ سے برابر یہ قطعۂ مُلک مستقل طور پر دربار شہنشاہی کے عمل و جاگیر میں رہا

اسی مبارک دور میں حضرت شیخ یحییٰ سنبھلی گذرے ہیں جن کا اعاظم مشائخ ہندوستان میں شمار ہوتا ہے شیخ عبدالقادر بدایونی کے پدر بزرگوار جن کا نام حامد ملوک شاہ تھا انھین بزرگ کے مُرید تھے۔ شیخ یحییٰ نے ۹۰۱ھ (۱۴۹۵ء) میں رحلت فرمائی۔ میاں حاتم سنبھلی بھی یہان کے مشہور اکابرین گذرے ہیں جو عہد اکبری میں مسلّم الثبوت فاضل تھے اور فقہ میں امام اعظم ثانی کہلاتے تھے۔

سولھوین صدی کے وسط میں احیا مرن گورنر سنبھل نے سُلطان محمد عادل کے خلاف سرکشی کی اور بادشاہی فوج کو شکست دی۔ سال العدمین راجہ متر سین کٹیہر یہ نے سنبھل پر قبضہ کر لیا اور احیا مرن نے اس پر حملہ کیا کندر کھی میں ہولناک جنگ ہوئی۔ راجہ نے شکست فاش پائی۔ ہمایون کے عہد میں علی قلی خان سنبھل کا گورنر تھا جس نے کٹیہریوں کو جو اب تک اپنے کو با اختیار اور آزاد سمجھتے تھے دبایا اور اُن کی سرکشی و بغاوت کا استیصال کیا ۱۹۳ھ (۱۵۶۶ء) میں حیدر مرزایان نے جو تیمور کی نسل سے تھے بغاوت کی اور اکبر کے عاملوں کو گرفتار کر کے قلعہ سنبھل میں مقید کر دیا۔ حسین خان نے اُن پر فوج کشی کی اور یہ لوگ بھاگ کر امروہہ چلے گئے اُسنے تعاقب کیا اور دم نہ لینے دیا بالآخر راہ گریز تنگ ہوئی اور یہ لوگ گنگا کے اُس پار چلے گئے۔ شاہجہان کی وفات اور مرکزی حکومت کے زوال کے بعد کٹیہریوں نے بغاوت کی۔ کچھ مدت تک خود مختار رہے۔ مسلمان گورنر اپنا دار الصدر اُٹھا کر قنوج لے گیا علی محمد خان روہیلہ سردار کی ترقی و عروج کو دیکھ کر گورنر مراد آباد نے اُسکے مغلوب کرنے کی کوشش کی مگر اس مرد سرد کے مقابلہ میں ناکام رہا۔ ۱۱۵۳ھ (۱۷۴۰ء) کے قریب پورا ضلع علی محمد کے قبضہ میں تھا جس نے اپنی ریاست روہیلکھنڈ کے نام سے جداگانہ قائم کر لی۔ روہیلوں کا عمل دخل ۱۱۸۸ھ (۱۷۷۴ء) یعنی جنگ روہیل کھنڈ اودھ کے تابع ہو گیا۔ پھر یہ ضلع دیگر اضلاع و انقطاع کے ساتھ بذریعہ حوالگی ۱۲۱۶ھ (۱۸۰۱ء) میں انگریزون کے قبضہ میں آیا۔ پہلے ۱۸۰۳ء و چار میں اس پر مرہٹون کے حملے ہوئے اسکے بعد ہی ۱۲۲۰ھ (۱۸۰۵ء) میں مشہور پنڈارا امیر خان باشندہ سنبھل اپنے پنڈاری سوارون کی جمعیت کے ساتھ سارے ضلع کو غارت کرتا ہوا چلا گیا۔

مراد آباد کے حوالی و مضافات میں بہت سے پُرانے کھیڑے اور ٹیلے باقی ہیں خاص کر تحصیل بلاری میں

روحانی حافظ سید ضیاء اللہ نے لکھا تھا اور دوسرا اس کا جواب (میر احمد کے قلم سے) سید ضیاء اللہ کو میر احمد سے جو محبت و عقیدت حاصل تھی اس کی یادگار ایک منظوم رقعہ باقی ہے جو سید ضیاء اللہ نے عید قربان کے موقع پر جب ایک دوسرے سے دور، اور درد محبت سے بے چین تھے بھیجا تھا۔

میر احمد کی شادی سید اسد اللہ عرف سید جان بھتہ کی صاحبزادی سے ہوئی تھی جو نسب میں آپ کی پاک جدی تھیں اور شرافت و سیادت و مکارم اخلاق میں برابر کی شریک میر عبدالجلیل نجیب الطرفین تھے اور عالی نسب۔ اور ہر اعتبار سے دُرِّ یتیم اور اپنے والدین کے تنہا عقب تھے۔ ؎

نسب کان علیہ من شمس الضحی   نوراً و من فلق الصباح عمودا

ما فیہ الا سید من سید   حاز المکارم والتقی والجودا

جن کو اسٹاک کھودا اور تفحص تفتیش نہیں کیا گیا ہے۔ امروہہ و سنبھل میں کئی خوشنما اور شاندار مساجد و مزارات ہیں۔ امروہہ میں مہدیوں کے عہد کی بھی یادگاریں موجود ہیں۔

مُراد آباد ایک بارونق و ترقی پذیر شہر، اچھا خاصا تجارت گاہ اور کئی ریلوں کا مرکز و مجمع ہے۔ خاص شہر صنعت و حرفت کے لحاظ سے بھی بڑی شہرت رکھتا ہے یہاں برنجی برتن نہایت خوشنما اور سبک اور ملمع رنگین و سادہ اور منقش ہر وضع و نمونہ کے بنتے ہیں جن کی قدر و طلب یورپ اور دیگر ممالک دور دست میں بھی ہوتی ہے۔ امروہہ کے مٹی کے ظروف نہایت اچھے اور نظر فریب و کارآمد ہر قسم کے ہوتے ہیں۔ اب شیشے کے کے ظروف و اشیا بنانے کی صنعت بھی مراد آباد اور اس کے حوالی میں ترقی کر رہی ہے۔

مراد آباد خاص کی مردم شماری ۱۹۲۱ء میں بیاسی ہزار چھ سو اکہتر (۸۲۶۷۱) تھی اور سنبھل کی اکتالیس ہزار پانسو بیاسی (۴۱۵۸۲)۔ مراد آباد، رام گنگا کے داہنے کنارے بلندی پر آباد ہے۔ جامع مسجد ایک قابل دید عظیم الشان عمارت ہے جو ساحل دریا پر بلند و رفیع دور سے نظر آتی ہے۔ اس کو رستم خان نے ۱۰۴۰ھ (۱۶۳۱ء) میں تعمیر کیا تھا۔ اسی کے قریب قلعہ کا ویرانہ ہے۔ جسے اسی گورنر نے بنایا تھا۔

۱۱ بڑے ذی علم اور پابند سنت بزرگ تھے۔ ۱۱۰۴ھ (۹۳-۱۶۹۲ء) میں رحلت فرمائی۔ جناب سید احمد بن سید محمد، صاحب سجادۂ کالپی سے عاشقانہ عقیدت ہو گئی تو فوراً عشق میں فرمایا کرتے تھے ؎

کالپی مکہ، بلگرام یمن   اے تو احمد! اسم اُدیس قرن

حسب ملازمت اقدس نصیب ہوئی تو تصوف کی کتابیں پڑھیں اور بلگرام میں ارشاد و ہدایت کا سلسلہ قائم کیا

ﺎ نامۂ سید ضیاء الله بہ میر احمد۔

"در خرمن کائنات کردیم نگاہ یک دانہ محبت ست و باقی ہمہ کاہ

سبحان الله چہ آن یک دانہ، و رحنب قیمت آن، گوہر یکدانہ کم از دانۂ خشخاش ست اُبوّت و نبوّت پناہ آدم صلی الله علیہ السلام در طلب این، انہ از فقدان نعمت بہشت ببید کشید وہر تعبے و شدتے کہ فرا پیش آمد، بہ اختیار کشید۔ یعقوب علیہ السلام از شوق این دانہ بحدے اشک ریخت کہ وَابْيَضَّتْ عَيْنَاهُ مِنَ الْحُزْنِ مفسر آن شد۔ صدر نشین محفل رسالت صلی الله علیہ وسلم بعد از آنکے کہ استغنا بآن دانہ ہم رسانید، حیاں ساحاصل کرد کہ ہر چند کونہا مکہ را طلاساختہ بحضرت حضور پیدا آورد مدنگوشۂ چشم نہ نگریست و رَفَعْنَا لَكَ ذِكْرَكَ مبیّن این ہمت ست۔ الجملہ ہیچ متنفسے درین عالم نیست و نبودہ و نخواہد بود کہ اثرے ازین خیال در سر نداشتہ باشد۔ مجنون بیچارہ سرگشتہ ہمین طلب از جہان رفت۔ فرہاد مسکین نیز درین ذوق جان داد۔ زلیخا بہ قوت ہمین دانہ پیر را از کار ید جدا ساخت۔ وائے بر داسطے کہ از طلب این دانہ نادانانہ گذشت۔ آمدیم بر سر مدّعا۔ بندہ ہر چند با مذاق طیبۂ محبان و حوصلہ ایشان آشنائی ندارد لیکن بہر حال یک گونہ لذّت سماع پیدا کرد کہ باستناد آن می زیاید ازینجاست کہ خود را خاک پائے اہل محبت می شناسد۔ امّا ہیچ معلوم نشد کہ آن عزیز دانہ خود اکہ

ایک بار سید میر بلگرامی کو اُن کی ماں کی سفارش میں ایک طولانی خط لکھا تھا۔ چند شعر ضیا منتا نقل کیے جاتے ہیں ؎

ائے صیافت شمردہ رجود ورص مادرت مُنت بو نبا ید قرص
می خورد روز و شب او لیکن حتم نوبت آسحنک، ولے از چشم
می ندانی کہ حیثیت صحن و تیر کار گر تر زآہ مادر پیر
مادرت زار بہر قرص نان عمرو رید مر ترا احسان
دعوت اغنیا کہ محض ریاست مارتس ار بر سید ریاست

ﮨ۱۱۸ اور مارے غم کے اُن کی دونوں آنکھیں سفید پڑ گئی تھیں۔ جزو ۱۳۔ سورۂ یوسف ع ۱۰۔ ۱۳

مقسوم ازل است مگر بیش طائرے انداختند که چیده پرواز کرد یا برابت توں سفر و بچنند که بگلو
فرو گشته کیفیت بے توجهی را نہی که واقعی است پیدا نگارد که راقع مسودات باطن گردید
تقدیرے که مخلص از رعایت حقوق دوستانه مقصر دانسته عوض بوده باشد ندهای آن داده
اما چون عوض بدی به بدی در مذهب دوستی نا محمود است بلیت که اظهر به قاعده مکاسل این
طرف پرداخته با دای احسان از جو می شدند و به ابنائے اعمال جهت امتثال مرهون منت
می ساختند مگر چه بود می حقوق صبا از یاد رفت ؎

اے عجب! آن عهد و آن سوگند کو   وعدہائے آن لب چون قند کو
گر فراق بنده از بدبندگی ست   چون تو با بد می کنی پس فرق چیست"

جواب میر احمد به سید ضیاء نمبر

"نامه عنبرین شمامه مشام یگانگی را معطر آمود ساخت و خاطر پراگنده را به جمعیت فراهم
آورد. ملال ما گرانباری کوہهائے محبت هکی إِنَّا عَرَضْنَا الْأَمَانَةَ عَلَى السَّمَاوَاتِ وَالْأَرْضِ
معلوم است که هیاکل افلاک با چنان رفعت و سائر مکونات با آن همه عظمت در تحمل این بار
پیچ و تاب خوردند و پشت خم گشته انکار نمودند و سرور انبیا صلی الله علیه وسلم بحیر آسانی
برگرفت و اولیای امت قدس الله اسرارهم بطفیل متابعت آنحضرت واجنبی اسش هم کمتر
نگذاشتند و بدوش بنا بر گرفته بعره ال من مرید رونمار لکن ما سیوان هندوستان از آن داستم این
بد تسلیم که ثمره اش سهو و نسیان و رسش غفلت و عطالت است الحمد لله و المنة کرفریاد انا ظلمنا
عذرخواه است و اشک ندامت شوینده داغ گناه ؎

بغیر از عذر تقصیر اندرین راه   ندارد چاره بیچاره درویش

بارے با تمسک از همت عزیزان و برکت انفاس ایشان سه بهست که پرده غفلات و نسیان

۱۱۹ اور تمھارے ذکر کا آوازہ بلند کیا جزء ۳۰ سورۃ الانشراح ع ۱۹-۱
۱۲۰ ہم نے ذمہ داری کو آسمانوں اور زمین پر پیش کیا جزء ۲۲ سورۃ الاحزاب ع ۹-۶

از بیش این خیر اندیش بر انداخته شود و ذرہ از عالم محبت نصیب گردد ع

کوتاہ کنم سخن ازین پس وصل است جواب نامہ و بس "

۲۔ ذیل کا وہ منظوم رقعہ ہے جو میر سید احمد کے نام سید ضیاء اللہ نے کسی عید کے موقع پر بھیجا تھا۔

اوّل بہ کرشمہ اش سلامے
و ز دیدہ بہ غمزہ اش پیامے

از نالہ بعشوہ اش دعائے
وز ہجر بہ وصل او ثنائے

از اشک بہ پائے او سجودے
واز آہ بگوش او درودے

از گریہ بخندہ اش نیازے
واز غم بہ نشاط او گدازے

از دست دعا مدامن او
و ز روح نثار بر تن او

شوقے ز نیاز من بنازش
آہے ز خروش من بسازش

چون خط شریف دلبر آمد
از نخل امید من بر آمد

لطفے کہ بنامہ اش نہان بود
برگشتۂ تیغ ہجر جان بود

ہجرے کہ بود مراد دلبر
از وصل ہزار بار خوشتر

چون جان برضائے دوست بست است
از ہر چہ رضائے اوست ست است

ہمّت بمراد او کنم صرف
شد ختم سخن بذکر این حرف

شوقِ تحصیل

میر عبدالجلیل ایک رقعہ میں اپنے فرزند میر سید محمد کو مخاطب کرکے لکھتے ہیں "برخوردارا!
بحضور پدر مرحوم ہمین قدر کہ حالا شما خط و سواد دارید سید شمیم ۔ این ہمہ کہ می ہنید لیسعی خود و شوق
مطالعہ کتاب بہم رسانده ام مطالعہ کتاب بسیار نافع است ہر گر کتاب از خود جدا نباید کرد
انشاء اللہ استعداد تمام بہم خواہد رسید"

میر عبدالجلیل کے باپ نے جس وقت انتقال کیا ہے تو میر کی عمر پچیس سال کے قریب تھی

اُن کو اعتراف اور بجا اعتراف ہے کہ جو کچھ اُنھون نے پایا۔ وہ محض اپنی قوت بازو اور سعی و شوق اور کُتب بینی سے حاصل کیا تھا۔ شاید اس خاندان کی یہ خصوصیت تھی اور بزرگون کا فیض کہ عمر و رُشد بڑھنے اور سمجھ آنے پر خود بخود علم و ہنر حاصل کرنے کا شوق دامنگیر ہو جاتا تھا۔ میر صاحب بھی باایں ہمہ فضل و کمال اور فراخ دستی و علو حوصلہ کے اپنے دُرِّ یتیم (اکلوتے بیٹے) کے لئے خود کچھ نہ کر سکے تھے۔ محض ترغیب و تشویق سے کام لیتے رہے کیونکہ وطن سے دُور اور آل و عیال سے مہجور تھے۔ میر سیّد محمد کی بدخطی یا کم سوادی جس کا بار بار ان تذکرہ فرماتے ہین، حداثت سن کی نہین ہے۔ بلکہ یہ وہ زمانہ ہے کہ میر سید محمد سوانح نگاری بھکر پر مامور ہو چکے ہین اور پدر عالی قدر کی طلب و تاکید پر اسناد سرکاری اور جائزۂ خدمت لینے دار السلطنت کو جا رہے ہین۔

تحصیل علم

میر عبدالجلیل کی پرورش و تربیت تمام تر بلگرام مین ہوئی اور وہان کے مشہور و مقبول معلّمین سے جنکو اِن کے خاندان والون نے علمار و فضلا کے نام سے یاد کیا ہے، ابتدائی کتابین یا درسیات انھون نے پڑھین۔ زیادہ تر میر سعد اللہ[۱۲۱] بلگرامی کی صحبت و تلمذ سے فیض یاب ہوئے۔ میر طفیل[۱۲۲] محمد جن کو کمال حسن عقیدت سے اُن کے تلامذہ اور خوشہ چین اُستاد المحققین

---

۱۲۱ سید سعد اللہ فقر و فضل دونون کے جامع اور اپنے جد امجد سید فیروز کے مُرید تھے۔ ملا عصمی ساکن امروہہ (شاگرد شیخ لیسین قنوجی) اور مُلا عبدالرحیم قاضی مراد آباد (تلمیذ مولوی عبدالحکیم سیالکوٹی) سے اکتساب علوم کرکے بعد فراغ، وطن واپس آئے اور درس و تدریس مین مشغول ہو گئے۔ زیارت حرمین شریفین سے مشرف ہو کر احمد آباد گجرات مین گوشہ گزین ہوئے۔ مولانا نورالدین کے مدرسہ مین قیام تھا۔ ۲۸ شوال ۱۱۳۸ھ (یکم جنوری ۱۷۲۶ء) یوم پنجشنبہ کو رحلت فرمائی۔ روضہ شاہ بھیکن نبیرہ شاہ عالم بخاری مین کنار لحد مین آرام فرما ہوئے۔

۱۲۲ میر طفیل محمد عربی و فارسی کے شاعر بھی تھے۔ ان کا کچھ کلام سبحۃ المرجان مین عربی کا، اور سرو آزاد مین فارسی کا نقل کیا گیا ہے۔ اترولی ضلع علی گڑھ کے باشندے تھے۔ ۱۰۷۳ھ (۱۶۶۲-۶۳ء) مین ولادت

کے لقب سے پکارتے ہیں، ان کے شریک درس تھے شعور کافی ہو جانے پر دونوں بلگرام سے نکلے اور دیگر قصبات پورب میں گھوم پھر کر کچھ کتابیں اور پڑھیں۔ متوسطات متفرق مواضع میں تحصیل کیں۔ اور آخر میں شیخ غلام نقشبند لکھنوی کے حلقہ درس میں حاضر رہکر سلسلہ تحصیل کو انتہا پر پہونچایا۔ قطب المحدثین میر سید مبارک بلگرامی تلمیذ خاص شیخ نور الحق

ہوئی۔ وہاں سے اپنے چچا سید احسن اللہ کے ہمراہ دہلی آئے اور سید حسین ... سے کچھ پڑھا پھر تحصیل علم کے لیے بلگرام آئے۔ ... کے سوا مولوی قطب الدین شمس آبادی ... مالک اور مقیم ... آباد ضلع فرخ آباد متوفی ۱۲۱۱ھ مطابق ۱۷۹۶ء سے کتابیں ختم کیں تیس سال کے قریب یعنی بعض آخر عمر تک سید ... کے دیوانخانہ واقع محلہ سیدان پورہ بلگرام میں مقیم رہے کبھی کبھی بقصد سیر و سیاحت کشمیر و گجرات و دیگر مقامات و متبرکات کو ہو آتے تھے احیائے علوم و تعلیم و تدریس میں تیس سال بلگرام میں بسر فرمائے جماعت کثیر ان کی شاگرد تھی ۱۲۵۱ھ (۱۸۳۶ء) میں رحلت فرمائی اور مرقد میر عبد الجلیل کے قریب باغ موتی میں جگہ پائی بڑے عالم و فاضل بزرگ تھے۔

۱۲۳ھ شیخ غلام نقشبند علوم ظاہری و معنوی کے حامل اور یکتائے روزگار تھے شیخ المشائخ شاہ پیر محمد کے سجادہ پر ممتاز ہوئے۔ ان کا درس بہت دور دور سے حق ... نے شہرت پایا تھا اکثر علمائے عصر ان کے حوالے حصول کرامت کے رنگ رہتے تھے ... شاہ عالم ... عالمگیر ان کی نہایت تعظیم و مدارات کرتا تھا آپ بڑے پابند شریعت تھے۔ ... آپ کی کرامت سے بہت ... تھے رجب ۱۱۲۶ھ (جولائی ۱۷۱۴ء) میں لکھنؤ میں وفات پائی حیدہ ... تفسیر قرآن پاک اور کچھ کتابیں مسئلہ وحدت وجود پر اور عروض وغیرہ میں یادگار چھوڑی ہیں۔

۱۲۴ھ ان کا یہ لقب میر غلام علی آزاد نے کئی جگہ لکھا ہے۔ میر سید مبارک نے حقیقتاً نہایت اچھی زندگی بسر کی تھی۔ اصول و فروع پر نگاہ رکھتے تھے۔ احیائے سنن اور ازالہ بدعات میں ہمیشہ مصروف رہتے۔ ان کا تقوے طہارت ان کے علوم ظاہری و باطنی کی شان کے موافق تھا۔ بلگرام سے درسیات پڑھ کر دہلی چلے گئے تھے۔ وہاں خواجہ عبد اللہ المشہور بہ خواجہ خورد بن خواجہ باقی باللہ نقشبندی سے طول پڑھا۔ دہلی میں قیام شیخ نور الحق کے گھر پر تھا۔ انہیں سے علم حدیث حاصل کیا اور سند پائی اور بقیہ عمر کلام نبوی کی خدمت میں گذار دی محدث کہلاتے تھے۔ میر سید عبد الفتاح عسکری احمد آبادی سے سلسلہ قادریہ میں بیعت کی تھی۔ بڑے پابند سنت اور اجرائے احکام شرعیہ میں نہایت سخت تھے ۱۱۱۵ھ (۱۷۰۳ء) میں بلگرام میں رحلت فرمائی۔

خلف الصدق شیخ عبدالحق[۱۲۵] دہلوی) سے علم حدیث کی سند پائی۔ آزاد لکھتے ہین کہ ان کو تمامی علوم عقلی و نقلی خصوصاً تفسیر و حدیث و لغت عربیہ و تاریخ عرب و عجم و موسیقی ہندوستانی و اکثر فنون عربیہ و محاضرات مین اقتدار عظیم حاصل تھا۔ سیرت نبوی اور اسماء الرجال مین دستگاہ بے نظیر رکھتے تھے خود ان کے استاد شیخ سلام نقش بند جو یورپ کے امام العلماء سمجھے جاتے ہین ہمیشہ ان کی تعریف کرتے اور کمال قدر و احترام فرماتے تھے۔

ابتدائے حال مین میر عبدالجلیل اور میر طفیل محمد نے ارادۂ تحصیل علم مستقر الخلافہ آگرہ[۱۲۶] کا قصد

---

۱۲۵ شیخ عبدالحق محدث دہلوی ہندوستان کے اولیائے کبار سے گزرے ہیں محرم ۹۵۸ھ (جنوری ۱۵۵۱ع) مین پیدا ہوئے اور ۱۰۵۲ھ (۱۶۴۲ع) مین رحلت فرمائی۔ آپ کا مقبرہ دہلی مین حوض شمسی کے کنارے واقع ہے۔ بیس سال کی عمر مین حفظ قرآن مجید اور اکثر علوم دینی کی تحصیل سے فارغ ہوئے۔ عنفوان شباب مین حرمین شریفین کا سفر اختیار کیا۔ مدت دراز تک وہان مقیم رہے اور علمائے اجل و فقرائے اکمل کی صحبت رہی۔ حدیث شریف کے ساتھ آپ کو شغف خاص تھا بلاد عرب مین اس کی تکمیل کی اور بعد مراجعت وطن ۵۰ سال تک اسی فن شریف کا چرچا جاری رکھا۔ آپ کی ذات مقدس سے اس ملک مین جس قدر فیض عام ہوچکا ہے۔ اسکی مثال تمام ممالک عجم مین نہین پائی جاتی۔ تمام فنون علمیہ مین عموماً اور فن حدیث مین خصوصاً نہایت معتبر کتابین تصنیف فرمائین جنکی تعداد تسوید اور جن کی سطرون کا شمار پانچ لاکھ پہونچتا ہے۔ جہانگیر بادشاہ آپ سے نہایت ادب و احترام کے ساتھ دربار مین ملا تھا لکھتا ہے کہ "مدت ہاست کہ در گوشہ دہلی در ضمن توکل بتجرید بسر می برد مرد گرامی است صحبتش بے ذوق نیست"

شیخ نورالحق آپ کے صاحبزادے (...) اور حضرت شیخ کے فرزند رشید تھے۔ زبدۃ التواریخ اور بہت سی کتابین آپ کی یادگار ہین۔

۱۲۶ شہر آگرہ سولھوین صدی عیسوی مین سلطنت مغلیہ کا دارالصدر تھا۔ کچھ زمانہ تک سترھوین صدی مین بھی رہا۔ سلاطین ماضیہ نے اپنی سلطنت و حکمرانی کی مسلسل منوانی یادگارین یہان چھوڑی ہین سنگ سرخ کی مستحکم و بلند عمارتیں اور سنگ مرمر کی نازک و نفیس عمارتین سارے ہندوستان مین اپنا نظیر نہین رکھتین۔ یہ شہر پہلے بیانہ کا ماتحت تھا شاہان اسلام مین سب سے پیشتر سکندر لودی بادشاہ دہلی نے دریائے جمن کے ساحل جنوبی یعنی جانب شرق اپنا محل و قلعہ بنوایا خود ۹۰۹ھ (۱۵۰۳ع) کے قریب مستقر سلطنت ہوگیا اور تمام شاہان لودی کا پایۂ تخت رہا۔ ۹۳۲ھ (۱۵۲۶ع) مین بابر نے ابراہیم حسین لودی پر فتح پائی تو اسکے پرانے محل پر قبضہ کیا جسکی بنیادین شہر آگرہ کی مخالف سمت کچھ زمانہ ہوا جب تک نظر آتی تھین مگر اب یہان ایک خوشنما

کیا۔ نواب فضائل خان میر منشی خلد مکان نے اُس زمانہ میں ملازمت سلطانی سے جدا ہو کر
وہاں گوشہ نشینی اختیار کر لی تھی۔ دونوں صاحب نواب سے ملے اور اُن کی اعانت سے
کچھ روز وہاں اقامت گزین رہے۔ شاہ حسین خان درگاہ خلد مکان سے دیوانی سرکار لکھنؤ پر

اور یا۔ رونق آبادی قائم ہو گئی ہے۔ اس کے ایک سال بعد ۹۳۳ھ (۱۵۲۶ء) میں بابر اور راجپوتوں سے قلعہ چندیری پر ایک فیصلہ کن عظیم جنگ ہوئی جس سے بابر کا قبضہ و تسلط مستقل ہو گیا تو اُس نے یہاں کا قیام بدستور رکھا۔ ۹۳۷ھ (۱۵۳۰ء) میں بابر نے یہیں انتقال کیا۔ اس کے جانشین اور بیٹے ہمایوں نے بھی پرانے آگرہ میں بود و باش اختیار کی یہاں تک کہ ۹۴۷ھ (۱۵۴۰ء) میں اُسکو شیر شاہ کی بدولت اپنی مملکت مالوفہ سے رخصت ہونا پڑا۔ اپنے عہد کے بڑے حصہ میں اکبر نے بھی آگرہ کو مستقر رکھا۔ پھر دریا کی داہنی جانب موجودہ شہر آگرہ کی بنیاد ڈالی ۹۷۳ھ (۱۵۶۶ء) میں آغاز کر کے پانچ سال میں سنگین قلعہ تعمیر کیا اور آگرہ کا نام اکبرآباد اُسیوقت سے قرار پایا [خافی خان کی روایت ہے مرزا رسا شاہجہان نامہ میں لکھتے ہیں کہ یہ نام (اکبرآباد) دادا کی محبت و یادگار میں شاہجہان نے رکھا تھا۔ اُسکے عہد تک آگرہ کہلاتا تھا] چار سال بعد قصبہ فتحپور سیکری کی آبادی کی بنا شہنشاہ مذکور نے ۹۷۷ھ (۱۵۶۹ء) میں رکھی۔ ایک تالاب بیس میل کے محیط و دَور کا اُسکے نواح و اطراف میں تعمیر کرایا جسکے شکستہ و ریختہ سدّہ کے نشانات بعض مقامات و ویرانوں میں ہنوز نمودار ہیں۔ بادشاہ کا عزم فتحپور سیکری کو دارالسلطنت بنانے کا مصمم ہو چکا تھا لیکن آگرہ کی عظمت اور خوبی موقع جمنا کی روانی و مناظر اور ہر طرح کی سہولتوں نے اس ارادہ کو عمل و وجود میں لانے سے باز رکھا۔ ۹۸۸ھ (۱۵۸۰ء) سے ۱۰۰۹ھ (۱۶۰۰ء) تک اکبر اپنی فتوحات جنوب و مشرق ہندوستان میں مصروف رہا لیکن جب اُسکو ۱۰۱۰ھ (۱۶۰۱ء) میں معرکہ آرائیوں اور مہمات سے سبکدوشی ہوئی تو پھر آگرہ چلا آیا اور چار سال بعد ۱۰۱۴ھ (۱۶۰۵ء) میں راہی ملک بقا ہوا۔ اسکے عہد میں قلعہ کے اندر محلات کی تعمیر شروع ہوئی اور آگرہ میں جنوبی دروازہ تعمیر ہوا۔ آگرہ سے مغرب و شمال پانچ میل کے فاصلہ پر سکندرہ کا روضہ اُسی شہنشاہ عظیم الشان کی آخری آرام گاہ کا نشان دیتا ہے جس کو اسکے بیٹے جہانگیر نے تعمیر کرایا تھا۔ اُس کا ایک نہایت عمدہ پھاٹک یا ترائی دروازہ سنگ سرخ کا ہے۔ جہانگیر نے اپنے خسر اعتماد الدولہ کا مقبرہ اور جینی کا روضہ دریا کی بائیں جانب بنوایا اور قلعہ کے اندر محلات کا وہ حصہ جو جہانگیری محل کہلاتا ہے تعمیر کرایا۔ ۱۰۲۸ھ (۱۶۱۸ء) میں وہ آگرہ سے ایسا رخصت ہوا کہ پھر یہاں آنا نصیب نہ ہوا۔ اُسکے عہد کا اختتام تھا اُسکا باقیماندہ وقت پنجاب و کابل میں بسر ہوا۔ ۱۰۳۸ھ (۱۶۲۸ء) میں شاہجہان نے اپنی بادشاہی و تخت نشینی کا اعلان یہیں سے کیا اور ۱۰۴۲ھ (۱۶۳۲ء) سے ۱۰۴۸ھ (۱۶۳۸ء) تک قیام گزین رہا۔ اگرچہ اُس نے دارالسلطنت دہلی کو قرار دیا تھا اور وہاں چلا آیا تھا لیکن آگرہ اور اُس کی یاد کو گوشہ خاطر سے محو نہ کر سکا۔ قلعہ کے اندر کی بہت سی

مامور ہو کر دکن سے اکبرآباد پہونچے۔ میر عبدالجلیل بھی شاہ حسین خان کی رفاقت مین اکبرآباد
سے لکھنؤ چلے آئے۔ پانچ سال وہان قیام رہا۔ خان مذکور بڑی مراعات و عنایات مبذول
رکھتے تھے۔ ظاہری ترقی یہین سے شروع ہوئی اور شیخ غلام نقشبند سے تلمذ بھی اسی زمانہ

عمارات کی تکمیل و تزئین اسکے عہد مین ہوئی۔ موتی مسجد، جامع مسجد، اور خاص محل کا وجود و بقا اسی کے دست دریا نوال کا منت گذار ہے۔ تاج محل جسکی نسبت تسلیم کیا جاتا ہے کہ دنیا مین عہد اسلام و اسلامیان کی تعمیرات کا بہترین اور مکمل ترین نمونہ ہے، اسی کی محبوب ملکہ ممتاز محل ارجمند بانو بیگم کی دائمی یادگار اور زوجین کے عشق و محبت اور باہمی شیفتگی کا ابدی قرینہ ہے۔ ۱۰۶۸ھ (۱۶۵۸ء) مین شاہجہان سے اسکے تیسرے بیٹے عالمگیر نے بغاوت کی اور مقام سامو گڈھ (ضلع آگرہ) فتح پائی تو شاہجہان کو سلطنت سے معزول اور تاج و تخت سے محروم کر دیا۔ لیکن اجازت دی کہ شاہجہان اپنی شاہانہ شوکت و شان کے ساتھ قلعہ اکبرآباد مین سکونت گزین رہے۔ البتہ وہ نظربند یا مقید تھا اور سات سال کے قریب یعنی اپنی وفات تک اسی حالت حبس مین رہا۔ اورنگ زیب دار الخلافہ کو مستقل طور پر دہلی اٹھا لایا۔ ۱۰۷۶ھ (۱۶۶۶ء) سے آگرہ محض ایک صوبہ دار یا گورنر کا مقام رہ گیا۔ جاٹون کے اس پر متوالی و متواتر کوہ شکن حملے ہوتے رہے۔ سلطنت مغلیہ کے تنزل کے زمانہ مین آگرہ کے اکثر مواضع بڑے زبردست و حوصلہ فرسا معرکون کے نتیجے دیکھ چکے ہین اورنگزیب کی وفات پر اسکے بیٹون نے سرحد دھول پور کے متصل جاجو پر خوب جنگ آزمائی کی۔ میر عبدالجلیل کے قیام یا آمد و رفت آگرہ کا تقریباً یہی زمانہ تھا۔ ۱۱۲۴ھ کے اختتام یا ۱۱۲۵ھ کے آغاز یعنی شروع ۱۷۱۳ء مین سلطنت کی قسمت کا فیصلہ پھر سواد آگرہ مین ہوا اور فرخ سیر نے جہاندار شاہ کو شکست دی اور اسی سے تسخیر قلعہ کو فتح کیا۔ اسکی تابناک قسمتین و سر بفلک عمارات پر آل تیمور کا پرچم پھر لہرانے لگا۔ میر عبدالجلیل اسوقت بھی فاتح و منصور بادشاہ کے ہمرکاب تھے۔

آگرہ کی سرزمین بڑی مردم خیز اور ہنرپرور رہی ہے۔ عہد اکبری کے نامور مورخ ابوالفضل اور اسکے برادر عصر بھائی ملک الشعراء فیضی کی یہی ولادت گاہ ہے۔ انیسوین صدی عیسوی مین اس نے انتہائی فارسی اور ادب اردو کے بڑے بڑے معمار صاحب کمال پیدا کئے۔ میر تقی میر اور شیخ ولی محمد نظیر کا خمیر اسی خاک سے تھا۔ مرزا اسد اللہ خان غالب کی عمر کا ابتدائی حصہ بھی یہین گزرا تھا۔

شہر کی مردم شماری ۱۹۲۱ء مین ایک لاکھ تریسٹھ ہزار سات سو پچاس ۱،۶۳،۷۵۰ تھی

۱۲۶ فضائل خان، عالمگیری امراء مین سے تھے۔ بڑے ذی علم اور علم دوست تھے اہل علم کی قدر و سرپرستی

رہا جب شاہ حسین خان دیوانی لکھنؤ سے معزول ہوکر دیوانی صوبہ پٹنہ[۱۲۸] پر منصوب ہوے تو یہ بھی اُن کے ہمرکاب پٹنہ تشریف لے گئے اور اُس سرزمین مین کچھ روز جمعیت خاطر کے ساتھ گزار دیئے پھر ایک تقریب مین بلگرام آنے کا اتفاق ہوا۔ انھین ایام مین سید محمد فیض زمیندار بلگرام کو حادثہ خان عالمی کی وجہ سے درگاہ خلد مکان کی حاضری کی ضرورت پیش آئی

فرماتے تھے۔ شیخ سلیمان اصلی نام تھا اُن کے علم و بزرگی کے لحاظ سے بادشاہ نے فضائل خان خطاب دیا تھا ۱۱۰۱ھ (۹۰-۱۶۸۹ء) مین انتقال کیا۔ دکن کی دیوانی پر بھی کبھی مامور رہے تھے

۱۲۸ھ صوبہ پٹنہ مسلمانون کی ابتدائے حکومت مین صوبۂ بہار کہلاتا تھا اور صوبہ کا گورنر شہر بہار مین رہتا تھا شیر شاہ کی بغاوت پر پٹنہ خود مختار ہوگیا۔ اکبر نے اس کو پھر مغلوب و تابع فرمان کیا اورنگ زیب نے اپنے پوتے عظیم الشان کو گورنر مقرر کرکے بھیجا تو اُس کی مناسبت سے اُسی وقت سے پٹنہ کا نام عظیم آباد پڑگیا جو آج تک شہرت رکھتا ہے۔ ہند برطانوی کی جدید تقسیم و تشکیل مین ۱۹۱۱ء مین اس صوبہ کا نام بہار و اُڑیسہ، قرار دیا گیا اور دارالصدر بدستور پٹنہ رکھا گیا۔ یہ صوبہ جانب غرب صوبہ آگرہ سے، جانب شرق صوبہ بنگالہ سے، شمال مین نیپال سے اور جنوب مین چھوٹا ناگپور سے ملحق و محدود ہے۔ اورنگ زیب خلد مکان کے عہد مین صوبہ بہار مین آٹھ سرکارین اور دو سو چالیس محال تھے۔ طول ایک سو بیس کوس اور عرض ایک سو دس کوس تھا۔ یہ جا ہندؤن کا معبد اور تربیت ہندی کا دار العلم۔ مظفر پور، حاجی پور سارن، مونگیر، اسی صوبہ مین داخل اور شامل تھے

اس صوبہ مین متعدد قدیم شہر و قصبات واقع ہین۔ خود پٹنہ بہت قدیم و مشہور جگہ ہے۔ ہندوستان عتیق کا دار الصدر "پاٹلی پوترہ" یہی مقام تھا۔ اسی کو میگاستھنیز یونانیون کے عہد کا "پالی بوتھرہ" بتاتا ہے یہی عہد گپت شہنشاہون کا "کسم پورہ" تھا چینی سیاحون مین سے فاہیان ۴۰۶ء مین اور ہیون تھسانگ ۶۳۷ء مین اِدہر سے گذرے اور اپنے سفرنامون مین اس سرزمین کا ذکر کرتے ہین۔ ڈاکٹر وڈورس مورخ پٹنہ کا بانی ہرقلس یا بلرام برادر کرشن کو بتاتا ہے۔ مذہب بودھ کا یہی گہوارہ تھا۔ پٹنہ، بدھ گیا، چمپارن، مظفر پور مین بودھون کے گذشتہ عروج و ترقی کے آثار اب بھی بہت سے نظر آتے ہین۔ "چار ستون" اُس راستہ کا نشان دیتے ہین جو مظفر پور اور چمپارن مین ہوکر تین صدی قبل حضرت مسیح نیپال کی ترائی مین جانے کے لئے اشوک نے اختیار کیا تھا۔ وہ ستون جو بکھرا کے پاس ہے اب تک بالکل مکمل اور درست ہے۔ ودسر ائیانرہ کے نزدیک اغلبا اُسی مقام پر

دکن کا عزم کیا۔ میر عبد الجلیل اور سید محمد فیض سے بڑا ربط تھا۔ اِس لئے اُن کی رفاقت مین یہ بھی دکن چلے اور اُردوئے بادشاہی مین پہونچے میر ناصر علی سے میر عبد الجلیل کی ملاقات اسی سفر مین اسی موقع پر ہوئی تھی۔ دکن پہونچتے ہی کام ٹھیک ہوگیا اور یہ بلگرام واپس آئے۔ اسی زمانہ مین خبر آئی کہ شاہ حسین نے مرشد آباد (دار الملک بنگالہ) مین انتقال کیا

جہان پُرانی سلطنت دُنیالی کا دار الصدر آباد تھا۔ بودھون کے آثار، تحقیقات علم الارض کے لحاظ سے گر ایک، بگیہ پور، پٹنہ، ادان، ہتکدسپس پور، تھا۔ او اسلام پور قابل ذکر مقامات ہین جس جگہ نالندا کی مشہور خانقاہ تھی وہان موضع بڑا گانون آباد ہے پُرانی سلطنت مگدھ بھی اسی سرزمین پر تھی جسکی راج دھانی راجگیر تھی۔

بادشاہان تیموریہ کے عہد مین تک بہار اکثر سلاطین و اُمرائے عظام کی جاگیر مین رہتا تھا (بادشاہ درولی عہد کو چھوڑ کر خاندان جغتائیہ کے تمام شاہزادے، ربقالی بنا سلاطین کہلاتے تھے۔)

قصبہ بہار و شہر پٹنہ و سہسرام و قلعہ ہناس گڈھ و مونگیر [illegible] ڈ مونگیر مین عہد اسلام کی یادگارین موجود ہین حضرت شاہ ارزان (متوفی ۱۰۳۲ھ مطابق ۱۶۲۳ء) کی درگاہ بہت متبرک و مشہور ہے جس کی عظمت و زیارت ہندو اور مسلمان یکسان کرتے ہین۔ شیر شاہ کی تعمیر کردہ مسجد سب سے قدیم اور سیف خان کا مدرسہ نہایت خوش منا اور نظر فریب عمارت ہے

۱۷۶۳ء کا واقعہ جو پٹنہ کا قتل عام کہلاتا ہے یہین ہوا تھا ۱۷۶۴ء مین صوبجات بنگال و بہار و اڑیسہ کی دیوانی بحق ایسٹ انڈیا کمپنی اسی قطعہ زمین پر بیٹھ کر منتقل کی گئی تھی۔

مسلمانون کے عہد مین یہ خطہ مہد علم و ادب رہا ہے۔ بڑے بڑے فضلا اور سخنور اس خاک سے اُٹھے اور اسی مین مل گئے ہین۔

۱۷۶۳ء کے قریب تک انگریزی کتابین پٹنہ کے کاغذ پر چھاپی جاتی تھین۔

عہد حاضرہ کی بہترین یادگار اور نفع رسان، مولوی خدا بخش خان بہادر سی۔ آئی۔ ای کا مشرقی کتبخانہ یعنی عربی و فارسی کی قلمی کتابون کا نادر و بے مثل ذخیرہ ہے۔

انگریزی تاریخون مین سے (۱) ہسٹری عہد۔ مولفہ ایم مارٹن مطبوعہ ۱۸۳۸ء اور (۲) بانکی پور گزٹ سو لفہ ڈاکٹر وڈل ۱۸۹۲ء مین یہان کے حالات زیادہ تفصیل و تحقیق کے ساتھ ملتے ہین۔

۱۲۹ سید محمد فیض بلگرام کے موروثی زمیندار اور خود بھی صاحب علم تھے۔ علوم متداولکی کتابین میر محمد اسماعیل و میر سید مبارک اور میر عبد الجلیل بلگرامی سے پڑھی تھین۔ امام ترمذی کی شمائل النبی، اور

تو میر صاحب نے تاریخ لکھی ہے

خان خورشید نسب شاہ حسین ‌‌ ‌ ذات او مظہر آیات جلی
آن امیرے کہ در انواع شکوہ ‌ ‌ ‌ داشتہ مرتبۂ بے بدلی
گوہر فکر وزیران جہان ‌ ‌ ‌ پہلوئے رائے منیرش عملی
در ہزار و صد و ہشت از ہجرت ‌ ‌ ‌ کرد نہضت بہ ریاض ازلی
سال تاریخ خرد گفت چنین ‌ ‌ ‌ باد حشرش بہ حسین ابن علی
(۱۱۰۸ھ (۹۷-۱۶۹۶ء)

شاہ حسین کی وفات کے بعد اُن کے فرزند ارجمند میر محمد رضا جو شاہزادہ عظیم الشان (بن شاہ عالم) کے ہم زلف تھے، بنگالہ سے بہ ارادۂ آستانۂ سلطانی چلے۔ بلگرام میں وارد ہوئے اور میر عبد الجلیل کے دیوان خانہ میں کئی روز مقیم اور راحت گزین رہے

اس وقت تک میر عبد الجلیل کو کم و بیش شوق تحصیل علم باقی تھا۔ ملازمت سرکاری شروع ہوئی تھی، سلسلہ درس و تدریس جاری تھا۔ لہٰذا یہ زمانہ جبکہ میر صاحب کی عمر عزیز کے چالیس سال گذر چکے تھے اُن کا زمانۂ طالب العلمی شمار کیا گیا ہے۔

مبلغ علم

میر عبد الجلیل کو زیادہ تر عطیات وہبی نے چمکا دیا اور مبلغ علم اور استعداد کو بڑھا دیا تھا۔ سید علی[30] معصوم

حصن حصین کا فارسی میں ترجمہ کیا تھا۔ زمینداری کا کاروبار بڑی شان و شوکت و حشم سے انجام دیتے تھے۔ اتفاقاً خان عالم خان حاکم شہر سے کسی بات پر بگڑ گئی اور ۹ر رمضان ۱۱۰۳ھ (۷ جون ۱۶۹۲ء) کو جدال و قتال کی نوبت پہونچی۔ خان عالم غالب آیا۔ سید محمد فیض کا تمام اثاث البیت غارت و تاراج ہوگیا۔ اسکے تدارک کے لئے سید محمد فیض مستعد ہوئے۔ دکن یعنی عسکر عالمگیر جانے کا قصد کیا میر عبد الجلیل بپاس ربط قدیم رفیق سفر تھے۔ دربار سلطانی میں پہونچ کر سارا ماجرا عرض کیا۔ خان عالم پر عتاب اور وہ حکومت بلگرام سے معزول ہوا۔ سید فیض نے ۱۱۳۰ھ (۱۷۱۷ء) میں وفات پائی۔

سے تعارف و ملاقات کا اتفاق جب اِن کو اورنگ آباد [۱۳۰] دکن میں ہوا، اور سابقہ پڑا، اور الظہر پڑھا۔ تو سیّد علی نے فرمایا تھا "کہ میں نے اپنی تمام عمر میں میر عبد الجلیل کے مثل غرائب عُلوم کا جامع نہیں دیکھا ہے۔"

---

۱۳۰ سید علی معصوم مدنی دستکی شیرازی حسنی حسینی، مشاہیر ادبا اور صنادید شعرا سے گذرے ہیں شیراز میں ان کا خاندان علم و فضل کا مشہور گھرانا تھا۔ شیراز کا مدرسہ منصوریہ ان کے دادا میر غیاث الدین منصور سے منسوب ہے

سیّد علی صدر الدین کے باپ سید نظام الدین احمد تھے اور دادا سید معصوم۔ معصوم سید کے ہمراہ شاہ عباس ثانی صفوی نے اپنی بہن کو زیارت حرمین شریفین کے لئے بھیجا تھا۔ ضروریات شرعی سے دونوں نے نکاح کر لیا اور بادشاہ کے خوف سے وطن چھوڑ کر مکہ معظمہ میں قیام اختیار کیا۔ میر نظام الدین وہیں پیدا ہوئے نشو و نما تعلیم و تربیت وہیں پائی۔ محمد سعید اردستانی مخاطب میر جملہ وزیر نے اپنی لڑکیوں کی شادی کرنے کے لئے میر نظام الدین اور ایک اور نوجوان سیّد سلطان کو مبلغ کثیر صرف کر کے حیدر آباد بلایا۔ عبد اللہ قطب شاہ بادشاہ نے دامادی کی اور اپنی بیٹی بیاہ دی۔ بادشاہ اور وزیر سے برہمی و برگشتگی ہو گئی بالآخر زوال سلطنت کا باعث یہی واقعہ ہوا

قطب شاہ کی بیٹی سے میر نظام الدین کا کوئی فرزند نہ تھا۔ سید علی دوسری زوجہ سے تھے جن سے مکّہ میں شادی ہوئی تھی۔ میر سید علی ۱۵ جمادی الاول ۱۰۵۲ھ (۱۶۴۲ء) کو مدینہ منورہ میں متولد ہوئے تھے اسی لئے مدنی کہلاتے ہیں۔ باپ ان کو مکّہ میں چھوڑ گئے تھے۔ ۲۲ ربیع الاول ۱۰۶۸ھ (۱۶۵۷ء) کو قافلہ کے ساتھ حیدر آباد میں داخل ہوئے اور پدر بزرگوار کا شرف قدم بوس حاصل کیا۔ ابو الحسن جب تخت پر بیٹھے تو وہ بوجوہ میر نظام الدین کی اولاد و وابستگان کا دشمن جان تھا اور تشنہ خون۔ سید علی کی درخواست حاجت پر عالمگیر نے اُن کو اپنے حضور میں طلب کر لیا اور عنایات و نوازشیں فرمائیں۔ ڈیڑھ ہزار کے منصب پر سرفراز کیا اور خدمات جلیلہ تفویض فرمائیں، پہلے اورنگ آباد و ماہور صوبہ برار کی حکومت سپرد تھی پھر برہانپور کی دیوانی قبول کر لی تھی۔ کچھ زمانہ بعد بادشاہ عالیجاہ سے اجازت لے کر اپنے اہل و عیال کے ساتھ سید علی حرمین شریفین چلے گئے بعد ازاں ائمہ اطہار علیہم التحیات کی عتبات عالیات کی زیارت کی۔ مشہد مقدس ہوتے ہوئے پھر اصفہان آئے۔ مگر سلطان حسین صفوی نے حسب توقع مدارات و التفات نہ کی۔ آخر کار وطن اصلی شیراز کو چلے آئے اور مدرسہ منصوریہ میں پاؤں توڑ کر بیٹھ گئے ۱۱۲۰ھ (۱۷۰۸ء) میں وفات پائی

تصانیف فائقہ یادگار چھوڑی تھیں (۱) انوار الربیع فی انواع البدیع ۱۰۹۳ھ (۱۶۸۲ء) میں

میر صاحب کے اوصاف جلیلہ میں آزاد اور اُنکے ہم نوا حضرات بڑے اہتمام و اصرار سے لکھتے ہیں کہ ماہران فن موسیقی[۱] آپ کو اُستادِ کامل مانتے تھے۔ میر صاحب نے اپنے اس کمال، وقوف و آگاہی کو اپنی مثنویات امواج الخیال و طوطئے فرخ سیر میں ظاہر

لکھی اسکا نہایت عمدہ اور خوش خط قلمی نسخہ مبارک لائبریری الہ آباد میں محفوظ ہے (۲)، ریاض السالکین جو صحیفۂ کاملہ کی شرح ہے (۳)، حاشیۂ قاموس (۴) دیوان اشعار (۵) سلافۃ العصر فی محاسن اعیان العصر جو شعرائے عرب کا ایک صحیح تذکرہ ہے۔ اس کی تالیف ربیع الثانی ۱۰۸۲ھ (۱۶۷۱ء) کو وقت مصر ختم ہو چکی تھی اسلئے میر عبد الجلیل کا نام اس میں نہیں ملتا ہے (۶) شرح فوائد صمدیہ (۷) حدائق الندیہ

۱۳۶ اورنگ آباد، تاریخوں میں صوبۂ مبارک مباد لکھا جاتا تھا اس شہر (کھڑکی) کی بنیاد ۱۰۱۹ھ (۱۶۱۰ء) میں ملک عنبر وزیر سلاطین نظام شاہی احمد نگر نے ڈالی اور فتح نگر نام رکھا تھا سترھویں صدی عیسوی کے اوائل میں یہاں افواج نظام شاہی بسرکردگی ملک عنبر، اور عساکر شاہان مغلیہ سے معرکہ آرائیاں رہیں حتی کہ ۱۰۲۵ھ (۱۶۱۶ء) میں ماحر آکر عنبر نے سپہ سالار جہانگیری کے حوالہ کر دیا ملک عنبر نے ۱۰۳۵ھ (۱۶۲۶ء) میں وفات پائی اور فرمانروایان احمد نگر کی قوت و حکومت رخصت ہو گئی ۱۰۴۲ھ (۱۶۳۳ء) میں اُن کے ممالک، سلطنت مغلیہ کے متعلق صوبہ دکن میں شامل ہو گئے ۱۰۴۸ھ (۱۶۳۸ء) میں اورنگ زیب، دکن میں نائب السلطنت مقرر ہوا اور جب اُس نے ۱۰۶۳ھ (۱۶۵۳ء) میں کھڑکی میں سکونت اختیار کی تو اُس کا نام بدل کر اورنگ آباد رکھا۔ یہ وہی مقام تھا جہاں سے اورنگ زیب نے اپنی اولوالعزمیوں اور ابتدائی تجاویز کو عملی جامہ پہنایا اور مرہٹوں اور بادشاہان بیجاپور و گولکنڈہ کے مقابلہ میں مہمات وافواج روانہ کیں ۱۰۶۸ھ (۱۶۵۸ء) میں جب اُس نے اپنے باپ شاہجہان کو تخت سے اتار کر نظر بند کر دیا تو چند سال بعد ہمہ تن مصروف ہو کر سلطنت ہائے اسلامی دکن کے مطیع و منقاد کرنے پر کمر باندھی مرہٹوں کے ساتھ لڑائیاں شروع کیں جن میں وہ آخر وقت بلکہ دم مرگ تک مصروف و مشغول رہا حتی کہ ۱۱۱۸ھ (۱۷۰۷ء) میں احمد نگر میں وفات پائی ۱۰۹۷ھ (۱۶۸۶ء) میں بیجاپور اور ۱۰۹۸ھ (۱۶۸۷ء) میں گولکنڈہ جو سلطنت قطب شاہی کا پایۂ تخت تھا فتح ہوا فتح ہونے کے ساتھ ان دونوں سلطنتوں کا الحاق بھی ہو گیا۔ اورنگ زیب کی وفات کے بعد بھی پیچیدگیاں اور مناقشات قائم رہے حتی کہ آصف جاہ نظام اول نے اورنگ آباد آکر اپنی مطلق العنانی و خود مختاری کا اعلان کیا۔ بعد کو حیدرآباد کو اپنا دارالصدر قرار دیا۔

شہر اورنگ آباد شمال و جنوب میں سحیل و ستارا پہاڑیوں کے سلسلہ سے محصور ہے اورنگ زیب کے عہد میں اسکی آبادی دو لاکھ نفوس سے کم نہیں بتائی جاتی۔ اطراف و جوانب کے دیہات اور شکستہ

ثابت کیا ہے۔ فرماتے ہین کہ "استخراج دقائق علوم مین عقلائے عرب اور اُن کے متبعین دانایان عالم پر ترجیح رکھتے ہین۔ لیکن ہندوستان کے اہل موسیقی نے اس فن مین اس قدر لطائف و دقائق استنباط کئے ہین کہ تمامی عالم کے فائق پر راجح ہوگئے ہین۔ اس قول کی سچائی ہر اُس شخص پر ظاہر ہوسکتی ہے جو اس فن مین مہارت و دستگاہ رکھتا ہو"۔ ؎

ہر کس از جلوۂ گل فہم معانی نکند   شرح این دفتر نوشتہ ز بلبل بشنو

مقامات - شہر کی عظمت رفتہ اور گزشتہ رونق و آبادی کی شہادت دیتے ہین۔ بی بی کا مقبرہ سنگ مرمر کا جو بالکل تاج محل کے نمونہ و قطع کا ہے نہایت خوشنما اور دلکش ہے۔ اسکو ۱۰۷۱ھ (۱۶۶۰ء) مین اورنگ زیب نے اعظم شاہ کی طرف سے اپنی ملکہ "بی بی رابعہ دورانی" کی یادگار مین تعمیر کرایا تھا۔ سارے شکستہ حال ہین بلکہ ایک تو صاعقہ برق سے گر گیا ہے۔ جدید شہر اورنگ آباد کہنہ کے پورب واقع ہے۔ فوج کی چھاؤنی جیہم کو دریاے کوم کے اُس پار ہے۔

اورنگ آباد اب سرکار ابد قرار نظام خلد اللہ سلطنتہ کا ایک صوبہ ہے۔ صوبہ دار (کمشنر) اور ناظم صوبہ (ڈسٹرکٹ جج) و تعلقہ دار اول (کلکٹر) و دیگر افسران محکمہ جات عدل و عمل کا مستقر ہے۔ ریل کا اسٹیشن ہے ۱۹۲۱ء مین اسکی آبادی ۶۸۶۷ تھی۔

بہم رسائی آب کا ایک سلسلہ ملک عنبر نے یہان قائم کیا تھا جسکی تکمیل اورنگ زیب نے کی۔ اگرچہ وہ اب زیادہ شکستہ حال ہے تاہم باشندگان کی تمام ضروریات کے لئے نہایت کافی مقدار مین میٹھا پانی بہم پہونچاتا ہے۔ اسکی صنعت و مخزن کو دیکھ کر بڑے بڑے فرزانگان فرنگ اور ماہران فن انجنیری دنگ رہجاتے ہین ۱۹۱۲ء مین ایک جدید طریقہ آبرسانی کا جاری کیا گیا جس سے چھنا ہوا پانی چھاؤنی مین دیا جاتا ہے قابل دید و دلچسپ مقامات شہر اور اُسکے مضافات مین بہت ہین مثلاً اورنگ زیب کی ملکہ کا مقبرہ جسکا ابھی ذکر ہوچکا ہے جامع مسجد معمرہ ملک عنبر۔ نظام کا پُرانا محل جو بوبایل کے قریب ہے۔ قلعہ ارک جو اورنگ زیب کا محلسرا تھا۔ اورنگ زیب کی بیٹی کا مقبرہ۔ شہر سے دو میل شمال کو اورنگ آباد کے مشہور غار ہین۔ ان کی تعداد بارہ ہے۔ یہ بودھوں کے وقت کے ہین اور اُن سے رہبان آخرین کی یادگار ہین۔ اسمین شک نہین کہ یہ نہایت دلکش و دلپسند مناظر پیش کرتے ہین ان کے متعلق کتاب۔ رپورٹ ہاے آثار قدیمہ واقع مغربی ہند جلد سوم قابل ملاحظہ ہے۔

دولت آباد کا عظیم الشان قابل دید قلعہ بھی اورنگ آباد کے قریب ہے جو بارھوین صدی مسیحی مین

میر صاحب کے سوانح نویس اس امر کے بیان سے قاصر رہے ہین کہ اُنھون نے اس فن لطیف کو کہان سیکھا تھا اُن کے اُستاد کون تھے اور کس حد تک شہرت رکھتے تھے؟ لیکن بات بھی

دیوگڈھ یا دیوگیری کہلاتا تھا خلد آباد مین جو روضہ کہلاتا ہے اورنگ زیب خلد مکان کا مقبرہ ہے۔ قبر سادہ ہے اطراف مین سنگ مرمر کا کٹہرہ لگا ہوا ہے۔ اسی بابرکت مقام مین ملک عنبر اور ابوالحسن تاناشاہ [عالمگیر نے آخر بادشاہان قطب شاہی جسکو اورنگ زیب نے ۱۰۹۸ھ (۱۶۸۷ء) مین قید کر دیا تھا] اور آصف جاہ (مورث اعلیٰ حضرت نظام دکن) بھی راحت گزین ہین۔ روضہ نہایت اچھی و پُرفضا جگہ، پہاڑیون پر واقع ہے اور دکن کی مشہور تفرج گاہون مین شمار ہوتا ہے یہان بیس مقبرے اور چودہ سو قبرین ہین۔ میر غلام علی آزاد جنھون نے اپنی زندگی کا بڑا حصہ دکن مین گزارا تھا یہین مدفون ہین۔

۱۲۳ موسیقی، یا موسیق سریانی زبان مین علم سرود کا نام ہے لغت یونانی مین لحن کے معنی مین آتا ہے۔ مرآۃ الخیال مین اسکی ترکیب موسو (معنی ہوا) اور سیقی (معنی گرہ لائی ہوئی) سے لکھی ہے۔ ایک وجہ تسمیہ یہ بھی بتائی جاتی ہے کہ جب حضرت موسیٰ علیٰ نبینا و علیہ السلام نے بہ امتثال فرمان خداوندی اپنا عصائے مبارک پتھر پر مارا اور اُس سے بارہ چشمے جاری ہو گئے تو منادی غیب نے ارشاد کیا کہ "یا موسیٰ سقی" یعنی اے موسیٰ! یاد کر لو جو کچھ ان چشمون کی روانی سے آواز آتی ہے

امام فخر الدین رازی لکھتے ہین کہ موسیقی کی ابتدا حکیم فیثاغورث سے ہوئی جو حضرت سلیمانؑ کے شاگرد تھے صاحب حدیقۃ الانوار بھی اسی روایت کی تصدیق کرتا اور حکیم کے رویائے صادقہ کا پورا واقعہ نقل کرتا ہے بعض حضرت داؤدؑ سے بتاتے ہین۔

دانایان ہند کی رائے مین اس کا ماخذ "ناہید" ہے وہ موسیقی کے معنی "سر الہیٰ" یعنی نعمت خداوندی بتاتے ہین اور اس کا موجد بعض کرشن جی کو اور بعض مہادیو جی کو جن کا زمانہ حضرت مسیحؑ سے ۱۲۳۷ سال قبل گذرا ہے یعنی ۱۲۳۴ سنہ سیوطی، لکھتے ہین۔

اہل تحقیق کی روایت یہ ہے کہ ققنس کسی جانور کا نام ہے جسکی آواز سے حکمائے علم موسیقی کا استخراج کیا ہے اور بارہ بروج فلکی کے مطابق بارہ مقام مقرر کئے اور ان مقامات کے شعبون کا شمار روز و شب کی ساعات کے موافق چوبیس قرار دیا ہے۔ ہر مقام مین دو شعبے رکھے ہین۔ ایک اُسی مقام کی پستی سے اوٹھتا ہے۔ دوسرا اُسی مقام کی بلندی سے پیدا ہوتا ہے موسیقی کے بارہ مقامات کو کسی باکمال نے اس رباعی مین یکجا کر دیا ہے ؎

یاد رکھنے کے قابل ہے کہ بجائے خود بلگرام اس فن کا قدرتی مرکز یا طبعی منبع کسی وقت مانا جاتا تھا۔ آئین اکبری میں لکھا ہے کہ "بلگرام قصبہ الیست خوش ہوا ایشتر مردم آن خوش نغم دسرود دستراء ودر آنجا

راست، عشاق، وسلیک بیانہ — با نوا، اصفہان، بزرگ، نواز
کوچک استاد، عراق و زنگوله — نیس حسینی و راہوے و حجاز

ہر شعبہ چند نغموں سے مرکب ہے۔ یہ مقامات بے شمار ہیں اور ہر ایک جدا جدا نام سے موسوم۔ ان کے گانے کے لئے مختلف اوقات مقرر ہیں۔ ہر مقام کے واسطے جدا گانہ قواعد و اصول منضبط ہیں۔ ہندی راگ فارسی سے بھی قدیم تر اور زیادہ بااثر و وسیع ہے۔ اہل ہند الحان و آواز کو اپنی اصطلاح میں "سُر" کہتے ہیں ان کی تعداد سات ہے۔ انھیں سے "سرگم" بناتے۔ ان کے راگ چھ ہیں اور ہر راگ کے متعلق پانچ راگنیاں ہر ایک کے لئے فصل، وقت مخصوص ہیں۔ مختلف اندام و اشکال کے سازہائے گوناگوں، ہر رگ حسب ضرورت وضع و اختراع کئے گئے ہیں جن سے گوناگوں آوازیں نکلتی ہیں۔ ہندی و ایرانی دونوں راگوں پر ماہرین نے کثیر التعداد اور قابل اعتبار کتابیں لکھی ہیں اور اس فن کے کمالات و لطائف و معلومات میں برابر اضافہ کرتے رہے ہیں۔ ایرانیوں نے ہندوستان آکر یہاں کی موسیقی کو سیکھا و حد کمال تک پہونچایا ہے دونوں کی آمیزش و ترکیب سے ایک تیسری چیز نکالی ہے جو زیادہ لطف انگیز ہوگئی اور جان تازہ بخشتی ہے

تقریباً تمام السنہ یورپ میں یہ کلمہ کسی قدر اختلاف املا و تلفظ کے ساتھ آتا ہے مثلاً انگریزی میں میوزک Music، فرانسیسی میں میوسیق Musique، جرمن میں میوزیکا Muzica، ہسپانوی و پرتگالی و اطالوی و لاطینی میں میوسیکا Musica، گریک یا یونانی میں میوسیکے Musikē، اور اس سے مراد وہ صنائع و فنون لئے جاتے ہیں جن پر اُن کے زعم میں میوز Muse دیویاں کارفرما و مجلس آرا ہوتی ہیں خصوصاً علم موسیقی اور وہ منظومات جو سرود و بربط پر گائے جاتے ہیں اور جن کی ترتیب فن موسیقار کے اصول و ضوابط پر مبنی ہو اور جو ساز و آلات پر سامعہ نواز ہوں۔ اہل یونان اسکے معنی میوز دیوی کے تعلق سے عموم فنون لطیفہ کے لیتے ہیں۔ انگریزی اہل لغت کے نزدیک اس لفظ کا مفہوم ہے (۱) ترانہ و سرود (۲) تال سُر اور سُر (۳) آواز کا تواتر جس کا نغمہ یا الاپ کانوں کو خوش کردے یا ایک وقت صداؤں کا وفاق و اتحاد کے ساتھ بلند ہونا۔

ایک انگریزی فلسفی جان لاک (سنہ ۱۶۳۲ء تا ۱۷۰۴ء) کا قول ہے کہ "مضراب و مزامیر، رقص و سرود، اور نغمہ و ترانہ دنیا میں بہت سے لوگوں کے لئے وہ کیفیت و اثر رکھتے ہیں جو لمحہ ہائے عبادت و دعا، تضرع و خشوع میں متصور و ممکن ہے"

"پیالہ ایست کہ ہر کہ یک روز آب از و آشامد، شناسائی و حسن منظر افزاید"

ایک صاحب حال بزرگ فرماتے ہیں کہ سماع (موسیقی) راحت دل اور اہل محبت کو جنبش دینے والا ہے جو کہ محبت میں سرشاری کرتے ہیں

دوسرے وسیع النظر محققین نے اسکی جامع تعریف یون کی ہے کہ "خوش آہنگی کے ساتھ آوازوں کا پیدا کرنا وہ فن، جو حصول اتحاد صدا، اُسکے مقصودات و متعلقات و وسائط تصدیہ باہمی پر حاوی و منضبط ہے"

متقدمین کا یہ متفقہ فیصلہ تھا کہ نغمات کا چھیڑنا، ہوا کو مسخر کرنا اور گرہ باندھنا ہے

صوفیائے کرام قدس سرہم نغمہ سے لطف خاص اور وجد و عرفان پاتے رہے ہیں۔ اُن کا ارشاد ہے "السماع غذاءُ الارواح" سید الطائفہ جنید بغدادی فرماتے ہیں کہ "میثاق کے روز عادت کلام اَلَسْتُ بِرَبِّکُمْ سے ارواح کو جو لطف آیا تھا اسکا اب تک وہی باقی ہے" سلطان نظام الدین اولیاء فرماتے تھے کہ "میں ایک موقع پر اَلَسْتُ بِرَبِّکُمْ پوربی کی راگ میں سُنا تھا جس کا لطف ہنوز باقی ہے"

۱۳۳ مسلمانوں کے عہد حکومت میں بلکہ اُن کے تسلط و فتح ہندوستان کے آغاز سے اس ملک میں بھی فن موسیقی نے بڑی ترقی کی۔ مسلمان بادشاہوں نے ماہران فن اور اہل کمال کی ہمیشہ قدردانی و سرپرستی فرمائی ہے ایسے حضرات کا حصر و شمار نہ آسان ہے نہ ممکن بہت سے ایسے دانایان فن گزرے ہیں جنکو نام و زندہ جاوید رہیں گے۔ البتہ وہ اہل موسیقی جنھوں نے اپنی نصیحی و ترنم و آواز یا آلات سرود و ساز کی بدولت شہرت و بقا پائی جن کا اکرام و احترام معاصرین و پس آیندگان نے ملحوظ رکھا، جنکے نام نامی تاریخ نگار و تذکرہ نویس نسلاً بعد نسل لکھتے اور بتاتے چلے آئے ہیں ایسے اُستادان مسلم الثبوت کی فہرست یہ ہے (۱) گوپال (۲) امیر خسرو، شاعر مشہور (۳) بیجو (۴) بھانو (۵) بینا دا (۶) بخشو (۷) لوہنگ (۸) سلطان حسین شرقی بادشاہ جون پور (۹) راجہ مان باشندہ گوالیار جو دُھرپد کا موجد ہے اور جس کے زمانہ میں چار اور اہل کمال موجود تھے، یعنی (۱۰) جرجو (۱۱) بھگوان (۱۲) دھوندھی (۱۳) ڈالو (۱۴) تان سین جس نے اکبر اعظم کے عہد میں عروج و شہرہ پایا اور جسکو اُسکے آقائے سابق راجہ رام چند نامی نے بادشاہ کی خواہش سے دربار اکبری کے نذر کر دیا تھا اور جہاں اسنے سنہ ۳۴ جلوس یعنی سنہ ۹۹۶ھ (۱۵۸۸ء) میں وفات پائی (۱۵) سبحان خان (۱۶) سُرگیان خان ساکن فتح پور (۱۷) میان چند یا چاند خان (۱۸) اُس کا بھائی سورج خان (۱۹) تان ترنگ خان پسر تان سین (۲۰) مدن رائے (۲۱) رام داس (۲۲) اُس کا لڑکا سور داس جو نابینائے مادر زاد اور شاعر اور علم اخلاق کا ماہر اور دانائے موسیقی تھا (۲۳) باز بہادر (۲۴) مونڈیا (۲۵) میان وند (۲۶) میان داود (۲۷) ملا اسحاق (۲۸) شیخ حضر (۲۹) شیخ یحیی (۳۰) حسن خان ٹیمی (۳۱) سورت سین (۳۲) اُس کا بھائی الالہدیی (۳۳) مرزا عاقل (۳۴) میان شوری (۳۵) علائی

میر شیر علی افسوس[۳۴]، پروفیسر فورٹ ولیم کالج[۳۵] اپنی تاریخ ہندوستان موسوم بہ آرائش محفل میں تحریر کرتے ہیں کہ "قصبہ لگیرام میں ایک کنواں ہے۔ جو کوئی چالیس دن متصل اس کا پانی پیئے خوب گانے لگے"، میں نہیں کہہ سکتا کہ اس قول کی اصلیت کیا ہے اور افسوس کے ذرائع تحقیق و تصدیق کیا تھے۔ تاہم یہ معلوم ہے کہ ضعیف الاعتقادی کی باتوں یالغو خیالات اور روایات کے نقل کرنے سے اس کتاب میں معمولاً احتراز و اجتناب کیا گیا ہے۔ اس کی اشاعت نواب گورنر جنرل بہادر آرل آف ڈلہوزی کی منظوری و فرمان سے ہوئی تھی اور اسکی ترتیب و تالیف (سنہ ۱۲۲۰ھ مطابق سنہ ۱۸۰۵ء میں) اسوقت کے سررشتہ تعلیم کے اکابر و شہرہ کی ہدایت و ارشاد سے ہوئی۔ مسٹر جے سی ولیمس نے رپورٹ مردم شماری اور مسٹر ولیم آروین نے پرتاپ گڑھ گزیٹیر مطبوعہ سنہ ۱۸۷۰ء میں بھی اس روایت کو نقل کیا ہے۔

اسی قسم کی روایت ہندوستان کے سب سے نامور اور کامل ترین گویا میاں تان سین کی نسبت مشہور ہے جسکو امپیریل گزٹیر نے بھی نقل کیا ہے۔ تان سین کی قبر گوالیار میں شیخ محمد غوث کے

(۳۶) میاں لال یا لال خان (۳۷) ہلیم پرکاش اور دو بین نواز (۳۸) قیروز خان (۳۹) نوبت خان (۴۰) منجھو قوال، جسکے کمال اور خدا پرستی کا اکبر بڑا معتقد اور قائل تھا اور جس کی عطا و بخشش کا ایک واقعہ "دربار اکبری" میں بھی منقول ہے۔

شعرا کے بعد یہی اکبر کے دربار کے ممتاز "خنیاگروں" نے آئین اکبری میں ممتاز جگہ پائی ہے۔

۳۴ھ میر شیر علی افسوس، میر علی مظفر خان، داروغہ نوبت خانہ نواب قاسم خان عالی جاہ کے بیٹے، نارنول کے رہنے والے تھے سلسلۂ نسب امام ہمام جعفر صادق علیہ السلام سے ملتا ہے۔ لڑکپن میں باپ کے ساتھ دہلی سے لکھنؤ چلے آئے تھے۔ بہ روایت گلشن بیخار میر حیدر علی حیران جہان آبادی سے تلمذ تھا۔ پہلے آصف الدولہ کے چچا نواب اسحاق خان کے بعد ازاں مرزا جوان بخت بہادر کی سرکار میں ملازم رہے۔ پھر مسٹر بارلو اور مسٹر گلکرسٹ، قدر شناسان علم و ہنر کے حسب الطلب، مسٹر اسکاٹ رزیڈنٹ کی تجویز سے، معقول مشاہرہ پر سنہ ۱۸۰۰ء میں کلکتہ چلے آئے۔ نو برس زندہ رہے۔ فارسی سے ریختہ میں ترجمہ کرنے کی خدمت پر مامور تھے۔ گلستان کا ترجمہ باغ اردو کے نام سے کیا تھا۔ ہندوستان کی یہ تاریخ (آرائش محفل) اردوئے مروجہ میں لکھی۔ منشی سجان رائے کھتری کی تالیف خلاصۃ التواریخ یا خلاصۃ الہند سے زیادہ تر استفادہ کیا ہے۔ کلکتہ میں سنہ ۱۲۲۱ھ (سنہ ۱۸۰۶ء) میں

مزار کے قریب واقع ہے۔ پہلے اس قبر پر املی کا ایک درخت چھایا ہوا تھا جسکی نسبت عام طور پر یقین کیا جاتا تھا کہ جو شخص اسکے پتے چبا لیتا ہے قدرت خدا سے اسکی آواز نہایت رسیلی اور پیاری ہو جاتی ہے ناچنے گانے والے طبقہ کے لوگ بڑی عقیدت سے اسکو کھاتے اور قدر کرتے تھے۔

اس فضل و کمال معنوی کے باوجود میر صاحب صناعات و فنون سپاہگری میں معرکہ پردازوں کے پیشوا اور ورزش اسلحہ و آلات حرب و ضرب میں ہنرمندوں کے استاد" بقول میر غلام علی آزاد تھے۔ نواب نظام الملک آصف جاہ اول سرور کے مدحیہ قصیدہ میں فخریہ فرماتے ہیں ؎

ز فضل گر گذرم تیغ ہنرمی گیرم | کہ بر جلادت من شاہدانہ این دو گوا
رز ذوالفقار چو برہان قاطعے دارم | بروز معرکہ فیصلہ نمایم این دعوی

شہسواری و فراست کے فن میں بھی طاق تھے گھوڑے پر خوب چڑھتے۔ اپنے بعض اعزہ کو بھی اسکے نکات و پیچ بتائے اور سکھائے تھے حقیقت یہ ہے کہ اس زمانہ میں ان کمالات مردانہ کی بڑی قدر تھی اور کوئی شخص اس وقت تک کامل نہیں سمجھا جاتا تھا جب تک سیف و قلم دونوں کا مرد بلکہ فرد نہ ہو۔

عربی و فارسی و ترکی و ہندی چاروں زبانوں میں بڑی طلاقت و روانی سے گفتگو کرتے اور بے تکلف، نہایت پرلطف شعر کہتے تھے۔

ذوق سخن میر سید جلیل کو بزرگان کرام کے کلام سے بڑی الفت تھی مثنوی مولانا روم اکثر زیر نظر رہتی۔ خواجہ حافظ شیرازی کا کلام بہت پسند تھا۔ اکثر غزلیں اور اشعار انکی زبان پر رہتے تھے امیر خسرو کے ساتھ ان کو بڑا شغف اور اُن کے کلام سے عشق تھا۔ اپنے قصائد و مثنویات میں

امانت حیات سرور کی

۱۳۵ آرائش محفل کا ترجمہ میجر ہنری کورٹ Major Henry Court نے انگریزی میں کیا تھا جس کو پایونیر پریس الہ آباد نے ۱۸۷۱ء میں مار ریار حوالی وخواندہ کے اہتمام سے شائع کیا

اس التفات و تعلق قلبی کی جھلک دکھائی اور اپنا اور امیر کا تقابل و توازن کیا ہے جس کا انشاء اللہ محل مناسب پر بیان کیا جائے گا۔ امیر کی یہ غزل خاص کر پسند تھی، اوقات خاص میں جب لطف و سرور میں ہوتے تو اکثر پڑھا کرتے اور اپنے دوستوں کو سنایا کرتے تھے یہ غزل قاضی شیخ محمد حافظ کو بھی یاد کرا دی تھی جس کو قاضی صاحب بڑے ذوق و شوق سے پڑھتے اور کیفیت و لذت پاتے تھے جسکی تعبیر زبان قال سے نہیں کرسکتے تھے ؎

یار قباچست کرد رخش بمیدان برید
این سر و در سر که هست در خم چوگان برید

مژده زن یار رسید ساخته دارید جان
یوسف ما بازگشت مژده بکنعان برید

مست خراب مرا حاجت نقل است اگر
این جگر خام سوز بر نمکدان برید

نیست دل چون منی در خور شاهین شاه
پاره کنیدش و را بر سگ دربان برید

بر رخ از خون نوشت خسرو دل خسته حال
ور نه دل مانده ام قصه بسلطان برید

حافظہ و یادداشت

میر عبدالجلیل کے حافظہ قوی اور زبردست یادداشت نے اُن کی استعداد وہبی و کسبی کو غایت اقصیٰ پر پہونچا دیا تھا۔ قاموس اللغات[۱۳۶] اول سے آخر تک اُن کی زبان کی نوک پر

۱۳۶ قاموس ایک شرح کا نام ہے جو یوسف بن ماہج نے "نصاب" کی لکھی تھی۔ ایک دوسری کتاب اسی نام کی طب میں بھی ہے جسکو مدین بن عبدالرحمٰن مصری نے گیارھویں صدی میں تحریر کیا تھا مگر یہاں مراد اُس مشہور کتاب سے ہے جو شیخ مجد الدین ابی طاہر محمد بن یعقوب فیروزآبادی نے عربی کے علم لغت، اُسکے اصول و تاریخ اور اشتقاق کے بیان میں تالیف فرمائی ہے۔ شیخ کا مفصل تذکرہ امام جلال الدین سیوطی نے بغیۃ الوعاۃ فی طبقات اللغویین والنحاۃ میں کیا ہے۔ بروایت نور الصباح و مُظہر دار سیوطی شیخ کا زمانہ آٹھویں صدی ہجری میں تھا۔ سنہ ۷۱۹ھ (۱۳۱۹ء) میں پیدا ہوا اور سنہ ۸۱۷ھ (۱۴۱۴ء) میں اس عالم آب و گل سے رخصت ہوگیا۔ زبید (یمن) میں شیخ اسمٰعیل جبرتی کے مقبرہ میں سپرد خاک ہوا۔

تھی۔ اسیطرح اور بہت سی مستند اور جامع کتابین جو کسی وقت نظر سے گذری تھین بڑی او
...ناط عمر مین بھی بدستور یاد تھین۔ احادیث نبوی مع اسناد و اسماء الرجال اور اشعار

حافظ ابن حجر لکھتے ہین کہ شیخ اپنا نسب شیخ ابو اسحاق شیرازی تک پہونچاتے تھے۔ جب ترقی کی اور قضائے ...ن کے والی ہوگئے تو حضرت صدیق اکبر کی اولاد سے ہونے کا دعوی کیا جو کو اپنے قلم سے صدیقی لکھنے لگے۔ سریع الحفظ تھے فرمایا کرتے تھے "کہ مین اسوقت تک سوتا نہین جب تک دو سو سطرین حفظ نہین کر لیتا ہون" ...یلس سے رحلت فرما کر پہلے واسط پہونچے پھر بغداد آئے وہاں سے دمشق گئے جو اسوقت علوم و فنون اسلامی کا مرکز و محور اور اہل علم کا مرجع بنا ہوا تھا۔ حافظ ابن قیم اور تقی سبکی اور سو سے زائد دیگر علما و فضلاء سے تحصیل کی پھر بعلبک و حماۃ اور حلب پہونچے اور ان جہات کے مشاہیر سے سماعت کی ...قدس مین دس برس کے قریب قیام فرمایا۔ درس دیا۔ صدر رہے ان کے فضائل و محاسن دیکھ کر اکابر کی ایک بڑی جماعت ان سے مستفید ہوئی صلاح صفدی اسی زمانہ کے تلامذہ سے تھے۔ شیخ نے وطن سے نکل کر بلاد شمال و مشرق کی سیاحت فرمائی۔ روم پہونچے ہمارے ہندوستان کی زمین نے بھی ان کے قدم چومے تھے۔ یہان سے یمن گئے۔ جمال ریمی کا انتقال ہوچکا تھا۔ ملک اشرف اسمعیل نے اُن کی قدرشناسی و تعظیم کی خود سلطان نے ان کے روبرو زانوے ادب تہ کیا۔ ارکان مملکت نے بھی ان کے خرمن علم سے خوشہ چینی کی پھر سارے یمن کے قاضی مقرر ہوئے سلطان اشرف نے ان کی عظمت و باہر دختر سے شادی کی ...کے حسن و جمال کی توصیف مین مورخین نے بڑے مبالغہ سے کام لیا ہے زبید کی خاک اور اہل زبید کے اخلاق و اکرام نے ان کو اپنا کر لیا اور یہ وہین کے ہو رہے۔ البتہ مکہ معظمہ کو چند بار آئے تھے۔ مدینہ منورہ اور طائف کی بھی مجاورت فرمائی تھی

خزرجی لکھتے ہین کہ جب شیخ نے ۷۹۹ھ (۱۳۹۶ء) مین مکہ مکرمہ کا قصد فرمایا تو سلطان کو ایک عرضداشت لکھی جس مین اپنی کہولت و پیرانہ سالی نحافت جسم اور ضعف قوے کا اظہار کیا اور لکھا تھا کہ صحیح بخاری کی یہ حدیث سامع شریفہ مین بار ہا گذری ہوگی کہ سیدنا رسول اللہ نے فرمایا ہے اذا بلغ المرء ستين سنة فقد اعذر الله اليه جس کا سن ساٹھ برس سے متجاوز ہو جاتا ہے اسکو خداے تعالی بھی معذور رکھتا ہے۔ میری حالت تو یہ ہے کہ ستر سے بھی گذر گیا۔ اسی کے قریب پہونچ رہا ہون۔ بیت رب العالمین اور زیارت سید المرسلین کا شوق و عزم تجدید تعجیل کر رہا ہے۔ مجھے اجازت روانگی دیجیے۔ اسکے سوا کچھ نہین چاہتا

تتوق الى الكعبة الغراء قد زادا — واستحمل القلص الوخادة الزادا
واستاذن الملك المنعام زيد علا — واستودع الله اصحابا واولادا"

و امثال چاروں زبانوں (عربی، فارسی، ترکی اور ہندی) کے انکے خزانہ دماغ میں اس درجہ محفوظ تھے کہ سننے والوں کو حیرت ہوتی تھی۔ تاریخ سے فطری محبت اور طبیعت کو لگاؤ تھا اس لئے بڑے بڑے واقعات اپنے سلسلۂ وقوع کے ساتھ انکو ایسے یاد تھے جیسے کہ انکے پیش نظر گذرے ہوں

سلطان اس خط کو پڑھ کر آبدیدہ ہو گیا اور حضرت تاب (خط کی پیشانی) پر لکھا کہ جس کا سوال وہی ہے جسکو صدر الکمال مصری میری زبان سے ادا کر گیا ہے۔ اس کے لئے سر لب کھلتے ہیں۔ نہ زبان جنبش کرتی ہے نہ نطق یاری کرتا ہے نہ قلم چلتا ہے۔ یمن عُمیا دونا بینا تھا۔ آپ نے منور فرمایا۔ روشنی پھیلائی۔ ہم آپ سے کیونکر کچھ کہہ سکتے ہیں۔ علم مُردہ ہو چکا تھا آپ کو علم ہے کہ آپ ہی کی بدولت اللہ تعالیٰ نے اس کو زندہ کر دیا۔ اے مجد الدین! آپ کو خدا کی قسم دیتا ہوں اور خود بھی قسم کھاتا ہوں کہ اس عمر کی جو تھوڑی عمر میں جو کچھ باقی ہے اس کے لئے دنیا اور نعیم دنیا کا چھوڑنا برداشت کر سکتا ہوں مگر میں اور اہل یمن سے آپکی مفارقت گوارا نہیں کر سکتا۔ شیخ علامہ شوکانی لکھتے ہیں وفی ھذا الکلام دعوۃ للمعتبرین من افاضل السلاطین بتعظیم قدر علماء الدین۔

ان کے ہزارہا تلامذہ تھے حافظ ابن حجر، مقریزی وبرہان حلبی کے نام سر فہرست ہیں۔ احمد بن محمد بن عبد السلام نے بھی بہت سے حالات البدر الطالع من الضوء اللامع لاہل القرن التاسع میں لکھے ہیں۔

کامل ہوش وحواس اور صحت سماعت وبصارت کی حالت میں شب بستم ماہ شوال ۸۱۷ھ (۴ جنوری ۱۴۱۵ء) کو رحلت کی۔

تقی کرمانی لکھتے ہیں کہ مجد الدین نظم ونثر فارسی میں اپنے زمانہ میں بے نظیر تھے۔

تصانیف کثیرہ چھوڑی ہیں۔ لغت وتفسیر وحدیث کی کتابوں کا شمار چالیس سے متجاوز ہے جسب ذیل بالتخصیص قابل ذکر ہیں۔

تفاسیر میں:
۱- بصائر ذوی التمییز فی لطائف الکتاب العزیز۔ دو جلدیں۔ یہ تفسیر فیروزآبادی کے نام سے بھی مشہور ہے
۲- الدر النظیم المرشد الی مقاصد القرآن العظیم۔
۳- تنویر المقباس فی تفسیر ابن عباس۔ چار مجلد میں۔

حدیث میں:
۱- فتح الباری فی شرح البخاری۔ چالیس جلد میں لکھنے کا ارادہ تھا مگر پیام اجل نے مہلت دی بیس جلد مکمل کر پائی تھیں (ابن حجر نے بھی اپنی شرح کا یہی نام رکھا ہے ممکن ہے کہ عدم آگاہی اسکا باعث ہوئی)
۲- امتصاص الشہاد فی افتراض الجہاد۔
۳- الاسعاد بالاصعاد الی درجۃ الاجتہاد۔ تین جلدیں۔
۴- تسہیل طریق الوصول فی الاحادیث الزائدۃ علی جامع الاصول۔

دکن میں میر صاحب کو مرزا آثار علی بیگ سوانح نگار حضور معلّٰی کی مجلس میں جانے کا اتفاق ہوا مرزا کا معمول اور ضابطہ معین تھا کہ ہمیشہ کتاب قاموس کی تصحیح و مقابلہ کرتے رہتے تھے اور اپنے وقت کا ایک حصہ اسی شغل میں صرف فرماتے تھے میر صاحب نے حاضرین محفل سے چند اشکالات

۵۔ الاحادیث الضعیفہ۔
۶۔ الدر الغالی فی الاحادیث العوالی۔
۷۔ سفر السعادہ۔

تاریخ و اخبار میں { المرقاۃ الوفیہ فی طبقات الحنفیہ۔

نفیس و بیش قیمت کتابیں جمع کرنے کا شوق تھا۔ صرف ایک ہی ذخیرہ پچاس ہزار اشرفی کا انتقال سونے میں خریدا تھا اس ابجد خوان علم نے جس وقت کہ اس کو کتاب کے سیدھا رکھنے کی تمیز بھی نہ تھی بعض مبتدی طلبہ کو معارضہ کرتے سنا تھا کہ شیخ کی زبان مستند نہیں۔ وہ محاورات میں لغزش کر جاتا اور اپنی مادری زبان (پارسی) کے تتبع و تقلید میں ایسی بات کہہ جاتا ہے جس پر اعراب ہنستے ہیں۔ اسکی تائید میں میرے ہمدرس اعزا سراپردہ عصمت و حجاب تک لے جاتے اور حجلہ عروسی کی "اقتلی السراج" والی نقل کہ ڈالتے تھے مگر آج وسعت نظر اور قدرے تحقیق کے بعد یہ باتیں افسانہ و حکایت سے زیادہ وقعت نہیں رکھتیں۔ بیشک شیخ شہر فیروز آباد (مضافات شیراز) کا رہنے والا تھا شہر گازرون (فارس) میں پیدا ہوا مگر اس نے ایک بیگانہ زبان میں وہ تبحر حاصل کیا کہ چھ سات سو برس سے برابر اسکی تحقیق مستند اور اس کا فیصلہ معتمد مانا جاتا ہے اور دنیائے علم و ادب نے اسکی وہ قدر و عزت کی ہے جسکی مثال پائی نہیں جاتی۔ شیخ کی عظمت ایک دوسری حیثیت سے بھی کی جاتی ہے جسکی نسبت نامۂ دانشوران ناصری اشارہ کرتا ہے "شیخ مجد الدین فیروز آبادی شافعی کہ از اکابر متاخرین فن حدیث است"۔ امام صفدی اور ابن ہشام وغیرہما کو شیخ سے استفادہ و تلمذ پر فخر تھا۔

قاموس کا پورا نام القاموس المحیط والقابوس الوسیط الجامع لما تفرق فی کلام العرب شماطیط ہے دیباچہ نگار ناقل ہے کہ فیروز آبادی نے قاموس سے پہلے اللامع المعلم العجاب الجامع بین المحکم والعباب فن لغت میں ساٹھ جلدوں میں لکھی تھی۔ یہ لغت کی مشہور کتابوں محکم (مجھے تلاش سے نہیں ملی) اور عباب (مصنفہ الصاغانی متولد ۵۷۷ھ متوفی ۶۵۰ھ) کے بعد اس فن کی سب سے بڑی کتاب تھی۔ اسی لامع جامع کا ایجاز و اختصار کرکے قاموس دو جلدوں میں رکھی گئی۔

سید مرتضیٰ صاحب تاج العروس نے خود شیخ کی قلمی تحریر دیکھی تھی جسمیں جلد اول کے نسخہ دوم پر لکھا تھا کہ اس نسخہ کی تبئیض سے ذی الحجہ ۷۶۸ھ (اگست ۱۳۶۷ء) میں شیخ نے فراغت پائی۔ شیخ کی دیگر تالیفات (فقہ جامع میں) سفر السعادۃ اور بصائر بھی ایسی ہی بلند پایہ ہیں۔

قاموس کے لفظی معنی دریائے عمیق یا جائے ژرف ترین از دریا کے ہیں۔ قاموس اللغۃ بھی واقعی ایک

قاموس کے بیان کئے۔ کوئی صاحب عقدہ کشائی نہ کر سکے۔ آخر خود میر صاحب کو اُن مقامات کو حل کرنا اور سمجھانا پڑا۔ سب نے تحسین وآفرین کی۔ یہی ذریعہ تعارف اور سلسلۂ مروت تھا جس نے مرزا یار علی بیگ کو انکی قدر شناسی پر مائل کر دیا۔ وہ کمال عنایت و نوازش فرماتے تھے اور بالآخر

ایک گہرا سمندر ہے جس سے غواص و متلاشی اپنے دسترس و استعداد کے مطابق ادب و انشا کے لآلی بے بہا نکال لاتے ہیں۔ نورالدین علی بن محمد بن علیف مکی اسکی مدح میں کہتا ہے۔

قد مد مجد الدین فی ایامہ   من بعض ابحرِ علمہ قاموسا

شیخ کی محنت و کمال کی داد یگانہ و بیگانہ سب نے دی ہے لیکن مشیت کی ستم ظریفی دیکھئے کہ سب سے زیادہ اعتنا اُنھیں گہر شناسوں نے کیا ہے جنکو قدر کمال دیار اغیار سے کھینچ لائی تھی۔

(۱) محمد بن الطیب الفاسی شیخ کا شاگرد، مراقش کا رہنے والا تھا جس نے قاموس کی بڑی عالمانہ شرح سب سے پہلے لکھی

(۲) ملا علی القاری سا ہمہ گیر و ہمہ داں ایک شرح "ناموس" لکھ کر اپنی جوہر شناسی کا اعتراف کر کے اہل علم پر بڑا احسان کر گیا ہے

(۳) سید مرتضیٰ زبیدی بھی جسکا مسقط الراس ہندوستان تھا ایک مکمل شرح تاج العروس کے نام سے لکھ کر اہل ذوق کو صلائے عام دے گیا ہے۔

(۴) عاصم آفندی نے قاموس کا ترجمہ ترکی میں اور (۵) فری تاگ Freytag نے ترکی سے اپنی زبان میں کیا۔

(۶) گولیس Golius نے اس کو لاطینی زبان میں منتقل کیا اور حسب ضرورت کہیں ایجاز سے اور کہیں شرح و بسط سے کام لیا ہے۔

(۷) مشرق نوازان فرنگ میں سے موسیو فلجیس فرنسل M Fulgence Fresnel اور پادری جے آر ٹی لائیڈر Rev. J. R. T. Lieder جنھوں نے اپنی عمر مصر و قاہرہ میں گزار دی تھی اسکے حافظ ہو گئے تھے۔

(۸) سب سے زیادہ قابل فخر اور مستحق ستائش مدّ القاموس ہے جو ۱۸۶۳ء میں انگلستان میں چار جلدوں میں شائع ہوئی ایڈورڈ ولیم لین Edward William Lane نے پورے تیس سال یا یوں کہئے کہ اپنی عمر عزیز اسی کی تالیف میں گزار دی تھی۔ ولایت کے ایک دولتمند و علم دوست امیر ڈیوک آف نارتھمبرلینڈ نے سرپرستی و دستگیری کی اور سرمایہ کافی بہم پہنچا دیا کہ غریب الدیار لین سات سال سے زائد مع قبیلہ و خانمان کے قاہرۃ الکبریٰ میں مقیم رہا۔ اُسکے بعد سرکار برطانیہ اور وزرائے مملکت نے بھی فیاضی کی۔ ایڈورڈ اسٹینلی لین پول E. S Lane—Poole نے جو ایڈورڈ لین کا برادر زادہ اور نسخ کا بڑا ماہر خطاط تھا عربی کا ٹائپ اختراع اور تیار کیا۔ اور یہ

میر صاحب کے کمالات صوری و معنوی گزارش کر کے علم دوست بادشاہ کی خاطر فیض ماثر کو انکی طرف متوجہ کر دیا۔

میر عبد الجلیل کے بے مثل حافظہ کا ایک واقعہ اور نقل کیا جاتا ہے۔ نواب امیر الامرا کی مجلس میں سوال درپیش تھا کہ از روے نزول قرآن کون سی آیت سب سے آخری ہے بعض نے کہا اَلْيَوْمَ اَكْمَلْتُ لَكُمْ دِيْنَكُمْ الخ (آج ہم تمھارے لئے تمھارے دین کو کامل کر چکے جزو ۶۔ سورۃ المائدہ۔ ع ۱۔ ۵) بعض نے کسی دوسری آیت کو بتایا۔ لیکن میر صاحب نے فرمایا کہ حقیقتاً یہ آیات اخیر نہیں ہیں۔ آخر حقیقی تو سورۂ بقر کی دو سو اسی وین (دو صد و ہشتادم) آیۃ ہے یعنی وَاتَّقُوْا يَوْمًا تُرْجَعُوْنَ فِيْهِ اِلَى اللّٰهِ ثُمَّ تُوَفّٰى كُلُّ نَفْسٍ مَّا كَسَبَتْ وَهُمْ لَا يُظْلَمُوْنَ (اور اس دن سے ڈرو جب کہ تم اللہ کی طرف لوٹا کر لائے جاؤ گے پھر ہر شخص کو اسکے کئے کا پورا پورا بدلہ دیا جائیگا اور لوگوں پر ظلم نہ ہوگا جزو ۳ سورۃ البقرہ۔ ۶۔ ۳۸) اور تفسیر بیضاوی کی [۱۳۸]

(عربی سے انگریزی ترجمہ والی) جامع و مکمل لغت لندن میں دو جلدوں میں طبع ہوئی۔ ہر جلد میں دو دو حصے ہیں۔ نقل و کتابت میں شیخ ابراہیم المعروف بہ عبد الغفار آفندی لین کے دست و بازو تھے بقول مصنف اس کتاب پر یہ نام دونوں معنی سے صادق آتا ہے (۱) دریا کا بڑھنا یا کشش۔ حقیقتاً یہ ایک سمندر کا موج ہے (۲) اصل قاموس کا تتمہ یا ضمیمہ جسمیں بقدر مقدور اور افزونی کی گئی ہے۔ لین کی وفات کے بعد اسٹینلی لین پول Stanley Lane—Poole نے بقیہ اجزا و حصص کی ادارت و اشاعت کا فرض انجام دیا۔ ۱۸۹۳ء میں سب سے آخر جلد اول کا آٹھواں حصہ مطبع سے نکلا۔ مجموعاً اس کام میں پچاس سال صرف ہوئے۔ جلد دوم کی تکمیل کی نوبت نہیں پہنچی۔ مصنف نے غرائب لغات و شواذ و نوادر کو اس میں لکھا کرنا چاہا تھا مگر پورا نہ کر سکا کچھ اجزا مرتب کر پائے تھے کہ پیام مرگ پہنچ گیا (ایڈورڈ ولیم لین ایک اور علمی یادگار الف لیلہ کا ترجمہ چھوڑ گیا ہے جو ۱۸۳۹ء میں کیا تھا)

(۹) ان سب کے بعد اور بہت تازہ تلاش و کاوش الجاسوس علی القاموس ہے۔ جو احمد فارس افندی الشدیاق صاحب الجوائب کی ضخیم تالیف ہے اور ۱۲۹۹ھ میں قسطنطنیہ کے مطبعۃ الجوائب سے لاجواب ٹائپ اور بڑے اہتمام سے شائع ہوئی۔ م

[۱۳۷] مرزا یار علی بیگ بڑا صاحب استعداد خوش سلیقہ اور بارسوخ امیر تھا۔ خلد مکاں اورنگ زیب کے

م (۱۰) القول المانوس فی صفات القاموس میں مفتی محمد سعد اللہ رامپوری نے اس کتاب کی خوبیاں اور خصوصیتیں پوری تفصیل اور کمال تحسین کے ساتھ بیان کی ہیں۔

عبارت بھی ملاحظہ فرمایئے) کہ ابن عباس[۱۳۹] فرماتے ہیں کہ یہی نزول اخیر ہے جسکو جبریل علیہ السلام لے کر آئے تھے۔ اصفہانی کہتے ہیں کہ یہ نزول وفات شریف سے ایک یوم پیشتر ہوا بعض سات دن اور بعض صرف تین ساعت بتاتے ہیں[۱۱۵] تمامی حضار مجلس انکی اس تقریر اور یادداشت سے متحیر ہوگئے

مزاج میں بہت دخل رکھتا تھا۔ رقعات عالمگیری میں کئی جگہ بادشاہ نے اسکا نام لیا ہے۔

[۱۳۸] ناصر الدین ابو سعید عبد اللہ بن عمر بن محمد الفارسی البیضاوی، صاحب تفسیر مشہورہ شافعی مذہب تھے۔ موضع بیضا (قریہ بیضا) شیراز میں واقع ہے۔ قاضی علامہ اور امام لکھے جاتے تھے کچھ مدت تک شیراز کے قاضی بحیثیت جج رہے تھے۔ تاج الدین سبکی نے طبقات الکبریٰ میں نقل کیا ہے کہ بیضاوی جب قضائے شیراز سے مصروف و معزول ہوئے تو تبریز (طارس) چلے آئے۔ ایک مجمع فضلا میں پہنچے اور پایان مجلس بیٹھ گئے کسی نے ان کو پہچان نہیں پایا۔ مدرس نے ایک نکتہ اس خیال سے پیش کیا کہ حاضرین میں سے کوئی اسکے جواب پر قادر نہ ہوگا اور اجلال استکمال چاہا۔ بیضاوی نے اسکو نہایت خوبی و فصاحت سے بیان کیا بلکہ خود مقرر کی غلطی بھی بتادی۔ وزیر سلطنت اس موقع پر موجود تھا۔ وہ بیضاوی کو اٹھا کر اپنے قریب لے آیا اور ان کے احوال کی تحقیق کی۔ عرض کیا کہ بیضاوی ہوں قضائے شیراز کی طلب و سعی میں آیا ہوں وزیر نے بڑا اکرام و احترام کیا اور خلعت دیکر اسی روز رخصت کردیا۔ دوسری روایت یہ ہے کہ مدت دراز تک وہاں مقیم اور وزیر کی دربار داری کرتے رہے۔ پھر شیخ محمد بن محمد کختائی سے سفارش و امداد چاہی شیخ حسب معمول وزیر کے پاس آئے تو فرمایا کہ "یہ شخص مرد عالم و فاضل ہے امیر کے ساتھ سفر میں اشتراک چاہتا ہے یعنی از جہنم بقدر سجادہ جگہ مانگتا ہے کہ وہی مجلس حکم ہے"۔ شیخ کے اس ارشاد سے بیضاوی ایسے متاثر ہوئے کہ منصب و رعیت دنیوی چھوڑ چھاڑ کر آخر حیات تک شیخ کے ملتزم خدمت رہے اور مرے تو انکی قبر کے پاس دفن ہوئے وفات تبریز میں ۶۸۵ھ (۱۲۸۶ء) میں پائی تھی بعض کہتے ہیں کہ ۶۹۱ھ (۱۲۹۲ء) میں۔

یہ تفسیر موسوم بہ انوار التنزیل و اسرار التاویل شیخ ہی کے ایما سے لکھی تھی۔ یہ نہایت مستند اور بڑے پایہ کی کتاب ہے اہل نظر کا فتویٰ ہے کہ یہ تفسیر "مستغنی الشان غنی عن البیان" ہے۔ اعراب و معانی کے متعلق اسمیں جو کچھ لکھا ہے اسکی تلخیص کشاف سے کی ہے حکمت و کلام کے بارہ میں جسقدر مرقوم ہے اسکو تفسیر کبیر سے لیا ہے اشتقاق و غوامض حقائق و لطائف اشارات کو تفسیر راغب سے اخذ کیا ہے پھر بہت سے وجوہ معقولہ اور تصرفات مقبولہ کا اضافہ اپنی فکر و اصابت رائے سے کیا ہے ہندوستان اور مصر کے کئی مطبعوں میں چھپی ہے۔

[۱۳۹] حضرت عبد اللہ بن عباس کا بحر العلم الخطاب اور ترجمان القرآن اور حبر الامۃ لقب تھا اعاظم صحابہ میں اور افضل اولاد عباس عم رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے تھے حسب تحقیق قاضی نور اللہ شوستری ربیب خاص

میر محمد یوسف نے اپنے نانا کے اس تبحر، حفظ اسناد و تازگی علم سے متاثر ہو کر انکی شان میں فرمایا ہے

هو الامام الذی اقواله حجج ولا تفاوت اصلا فی روایته
فلا الشیخ الصدق مرآة ولا صدأ صان الاله صدوقا فی حکایته

خط

اوائل میں میر عبدالجلیل خط نسخ نہایت شیریں لکھتے تھے۔ پھر نستعلیق سے ایک طبعی

زیر سایہ امیر المومنین علی کرم اللہ وجہہ پائی تھی۔ علم تفسیر و فقہ و حدیث و قرأت میں اُن کا علو درجت اہل نصرت و سیر میں مشہور ہے۔ صاحب استیعاب کی روایت ہے کہ آنحضرت صلعم نے اُن کی نسبت دعا فرمائی تھی اللھم علمه الحکمة و تاویل القرآن اور اللھم فقهه فی الدین وعلمه التاویل اسلام کے متعلق آپ نے نہایت پسندیدہ علمی خدمات انجام دی ہیں۔ آپ کا کاشانۂ فیض طالبان علم و فقہ کا مرکز تھا۔ ارباب شوق جوق جوق آتے استفادہ و استفاصہ کرتے اور خوب سیر ہو کر جاتے آپکے دوسرے بھائی عبید اللہ بن عباس بڑے اہل ہمت و کرم تھے۔ ان کے مائدہ نعمت و خوان نوال سے ایک جماعت کثیر پرورش پاتی تھی "خوان احسان کشادہ و صلائے عام دادہ" انکی نسبت زبان زد خاص و عام تھا۔ ابن عباس کی ولادت شعب ابی طالب میں ہجرت سے تین سال پیشتر (۶۱۹ء) میں ہوئی اور جب رسالت پناہ نے روضۂ رضوان کا عزم فرمایا تو حضرت عبد اللہ کی عمر ۱۳ سال تھی یا کچھ کم۔ ۶۸ھ (۶۸۸ء) میں طائف شریف میں وار البقا کو رحلت کی۔ اکہتر یا بہتر سال عمر تھی۔

ادب و انشا کے بڑے شائق اور قدر شناس تھے۔ آپ کا قول ہے الشعر دیوان العرب فاذا خفی علینا الحرف من القرآن رجعنا الی دیوانها۔ دوسری جگہ فرمایا ہے اذا سألتمونی عن غریب القرآن فالتمسوه فی الشعر۔

یہ حدیث حسن صحیح ترمذی میں ہے کہ نبی پاک صلعم نے آپ کو وصیت فرمائی تھی۔ اذا سألت فاسئل الله واذا استعنت فاستعن بالله۔ جب آپ کے پدر بزرگوار حضرت عباسؓ نے رحلت فرمائی تو ایک اعرابی ماتم گساری کے لئے آیا اور تعزیت میں یہ دو شعر پڑھے ؎

اصبر نکن بك صابرین فانما صبر الرعیة بعد صبر الراس
خیر من العباس اجرك بعده والله خیر منك للعباس

روش ایجاد کرلی تھی۔ یہ نہایت شیریں، دل نشیں اور پختہ تھی جس سے دیکھنے والوں کی آنکھیں روشن ہوجاتی تھیں۔ ذوق کتابت اس حد تک بڑھ گیا تھا کہ قیام بھکر کے آخر ایام میں صحیح بخاری خود لکھ ڈالی تھی۔ مقابلہ کرنے کی فکر میں تھے کہ عزل خدمت ہوگیا

آپ بڑے ہیں صبر فرمائیے کہ ہم چھوٹے بھی صبر کریں۔ عباس کے انتقال سے آپ کو ایسی چیز مل گئی جو آپ کے لئے عباس کی ذات سے زیادہ نفع رساں ہے یعنی ثواب۔ اور عباس کو خدا مل گیا۔ جو اُن کے لئے آپ سے بہتر ہے۔

۱۴۰ ابن عباس کی یہی روایت انوار التنزیل و مدارک نے بھی نقل کی ہے اور شیخ عبدالحق دہلوی نے اپنی کتاب ماثبت بالسنتہ فی ایام السنتہ میں لکھی ہے۔ مفسرین کی ایک جماعت یہ لکھتی ہے کہ اس آیت کے نزول کے گیارہ اور بروایتے سترہ روز بعد حضرت سرور کائنات مفخر موجودات علیہ الصلوٰۃ والتحیات نے انتقال فرمایا۔ التسامۃ العبیریۃ میں تحریر ہے کہ آیت مذکورہ کے اُترنے کے بعد حضرت صلعم اکیس دن یا اٹھارہ دن یا تین ساعت زندہ رہے تھے۔

۱۴۱ نسخ۔ چھ متعارف خطوں میں سے ایک ہے اس کو خواجہ عماد الدین یاقوت مستعصمی نے اختراع کیا تھا۔ اہل لغت نسخ کے معنی "زائل کرنا" یا کسی چیز کو اُس سے بہتر چیز دیگر ذکر دینا" بتاتے ہیں اس لئے جب خواجہ عماد نے اس خط کو نکالا تو جتنے اور خطوط تھے اسکے سامنے منسوخ ہوگئے اور اس خط کا نام نسخ رکھا گیا۔ ابو علی بن مُقلہ اس کے موجد مانے گئے ہیں جنھوں نے اس خط کو خط کوفی سے نقل کیا اور اپنے ادراک و شعور کے موافق انھیں اختراعات کیں اُن کا خط خوب تھا۔ لیکن علی بن ہلال الکاتب مشہور بہ ابن بوّاب کا یہ مرتبہ تھا کہ اُنھوں نے ابو علی کے طریقہ کی تنقیح و تہذیب کی اور اس کو بہجت و حلاوت کا جامہ پہنایا تمام خوشنویس اُنکا تتبع کرتے آئے اور اُن کے منوال اور پرداز کتابت پر چلتے رہے ہیں۔ امام یافعی فرماتے ہیں کہ کتابت میں اُنکے برابر یا اُن کے نزدیک تک کوئی نہیں پہنچا۔ تاریخ مصر و قاہرہ میں لکھا ہے علی بن ہلال الامام الاستاذ ابوالحسن صاحب الخط المنسوب الفائق المعروف بہ ابن البواب کان ابوہ نوابا لبنی بویہ وھو عھو الفراٰن و نفقہ و فاق اھل عصرہ فی الخط المنسوب حتی شاع ذکرہ شرقا وغربا وکان ھو حاد مالفخر الدولہ۔

تقدیر الٰہیہ کی کرشمہ سازی دیکھئے کہ ملک بہاء الدولہ بن بویہ کا ایک ادنیٰ غلام قلم و کتابت کا شہنشاہ ہوجاتا ہے اور آفتاب کمال ہوکر چمکتا ہے۔ ابن بواب کی وفات جمادی الاول ۴۱۳ھ (اگست ۱۰۲۲ء) میں بتائی جاتی ہے لیکن قاضی نوراللہ شوستری ۴۲۳ھ (۱۰۳۲ء) لکھتے ہیں۔ دارالسلام بغداد مدفن ہے اکثر شعرائے

شاہجہان آباد کے عزم سے نکلے۔ نوشہرہ میں جو سواد جہلم میں اُس وقت ایک موضع تھا اور
اب نوشہرہ کے نام سے ایک مشہور مقام ہو گیا ہے، خیمے ڈال دئے اور محض صحیح بخاری کی
تصحیح و مقابلہ کے لئے وہاں چھ ماہ مکث و قیام فرمایا بہت سے توابع و لواحق ہم رکاب تھے

معاصر نے نہایت روانگیز مراثی عربی میں لکھے ہیں۔

ف عربی کے بہترین اور نام آور لکھنے والوں کی فہرست میں دو یاقوت نہایت ممتاز و روشن نظر آتے ہیں۔

(۱) یاقوت الملکی۔ امین الدولہ ابو الدر یاقوت بن عبد اللہ الموصلی جو سلطان ابو الفتح ملک شاہ بن سلجوق بن محمد بن ملک شاہ اکبر سلجوقی کا کاتب و خوشنویس تھا اُسی تعلق سے الملکی کہلاتا ہے موصل میں ۶۱۸ھ (۱۲۲۱ء) میں وفات پائی۔

(۲) یاقوت المستعصمی ابو المجد خواجہ عماد الدین یاقوت مستعصمی جس کا نام اوپر لیا گیا ہے مستعصم کا کاتب دیوان و خطاط تھا ۶۹۸ھ (۱۲۹۸ء) میں رہگرائے عالم جاوداں ہوا۔

۱۴۲ف نستعلیق خط معروف ہے۔ یہ لفظ اصل میں نسخ تعلیق تھا۔ نسخ اور تعلیق دو خطوں کے نام ہیں جن سے یہ خط استخراج کیا گیا ہے جب دونوں کی ترکیب سے ایک نام مقرر ہو گیا تو خائے معجمہ تخفیفاً حذف کر دی گئی۔ اس خط نے بلاد ایران و ترکستان و کشمیر وغیرہ میں بہت عروج پایا۔ ممالک اسلامی میں امرا و سلاطین نے سرپرستی فرمائی اسکے ماہرین اور اہل کمال پر بخشش و عطا کے دریا بہا دئے ہمارے ملک میں کوئی ایسا پرانا خاندان نہ ہوگا جسکے بزرگوں اور مورثوں نے ایک ایک حرف کے عوض ایک ایک اشرفی بلکہ نقد جان دیکر کوئی قطعہ یا وصلی نہ خریدی ہو۔ اسکا بہترین ذخیرہ تو فرنگستان اہی قدر شناس نظروں اور زرپاش ہاتھوں کی معرفت منتقل ہو گیا۔ کم ہمت و پست حوصلہ اخلاف اس دولت گرانمایہ سے محروم رہ گئے۔ جو کچھ باقی ہے وہ بھی رفتہ رفتہ رخصت ہو رہا ہے۔ اس خیال سے کہ کان میں پڑی ہوئی بات کبھی کام آتی ہے اس خط کے موجد اور بعض مشاہیر کاتبین کا مختصراً تذکرہ کر دینا ضروری سمجھتا ہوں۔

واضع خط نستعلیق خواجہ میر علی علوی تبریزی تھے۔ ان کے حالات میں ایک پوری مثنوی انکے ایک شاگرد رشید مولانا سلطان علی نے لکھی ہے ؎

نستعلیق اگر خفی و جلی است | واضع اصل خواجہ میر علی است
نسبتش بود با علی ازلی | نسبتش میزمی رسد بہ علی

ہزار ہا روپیہ صرف ہو گیا

اسیطرح دلائل الخیرات کا وہ نسخہ جو وظیفہ خاص مین تھا اپنے ہاتھ سے تحریر فرمایا تھا معمول یہ تھا کہ جب کتابت کا قصد کرتے تو پہلے ایک معین کا عدد حمد و صلوٰۃ لکھ لیتے پھر جو کچھ لکھنا مقصود ہوتا اُسکو شروع کرتے۔ آخر عمر تک یہی عمل قائم رکھا۔ کتبخانہ عظیم جو سبر صاحب نے اپنی باقیات صالحات کے زمرہ مین چھوڑا تھا۔ اسمین کی اکثر کتابین خود اِن کے

تاکہ بودہ است عالم و آدم | ہرگز این خط نبودہ در عالم
وضع فرمود او ز ذہن دقیق | از خط نسخ و از خط تعلیق
نے ز کلکش ازان شکر ریز است | کاصلش از خاک پاک تبریز است
نہ کسی مثل او ز ہمدانی | بے ولایت نبودہ تا دانی
کاتبانیکہ کہنہ و نوئیند | خوشہ چینان خرمن اُویند
در جمیع خطوط بود سترگ | رہ استادان ستودہ ام این حرف
خط پاکش چو شعر اُو موزون | ہست تعریف او ز حد بیرون
مُدعا صر محسع الاتصال | شیخ شیرین مقال سنج کمال
آنکہ شعرش چو میوہ ہائے خجند | ہست شیرین تر از نبات و قند
ہمہ رفتند از جہان خراب | رُخ نہفتند در نقاب تراب
بہر شان راحیہ خوانم و دائم | رَوّحَ اللّٰہُ رُوحَہُم خوانم

خود مولانا سلطان علی مشہدی نے بھی اس فن کتابت کو بہت ترقی دی اور خط نستعلیق مین مقدر کمال کمال شہرت پائی اپنے رسالہ منظومہ مین وہ لکھتے ہیں کہ مین نے بظاہر اس فن کو استادان فن سے سیکھا ہے مگر حقیقتاً یہ رتبہ عالی محض حضرت امیر کرم اللہ وجہہ کی نظر مہر و توجہ سے حاصل ہوا ہے ؎

خواب را مختصر نمودم باز | قصۂ خواب ہست و دیر و دراز
بندہ سلطان علی غلام علی است | شہرت خط او ز نام علی است

مؤلف حبیب السیر لکھتا ہے کہ یہ بڑے وجیہ صورت اور نیک سیرت تھے خط نستعلیق مین ایسی مہارت تھی کہ متقدمین و متاخرین کو گرد کر دیا تھا سلطان حسین مرزا کا زمانہ پایا بادشاہ کے ایما اور میر علی شیر کے التماس سے بہت سی کتابین لکھ ڈالی تھین شعر بھی کہتے تھے عمر ساٹھ برس سے متجاوز ہو چکی تھی۔ مگر

دست و قلم کی درست و اصلاح کی ہوئی تھیں ہر ایک کا مقابلہ بھی خود فرمایا تھا۔ بہت سے نسخے دست خاص سے لکھے تھے

کُتُب خانہ

بزرگان بلگرام کو خود کتابیں لکھنے اور کتبخانہ جمع کرنے کا شوق تھا شیخ کمال[۹۰۰ھ] زنوری باوجود حکومت و تمول و تولیت اراضی و مدد معاش کے بدایت عمر سے نفس واپسین تک خدمت علم میں مصروف رہے۔ خط عربی نہایت جلا و شیرینی و پختگی کے ساتھ لکھتے تھے تمام درسی کتابیں، صرف و نحو و منطق و حکمت و معانی و بیان و فقہ و اصول و تفسیر و غیرہا کی اپنے ہاتھ سے لکھی تھیں اور ہر کتاب کو اول سے آخر تک خود محشّیٰ کیا تھا۔ یہان تک کہ متن شرح کا محتاج اور شرح حاشیہ کی محتاج رہی تھی مآثر الکرام مین لکھا ہے کہ "ان کتابون کو صحائف آسمانی کا نمونہ اور الواح ربانی کا نسخہ کہہ سکتے تھے۔ اسلئے کہ تمام کتاب مین کسی جگہ بھی ایک نقطہ

ہاتھ مین قوت اور قلم کا زور باقی تھا۔ فرماتے ہین ؎

مرا عمر شصت و سہ شد، بلبش و کم | ہنوز م جوان ہست مشکین قلم
توانم ہنوز از خفی و جلی | نوشتن کہ العبد سلطان علی

سنہ ۹۱۹ھ ۱۵۱۳ء، مین مشہد مقدس مین وفات پائی۔

مُلّا میر علی مشہدی نے ملا زین الدین محمود کاتب اور ملا سلطان علی سے مشق کی تھی جب ان کا خط مرتبۂ کمال کو پہونچ گیا تو مولانا سلطان علی سے برسر دعوی و مقابلہ ہوئے۔ اہل عصر نے مولانا کی جانبداری کی۔ آخر کار اتمام حجت کے لئے میر علی نے مولانا سے اُن کے لکھے ہوئے، تین قطعے لے کر تقلید (نقل) کی اور اپنے اور اُن کے قطعے لے کر مولانا کے پاس آئے۔ مولانا شناخت نہ کرسکے متحیر تھے کہ اُن کا خط کونسا ہے۔ بڑے تامل کے بعد ملا میر علی کے خط کو اُٹھا لیا۔ عبید خان ازبک مع دیگر کاملین فنون اور مقتدایان حرفہ کے ان کو ہرات سے بخارا لیگیا تھا بیچارے کو تمام عمر وہان رہنا پڑا اسیجہ پریشان تھے اور بڑی حسرت و تمنا سے ہرات کی یاد کیا کرتے تھے ؎

طالب من ہمہ شاہان جہانند مرا | در بخارا جگر از بہر معیشت خون شد
این بلا بر سرم از بہر خط آمد امروز | کہ خط سلسلۂ پائے من مجنون شد

غلط نہیں ملتا تھا اور یہ کتابیں اہل شوق و اہل علم کے صرف میں مدتوں رہی تھیں شیخ کمال کا کتبخانہ اُن کے بعد بالکل برباد ہوگیا کتابیں متفرق و منتشر ہوگئیں۔ جسکے جو ہاتھ لگی، لے گیا۔ کچھ بلگرام میں رہیں اور کچھ اطراف و اکناف میں پہنچیں۔ کسی دردمند نے شیخ کمال کے کمال اور اُنکی ذخیرۂ علم کی پریشانی و تاراج کا مرثیہ لکھا تھا ؎

بر طالبان حیات دو روزہ وبال شد   دردا و حسرتا کہ زوال کمال شد

اسیطرح سید عبد الواحد بلگرامی جو فاضل عصر اور نادر زاد دلی تھے خط نسخ نہایت شیرین لکھتے تھے بہت سے نسخے کلام اللہ المجید کے اور بے پایان کتابیں اپنے قلم سے لکھ ڈالی تھیں۔

سید عبد اللہ بلگرامی، قابل تخلص، اور اسم ہاشمی تھی علوم عربی و فارسی و ہندی میں ذی استعداد تھی اور ہفت قلم سے خط لکھتے تھے۔ سپاہگری کے فن اور استعمال آلات حرب و ضرب میں طاق تھے۔ کاغذ کے پھول نہایت خوب تراشتے تھے۔ نواب سربلند خان کی خدمت میں رہے تھے سنہ ۱۱۲۲ھ (۱۷۰۹-۱۰ء) میں رحلت کی۔ نادر اور عمدہ کتب خانہ جمع کیا تھا۔ اُن کے انتقال کے بعد کتابیں متفرق و منتشر ہوگئیں اور کتبخانہ لُٹ گیا۔

سید عبد الجلیل کو کتابیں جمع کرنے کا بے حد شوق تھا خود بھی لکھتے اور جہان کہیں کوئی اچھی کتاب دستیاب ہوسکتی اُس کی فکر و تلاش میں رہتے تھے۔ میر سید محمد کو لکھتے ہیں کہ "برخوردارا! کتاب وصفۃ النظر (منتخب اشعار عربی و فارسی) اُس صندوق میں رکھی ہے جو گجرات سے گھر پر لے آیا تھا۔ یہ کتاب کمیاب ہے اُسکی نفاست کے سبب سے براہ احتیاط میں اسکو ہمراہ نہیں لایا تھا۔ اسوقت اُس کتاب کی فہرست کی

ملا میر علی نے اپنا ورثہ اپنے فرزند مُلا باقر کو دیا تھا۔ ملا باقر کاتب گر خان اعظم مرزا عزیز کوکلتاش اکبر بادشاہ کا تھا اہل نظر اسکے قلم کے ایک ایک حرف کو بڑی قدر سے دیکھتے اور مشہور استادوں کی تحریرات کے برابر جگہ دیتے تھے۔

سنہ ۱۱۴۳ قاضی ابو الصبح بلگرامی عرف شیخ کمال بروایت شرائف عثمانی ۹۱۷ھ (۱۵۱۱ء) میں پیدا ہوئے اکبر بادشاہ کے عہد میں خدمت قضا پر ممتاز تھے۔ چوراسی سال کی عمر میں ۱۰۰۰ھ (۱۵۹۲ء) میں رحلت فرمائی۔ ملا میر عثمانی نے تاریخ وفات جو اُن کے نام "شیخ کمال" میں پائی

ضرورت لاحق ہے۔ کتاب کو صندوق سے نکال کر اور مخدومی میاں محمد طفیل کو دکھا کر ان سے التماس کیجئے کہ اگر فرصت ہو تو چند ورقوں پر اسکی نقل کر دین۔ ورنہ آپ (برخوردار مخاطب) خود ہی اُس کی نقل احتیاط کے ساتھ کر کے اور مقابلہ کر کے اپنے خط مین ملفوف کر کے بھیج دین کہ ضرورت شدید ہے۔ کتابون کی احتیاط کے بارہ مین کیا لکھون۔ آپ پر ظاہر ہے کہ مین کتابون کو کس قدر عزیز رکھتا ہون اور کتنی محنت و تلاش سے اُن کو فراہم کیا ہے۔ آپ مجھسے بھی زیادہ احتیاط سے کام لین گے اور حزم و ہوشیاری رکھین گے تاکہ کتاب بیجا نہ جانے پائے۔ کبھی کبھی دھوپ بھی دکھادیا کرین۔ زیادہ کیا مبالغہ کیا جاسے۔ مخدومی میاں محمد طفیل نے رسالہ کلمۂ طیبہ فقیر سے نقل کرنے کیلئے لیا تھا جب فارغ ہو جائے تو احتیاط کے ساتھ کتابون مین رکھدیجئے گا۔ ایک دوسرے خط مین اطلاع دیتے ہین" جو کتابین آپ کیلئے بہم پہونچائی تھین، اُن کی فہرست بھیج چکا ہون جب راستون کی طرف سے دلجمعی ہو جائیگی تو کتابین بھی بھیج دون گا آپ اُن کو دیکھین گے تو بہت محظوظ ہون گے"۔

تیسرے موقع پر ارشاد ہوتا ہے کہ" نصاب ترکی، جو آپ نے بھیجا تھا پہونچگیا۔ خدا سلامت رکھے۔ ایک جزو رسالہ اذن حدیث کا جو مرحومی سیدی شیخی میر سید مبارک مغفور نے اپنے خط سے لکھ کر سند اجازت کے طور پر بندہ کو دیا تھا مین گھر پر چھوڑ آیا تھا۔ یہان اکثر اوقات مطلوب ہوتا ہے۔ لازم ہے کہ اصل (جزو) کو جو متبرک ہے اُسی جگہہ رہنے دیجئے۔ اُسکی نقل کر کے بعد مقابلہ مجھے بھیج دیجئے۔ اس باب مین تاکید سمجھئے گا۔ اسی طرح چھوٹی بیاض مین بعض اشعار عربی لکھے ہوئے ہین۔ جو ان کنکولا کی ترکیب بھی اسمین درج ہے، تم نے اُسی سے لکھ کر مجھے بھیجی تھی۔ ایک ورق پر اوزان رباعی جو محمد امین جونپوری کشمیری نے نظم کئے تھے مین نے تحریر کر دیے ہین اُنکی نقل بھی درکار ہے نقل کر کے اور مقابلہ کر کے بھیجدیجیے گا"۔ ... اختیارات بدیعی جو طب کی

اس نام کی کئی کتابین ہین۔ ایک کتاب اختیارات احکام سعادت و نحوست کے بارے مین ہے ایک اختیارات بدیعی کا ذکر محمد بن عبدالخالق بن معروف نے اپنی تصنیف تالیف "کنز اللغات" مین کیا ہے

ایک کتاب ہے۔ الفاظ الادویہ، قرابادین شفائی، کون کتاب گھر پر موجود نہیں ہے۔ کتاب اختیارات کو آپ اکثر زیر مطالعہ رکھیں۔ ...."

اسی رسالہ کی پھر یاد آتی ہے اور تاکید کرتے ہیں کہ "میں نے اس سے پہلے آپ کو لکھا تھا کہ سند علم حدیث جو میر مرحوم میر سید مبارک رضوان اللہ علیہ نے بندہ کو دی تھی ایک چھوٹے سے جزو پر لکھی ہوئی ہے۔ اسی جزو کے ورق اخیر پر میر سطور کا خط شریف ہے۔ مناسب ہے کہ اُس جزو کو کتاب خانہ سے نکال کر نقل کر کے مقابلہ کے بعد احتیاط کے ساتھ بھیج دیجئے کہ سخت ضرورت ہے اور اصل جزو کو باحتیاط تمام گھر پر محفوظ رکھئے۔ اس باب میں اس سے زیادہ کیا مبالغہ کیا جائے"

"کتاب تہذیب[١٤٥] الاسماء کے اوائل میں جو باب کُنی واقع ہے اُس کی نقل کر کے بھیج دیجئے"

اشرف علی خان داروغہ خلعت خانہ شاہی کے یہاں میر سیاہہ تبرک لے کر سیچ[١٤٦] یا شال کے لینے کے لئے جاتے ہیں وہ بھی شائق علم ہیں ان سے بڑی تپاک و گرم جوشی سے ملتے ہیں

حس کو کارگیا سلطان محمود والی جیلان (۸۵۱ھ لغایتہ ۸۸۳ھ مطابق ۱۴۴۷ء لغایتہ ۱۴۷۸ء) کے نام سے معنون کیا تھا میر صاحب جسکا ذکر کرتے ہیں۔ وہ علی بن الحسین الانصاری مشہر حاجی زین العطار کی تصنیف، بلکہ بدیع الجمال کے نام سے منسوب ہے اسمیں دواؤں اور جڑی بوٹیوں کے اسما عربی و فارسی و ہندی مع ان کے متعلق تمام ضروری اطلاعات اور طبی تحقیقات و معلومات کے مندرج ہیں۔ اسکے قلمی نسخے اس ملک میں بسیوں ملتے ہیں کبھی چھپی بھی تھی

١٤٥ تہذیب الاسماء (مرتب الحروف) فن لغت میں نہایت قابل قدر کتاب ہے اسمیں اسمائے عربیہ فارسی میں بیاں کئے گئے ہیں یہ مجموعہ اٹھائیس کتابوں میں منقسم ہے اور ہر کتاب میں تین تین باب ہیں۔ الفاظ حروف ہجا کی ترتیب کے مطابق درج کئے گئے ہیں۔ اسمای حسنی یعنی لو دو نام پاک سے ابتدا کی ہے اور اُن کو مع اُن کے معانی و مطالب کے توضاحت تحریر کیا ہے

اس کا مصنف محمود بن عمر بن محمود بن منصور القاضی الزنجی السنجزی ثم الهرفی تقیلہ سیستان کا تھا، اُس نے بہت سی مستند اور مبسوط کتابوں اور صحیح آحد سے استفادہ کیا تھا ١۔ الاسامی والاسماء ٢۔ کتاب الاسامی الموسوم بالسعیدی ٣۔ کتاب البُلغۃ۔ ٤۔ کنز الاسامی۔ ٥۔ ترجمان القرآن۔ ٦۔ الرحضہ۔ ٧۔ المنت امیرہ۔ اصطلاحات المنطق۔ ٩۔ عرب المصنف کا اسے بالخصوص حوالہ دیا ہے۔ حاجی خلیفہ نے بھی اسکا ذکر کشف الظنون عن اسامی الکتب والفنون کی جلد ششم میں صفحہ ٢٧٣ پر کیا ہے۔

یورا دن ان کو اپنے "سامنے" رکھتے اور لطف صحبت اٹھاتے ہین - ان کو ثعالبی کی کتاب سر الادب کی مدت سے تلاش ہے - کہین دستیاب نہین ہوتی بخان موصوف کے پاس موجود ہے بے تکلف نہایت تواضع سے کتاب میر عبد الجلیل کو عنایت کر دیتے اور انکا کام بھی نکلوا دیتے ہین سید عبد اللہ جن کا ذکر ابھی ہو چکا ہے جوار رحمت الٰہی مین پہونچ چکے تھے - لیکن اُنکی کتابین اُسوقت تک دستبرد و غارت سے محفوظ تھین - اُن کے کتاب خانہ مین ایک نادر کتاب تھی یعنی کسی شافعی المذہب عالم نے ہدایۂ حنفی پر حاشیہ رد اقوال ہدایہ مین لکھا تھا یہ حاشیہ میر عبد اللہ مرحوم کے یہان موجود تھا جس کا علم میر عبد الجلیل کو بھی تھا اس کا تذکرہ دہلی مین کہین آگیا تھا اور میر صاحب نے سید محمد بن شاکر سے سید عبد اللہ کے گھر لکھا کہ بھجوا دیا تھا - اسی سلسلہ مین میر سید محمد کو

یہ کتاب اب کمیاب ہے اسکی ایک جلد بانکی پور کے کتبخانہ مشرقیہ مین موجود ہے - مسٹر چیپمن Mr Chapman محافظ و مدیر کتب خانہ عالیہ سرکاری کلکتہ کی رائے مین تو یہ ایک نادر و عجیب اور دلچسپ قلمی نسخہ ہے" ایک دوسری جگہ تحریر فرماتے ہین کہ "مھذب الاسماء ایک بے حد نادر و نایاب فرہنگ عربی ناموں کی ہے جسکی توضیح و تشریح محمود بن عمر الشیبانی نے فارسی زبان مین کی ہے"

۱۴۶ سر پیچ، ایک زیور مرصع دستار یا پگڑی پر پہننے کا ہوتا تھا سونے کے مربع پتر لکھا و جو ہر رشتہ کر دیے جاتے تھے اور ان مین سے ہر ایک پر بیش بہا جواہر جڑے ہوتے تھے - دستور تھا کہ دستار کے سیر و پی اور سب سے نمایاں حصہ پر یہ لگایا جاتا تھا اور اس کا آویزہ جواہر پیشانی پر لٹکتا رہتا تھا -

اسی سلسلہ مین یہ تفصیل یا تشریح بھی بے محل نہ ہوگی کہ (۱) دستار ایک نہایت باریک لطیف تھان ململ یا مھس تریب کا ہوتا تھا عرض ڈیڑھ ہاتھ کے قریب اور طول ۱۶ - ۱۷ گز سے لے کر ۳۲ - ۳۴ گز تک - اس پر پُر تکلف گلکاری بھی ہوتی تھی بلکہ رسمی اور درباری پوشاکون اور خلعتون مین اسکا زر تار اور چوب کار ہونا معمول تھا البتہ جواہر اسمین نہین لگائے جا سکتے تھے - سرپیچ، اسی پر پیشانی کے قریب باندھ دیا جاتا تھا جو خوبی و لطافت کے ساتھ چہرہ سے پیوستہ و متصل رہتا تھا - (۲) ہما و امرا اور راجگان کی پگڑیون پر کلغی لگائی جاتی تھی - یہ بھی ایک قیمتی زیور تھا - یون سمجھیے کہ ہما یا کسی نایاب پرند کا پر مع ایک گوہر یکدانہ کے دستار مین لگا دیا جاتا تھا اسی کو اُماڈھی کہتے تھے (۳) جیغہ بھی دستار پر پہنا جاتا تھا - اسکی مختلف صورتین تھین ایک، سونے کے زیور کی شکل مین - دوسری، مخمل کی ایک پٹی، تین انگل چوڑی اور دو دس انگل لمبی - جس پر نہایت عمدہ سہرا کام بیل بوٹے کا ہوتا تھا - اسی پر ایک طلائی پتر جسمین قیمتی پتھر جڑے ہوتے تھے ٹانک دیا جاتا تھا تیسرا

ہدایت کرتے ہین کہ آپ اُس تحریر کے بموجب جاکر سید عبداللہ کے کتاب خانہ کو ملاحظہ کرین
جو کتاب کہ ہدایہ کے رد مین لکھی ہے لے کر روانہ کر دین "

اپنے شوق اور اپنی ضرورتون سے زیادہ میر سید محمد کی ولایت، میر عبدالجلیل کو تلاش کتب
مین مشغول رکھتی تھین۔ درسی کتابین حاصل کر اُن کے کام کی چیز تھین اور ان کی فراہمی وردنگی
کا سلسلہ یکے بعد دیگرے جاری رہتا تھا میر سید محمد کو شرح ملاخوش خط درکار ہے باب پر تقاضا
ہے۔ یہ جواب دیتے ہین کہ " تلاش مین ہون جب وقت مل جائیگی بھیج دون گا۔ بالفعل ایک شرح ملا
میرے پاس موجود تھی بھیجتا ہون۔ پڑھنے کے کام آئے گی "

عبرت ہے کہ بلگرام مین نہ اب وہ کتابین باقی ہین نہ وہ عمارت کہ جس مین یہ علمی خزانہ کبھی محفوظ
تھا۔ ناخلف اخلاف کی ناقدری و حاجتمندی سے اکثر نادر کتابین اور اشیاء خفیہ یا علانیہ
معرض بیع مین آگئین۔ قدرشناس اہل نظر ہاتھون ہاتھ لے گئے۔ حافظ حقیقی جل شانہ کی مصلحت
کا اقتضا تھا کہ اُن کا بہتر حصہ خصوصاً میر کی بیشتر تصانیف و مکتوبات کتب خانہ عالیہ آصفیہ مین
پہونچین جہان اُن کی صیانت و بقا کا انتظام و اطمینان ہوگیا۔ وَكَانَ أَمْرُ اللَّهِ مَفْعُولًا
(اور خدا کا حکم تو ہو کر رہتا ہے جزء ۲۲ سورۃ الاحزاب ع ۵-۲)

ریشم یا زربفت کا ایک سربند، دو ہاتھ سے لے کر ڈھائی ہاتھ تک لمبا۔ پگڑی کے سامنے والے رخ پر ایک
معین طرز سے لگایا جاتا تھا۔ یہ بالاسبدھی کہلاتا تھا۔

۱۴۷ ابومنصور عبدالملک بن محمد بن اسماعیل ثعالبی نیشاپوری، ۳۵۰ھ (۹۶۱ء) مین نیشاپور مین
پیدا ہوا ۴۲۹ھ (۱۰۳۸ء) میں وہین بعمر ۷۹ سال ہوگیا۔ خاندانی پیشہ ثعالب (رُوباہ) کی کھالوں کی خیاطت تھی
اسی مناسبت سے ثعالبی مشہور رہے۔ بڑا عالم لغت، ادیب و فاضل اور فصیح و طبع شاعر تھا۔ ابوبکر خوارزمی کا شاگرد تھا
استادکا یہ قول اکثر نقل کیا کرتا تھا کہ یمن کے لئے مخلاف ایسا ہی ہے جیسا کہ عراق کے واسطے سواد اور خراسان
کے لئے رستاق۔ وفیات الاعیان میں اس کا مبسوط ترجمہ موجود ہے۔ تصانیف کثیرہ چھوڑی تھین۔
تذکرۂ یتیمۃ الدہر۔ فقہ اللغہ۔ النہایۃ فی التعریض والکنایہ۔ لطائف المعارف۔ مونس الوحید۔ سحر البلاغہ
کتاب فرائد القلائد۔ من غاب عنہ المطرب۔ نظم و نثر کا نہایت عمدہ مجموعہ ہے احسن المحاسن، محاضرات مین اور
برد الاکباد (ادب مین) نہایت خوب ہین۔

معمولات وعقائد

میر عبد الجلیل کا طریقہ نہایت صفائی و راستبازی کا تھا۔ طاعت خدا اور آگاہی دوام سے کسی وقت فارغ نہ رہتے تمکین و وقار بدرجۂ غایت رکھتے تھے۔ باوصف تعلقات ظاہری اور خدمات بادشاہی اختیار کرنے کے دقائق امانت و دیانت سے کوئی دقیقہ سر مو فروگذاشت نہیں ہونے پاتا تھا۔

زہد و ورع بخدمت سلطان نقیض نیست   دل را بحق بہ بند و میان را بجا کری

ارباب استحقاق کی ہمیشہ خبر رکھتے اُن کو نہایت اخفا اور احتیاط کے ساتھ دیتے وَاِنْ تُخْفُوْهَا وَ تُؤْتُوْهَا الْفُقَرَاءَ فَهُوَ خَيْرٌ لَّكُمْ (اور اگر اسکو چھپاؤ اور حاجتمندوں کو دو تو یہ تمھارے حق میں زیادہ بہتر ہے جزو ۳ سورۂ بقرہ ع ۳۷-۵) یہ عمل فرماتے تھے۔ ادائے فرائض و سُنن کے بعد سب سے بڑا شغل مطالعۂ کتاب کا تھا جمعہ کے دن نماز صبح کے بعد سے استوا کے قبل تک دلائل الخیرات کا ختم کرتے تھے اس کے اندر کوئی بات نہ کرتے۔ دلائل الخیرات کا وہ نسخہ جو وظیفہ خاص تھا اپنی قلم سے لکھا تھا۔ قریب استوا غسل فرماتے جمعہ کیلئے مسنون ہے پھر متوجہ مسجد ہو جاتے۔ ماہ مبارک رمضان میں بیت الخلا کو ہر روز نہ جاتے۔ سفر و حضر میں نماز تراویح ترک نہ ہوتی۔

عبادات میں ان کا طریقہ محدثین کا تھا۔ قول احوط ہمیشہ اختیار فرماتے اور اُس پر عمل کرتے مثلاً وضو کرتے وقت پاؤں کا مسح و غسل دونوں کرتے تھے۔ میر سید محمد نے انکے آثار بابرکات میں نقل کیا ہے کہ میر صاحب ایک روز وضو کر رہے تھے پاؤں کا مسح بھی کیا اور غسل بھی۔ مجھے یہ خیال پیدا ہوا کہ ان دونوں طریقوں کو جمع کرنے کی آخر وجہ کیا ہے؟ آپ کو میرے اس خطرہ قلب سے آگاہی ہو گئی وضو سے فارغ ہو کر سیدھے بیٹھ گئے اور فرمایا کہ محی الدین عربی نے فتوحات مکیہ میں ایسا ہی لکھا ہے اور یہ

ثمار القلوب ۱۲۸۵ سر الادب نہایت کمیاب ہے۔ صاحب قضاء الارب نے تصنیفات ثعالبی کے ذیل میں اسکا بھی نام لیا ہے فقہ اللغۃ کا جزو ثانی مسمی بسر العربیہ ہے جو فقہ اللغۃ کے تمام مصری مطبوعہ نسخوں کے ساتھ ملحق ہے۔

... ظاہر الآیۃ المسح والغسل وجوبہا الجبر والجمع اولیٰ (میر غلام علی آزاد نے ... تذکرہ مشمول ستہاہ ... فتوحات کے متعدد مربوط وغیرہ مخطوطہ ... [illegible] ... المسح آخر الکلام ... والغسل السنۃ ویحتمل الآیۃ بالعدول ... المسح ...)

... کسی نہ کسی ... عقیدت کے نزدیک یا لحاظ خود ہی ... [illegible] ... ممکن فقہا ... اس کو ... صواب ... کلام ہو۔ آج کے مسلمانوں کی ایک ممتاز جماعت اہل حدیث ... یا غیر مقلد ہونے کی حیثیت سے خود ... کر لینے اور استنباط مسائل شرعیہ کی دعویدار ہے ... سمجھنا چاہئے لیکن ظاہر ہے کہ ... [illegible] ... ان کی تقلید ... کرنے والے کو تلقین ... ارشاد اور اتباع احکام ... [illegible] ... وانمار ... تعریض کا موقع ملتا ہوگا جیسا کہ

قاضی نور اللہ شوستری مجالس المؤمنین میں ... صوفیہ اور تصوف کی بحث میں لکھتے ہیں ... اکابر این طائفہ فقیر کامی گویند الصوفی سنی لا مذہب لہ ... فی الحقیقت ... التزام یکی از مذاہب اہل سنت ... احتراز ... تصریح بالتفضیل ... مذہب شیعہ ... تقیہ و لہذا ... گفتہ اند ... اظہار مذہب ... دلالت کرد ... [illegible] ... عارف ... تفاصیل مذاہب ... صحیح است ... اتباع مذہب امامیہ ... احوط مذاہب عند الاستقرار مذہب این فرقہ ناجیہ است"

ملّا ایسی ہی روایات و اعمال کی بنا اور اقوال احوط کے اختیار کرنے سے میر عبد الجلیل کے دیکھنے اور جاننے والوں کو ان کے عقائد کی طرف سے اشتباہ ہوتا ہوگا عنقریب مذکور ہوگا کہ اس جماعت ان کو تفضیلی بتاتی تھی۔

میر صاحب کا طرز معاشرت نہایت سادہ اور درویشانہ تھا ... تقدس سے نفرت کرتے اور اپنی تعظیم و تکریم سے منع فرماتے تھے ... سادہ ... سادہ دلی ... مساوی ...

ملتے، اُن کی مہمانداری و مدارات بڑی عالی ہمتی، حوصلہ اور صرف وافر سے کرتے تھے

اتقا و خوف خدا

سید حسین[۱۴۹]، امتیاز خان متخلص بہ خالص صفاہانی ۱۱۲۲ھ (۱۷۱۰ء) میں ہندوستان سے عازم ولایت ہوا جب سیوستان پہونچا تو خدایار خان مرزمان سدھ نے اُس کو قتل کرا دیا۔ اور اُسکے لاکھوں روپیہ کے مال و اسباب کو غصب کر لیا۔ میر عبدالجلیل کو پیام بھیجا کہ جس طور پر یہ واقعہ ہوا ہے اس طور پر اس کی خبر سوانح بادشاہی میں درج نہ کریں۔ ہی کے ساتھ ایکہزار اشرفیاں طلائی جن کے چودہ ہزار روپیے رائج الوقت ہوتے تھے نذر بھیجیں۔ میر صاحب نے اِن کے لینے سے انکار کر دیا اور کہلا بھیجا کہ "عنایت الٰہی سے مجھے بھی کچھ ثروت حاصل ہے۔ محتاج نہیں ہوں اگر یہ خبر واقعی سپرد قلم نہ کروں گا تو رب العزت تعالیٰ شانہ کے حضور میں کل کیا جواب دونگا" میر صاحب کی اس بے نیازی و استغنا کو دیکھ کر آزاد نے یہ شعر لکھا تھا ؎

غنی عن الاصداف لؤلؤ بحر ونفس همته العلیا تربیه

[موتی کے پرورش کے لئے دریا صدف کا محتاج ہے لیکن یہ دریا سیپی کا حاجتمند نہیں ہے احتیاج کے وصف ہی سے احتراز کرتا ہے حاصل یہ ہے کہ وہ جب کسی کی پرورش کرنا چاہتا ہے تو اُس کی پرورش کے لئے دوسرے کی اعانت کی حاجت نہیں رکھتا]

بیعت

میر عبدالجلیل کے مناقب جلیلہ میں اُنکی بیعت بھی داخل ہے۔ اپنے طالع بیدار کی برکت دُمین سے شاہ ولایت کرم اللہ وجہہ کو خواب میں دیکھا۔ ہاتھ بڑھا کر بیعت[۱۵۰] کی منقبت میں ایک

---

۱۴۹ عالمگیر کے زمانہ میں ہندوستان آیا تھا۔ کچھ عرصہ تک صوبہ دار گجرات بھی رہا تھا کہا جاتا ہے کہ قاسم علیخان نواب بنگال اسی کا پوتا تھا۔

۱۵۰ مولانا شاہ عبدالعزیز دہلوی کو بھی حضرت علی مرتضیٰ علیہ السلام کی رُویت و بیعت کا شرف حاصل

قصیدہ لکھا اور اس موہبت عالیہ کا شکر ادا کیا کچھ زمانہ بعد اسکو اور بڑھا دیا اور امیر المومنین
وامام المتقین علیہ السلام کے مرثیہ کے نام سے نامزد کردیا ؎

دیدہ خونبار و چشم گریان است — صبر بے تاب، سینہ بریان است
اشک چون سیل موج در موج است — آہ چون برق، آتش افشان است
گل گریبان دریدہ در ماتم — بلبل از نوحہ مرثیہ خوان است
زین مصیبت برنگ چاک الف — سرو در سینہ گلستان است
قمری از سوز میکند کو کو — لمد گردنش نمایان است
لالہ زین غم کشید ساغر خون — سنبل از تاب غصہ پیچان است
نرگس از غم نگاہ باختہ است — تکیہ اش بر عصا چو عمیان است
سینہ ریش است بسکہ تاج خروس — لخت دل بر سرش پریشان است
صور محشر دمیدہ عباسی — کوہ صبر و ثبات لرزان است
زین مصیبت بنفشہ غمگین است — جامہ نیل شاہد آن است
سوسن از نالہ شد کبود زمین — از تف سوز سینہ عطشان است
این ہمہ زردی رخ صدبرگ — اثر شعلہ ہائے پنہان است
ہمہ تن دیدہ گشتہ است فلک — انجم از دے چو اشک ریزان است
باد بے تاب و خاک مدہوش است — آتش آشفتہ آب نالان است
جامہ صبر بر تن ہر یک — چاک گردیدہ تا بدامان است
ہائے ہائے است ہر طرف در گوش — ماتم سخت بستادہ مردان است

ہوا تھا۔ اصحاب نے تو یہ بھی تذکرہ فرمایا تھا کہ ہمارے یعنی صحابہ کرام کے زمانہ مین وصول الی اللہ کے تین طریقے
سلوک وحصول تھے۔ دو تو موقوف ہوگئے یعنی صلوۃ و تلاوت قرآن۔ تیسرا ذکر ہے جو اتک باقی ہے۔ اس
طریق مین بہت سی مبدعات داخل ہوگئی ہین اسکے لیے تلاوت وصلوۃ کو الفاظ یابانا سردار آزاد ۱۵ بیضا

ابن ملجم شقی مردود جهان — آنکه استاد حزب شیطان است
زخم بر تارک مبارک زد — اثر [illegible] در دل یاران است
چون بگرد محراب نماز صبح — خون این زخم سیل [illegible] است
رمضان بود روز نوزدهم — کاندران روز زخم [illegible] است
روز ثالث ز زخم بیست و یکم — وقت [illegible] باغ رضوان است
چهلم سال آخر این ماتم — [illegible]
مرقد انور شهی غری گردید — رشک جنت غری که [illegible] است
زین مصیبت که طاق کعبه شکست — زلزله در جهان [illegible]
کعبه زین غم سیاه پوش شده است — اشک از چشم بیدن طوفان است
سلک خونین [illegible] زین غم — [illegible] مرحبا [illegible]
تا کنم شانه نعت ماتم را — [illegible]
دل خونین [illegible] — گره بلبل در [illegible] است
دیده شد ابر تیره زین ماتم — [illegible]
وای و یلا هزار واویلا — زین مصیبت که در دل و جان است
ماتم مرتضی علی ولی — آنکه [illegible]
اسد الله سرور غالب — ذات پاکش [illegible]

[illegible] حرب [illegible] کی حالت [illegible] کسی پر ظلم و ستم کرنا
[illegible] عربی [illegible] ساتھ عنی کے نزدیک [illegible] مسجد کا نام ہے جو کوفہ کی [illegible]
عربی اسلئے کہتی ہیں کہ [illegible] عقیل [illegible] حدیبیہ [illegible] بنائے گئے تھے اور [illegible]
کہلاتے تھے دعوی [illegible] کرنے کو کہتے ہیں یہی مشہد غری بھی کہلاتا ہے - اس مقام کے حالات و فضائل میں سید رضی الدین علی
بن طاؤس نے ایک مستقل کتاب فرحۃ الغری فی فضائل [illegible] الغری لکھی ہے - قاضی نور اللہ شوستری نے مجالس المومنین
میں اس کا ذکر کیا ہے [illegible] لوفان - کوفہ کا نام ہے [illegible] [illegible]

حجت الله در زمین و زمان	از خدا بهر خلق برهان است
نفس پاک نبی در انفسنا	این توحّد نه جای اینان است
وحدت لحم و دم چنان باشد	این عجب اتحاد با شان است
با نبی نسبت ثابت او	هم چو هارون و پور عمران است
غیر او کز نبی اخوت یافت	این شرف را کدام شایان است
آنچه گفتم ز روی تحقیق است	کاین همه در حدیث و قرآن است
گر ز قرآن دلیل می خواهی	سورهٔ پاک آل عمران است
در حدیث بخاری و مسلم	خصم را نیز جای اذعان[158] است
او بمثل کسی اگر نبی باشد	در کمالش کمال حیران است
چون نبوت نماند آنچه فرض کنند	همه در اوست آنچه شایان است
کرده خود را فدای پیغمبر	عاشق را الحق فدای جانان است
دست او مظهر ید الله است	کشتن عمرو و مرحب آسان است؟
در خیبر بزور باز و کند	این جلادت نه حد انسان است
ذات او منتهای سلسله است	سر هر سلسله فراوان است
هر که صرف فنای فی الشیخ است	محو او شد که پیر پیران است
مصطفی کعبه مرتضی در اوست	کعبه را اندرو در آستان[159] است
اهل بیت اند هم چو کشتی نوح	ذات او زان مشابه سکان است
بهر سکان[160] کشتی این سکان[161]	در حوادث امان ز طوفان است
حب او جنت است و گردد کار	بغض او دوزخ است و نیران است

۱۵۸ اذعان فروتنی کرنا۔ گردن جھکا دینا۔ ۱۵۹ آستان۔ آنا ۱۶۰ سکان بہ ضم سین و کاف مشدد ساکن کی جمع۔ باشندگان ۱۶۱ سکان۔ کسی شخص یا چیز کا پچھلا۔ دنبالہ کشتی

غیرِ مومن۱۶۲ ندارد او را دوست ‏ ‏ در منافق ظہورِ شنآن۱۶۳ است

ہست در مسلم این حدیث صحیح ‏ ‏ کہ ز صحت محل ایقان۱۶۴ است

دین پناہا، تفضل آگاہا ‏ ‏ دل پاک تو شمع عرفان است

کے ثنائے تو حد ہم چو منے ‏ ‏ نہ آنکہ بیرون ز حد امکان است

عرض اظہار بندگی خود است ‏ ‏ بندگی شیوۂ غلامان است

من غلام و مرید و سر زدم ‏ ‏ مہر دل سخت شوق جنبان است

مدعی گر دلیل می خواہد ‏ ‏ ذکر اما بہ نص قرآن۱۶۵ است

کردہ ام بیعت تو در رویا ‏ ‏ این سعادت ز فضل رحمان است

دست ما را گرفتہ بکرم ‏ ‏ می شناسم کہ این چہ احسان است

من و این رتبہ، از کجا لیکن ‏ ‏ مور پر وردۂ سلیمان است

دست عبد الجلیل و دامن تو ‏ ‏ التماسش نجات و غفران است

با سخن ہر کہ آشنا باشد ‏ ‏ پیش او این قصیدہ آسان است

ایک دوسرے موقع پر میر نے شیخ سعدی شیرازی کے ایک مشہور شعر کی تضمین کر کے آدم اولیا حضرت علی مرتضیٰ کی منقبت میں یہ قطعہ نظم فرمایا تھا ؎

ابن ملجم چو بر شہ مردان ‏ ‏ از سر کینہ زخم زد کاری

۱۶۲ اس کا حوالہ یہ ہے عن زر بن حبیش قال علی بن ابی طالب رضی اللہ عنہ والذی فلق الحبۃ و برا النسمۃ انہ تعھد النبی الامی صلی اللہ علیہ وسلم الی انہ لا یحبنی الا مؤمن ولا یبغضنی الا منافق ایک راوی سے جن کا نام زر بن حبیش ہے منقول ہے کہ علی رضی اللہ عنہ نے فرمایا۔ قسم ہے اس خدا کی جس نے دانہ کو پھاڑا اور خلق کو پیدا کیا ہے۔ ضرور آپ سے نبی امی صلی اللہ علیہ وسلم سے عہد کیا اس امر کا کہ مجھکو سوائے مومن کے کوئی دوست نہ رکھے گا اور منافق کے سوا کوئی دشمنی نہ کرے گا

۱۶۳ شنآن بفتح و سکون ہمزہ۔ دشمن رکھنا ۱۶۴ ایقان۔ الاسیقین کرنا۔ بے گمان ہو جانا ۱۶۵ نص قرآنی سے اس آیۂ کریمہ کی طرف اشارہ ہے فاذکروا اللہ کذکرکم آباءکم او اشد ذکرا تو جس طرح تم اپنے باپ دادوں کے

تپش زخم شعلہ زور دل | تشنگی ریخت رنگ بسیاری
ستر بنے ساختہ ز مشک و گلاب | تا نشاند حرارت ساری
شاہ گیتی پناہ از سر لطف | گفت با خادمان درباری
کہ ازین جام جرعۂ بخشید | بہر آن ہجر نوش خونخواری
این ہمہ جو شربتش دادند | کرد ابا از سر زیان کاری
تا مگر زخم سودۂ الماس | نزند نشتر دل افگاری
زین ابا شاہ صورت و معنی | کرد انجبر لب گہرباری
من نخوردیم جرعہ از کوثر | تا ندادیم من بہ آن ناری
واسطی چون شنید این قصہ | خواند این بیت از طلبگاری
دوستان را کجا کنی محروم | تو کہ با دشمنان نظر داری

میر عبد الجلیل نے بعض مدارج معنوی اور آداب ظاہری شیخ غلام نقشبند لکھنوی کی معرفت بھی طے کر لئے تھے طرائق متعارفہ و سلاسل متداولین سے پتہ نہیں چلتا کہ وہ کس خاندان و خانوادہ سے تعلق رکھتے تھے؟ ظاہر ہے کہ جو بزرگ خود حضرت امام الاولیا و سید الاتقیا سے بلا واسطہ دیگرے شرف توصّل[۱۶۶] رکھتا ہو وہ کسی اور درویش یا ہادی متاخر سے وسیلہ و نسبت کیوں رکھے گا۔ شیخ غلام نقش بند کا مسلک نقشبندی تھا۔ انکے پدر محترم شیخ عطاء اللہ نے اُن کا نام غلام نقش بند خود حضرت خواجہ نقشبند قدس سرہ کی اشارت روحانی سے رکھا تھا شیخ جلیل القدر عالم اور صاحب تفاسیر و تصانیف کثیرہ تھے۔ احکام شرعیہ کے حفظ و نگہداشت میں کمال مصروف رہتے اور باقتضائے الحب للہ والبغض للہ جب کسی متنفس سے کوئی ناملائم فعل سرزد ہو جاتا تو سخت رنجیدہ ہو جاتے پھر جب وہ توبہ کر لیتا تو اُس پر پہلے سے زیادہ مہربان اور شفیق ہو جاتے تھے ایک جگہ آزاد[۱۶۷] لکھتے ہیں کہ میر عبد الجلیل عالم بیداری کے لحاظ سے "اویسی"[۱۶۸] تھے

ذکر میں لگ جاتے تھے۔ اسی طرح بلکہ اس سے بڑھ کر خدا کی یاد میں مشغول ہو جاؤ۔ البقرہ ۲ سورہ بقرہ ع ۲۵-۹)
۱۶۶ توصل: وابستگی، جستن، پیوستن۔ ۱۶۷ بار الکرام ۱۶۸ خواجہ اویس قرنی۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم پر غائبانہ ایمان لائے تھے لیکن مادر صالحہ کی پیرانہ سالی کی وجہ سے ان کو چھوڑ کر نہ جا سکے۔ والدہ ماجدہ کے احوال کا تفقد علیٰ التعظیم ترتیب غرا تھا

سید یٰسین حموی سے جو صاحب سجادہ غوث صمدانی شیخ عبد القادر جیلانی رضی اللہ عنہ کے تھے میر صاحب نے غائبانہ بیعت حاصل کی تھی۔ دوسرا قول یہ ہے کہ میر صاحب اہل حدیث کا مسلک رکھتے تھے اور اتباع سنت سنیہ میں شغف و توغل فرماتے۔ قرینہ کہتا ہے کہ ان کی بیعت بیعت مسنونہ تھی للتمسک بحبل التقویٰ بیعت مروجہ پیری مریدی کی نہ رہی ہوگی۔

بہرحال انھیں قدسی تعلیمات اور پاک اتباعات کا نتیجہ تھا کہ میر عبد الجلیل تزکیہ قلب تصفیہ باطن و تقدس ذات و جلائل صفات میں یگانہ زمانہ ہوئے۔ اگر ان کی کمر سلطان مجازی کی خدمتگذاری کیلئے بندھی ہوئی تھی تو ان کا دل شہنشاہ حقیقی کی یاد و فرمان برداری میں مشغول تھا ؎

مرد حق در عین دنیاداری از دنیا بری است ۔۔۔ ملک در دست سلیمان است در انگشتری

صحبت والا پر فائز نہ ہو سکے۔ بالکل غربت اور مسکنت کی زندگی بسر فرماتے تھے۔ دن میں شتربانی کرتے۔ اسکے عوض کو صرف مستحقین فرماتے۔ مال کو نفقہ دیتے۔ حضرت خاتم المرسلین نے آپ کو نفس الرحمٰن اور خیر التابعین فرمایا ہے۔ سید حیدر بن علی الآملی کتاب منبع الانوار میں تحریر کرتے ہیں هو الذی وصفه رسول الله صلعم بالولاية وقال انی لاجد نفس الرحمٰن من جانب الیمن وقال ایضاً وهو سید التابعین۔ سید محمد نوربخش شجی فی شجرة الاولیاء میں بھی متعدد احادیث آپکے فضائل میں نقل کی ہیں۔ سرور دو عالم نے آپکے جلیل القدر صحابہ کے سامنے آپکی مدح فرمائی تھی موت نے جب ان کا سایہ سر سے اٹھایا تو والہانہ دیتا ماند دیا۔ جیب میں پونچھے۔ سوقت ایک گلیم شتری زیب تن تھی۔ سر دیا برہنہ تھا۔ دونوں جہان کی دولت و تونگری اسی فرسودہ کمبل کے نیچے پوشیدہ تھی۔ آستانہ رسالت پر یہ سرفرازی نصیب ہوئی کہ حسب وصیت رسول اللہ صلعم خرقہ مبارک حضرت عمر اور حضرت علی نے حضرت اویس کے حوالہ کیا۔ حبیب السیر میں لکھا ہے کہ حضرت اویس بڑے عابد و زاہد تھے۔ ساری شب جاگتے اور کہتے کہ هذه لیلة الرکوع (یہ رکوع کی رات ہے) اور ساری رات ایک ہی رکوع میں گزار دیتے۔ دوسری شب میں فرماتے هذه لیلة السجود (آج سجدہ کی رات ہے) اور ایک سجدہ میں صبح کر دیتے۔ اگر کوئی اختلاط نہ فرماتے۔ کوئی شخص ملاقات کیلئے آتا تو فرماتے کیوں آیا؟ تمکو خدا سے بھی کچھ کام ہے یا نہیں؟ اگر خدا سے کام ہے تو مجھ سے کیا مطلب؟ اور اگر تمکو خدا سے کچھ مطلب نہیں ہے تو مجھے تم سے کیا کام؟"

حضرت علی و امیر معاویہ کے معرکہ میں ۹ شوال ۳۷ھ مطابق ۲۹ مارچ ۶۵۸ء کو شہید ہوئے لیکن محمد فاضل اکبرآبادی صاحب مخبر الواصلین یوم وفات بالاتفاق ۲ شوال ۳۹ھ روز جمعہ بتاتے اور کہتے ہیں کہ ایک جماعت کو انکی شہادت سے انکار ہے۔ انکی کرامات کثیر ہیں۔ مرنے سے پہلے یہ کیفیت تھی کہ پرانے چیتھڑے جو ادھر ادھر سے فراہم کرکے ستر عورت کر لیتے تھے۔ لیکن غسل کے وقت ان کے کپڑوں میں ایک اچھا خاصہ کفن نکلا جسمیں تکفین کی گئی۔ ان کی قبر بھی خود بخود تیار ملی یعنی ایک بڑے پتھر میں کھدی ہوئی پائی گئی جسمیں یہ مدفون ہوئے۔

۱۲۹ھ نضار الارب میں ذکر علما والشعراء الادب میں مولانا ذوالفقار احمد لکھتے ہیں کہ سید مرتضیٰ محدث بلگرامی بھی خانوادہ قادریہ میں سید یٰسین حموی کے مرید تھے۔ خود مولانا کو بھی اسی سلسلہ مبارکہ حمویہ کی سند سید محمد نجیب ابو البرکات جیلانی بن سید مرتضیٰ نقیب سادۃ الاشراف بحماۃ ابن سید محمد نجیب بن سید محمد سعدی ازہری جیلانی مفتی حماۃ ابن عمر بن سید شریف یٰسین ابن سید عبد الرزاق سے حاصل تھی۔ میر عبد الجلیل اور سید مرتضیٰ کے اختلاف اعصار و ازمنہ سے قیاس ہوتا ہے کہ دونوں کے مختلف سلسلہ میں نسب و بیعت کا نام ہوگئے مگر سب کے پیر سید کے مرشد سے ضرور ہونگے کیونکہ یہ سلسلہ ہمیشہ سے نہایت مقبول اور مرجع صلحا چلا آتا ہے۔ سید یٰسین حسنی حسینی تھے حماۃ ملک شام میں ایک مشہور شہر ہے۔ ۱۵ھ کسی بزرگ سے بیعت ہو کر فیض حاصل کرکے تاریخ سلوک کا طے کرنا۔

اہل تصوف کی اصطلاح میں بیعت طریقت ... [illegible] ... اور صاحب ارشاد ... [illegible]

اہل بیت نبوی

میر عبد الجلیل کی "عقیدت" اور "حب اہل بیت" کے بیان سے پہلے اہل بیت کی تعریف ضروری و مناسب معلوم ہوتی ہے۔

اہل بیت کے لغوی معنی کیا ہیں؟ اہل بفتح الف وسکون ہا سزاواری عقل و سمجھ حاصل کرنا۔ کدخدا ہونا۔ نیز گھر کے لوگ۔ اہل بمعنی صاحب، اور بمعنی مفرد و جمع دونوں آتا ہے۔ بیت کے معنی خانہ و سرائے کے ہیں۔

اس سے مراد کون حضرات ہیں؟

انکی ایک عام تعریف تو یہ بتائی جاتی ہے کہ اہل بیت اطہار وہ برگزیدہ طبقہ ہے جس پر حضرت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے ساتھ درود بھیجنے کا حکم صیغہ تعلیم صلوۃ میں صادر ہوا ہے اور جن کے ذکر خیر کے بغیر صلوۃ و سلام بھیجنے (تصلیہ و تسلیم) کے بارہ میں امر نبوت کا امتثال متحقق نہیں ہوتا۔ مگر ابھی یہ تعمیم یا تعریف مزید تخصیص و توضیح کی محتاج ہے۔

امام فخر الدین رازی لکھتے ہیں کہ "اہل علم میں اس بارہ میں اختلاف ہے کہ آیا اہل بیت سے مراد ازواج مطہرات ہیں (جیسا کہ ابن عباس و عکرمہ و مقاتل کا قول ہے) یا فاطمہ و حسنین و مرتضیٰ علیہم السلام (جس کی روایت ابو سعید خدری اور ایک جماعت تابعین مثل مجاہد و قتادہ کے فرماتے ہیں)"

ابن حاتم کی روایت ہے کہ جب آیہ پاک إِنَّمَا يُرِيدُ اللَّهُ لِيُذْهِبَ عَنكُمُ الرِّجْسَ أَهْلَ الْبَيْتِ وَيُطَهِّرَكُمْ تَطْهِيرًا اتری تو ابن عباس بازاروں میں پکار پکار کر کہتے پھرتے تھے کہ یہ آیت آنحضرت کی بی بیوں کے بارہ میں نازل ہوئی ہے۔ عن ابن عباس انه كان ينادي في السوق ان قوله تعالى انما يريد الله الخ نزلت في النساء النبي۔

زید بن ارقم کہتے ہیں کہ اہل بیت وہ ہیں جنپر صدقہ حرام ہے جیسے آل علی و آل عقیل و آل جعفر و آل عباس۔

قسطلانی فرماتے ہیں کہ اولی یہی ہے کہ مراد اہل بیت سے اولاد و ازواج و حسن و حسین و علی ہیں رازی و زمخشری تسلیم کرتے ہیں کہ آل سے مراد علی و فاطمہ و حسنین ہیں یہی کلیہ اہل بیت کی نسبت بھی صادق آتا ہے۔

آیت پاک انما یرید اللہ لیذھب عنکم الرجس اھل البیت ویطھرکم تطھیرا با عتقاد بعض فرق امت مرحومہ علی و فاطمہ و حسنین کی شان میں نازل ہوئی ہے اور رسول مقبول نے اس آیت کے نزول کے وقت انھیں چاروں کو اپنے کسائے پاک میں چھپالیا تھا اور فرمایا تھا اللّٰھمّ ھؤلاءِ اھلُ بیتی فاذھب عنھم الرّجس فطھّرھم تطھیرا۔ اے بار الٰہ یہ میرے اہل بیت ہیں پس ان سے رجس (چرک و پلیدی) کو دور کر اور سب کو خوب پاک فرمادے۔

وفد نجران کی داستان مباہلہ میں خدائے تعالیٰ شانہ نے فرمایا قل تعالوا ندع ابناءنا و ابناءکم ونساءنا ونساءکم وانفسنا وانفسکم ثم نبتھل فنجعل لعنۃ اللہ علی الکاذبین ٥ کہو کہ (اچھا میدان میں) آؤ۔ (ادھر) ہم اپنے بیٹوں کو بلائیں اور (ادھر) تم اپنے بیٹوں کو (بلاؤ) اور (ادھر) ہم اپنی عورتوں کو بلائیں) اور (تم اپنی عورتوں کو بلاؤ) اور ہم اپنے تئیں (بھی شریک کریں) اور تم (بھی) اپنے تئیں (شریک کرو) پھر ہم (سب ملکر خدا کی بارگاہ میں گڑگڑائیں اور جھوٹوں پر خدا کی لعنت کریں۔ (جز ۳۔ سورۂ آل عمران ع ۶۔ ۱۴) اہل سیر و تواریخ متفق ہیں کہ انھیں چاروں بزرگوں کو مباہلہ کے لئے ہمراہ رکھا تھا۔ اسی لئے صحابہ کی ایک جماعت متفق ہے کہ اہل بیت سے مراد یہی چاروں ہیں۔ (یہ روایت مسلم نے سعد بن ابی وقاص سے کی ہے)

خازن کی لباب التاویل اور دیگر تفاسیر میں مرقوم ہے کہ حضرت نے حسین کو گود میں لے لیا تھا۔ حسن کا ہاتھ پکڑا تھا۔ فاطمہ زہرا آپ کے عقب میں تھیں اور علی مرتضیٰ فاطمہ کے پیچھے۔ یہی اربعہ متناسبہ "اہل کساء" بھی کہلاتے ہیں کیونکہ ان نفوس قدسی کو زیر گلیم لے کر فرمایا تھا انما یرید اللہ

خود عائشہ صدیقہ سے خطیب نے یہ روایت کی ہے اور مسلم نے بھی لکھا ہے۔

اس روایت کو ابن ابی سیبہ اور ترمذی حسن بتاتے اور ابن جریر، ابن المنذر، طبرانی اور حاکم صحیح مانتے ہیں کہ جب آیۂ تطہیر نازل ہوئی تو حضرت جب نماز فجر کو نکلتے اور فاطمہ کے گھر سے گزرتے تو فرماتے تھے الصَّلٰوۃُ اَھْلَ الْبَیْتِ اِنَّمَا یُرِیْدُ اللّٰہُ لِیُذْھِبَ عَنْکُمُ الرِّجْسَ اَھْلَ الْبَیْتِ وَیُطَھِّرَکُمْ تَطْھِیْرًا۔ ابن مردویہ ابوسعید سے روایت کرتے ہیں کہ چالیس صبحوں تک اسی طرح فاطمہ کے گھر سے گزرتے اور فرماتے رہے۔ اَلسَّلَامُ عَلَیْکُمْ اَھْلَ الْبَیْتِ وَرَحْمَۃُ اللّٰہِ وَبَرَکَاتُہٗ۔

رہے ان حضرات کے فضائل سو حق سبحانہ تعالیٰ ان کی شان عموماً میں فرماتا ہے فَبَشِّرْ عِبَادِیَ الَّذِیْنَ یَسْتَمِعُوْنَ الْقَوْلَ فَیَتَّبِعُوْنَ اَحْسَنَہٗ اُولٰٓئِکَ الَّذِیْنَ ھَدٰھُمُ اللّٰہُ وَ اُولٰٓئِکَ ھُمْ اُولُوا الْاَلْبَابِ o ہمارے اُن بندوں کو خوش خبری سنا دو جو (ہمارے) کلام کو کان لگا کر سنتے اور اس کی اچھی اچھی باتوں پر چلتے ہیں یہی تو وہ لوگ ہیں جن کو خدا نے (نیک) ہدایت دی ہے اور یہی تو عقل (سلیم بھی) رکھتے ہیں۔ (جزو ۲۳ سورۃ الزمر ع ۲-۱۶)۔

سادات کے اجداد و اسلاف کون تھے یہی اہل بیت، اور انکی اولاد امجاد جو ائمہ معصومین کہلاتے ہیں۔ اکابر شیعہ کا قول ہے اور بالکل بجا ہے کہ "اسی جماعت نے شرائع اور احکام دین کو منابع (سرچشمہ ہائے) علم اور مصابیح (چراغان) حکمت اور معادن (کانہائے) عصمت سے حاصل کیا ان کے مناقب و مفاخر اور علم و زہد و عصمت میں کتابیں لکھی گئی ہیں"۔ متقدمین علمائے اہل سنت بھی ان کے مدارج و عظمت کے پہچاننے اور احترام و بزرگی کے ماننے میں پیش پیش ہیں۔ انکی مصنفات و مؤلفات اس بارہ خاص میں تعداد کثیر تک پہونچی ہیں اور بڑے پایہ کی کتابیں ہیں جیسے غایۃ السؤل فی مناقب آل الرسول (از ابن مغازلی شافعی) کتاب ابوبکر بن محمد بن مومن شیرازی جس میں مؤلف نے بارہ تفسیروں سے استخراج کیا ہے۔ کتاب موفق بن احمد مکی۔ نور الابصار، تالیف سید شبلنجی عرف سید مومن۔ محاضرۃ الابرار و مسامرۃ الاخیار للشیخ الاکبر محی الدین محمد بن عربی۔ الکنز المدفون والفلک المشحون للسیوطی۔ اعلام الوریٰ

مولفہ ابو علی فضل بن حسن طبرسی شیعی فصول المہمہ فی معرفۃ الائمہ للشیخ نور الدین بن علی بن محمد بن الصباغ المالکی المکی الہاشمی۔ کتاب الدلائل للحمیری۔ اسعاف الراغبین فی سیرۃ المصطفےٰ وفضائل اہل بیتہ الطاہرین للشیخ محمد الصبان۔

صوفیہ صافیہ میں سے ایک جماعت کا عقیدہ یہ ہے کہ ہر عصر وزمانہ میں قطب الاولیا صرف اہل بیت سے ہوتے ہیں۔ اس لئے کہ امام حسن علیہ السلام نے محض ابتغاءً لوجہ اللہ اپنے نفس نفیس کا خلع کر کے خلافت ظاہرہ سے نزول فرمایا تھا۔ اسلئے اللہ جل شانہ نے حسن اور اُنکے اہل بیت کو اس امارت ظاہری کے عوض میں خلافت باطنی عطا فرمائی۔

نواب صدیق حسن خان اپنے رسالہ تشریف البشر بذکر الائمۃ الاثنا عشر میں لکھتے ہیں کہ یہی اہل بیت کلاً یا بعضاً جملہ سادات بنی فاطمہ ساکنان ربع مسکون کے اصل اصول ہیں تمام شرفاء عرب وعجم کا نسب انھیں پر منتہی ہوتا ہے اور جو مناقب وفضائل اہل بیت رسالت کے احادیث مرفوعہ صحیحہ میں آئے ہیں روز بعث ونشر تک شرفاء وسادات اس عموم میں اس وقت تک داخل وشریک رہیں گے جب تک کہ طریقۂ توحید واتباع سنت پر قائم رہیں اور بدعات مکفرہ ومضلہ میں گرفتار ومبتلا نہ ہوجائیں۔ عموم کی شرط اس لئے لگادی ہے کہ جو فضائل بعض اعیان اہل بیت کے ساتھ مخص ہیں وہ البتہ انھیں اشخاص معین کے ساتھ ہیں۔

مناقب وفضائل

اہل بیت پاک مسلماً ائمہ امت محمدیہ ہیں اور بموجب نص قرآن مجید کے موافق تمام آلائش ظاہر وباطن سے منزہ۔ ان کی شان میں خدا تعالےٰ نے فرمایا ہے اِنَّمَا يُرِيدُ اللّٰهُ لِيُذْهِبَ عَنْكُمُ الرِّجْسَ اَهْلَ الْبَيْتِ وَيُطَهِّرَكُمْ تَطْهِيرًا (اے پیغمبر کے گھر والو خدا کو بس یہی منظور ہے کہ تم سے ہر طرح کی گندگی کو دور کرے اور تمکو ایسا پاک صاف بنائے جیسا کہ صاف پاک بنانیکا

حق ہے۔ جزو ۲۲۔ سورۃ الاحزاب۔ ع ۴-۱-)

مُسند امام احمد بن حنبل میں روایت ہے کہ رسول اللہ صلعم نے فرمایا نجوم، ستارے آسمان والوں کی امان ہیں جب نجوم برطرف ہو جائیں تو آسمان معدوم ہو جائے گا اور میرے اہل بیت اہل زمین کی امان ہیں جب یہ فنا ہو جائیں گے تو زمین والے بھی برطرف ہو جائیں گے۔"

حدیث نبوی میں رفعاً آیا ہے اور صحابہ پاک میں سے چھ اشخاص راوی ہیں کہ فرمایا نبی برحق صلعم نے مثل اھل بیتی کمثل سفینۃ نوح من رکبھا نجی ومن تخلف عنھا غرق وھلک میرے اہل بیت مثل کشتی نوح کے ہیں جس نے انکی متابعت کی، نجات پاگیا، اور جس نے مخالفت کی ڈوبا اور ہلاک ہوا۔ اسی کی نسبت امام احمد لکھتے ہیں کہ ابوذر کے الفاظ یہ ہیں الا ان مثل اھل بیتی فیکم مثل سفینۃ نوح الخ ابوذر اسوقت خانہ کعبہ کا دروازہ پکڑے ہوئے کھڑے تھے جسوقت یہ روایت کر رہے تھے۔

امام ترمذی زید بن ارقم سے روایت کرتے ہیں کہ رسول مقبول صلعم نے فرمایا انی تارک فیکم الثقلین ما ان تمسکتم بھما لن تضلوا بعدی۔ احدھما اعظم من الآخر۔ کتاب اللہ حبل ممدود من السماء الی الارض۔ وعترتی اھل بیتی ولن یفترقا حتی یردا علی الحوض فانظروا کیف تخلفونی فیھما۔ میں تم میں دو بھاری چیزیں چھوڑتا ہوں تم جب تک انکو میرے بعد تھامے رہوگے کبھی راستہ سے نہ بھٹکوگے۔ انمیں کی ایک ایک چیز دوسری سے زیادہ عظمت والی ہے (۱) خدا کی کتاب۔ وہ ایک رسّی ہے جو آسمان سے زمین تک بڑھا دی گئی ہے اور (۲) میری اولاد جو میرے اہل بیت ہیں یہ دونوں ہرگز جدا نہ ہونگے جب تک کہ وہ مجھسے حوض (کوثر) پر نہ مل لینگے۔ (مسلمانو!) بس دیکھنا کہ تم میرے پیچھے ان سے کیسے پیش آتے ہو۔

امام حنبل سعد سے روایت کرتے ہیں کہ رسولؐ نے فرمایا کہ "اے میری امت! دو بڑی چیزیں تمھارے درمیان چھوڑتا ہوں اگر انکو پکڑے رہوگے ہرگز گمراہ نہ ہوگے۔ ایک خدا کی کتاب جو ایک رسمان ہے آسمان سے لٹکی ہوئی اور دوسری میرے اہل بیت و عترت"۔

شرف نبوت مین ابوسعید نے حضرت عبدالعزیز سے روایت کی ہے کہ رسول اللہ صلعم نے فرمایا
انا واھل بیتی شجرۃ فی الجنۃ واغصانھا فی الدنیا من تمسک بھا تخذ الی اللہ سبیلا
مین اور میرے اہل بیت جنت کا ایک درخت ہین جسکی شاخین دنیا مین پھیلی ہوئی ہین۔
ان شاخون کو جو کوئی تھام لیتا ہے وہ خدا کی طرف پہونچنے کی راہ پا جاتا ہے۔

زید بن ارقم سے ایک اور روایت حافظ جمال الدین محمد یوسف زرندی نے نقل کی ہے۔
کہ جب جناب رسالت مآب حجۃ الوداع کے لئے تشریف لائے تو مسلمانون سے خطاب فرمایا۔
انی فرطکم علی الحوض وانکم تبعی وانکم توشکون ان تردوا علی الحوض فاسئلکم عن ثقلی کیف
خلفتمونی فیھما بیشک مین تمھارا پہلے سے بھیجا ہوا نفع حوض کوثر پر ہون اور تم میرے بعد اور میرے
پیچھے رہوگے اور تم ضرور حوض کوثر پر مجھسے ملوگے تو اسوقت مین تم سے اپنی دونون بھاری چیزون
کی نسبت پوچھون گا کہ تمنے انکے ساتھ میرے پیچھے کیا کیا؟ مہاجرین رضی اللہ عنہم نے دریافت
کیا کہ وہ دونون بھاری چیزین کیا ہین؟ ارشاد ہوا کہ الاکبر منھما کتاب اللہ سبب طرفہ
بید اللہ وطرفہ بایدیکم فتمسکوا بہ والاصغر عترتی من استقبل قبلتی واجاب دعوتی
فلیستوص بھم خیرا۔ ان دونون مین سے بڑی چیز تو خدا کی کتاب ہے۔ وہ ایک سبب (رسی)
ہے جسکا ایک کنارہ خدا کے ہاتھ مین ہے اور دوسرا کنارہ تمھارے ہاتھون مین۔ تم انکو پکڑے رہو۔
اور چھوٹی چیز میری عترت (اولاد) ہے تو جو شخص میرے قبلے کی طرف رخ کرے اور میری دعوت
اسلام پر اجابت وقبول کرے اسکو لازم ہے کہ انکے لئے بھلائی کی وصیت قبول کرے۔

عمران بن حصین روایت کرتے ہین کہ سرور عالم نے فرمایا سألت ربی ان لا یدخل النار
احدا من اھل بیتی فاعطانی ذالک مین نے اپنے پروردگار سے درخواست کی کہ میرے اہل
بیت مین سے کسی کو دوزخ مین داخل نہ کرے۔ تو خدا نے مجھے اس دعا کی قبولیت دیدی۔

امام فخرالدین رازی فرماتے ہین کہ اہل بیت رسالت پانچ چیزون مین حضرت نبوت کے
برابر ہین۔ ایک تشہد مین حضرت پر درود بھیجے مین۔ دوسرے سلام مین۔ تیسرے طہارت دیا کرنے گی

ہین۔ چوتھے تحریم صدقہ[۱] ہین۔ پانچوین[۲] وجوب محبت ہیں۔ لیکن خیال رہے کہ ہر حال ہین توحید وابلاغ رسالت کا مقدم ہونا لازم ولابد ہے۔ اسی لئے حاکم نے یہ اسناد صحیح یہ لفظ بتائے ہین کہ حضرت نے فرمایا وعدنی ربی فی اہل بیتی من اقر منہم بالتوحید ولی بالبلاغ ان لا یعذبہم]

اختصاص

یہ حدیث تمامی صحاح ستہ مین منقول ہے کہ رسول اللہ صلعم نے فرمایا رحم اللہ علیا۔ اللہم ادر الحق معہ حیثما دار خدا علی پر رحمت کرے۔ بار الہا حق کو علی کے ساتھ پھرا جہان کہین وہ پھرین۔

احمد بن موثر سے یہ حدیث مروی ہے الحق مع علی وعلی مع الحق لن یفترقا حتی یردا علی الحوض۔ حق علی کے ساتھ ہے اور علی حق کے ساتھ۔ اور ہرگز جدا نہ ہونگے جب تک حوض کے نزدیک میرے پاس وارد نہ ہون۔

---

[۱] صدقہ کا مال لوگون کا چرک ومیل ہے۔ سترفا پر اُسکا لینا حرام ہے۔ اُسکے عوض اُنکے لئے خمس خمس فیئ اور غنیمت سے مقرر ہے۔ امام شافعی اور امام احمد بن حنبل۔ بنی ہاشم وبنی مطلب دونوں پر صدقہ حرام بتلاتے ہیں لیکن امام ابوحنیفہ اور امام مالک صرف بنی ہاشم پر تحریم صدقہ کا قصر کرتے ہین۔ اکثر علمائے احناف وشوافع وحنابلہ کا مذہب ہے کہ بنی ہاشم کو صدقۂ نفل کا دینا روا ودرست ہے ایک روایت سے امام مالک کے نزدیک بھی اسکا جواز پایا جاتا ہے لیکن دوسری روایت کے مطابق صدقۂ فرض کا لینا درست ہے نہ صدقہ تطوع کا۔ آخرین زیادہ قوی ہے۔ راجح ومختار یہ ہے کہ بنی ہاشم پر بھی زکوۃ مفروضہ کا لینا مطلقاً حرام ہے۔ خواہ خمس ملے یا نہ ملے۔ بلکہ اُنکے موالی پر بھی زکوۃ کا لینا منع ہے۔ اور تقوی یہ ہے کہ صدقہ تطوع بھی نہ لیں۔

[۲] شرعاً لوٹ کی دو قسمیں ہیں۔ ایک جو کفار سے لڑکر ہاتھ آجائے اُسکو غنیمت کہتے ہین۔ اور دوسری وہ جو بے لڑے ہاتھ لگے اُسکو اصطلاح مین فیئے کہتے ہیں جس کا ترجمہ آجکل کی زبان مین مُفت کیا جاتا ہے۔

احمد بن حنبل اپنی مسند مین جابر سے روایت کرتے ہین کہ پیغمبر نے علی سے کہا کہ "اے علی! مین اور تم ایک درخت سے خلق ہوئے ہو۔ مین اس درخت کی اصل (جڑ) ہون۔ اور تم فرع (شاخ) ہو۔ حسن وحسین اس درخت کی شاخین ہین۔ پس جو کوئی ان شاخون سے کسی شاخ مین لٹک جائے گا۔ ہمیشہ بہشت مین رہے گا"

مسلم نے اپنی صحیح مین دو مواضع پر زید بن ارقم سے یہ حدیث روایت کی ہے کہ پیغمبر صلعم نے مکہ ومدینہ کے درمیان خطبہ کیا اور اس خطبہ مین فرمایا کہ "اے لوگو! نزدیک ہے کہ میرے پروردگار کا رسول (فرستادہ) میرے پاس آئے اور مین اسکو اجابت کرون۔ پس تمھارے درمیان دو چیز ودیعت چھوڑتا ہون دو بڑی چیزین۔ ایک خدا کی کتاب۔ دوسرے اپنے اہل بیت کو۔ اور سفارش کرتا ہون تم سے اپنے اہل بیت کے حق مین"

جار اللہ زمخشری نے باسناد مختلفہ اس روایت کو نقل کیا ہے کہ حضرت صلعم نے فرمایا کہ "فاطمہ سرور دل ہے اسکے دونون بیٹے میرے دل کا میوہ، اور اسکا شوہر میری آنکھ کا نور ہے"

مفسرین عظام لکھتے ہین کہ جب آیت پاک قُل لَّا اَسْئَلُکُمْ عَلَیْہِ اَجْراً اِلَّا الْمَوَدَّۃَ فِی الْقُرْبیٰ نازل ہوئی تو صحابہ کرام رضی اللہ عنہم اجمعین نے رحمت دوعالم صلی اللہ علیہ وسلم سے پوچھا کہ آپ کے وہ کون اقربا ہین جنکی مودت ہم پر لازم ہے تو فرمایا کہ علی و فاطمہ وابناھما (علی اور فاطمہ اور انکے دونون بیٹے)۔

جنکے اور جنکے بزرگون کی نسبت مخالف وموافق نے مدائح ومحامد مین اتفاق رکھا ہے انکی متابعت ومحبت مسلمانون پر واجب ہے اور ان سے بغض وکینہ رکھنا بہ تحریم غلیظ حرام ہے۔ جیسا کہ احادیث صحیحہ سے ثابت ہے اور جسکی تصریح بیہقی وبغوی نے فرمادی ہے۔ شافعی نے اسپر ان الفاظ مین تنصیص کی ہے ؎

یا اہل بیت رسول اللہ حبکم — فرض من اللہ فی القرآن انزلہ
یکفیکم من عظیم الفخر انکم — من لم یصل علیکم لا صلوٰۃ لہ

ترمذی میں ابن عباس سے روایت ہے کہ رسول خدا نے فرمایا اللہ کو دوست رکھو کیونکہ وہ ہر صبح تم کو اپنی نعمت دیتا ہے اور اللہ کی وجہ سے مجھے دوست رکھو اور میری محبت کے سبب سے میرے اہل بیت کو دوست رکھو قال رسول اللہ صلعم احبوا اللہ لما یغذوکم من نعمۃ و احبونی بحب اللہ واحبوا اہل بیتی بحبی۔

بخاری میں عبداللہ بن عمر روایت کرتے ہیں کہ حضرت صدیق اکبر نے فرمایا ارقبوا محمدا فی اہل بیتہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم کا احترام و بزرگی آپ کے اہل بیت کے حق میں کرو۔

حب اہل بیت

میر عبدالجلیل کو تولائے اہل بیت اطہار میں ترنگ تھا۔ اُنکے حسن عقیدت کی جھلک اُنکے کلام میں ہر جگہ نظر آتی ہے۔ مثنوی طوطے نامہ کے خاتمہ میں "خدا و ند گنہ بخش ترحم آفرین" سے تخاطب و استغفار فرماتے اور لکھتے ہیں ؎

باعزاز رسول رحمت آثار   بہ آل طیب و اصحاب اخیار

خصوص آن پنجتن نور بہ ہمن   کہ حُب شان بود سرمایۂ من

کہ در محشر چو دست و پا کنم گم   ترحم کن بہ حال ما ترحم

سادات کے فضائل میں انھوں نے متعدد رباعیاں لکھی ہیں۔ اُنکے انداز تحریر سے پایا جاتا ہے بلکہ ایک رقعہ میں اپنے فرزند رشید سے صاف طور پر اظہار بھی کر دیا تھا کہ اگر سادات کی نعت سرائی سے خود اپنے رفع شان اور نجابت و سیادت کے اظہار اور مباہات و افتخار پر محمول کئے جانے کا اندیشہ نہ ہوتا تو وہ بہت لکھتے اور کیا کچھ نہ لکھتے ؎

(۱)

اولاد علی خلاصہ ابرار اند   چون والد خویش محرم اسرار اند

تخلیص مواد فاسد کف کنند — در منفعت مزاج دین جہد دارند

دوسرا شعر ید بیضا میں یوں نقل کیا ہے ؎

زالشان باشد مزاج اسلام قوی — در تقویت دین متین جہد دارند

یہی رباعی کسی قدر تغیر عبارت کے ساتھ شیخ حزین اصفہانی اور والہ داغستانی نے عسکری[۱۷۲] قمی کے نام سے لکھی ہے ؎

سبطین کہ از انبیا فزون مقدارند — چون والد خویش محرم اسرارند

باشد ز امیتان مزاج اسلام قوی — در تقویت دین نبی جہد دارند

---

[۱۷۲] ملک قمی بن عسکری نام بڑا فصیح و ملیح شاعر تھا۔ ملک الکلام بھی کہلاتا ہے شاعری کا شوق بچپن سے دامنگیر تھا۔ پہلے قم سے کاشان آکر بشوق سخن کچھ عرصہ رہا، پھر تبریز گیا اور چار سال قیام کیا۔ رمضان ۹۸۷ھ (نومبر ۱۵۷۹ء) میں ہندوستان آیا۔ سلاطین دکن نے بڑی قدر شناسی کی۔ مرتضی نظام شاہ دیوانہ والی احمد نگر اور اسکے بعد برہان شاہ نے انعام و اکرام سے مالا مال کردیا۔ پھر بیجاپور ابراہیم عادل شاہ کے دربار میں چلا آیا۔ جس نے بڑی رعایات و عنایات فرمائیں۔ وہیں ملا ظہوری کا جو ہر قابلیت دیکھا، اور بکمال اپنی لڑکی سے اُس کی شادی کردی شیخ فیضی جب اکبر کی طرف سے برہان شاہ والی احمد نگر کے یہاں سفیر ہو کر گیا تھا تو اپنے سفرنامہ میں بادشاہ کو لکھا تھا کہ "در احمد نگر دو شاعر حاکی بود، صاحب شعر است۔ و در شعر رتبہ عالی دارند یکے ملا ملک قمی کہ بکس کمتر اختلاط می کند و ہمیشہ منزوی دارد۔ دیگر ملا ظہوری کہ بغایت رنگین کلام است۔ و در مکارم اخلاق تمام عزیمت آسان بوس دارد" تاریخ عالم آرائے عباسی میں لکھا ہے کہ ملک قمی نے ظہوری تبریزی کی شرکت و اتفاق سے کتاب "نورس" تو ہزار شعر کی عادل شاہ کے نام پر لکھی تھی اور نو ہزار ہون بالمناصفہ صلہ پایا تھا۔ خان آرزو لکھتا ہے کہ قمی و ظہوری نے مخزن کے جواب ایک کتاب تصنیف کی اور اُسکے عوض میں ایک شتر کا بار سونا عادل شاہ نے دیا۔ جب اکبر بادشاہ کی فوجوں نے قلعہ احمد نگر کا محاصرہ کیا تو ملک قمی نے وہاں سے نکلکر شاہزادہ شاہ مراد اور نواب سپہ سالار عبدالرحیم خان خانخانان کی آستان بوسی کی ہر ایک کی مدح میں قصائد غرا لکھے اور انعامات پائے۔ ملازمت کے لئے ہر چند اُس سے اصرار ہوا مگر قبول و منظور نہ کیا۔ ایک ضخیم کلیات کئی مثنویاں یادگار چھوڑی ہیں۔ بروایت مآثر تبریزی ۱۰۲۴ھ میں وفات پائی لیکن کلیم سال وفات ۱۰۲۵ھ (۱۶۱۶ء) بتاتا ہے اور "گفتا دو مصراع سخن لود" سے تاریخ نکالتا ہے۔

میر غلام علی آزاد خزانۂ عامرہ میں لکھتے ہیں کہ میر عبدالجلیل نے یہ رباعی عشرہ دہم بعد الف میں کہی تھی اور سنہ ۱۱۳۸ھ (۱۷۲۵ء) کے بعد عشرہ رابع میں انتقال کیا۔ واقعہ یہ ہے کہ میر عسکری نے سنہ ۱۰۶۸ھ (۱۶۵۷ء) کے بعد عشرہ سادس میں وفات پائی تو ظاہر ہے کہ میر عسکری کا زمانہ میر عبدالجلیل کے زمانہ سے خصوصاً اس رباعی کے نظم کرنے کے اعتبار سے بہت متقدم ہے[1] لہٰذا میر عبدالجلیل کی عبارت کی ترجیح نقاد سخن پر ظاہر ہے ؎

(۲)

از بہر محبت علی ہستی ماست | گلچینی این بہار تردستی ماست
دل ساغر و مہر ساقی کوثر ہے | از میکدۂ غدیر خم مستی ماست

(۳)

گویند کہ پنج است بنائے اسلام | غافل شدہ از معنی این حرف عوام
یعنی از حب پنج تن در دنیا | گردید بنائے دین اسلام تمام

(۴)

از دوستی پنج تن ہے معنی سنج | در ہر دو جہان از تو رود آفت و رنج
ران داد خدا دست تو پنج انگشت | تا دامن پنج تن بگیری زین پنج

(۵)

تا مرقد پاک تو خراسان شدہ است | این خطہ بہ از روضۂ رضوان شدہ است
معلوم شد اکنون کہ خراسان زچہ رو | منسوب بہ آفتاب تابان شدہ است

منقبت آل پاک میں اور بہت سا کلام ہے لیکن پانچ کے عدد کی رعایت سے پانچ رباعیاں نقل کر دی گئیں۔

[1] یہ صریحاً غلط ہے میر عسکری کا زمانہ میر عبدالجلیل سے بہت مسن تھا سیس کی غلطی خواہ والے کی ہو یا خود میر غلام علی نے کہی ہے۔

اس[174] بحث کی نسبت کہ حضرت فاطمہ زہرا کو جناب عائشہ صدیقہ پر فضیلت تھی اپنے عقیدے کو ظاہر کرتے ہیں ؎

ور کسے گفت عائشہ در فضل | بہتر از بنت سید البشر است
مصرعٔ در جواب او خواندم | رشتۂ دیگر، رگ جگر دگر است

یہ سیف ثنائی کے مصرع کی تضمین ہے۔ اسکا شعر یہ تھا ؎

لذت سوختن ز شمع مپرس | رشتۂ دیگر، رگ جگر دگر است

میر عبدالجلیل کے اہل وطن بلکہ بعض اہل عشیرت کو اس تفضیل[175] و ثنا خوانی میں خلوص و عقیدت کا نہیں، بلکہ جاہ طلبی و زمانہ پرستی کا جلوہ نظر آتا تھا۔ معترضین اسکو اپنے مربی و سرپرست شیعہ امراء کے تملق اور خوش کرنے اور اپنا رنگ جمانے کا ذریعہ سمجھتے تھے۔ یہ عاجز جامع اوراق ان ایرادات کی تائید یا تردید کے لئے کوئی مواد فراہم نہیں پاتا۔ میر عبدالجلیل نے عالم رویا میں خود حضرت سید الاولیا کرم اللہ وجہہ کا دامن پکڑا تھا اور ظاہر میں شیخ غلام نقش بند لکھنوی کے نقش قدم پر چلے تھے اور انکی صحبت و ارشادات سے فیض و برکت حاصل کی تھی۔ میر کا اصلی مسلک یا طریق تصوف تو معلوم نہیں (اغلباً قادری تھے) مگر شیخ اسم با مسمی اور پکے نقشبندی تھے۔ اس خاندان کا سلسلہ حضرت ابوبکر[176] صدیق رضی اللہ عنہ سے چلتا ہے۔ وہاں یہ معاملہ

---

[174] الفرع النامی من الاصل السامی سید صدیق حسن خاں صفحہ ۱۵۵۔

[175] تفضیل ایک شخص کو دوسرے سے زیادہ برگزیدہ جاننے اور ترجیح دینے اور بزرگ تر بتانے کو کہتے ہیں۔ اہل سنت و جماعت میں ایک فرقہ تفضیلی بھی ہے جو اگرچہ حضرت علی کرم اللہ وجہہ کو خلیفہ بلا فصل نہیں کہتے بلکہ خلیفہ چہارم مانتے ہیں مگر اوصاف و فضائل میں انکو خلفائے ثلثہ اولین سے افضل و بزرگ تر بتاتے ہیں۔

[176] حضرت ابوبکر صدیق اکابر و عمائد قریش سے تھے۔ نام نامی عبداللہ بن عثمان بن ابی عامر تھا۔ ابن ابی قحافہ کنیت تھی۔ حضرت رسول مقبول علیہ الصلوٰۃ والسلام کے نسب سے آپ کا نسب مرہ بن کعب پر جاکر مل جاتا ہے۔ آپ کا لقب صدیق (نہایت سچ بولنے والے اور ہر ایک کی بات کو بالکل سچ مان لینے والے)

کہاں۔ اس طریقہ سنیہ کے اکابر و مشائخ کے اقوال و ارشادات تو کچھ اور ہیں۔
شیخ فاضل دولت شاہ سمرقندی، صاحب تذکرہ مشہورہ ایسے تنگ نظر لوگوں پر تعجب کرتے اور لکھتے ہیں کہ یہ شخص جسکو عالم معنی سے ذرا بھی آگاہی ہے اپنے کو رد و قبول سے دور رکھتا ہے اور یقین رکھتا ہے کہ اسکو فضولی کے لئے پیدا نہیں کیا گیا ہے۔ خاصکر اصحاب رسول صلعم کے

اسوجہ سے قرار پایا کہ حضرت صلعم کی نبوت اور معراج پر سب سے پہلے آپ ہی ایمان لائے تھے۔ آپ کی صاحبزادی عائشہ صدیقہؓ رسول پاک کے حبالہ نکاح میں تھیں۔ حضرت صلعم نے ۱۲ ربیع الاول سنہ ۱۱ھ (۷ جون سنہ ۶۳۲ء) کو وفات پائی۔ ثقیفہ بنی ساعدہ میں مہاجرین و انصار نے مشورہ و صلاح کرکے بالاتفاق حضرت ابوبکرؓ سے بیعت کی اور اپنا امام قرار دیا اور خلیفہ رسول اللہ کہکر خطاب کیا۔ مسند خلافت پر آپ کو بٹھایا۔ ابوبکرؓ نے کچھ دن بعد ممالک عراق و عجم کی تسخیر کے لئے خالد کو، بابت حیرہ کے لئے مثنی بن حارث کو، شام کے لئے ابو عبیدہ بن الجراح کو روانہ کیا۔ مورخین لکھتے ہیں کہ جس روز دمشق فتح ہوا ہے اسی دن ابوبکر صدیق نے اس جہان سے انتقال فرمایا۔ آپکی وفات ہجرت کے تیرہویں سال میں ۲۲ جمادی الآخر ۱۳ھ (۲۳ اگست سنہ ۶۳۴ء) کو ترسٹھ سال تین ماہ نو یوم کی عمر میں ہوئی۔ مدت خلافت دو سال پانچ ماہ تھی۔ مَا طَلَعَتِ الشَّمْسُ وَلَا غَرَبَتْ عَلَىٰ اَحَدٍ بَعْدَ النَّبِيِّيْنَ اَفْضَلُ مِنْ اَبِيْ بَكْرٍ حدیث پاک آپ کی شان میں ہے۔ فردوسی نے شاہنامہ میں اسی حدیث کی طرف تلمیح کی ہے ؎

چہ گفت آں خداوند تنزیل وحی — خداوند امر و خداوند نہی
کہ خورشید بعد از رسولاں مہہ — نتابید بر کس ز بوبکر بہ

[یہ وہی فردوسی ہے جسکو یورپ فارسی کا ہومر Homer کہتا ہے اور وہی شاہنامہ جسکو ابن الاثیر فارسی کا قرآن بتاتا ہے]

دوسری حدیث جو ابی نے کعب بن مالکؓ سے روایت کی ہے ان اللہ لم یکن نبی الا وله خلیل من امته وان خلیلی ابوبکر ان اللہ تعالیٰ اتخذ صاحبکم خلیلا۔ صدیق اکبر کے مناقب و خصوصیات میں سے تھا کہ آپ نے نبی صلوات اللہ علیہ وعلی آلہ سے اپنے لئے کبھی کسی شے کا سوال نہیں کیا حتی کہ دعا کا بھی۔ آپ بھی اسی جماعت صحابہ سے تھے جس نے آنحضرت سے بیعت اس بات پر کی تھی کہ باہم کسی شخص سے کوئی چیز نہ مانگیں گے۔ اور اس عہد کو یہاں تک نباہ دیا کہ سوار ہونے کی حالت میں بھی اگر کسی کا کوڑا گر جاتا یا ہاتھ سے مہار شتر چھوٹ جاتی تو اسکے اٹھا دینے کے لئے دوسرے سے کبھی نہ کہتا۔

قبول ورد کے لئے۔ ہر ایک کو بزرگ و فاضل جاننا اور حق و راستی پر سمجھنا یہی شریعت ہے۔ ورنہ طریقت کفر ہو جاتی ہے"

حضرت عطارؒ ۱۷۱ نے اس بارہ میں خوب فرمایا ہے ؎

اپنے معاصر شعرائے عرب میں علم و فضل اور شعر گوئی میں کسی سے کم نہ تھے۔ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے جوار قدس میں رونق بخش ہونے پر جو منظوم مرثیہ لکھا تھا آج تک اہل سخن کی زبان پر ہے۔ اسیطرح آپ کی مشہور مناجات، جسکو اہل اللہ اور اہل دل اور اہل درد ہر صبح پڑھتے اور استجابت دعا و نحوے کا لطف پاتے ہیں۔

۱۷۱ شیخ فریدالدین عطار، محمد بن ابراہیم نام ہے کدکن ضلع نیشاپور کے رہنے والے تھے۔ ابتدا میں اپنا آبائی پیشہ عطاری کیا کرتے تھے ایک دن کوئی درویش انکے یہاں آیا اور کوئی چیز مانگی۔ یہ نہایت مشغول تھے ملتفت نہ ہو سکے۔ درویش نے کہا کہ "بابا اسقدر خواہش و تعلق کے ساتھ آپ کیونکر مرینگے" انھوں نے جواب دیا کہ "جس طرح تم مروگے" درویش نے کہا کہ "خواجہ صاحب آپ میرا ساتھ نہ دے سکیں گے" اسیوقت لکڑی کا پیالہ جو ہاتھ میں تھا درویش نے سر کے نیچے رکھکر لا الٰہ کہکر جان دیدی۔ عطار اس واقعہ کو دیکھکر دوکان سے اٹھ کھڑے ہوے اور جس سے جو مانگا دے ڈالا۔ وطن میں بزمانہ طفولیت قطب عالم قطب الدین حیدر کے مرید ہو چکے تھے۔ کئی سال شیخ رکن الدین کاف کے ہمراہ رہے۔ پھر زیارت بیت اللہ کے لئے گئے۔ وہاں بہت سے بزرگوں کی زیارت کی واپسی پر فخر الشہدا شیخ مجدالدین بغدادی کی خدمت میں حاضر ہوکر خرقہ ارادت پہنا۔ ملا جامی نفحات الانس میں لکھتے ہیں کہ مولانا جلال الدین رومی قدس اللہ سرہ بلخ سے جاتے ہوے جب نیشاپور سے گزرے تو شیخ کی صحبت میں بھی حاضر ہوے وہ زمانہ شیخ کے کبرسن کا تھا۔ آپ نے اپنی تصنیف اسرار نامہ کا ایک نسخہ مولانا کو دیا جسکو وہ ہمیشہ ساتھ رکھتے اور معارف و حقائق کے بیان کرنے میں شیخ کی اقتدا کرتے۔ آپ کے فضل اور عظمت شان کے تمام معاصرین و متاخرین مشائخ و علماء سب معترف ہیں۔ سلطان سنجر کے عہد میں شعبان ۵۱۳ھ (نومبر ۱۱۱۹ء) میں پیدا ہوے۔ انتیس سال نیشاپور میں رہے اور بچاسی برس شہر شادیاخ میں۔ نیشاپور کے قتل عام میں ۱۰ جمادی الثانی ۶۲۷ھ (۲۶ اپریل ۱۲۳۰ء) کو ایک مغل کے ہاتھ سے شہید ہوے۔ ایک سو چودہ ۱۱۴ برس کی عمر تھی۔ ایک ضعیف روایت سے سال وفات ۵۸۹ھ (۱۱۹۳ء) پایا جاتا ہے۔ یہ اختلاف عظیم ہے۔ شیخ کی تالیفات کثیر ہیں۔ منظوم رسالوں کی تعداد چالیس سے متجاوز ہے۔ ایک دیوان کبیر الحجم، متعدد مثنویاں اور ایک تذکرۃ الاولیا یادگار چھوڑا ہے۔ منطق الطیر، الٰہی نامہ، اسرار نامہ، مظہر العجائب، جوہر الذات، مختار نامہ، جامع رباعیات، زیادہ شہرت رکھتے ہیں۔

الا اے در تعصب جانت رفتہ — گناہ خلق در دیوانت رفتہ
مشو از الجھی پر زرق و پر مکر — گرفتار علی ماندی و بو بکر
گمے این یک بود نزد تو مقبول — گھے آن یک بود از تو معزول
گر این بہتر و را آن بہتر ترا چہ — کہ تو چون حلقہ بر در ترا چہ
یقین دانم کہ فردا پیش حلقہ — یکے گردند ہفتاد و دو فرقہ
چو یکدم زین تخیل می نرستی — ندانم تا خدا را کے پرستی
گر فتم کہ ہمہ زشت ار نکو بود — چو نیکو بنگری جوئے آن بود
الا اے نفس سرکش راز بون کن — فضولی از دل جملہ برون کن
دل ما را بخود مشغول گردان — تعصب جوئے را معزول گردان

مولانا کمال الدین غیاث شیرازی نہایت دانشمند، مورخ، حکیم، شیوہ اور خوش طبع تھے

مولانا کاتبی محمد بن عبد اللہ نیشاپوری صاحب مثنوی مجمع البحرین نے ایک قصیدہ ردیف گل لکھا ہے جسمین حضرت عطار کی شان مین لکھتے ہیں ؎

ہم چو عطار از گلستان نشاپورم ولے — خار صحرائے نشاپورم من و عطار گل

شیراز مین یہ نام کسی وقت بہت مقبول تھا۔ نوین صدی مین مولانا غیاث اور دسوین مین امیر غیاث الدین منصور بیٹا امیر صدر الدین نے زیادہ شہرت پائی لیکن دونوں کے مزاج وطبائع مین تناسب و اختلاف شدید تھا۔ امیر نے ۹۴۸ھ ۱۵۴۱ء مین وفات پائی۔ آپکا ایک ذکی و ذہین شاگرد حکیم فتح اللہ شیرازی ہندوستان آیا تھا پہلے سلطان علی عادل شاہ والی بیجاپور کا متوسل و وکیل اور اسکے بعد شہنشاہ اکبر کا معتمد و ندیم ہو گیا تھا۔ امیر جیسے بڑے ذی علم و حافظ احادیث و حامل علوم شرعیہ تھے ایسے ہی دیندار اور پابند احکام دینیہ بھی تھے۔ احتیاج زر و قدر سے دریغ نہ فرماتے۔ چودہ سال کی عمر مین علامہ محقق جلال الدین محمد دوانی سے مناظرہ کا واقعہ پیدا ہوا تھا۔ تحفۃ الکلام مین تحفۃ الاسلام امام غزالی کے بعض اقوال کی تردید کی ہے محاکمات صدر الدین محمد شیرازی و جلال الدین محمد دوانی کی شرح تحریر کی ہے۔ استاد البشر لقب تھا۔ اخلاق منصوری آپکی یادگار ہے۔

شاعری کے پھلوان اور فارسی زبان کے مسترکہ گیر مانے گئے ہین۔ خاندان طیبین وطاہرین کے مناقب مین قصائد غرا لکھے ہین مگر منصف مزاج اور بعض ابنائے جنس کے خلاف تعصب وتشیع سے پاک تھے ہمیشہ اعتدال مرعی رکھتے۔ ایک مرتبہ شاہزادہ[۱] ابراہیم سلطان گورگان نے پوچھا کہ "مولانا کس مذہب کے متابعین وپیرو زیادہ اچھے اور بزرگ ہین" جواب دیا کہ "ہر قوم وہر مذہب کے صلحاء"

مولانا غیاث باہمہ علم وحکمت کسی سے جھگڑا بکھیڑا نہ کرتے صلح وآشتی ومیانہ روی اُنکا شیوہ عالی تھا۔ مورخین اُن کے تدین کی نسبت اچھی رائے نہیں رکھتے ہیں لکھتے ہین کہ نماز وعبادات کے چندان پابند نہ تھے۔ اُنکے معتقدات پر بھی اعتراض کیا جاتا ہے۔ مولانا نے تمام عمر نہایت آزادہ روی اور آزاد خیالی کے ساتھ گذاردی کبھی کسی سرکاری خدمت کا بار سر پر لینا گوارا نہ کیا۔ امیر منصور مدت دراز تک بادشاہ کی صدارت پر مامور رہے تھے۔ امیر نے بہت سی تصانیف رائقہ یادگار چھوڑی ہین مولانا کے علمی کارنامون پر مستوری وگمنامی کا پردہ پڑا ہوا ہے ؎

یادش بخیر وہ دل ناکام بر نیامد مراد　　اس طرح لٹ گیا کہ پتا ہی کہیں نہیں

[۱] امیر تیمور صاحبقران کا پوتا۔ مرزا شاہرخ کا منجھلا بیٹا تھا مرزا نے اپنی زندگی میں ارفع تر اور حفظ امن کے لئے اپنی مملکت اپنے بیٹوں مین تقسیم کردی تھی۔ شاہزادہ ابراہیم سلطان گورگان کو پہلے بلخ و طخارستان کی حکومت تا حدود کابل وبدخشان سپرد کی تھی بعد ازان ولایت شیراز پر مامور کیا تھا۔ یہ ایک ذی علم وعلم دوست شاہزادہ تھا۔ اُسکے دربار مین علماء وحکماء وشعرا کا مجمع رہتا علمی بحثین ہوتین لچسپ صحبتین رہتی تھین۔ اہل تاریخ لکھتے ہیں کہ ان تینون بھائیون (الغ بیگ، بایسنغر، اور ابراہیم سلطان) کے دور مین ہرات وسمرقند وماوراء النہر دارالعلم والعمل بنے ہوئے تھے۔ ان شاہزادون کے باہمی لطائف ومکاتبات دنیائے علم مین یادگار بتائے جاتے ہین۔

ابراہیم نے اپنے باپ مرزا شاہرخ کی حیات اور اپنی جوانی میں ۸۳۸ھ (۱۴۳۴ء) مین شیراز میں وفات پائی۔ مرزا عبداللہ اُسکا فرزند سمرقند مین دادا کے تخت پر بیٹھا تھا۔

گورگان ترکی زبان مین داماد کو کہتے ہین۔ چنگیز خان کے سلسلۂ وراثت مین جو شخص دامادی کا شرف پا جاتا تھا اوسکو یہ خطاب ملتا تھا۔ تیمور خود بھی اُسی نسل سے تھا اور پھر بادشاہ وقت کی لڑکی سے شادی کی تھی اسلئے گورگان کھلاتا تھا اُسکے بعد یہ لقب اُسکی اولاد مین بھی چلا آیا۔

استاد اسعد مِیہنہ۵۱۸ھ جو فحول علماء سے تھا سلطان محمد ۵۱۱ھ بن ملک شاہ کی مجلس میں افضل العلماء ۵۱۸ھ

۵۱۸ھ ابوالفتح اسعد بن ابی نصر بن ابی الفضل المیہنی الفقیہ الشافعی الملقب بہ مجد الدین [میہنی بکسر میم وسکون یاء و فتح ھا - دبہ آخر نون میہنہ سے منسوب ہے جو رواۃ اس علاقاں خابراں کا ایک قریہ ہے اور خابران مابین سرخس وابی وردکے اقلیم خراسان میں ایک ناحیہ ہے] استاد اسعد فقہ اور دیگر علوم و فنون متداولہ میں نامور امام گذرے ہیں۔ انکی تعلیقات مشہور ہیں۔ فقہ مرو میں حاصل کی تھی۔ پھر غزنہ چلے آئے وہاں بڑی شہرت پائی، انکے علم و تبحر کی خوب اشاعت ہوئی۔ غزی نے بھی انکی مدح کی ہے پھر بغداد آگئے وہاں کے مدرسہ نظامیہ کی تدریس دوبارہ انکے سپرد ہوئی۔ پہلے ۵۰۷ھ (۱۱۱۳ء) میں جس سے ۱۸ رشعبان ۵۱۳ھ (۱۵ اکتوبر ۱۱۱۹ء) کو سبکدوش کردئے گئے۔ دوسری بار شعبان ۵۱۷ھ (اکتوبر ۱۱۲۳ء) میں مقرر ہوئے۔ اسی سال ذیقعدہ (جنوری ۱۱۲۴ء) میں عسکر (من محلات نیشاپور) چلے آئے مدرسہ میں دوسرا استاد مقرر ہوگیا۔ عسکر میں انکے گرد ازدحام عام رہتا تھا۔ خلق کثیر انکے علم و فضل سے فائدہ اٹھاتی۔ ان کی تقریر و تحریر و مناظرات سے متمتع ہوتی تھی۔ حافظ ابوسعد سمعانی نے اپنی کتاب الذیل (تاریخ خطیب) میں انکو بڑی عزت سے یاد کیا ہے۔ لکھتے ہیں کہ سلطان محمود سلجوقی کی طرف سے مرو میں سفیر مقرر ہوکر آئے تھے۔ پھر بغداد سے ہمدان کو ایلچی بناکر بھیجے گئے۔ ہمدان ہی میں ۵۲۷ھ (۱۱۳۲ء) میں وفات پائی۔ سمعانی لکھتے ہیں کہ مجھسے ابوبکر محمد بن علی بن عمر خطیب نے روایت کی تھی اور انہوں نے کسی فقیہ اہل قزوین نے لکھا تھا جو پایاں عمر میں اسعد کی خدمت و تیمار ہمدان میں کرتا رہا تھا۔ وہ لکھتا تھا کہ موت کا وقت جب قریب آیا تو میں بھی استاد کے پاس انکے گھر پر موجود تھا۔ استاد نے ہم سب کو دور ہٹا دیا ہم لوگ باہر چلے آئے مگر دروازے سے لگے کھڑے رہے اور سننے لگے۔ امام اپنے چہرے پر طمانچے مارتے اور کہتے تھے یا حسرتیٰ علیٰ ما فرطت فی جنب اللہ۔ خوب روتے تھے اور منہ پیٹتے تھے اور بار بار یہی کہتے تھے۔ حتیٰ کہ طائر روح قفس عنصری سے پرواز کرگیا۔

انھیں اسعد میہنی کے تلامذہ (یعنی مدرسہ نظامیہ کے طلبہ) میں شیخ العراق امام ابوالنجیب عبدالقاہر ضیاء الدین سہروردی تھے۔

۵۱۱ھ ابوشجاع محمد بن ملک شاہ بن الپ ارسلان ملقب بہ غیاث الدین۔ جب ملک شاہ نے ۱۶ شوال ۴۸۵ھ (۲۰ نومبر ۱۰۹۲ء) کو وفات پائی تو اس کی مملکت اسکے تینوں بیٹوں (۱) برکیاروق (۲) سنجر (۳) محمد میں منقسم ہوگئی۔ محمد اور سنجر ایک ماں سے تھے۔ تاہم تعلقات کشیدہ رہتے۔ جب محمد و برکیاروق میں اختلاف پیدا ہوا تو محمد اور سنجر بغداد آئے۔ امام مستظہر باللہ نے انپر نوازش وعنایت فرمائی۔ محمد نے امیر المومنین سے درخواست کی

محمد غزالی سے مناظرہ کرنے لگا۔ علمائے خراسان استاد کے یادر و پشت پناہ تھے۔ پہلا سوال غزالی

کہ میرے اور میرے بھائی سنجر کے لئے اجلاس کیا جائے۔ التماس منظور ہوا خلیفہ نے قبۃ التاج میں دربار کیا۔ تمام ارباب مراتب اور اتباع حاضر ہوے۔ امیر المومنین نے ایک سدّہ (سرا و طاق) پر نشست فرمائی۔ سیف الدولہ صدقہ بن مزید صاحب الحلہ (لارڈ چیمبرلین) تخت کی داہنی جانب کھڑا ہوا اُسکی دوش پر نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی چادر مبارک تھی۔ سر پر عمامہ اور ہاتھوں مین قضیب (عصا) محمد کو حسب عادت سلاطین سات پارچہ کا خلعت پہنایا گیا۔ طوق اور تاج مرصع ہوا سوار بن (کنگن) پہنائے گئے۔ خلیفہ نے خود تلوار عنایت کیا۔ دو تلوارین زیب گلو کیں۔ پانچ گھوڑے مع ساز و یراق کے مرحمت فرمائے۔ سنجر کو بھی اسی طرح خلعت پہنایا گیا جیسا کہ اُس زمانہ مین دستور تھا جامع بغداد مین محمد کے نام کا خطبہ سلطنت پڑھا گیا۔ برکیاروق کا خطبہ چھوڑا دیا گیا۔ محمد بن عبد الملک ہمدانی اپنی تاریخ مین لکھتے ہین کہ یہ واقعہ ۴۹۵ھ (۱۱۰۲ء) کا ہے۔ مگر صاحب تاریخ سلجوقیہ کا بیان یہ ہے کہ سلطان محمد کا خطبہ بغداد مین ۲۰ ذیحجہ ۴۹۲ھ (۵ نومبر ۱۰۹۹ء) کو پڑھا گیا تھا۔ بقول ہمدانی عجیب اتفاق یہ ہوا تھا کہ جسوقت جامع قصر بغداد کا خطیب سلطان برکیاروق کے لئے دعا مانگے اور اُسکا نام لینے کو ہوا تو خود بخود اُسکی زبان سے سلطان محمد کا نام اور اُسکے لئے دعا نکلی۔ برکیاروق کے خیر خواہون نے اُسپر آفت ڈھائی۔ وہ معزول ہوا مگر اُس کی جگہ پر اُسکا بیٹا مقرر کر دیا گیا۔ اس واقعہ کے بعد سلطان محمد کے خطبہ مین صرف چند روز کی تاخیر ہوئی تھی اُسکے حق مین یہی فال نیک تھی۔ اس کے بعد کے واقعات برکیاروق اور محمد شاہ کی جنگ آزمائی اور محمد شاہ کا ہر مرتبہ شکست پانا تاریخون مین بالتفصیل مرقوم ہین۔

سلطان محمد ملوک سلجوقیہ مین بڑا امر داور نامور گزرا ہے۔ بہت سے آثار جمیلہ اور سیرہ حسنہ اور معدلت شاملہ یادگار چھوڑی ہین۔ فقرا اور ایتام کے ساتھ بڑی نیکی کرتا تھا طوائف ملحدہ سے ہمیشہ بر سر جنگ و پرخاش رہتا۔ امور رعیت پر نگاہ رکھتا۔ ابوالبرکات بن المستوفی نے تاریخ اربل مین اُسکا ذکر کیا ہے اور ایک مخاطبہ (ایڈریس یا بیان) جو امام ابو حامد غزالی نے سلطان محمد بن ملک شاہ سے کیا تھا اُسکو بھی نقل کر دیا ہے۔ برکیاروق کی وفات پر محمد شاہ سلطنت کا مالک مستقل ہو گیا اور دنیا کو عام فائدہ پہونچانے اور نام نیک حاصل کرنے لگا۔ بیمار زیادہ عرصہ تک رہا۔ پنجشنبہ ۲۴ ذیحجہ ۵۱۱ھ (یکم جنوری ۱۱۱۸ء) کو شہر اصفہان مین وفات پائی ۳۷ سال چار ماہ چھ یوم عمر تھی۔ اصبہان مین مدرسہ عظیمہ مین دفن ہوا، جو طائفہ حنفیہ کے لئے وقف تھا اور جسکے برابر کوئی کالج دار السلطنت میں نہ تھا۔ محمد شاہ جب اپنی زندگی سے نومید ہوا تو اپنے لڑکے محمود کو بلایا اور بوسہ دیا۔ دونون خوب روئے۔ باپ نے بیٹے کو حکم دیا کہ جاؤ۔ تخت شاہی پر جلوس کرو۔ امور پاس پر ر

سے یہ کیا کہ آپ مذہب حنفی پر ہیں یا شافعی پر؟ غزالی نے کہا کہ میں عقلیات میں مذہب برہان کا

نظر ڈالو۔" بیٹے نے باپ سے عرض کیا کہ "آج کا دن ۔طریق نجوم مبارک نہیں ہے" بولا کہ "ہاں ۔سچ ہے ۔لیکن باپ کے لئے نحس اور سلطنت کے لئے مبارک ہے" چنانچہ محمود گیا۔ تخت پر نشست فرمائی ۔تل اور سوار ین (کنگن) بھیجے ۔ملوک سلجوقیہ میں سے کسی نے اتنا سامان، ذخائر، اصناف اموال اور دواب وغیرہ سے نہیں چھوڑا جتنا اس نے چھوڑا تھا۔امام مقتفی لامر اللہ نے فاطمہ دختر سلطان محمد مذکور سے ۵۳۱ھ (۱۱۳۶ء) میں شادی کی تھی قبول نکاح کا وکیل وزیر شرف الدین ابو القاسم علی بن طراد زینبی تھا لڑکی کا خال مسعود بھی مجلس عقد میں موجود تھا۔فاطمہ بیت سلطان محمد شوہر کے یہاں ۵۳۳ھ (۱۱۳۹ء) میں لائی گئی۔ مورخین لکھتے ہیں کہ یہ لڑکی نہایت تعلیم یافتہ تھی خوب لکھی پڑھی اور نہایت صائب رائے رکھتی تھی ۔وہ موضع جو درگاہ خاتون کے نام سے معروف ہے اسکا سکونت گاہ تھا۔ شنبہ ۲۲ ربیع الآخر ۵۴۲ھ (۲۰ ستمبر ۱۱۴۷ء) کو وفات پائی ۔رصافہ (بغداد) میں دفن ہوئی۔

۹۱۸؎ حجۃ الاسلام محمد زین الدین محمد بن محمد بن احمد الغزالی الطوسی ۔آپ کی کنیت ابو حامد تھی ۔غزالہ یا غزالہ (غزال) کے رہنے والے تھے جو اعمال طوس میں ایک قریہ ہے ۔وہیں ۴۵۰ھ (۱۰۵۸ء) میں پیدا ہوئے ۔ دوسری روایت یہ ہے کہ غزال ریسماں فروش کو کہتے ہیں وہ اسی مادر معظمہ کا تیار کیا ہوا سوت بازار میں لے جاکر فروخت کرتے تھے اسلئے یہی نام قرار پا گیا۔ ابتدا ءً احمد رادکانی سے طوس میں تعلیم پائی ۔پھر نیشاپور میں امام الحرمین ابو المعالی جوینی سے تکمیل تحصیل علوم فرمائی۔ جب نظام الملک وزیر سے ملاقات ہوگئی تو اس نے بڑی قدر شناسی اور رعایت و تعظیم کی اسکے دربار میں ہمیشہ علماء و فضلا کا مجمع رہتا تھا آپ اُن سے مباحثہ و مناظرہ کرتے اور سب پر غالب رہتے ۔کچھ دن بعد نظامیہ بغداد کی تدریس آپ کے سپرد ہوگئی ۔جمادی الاول ۴۸۴ھ (جولائی ۱۰۹۱ء) میں وہاں تشریف لے گئے ۔ ذیقعدہ ۴۸۸ھ (نومبر ۱۰۹۵ء) میں تعلقات دنیوی کو خیرباد کہا دنیا سے انقطاع کر لیا ۔حج کو چلے گئے ۔لوٹے تو سیدھے شام میں آئے دمشق میں بود و باش اختیار کی اور جامع عربی کے ایک زاویہ میں پڑھنے پڑھانے لگے ۔پھر بیت المقدس چلے گئے ۔وہاں سے مصر گئے ۔اسکندریہ میں مقیم رہے ۔پھر بلاد مغرب کا رخ کیا ۔امیر یوسف بن تاشفین صاحب مراکش سے ملنے جا رہے تھے ۔راستے میں اُسکے مرنے کی اطلاع پائی تو اپنے وطن طوس چلے آئے ۔اور خلوت گزیں ہوگئے۔ احیاء علوم الدین جسکو ابن خلکان "نہایت نفیس و جمیل" کتابوں میں شمار کرتا ہے و کیمیائے سعادت، یاقوت التاویل فی تفسیر التنزیل (چالیس جلدیں) موسوم بہ تفسیر جواہر القرآن، عقائد غزالی، تہافۃ الفلاسفہ، رسالہ علم لدنی، میزان عمل، بدایت الہدایت، مشکوٰۃ الانوار، کتاب الوسیط، والبسیط، والوجیز، المنخول، المنتحل فی علم الجدل، محک النظر، المنقذ عن الضلال وغیرہ ننانوے کتابیں اسی عہد عزلت و خلوت کی یادگار ہیں۔

پیروہون اور شرعیات مین مذہب قرآن کا مجمیر نہ حنیفہ[۱۸۳] کا کچھ حق ہے اور نہ شافعی[۱۸۴] کا کوئی حصہ۔

مستصفی کے (اصول فقہ مین) لکھنے سے ۶ محرم ۵۰۳ھ کو فراغت پائی۔

گوشۂ عزلت سے نکل کر نظامیہ نیشاپور مین درس دیئے گئے کچھ دن بعد اسکو بھی ترک کردیا اور اپنے وطن طوس کو چلے آئے۔ یہان صوفیون کے لئے خانقاہ درست کرائی اور طالبان علم کے واسطے مدرسہ کی بنیاد ڈالی۔ اپنے اوقات عزیز تمام تر وظائف خیر و ختم قرآن اور صحبت ارباب قلوب اور تدریس علوم مین صرف فرماتے۔ فقیہ شافعی تھے۔ مفتیان احناف کی ایک جماعت آپ کے خلاف بھی جو قتل کے فتوے دیا کرتی مگر آپ کو کبھی ضرر و گزند نہ پہونچا سکی۔ اہل تصوف لکھتے ہین کہ آپ نے ستر علوم پڑھے تھے مگر کسی سے کشود کار نہ ہوسکا۔ لاچار صوفیہ سے رجوع کیا۔ زہد و عبادت اختیار کی اور فائز المرام ہوے۔ ان کی عام روش یہی ہے کہ شرعی باتون کو صوفیون کی باتون سے مخلوط کر کے بیان کرتے ہین۔

شاعر بھی بڑے پایہ کے تھے۔ حافظ ابوسعد سمعانی نے اپنی کتاب الذیل مین انکے کلام کا کچھ نمونہ دکھایا ہے۔ آپ دوشنبہ کی صبح ۱۴ جمادی الآخر ۵۰۵ھ (۱۸ دسمبر ۱۱۱۱ء) کو بمقام طابران (جو طوس کا ایک قصبہ ہے) جوار رحمت حق مین شامل ہوے۔ اور ظاہر (بیرون قصبہ) مین دفن۔ ابوالمظفر محمد ابیوردی مشہور شاعر نے مرثیہ لکھا۔

انکے بھائی امام احمد غزالی بھی بڑے عالی مرتبت محقق و عالم تھے۔ بعض اوقات دونون بھائیون مین مناظرہ و مباحثہ ہو جاتا تھا۔ امام صاحب کے تلمیذ رشید محمد بن ابی القاسم طوسی تھے۔ جنھوں نے اپنے وحید عصر استاد کے بہت سے حالات رسالہ محاکمات مین تحریر کئے ہین۔ حریاں نامہ کے باب سوم مین کچھ احوال مرقوم ہین مستشرقین یورپ میں سے براؤن نے اپنی مشہور تاریخ ادبیات ایران میں آپ کو کئی جگہ بڑی عظمت و ادب سے یاد کیا ہے۔ ترکی ترجمہ سے ایچ اے ہومس H A Homes نے کیمیائے سعادت کا انگریزی مین ترجمہ کیا اور وہ الفاظ ان کی شان مین لکھے ہین جنکو کوئی اور بڑے سے بڑا عقید تمند بھی نہ لکھ سکے گا۔ البتہ ڈیٹرسی Dieterici مخالفانہ روش رکھتا اور اپنی کتاب فلسفۃ الاعراب (مطبوعہ لیپزگ ۱۸۷۶ء) مین ایراد و تعنت کرتا ہے۔ جرمن کے ایک وسیع النظر عالم نے آپ کی تصانیف پر تین سو صفحات کی ایک کتاب لکھی ہے۔

۱۸۳ـ ابوحنیفہ نعمان بن ثابت بن زوطا بن ماہ کوفی۔ گو اگرچہ فقہائے بلاد کے تذکروں میں علمائے رجال و اصحاب سیر نے فقیہان کوفہ مین شمار کیا ہے لیکن حقیقت یہ ہے کہ آپ کے نام کا انتشار، آپ کے علم کا اشتہار، آپ کے حکم کا نفاذ کوفہ سے اختصاص نہین رکھتا۔ آپ کی فقاہت و افتاء کا آوازہ و شہرہ چار دانگ عالم

استاد واسعد نے کہا کہ "یہ بات تو ٹھیک نہیں" غزالی نے کہا کہ "اے بیچارے! اگر تجھکو علم الیقین سے ثمر

پر محیط ہے ربع مسکوں کے ربع اہل سنت بلکہ نصف کے قریب مذہب حنفی (جو مذاہب اربعہ عامہ سے ہے) اختیار کئے ہوئے ہیں انقلابات حال و دستور جمہوریت سے پیشتر ممالک روم (ترکی) میں لازم و مقرر تھا کہ سلاطین آل عثمان و صدر اعظم اور قاضی القضاۃ (شیخ الاسلام) ابو حنیفہ کے مذہب کے متبع ہوں۔ ائمہ مجتہدین و فقہاء میں آپ اسبق و اقدم تھے۔ امام اعظم کہلاتے ہیں نعمان اصلی نام تھا سلسلۂ نسب نوشیروان تک پہونچتا ہے۔ دادا زمرۂ کفار سے تھے۔ لڑائی میں مسلمانوں کے ہاتھ گرفتار ہوئے۔ مدت تک قبیلہ بنی تیم اللہ بن ثعلبہ مین کسی کے یہاں غلامی مین بسر کی، جب آزاد ہوئے تو دولت اسلام کی سعادت نصیب ہوئی جناب ثابت آپ کے والد ماجد اُس وقت عالم وجود مین آئے۔

اہل سنت تذکرہ نگاروں کا قول و عقیدہ ہے کہ اُس مولود کو آستان مبارک علی بن ابی طالب امیر المومنین بر لے گئے۔ حضرت نے ثابت اور اُنکی اولاد کے حق مین دعائے خیر فرمائی چالیس سال سے عمر متجاوز تھی کہ صلب ثابت سے سنہ ۸۰ھ (۶۹۹ء) میں کو مین نعمان (ابو حنیفہ) نے اس عالم مین قدم رکھا رشد کا زمانہ ہوا تو خزازوں (چرم دوزوں) کی جماعت مین داخل ہوکر داد و ستد کرکے بسر کرنے لگے۔ ایک رات عالم واقعہ مین دیکھا کہ خوابگاہ مطہر حضرت خاتم الانبیاؐ سے کفن نکال رہا ہوں۔ گھبرا کر خواب راحت سے بیدار ہوئے سراسیمگی و ہراس غالب تھا مشہور معبّر ابوبکر محمد بن سیرین کے پاس آدمی بھیجا اور قصہ تب گزارش کیا تعبیر کی خواہش کی۔ جواب ملا کہ خواب دیکھنے والے کو اتنا علم و حکمت ہوگا کہ وہ تمامی مردمان زمانہ اور علمائے عصر سے بڑھ جائے گا۔ داعیۂ شوق تحصیل اسیوقت سے روز بروز بڑھنے لگا اور اکتساب معارف و اقتباس معانی میں جد و جہد کرنے لگے۔ ایک گروہ تابعین کی صحبت سے بھی فائض ہوئے تھے منھم ۱عطاء بن ابی رباح ۲ابواسحق سبیعی ۳محارب بن دثار ۴ہیثم بن حبیب ۵ہشام بن عروہ ۶محمد بن منکدر ۷نافع مولی عبداللہ بن عمر ۸سماک بن حرب ۹ابو عمار ابراہیم نخعی (تابعی) مقامات حدیث اور مراتب معالم دین انھیں بزرگوں کی خدمت مین طے کئے۔ مباق علم فقہ کو حماد بن ابی سلیمان سے پختہ و مشید کیا۔ عام و خاص ذرائع سے ثابت ہوا ہے کہ امام ابو حنیفہ کو حضرت امام جعفر بن محمد الصادق سے بھی تلمذ حاصل تھا۔ جسکا تذکرہ حافظ ابن حجر مکی نے صواعق میں کیا ہے اور علامہ مجلسی نے بحار الانوار مین۔ بعض تابعین رضی اللہ عنہم اجمعین کی صحبت سے بھی مشرف ہوئے تھے صاحب مطلع العلوم و مجمع الفنون لکھتا ہے کہ امام ابو حنیفہ حضرت امام موسیٰ کاظم علیہ السلام (سنہ ۱۲۸ھ

پھر بھی آگاہی ہوئی تو یہ کہتا کہ تم خطا کرتے ہو۔ مگر تو فیہ ظاہر ہیں ٹرگر ا اور معذور ہے اگر نیر ے

تغایت ۱۳۳ھ) کے شاگرد تھے۔ یہ قرین قیاس نہیں کیونکہ امام ابوحنیفہ کی وفات کے وقت امام موسی کاظم کی عمر صرف بائیس سال کی تھی۔ مولانا شبلی سیرۃ النعمان میں فرماتے ہیں کہ حضرت کو امام باقر علیہ السلام سے تلمذ تھا۔ باعتبار تناسب عمر یہ روایت قابل قبول ہے (انکا سال ولادت ۵۷ھ وفات ۱۱۷ھ ہے) زیادہ اجماع امام جعفر صادق علیہ السلام کی شاگردی پر ہے جسکا زمانہ ۸۰ھ یا ۱۰۰ھ سے ۱۴۸ھ تک تھا۔

آپ کے علم وفضل کا یہ مرتبہ تھا کہ امام شافعی جو مذاہب چہارگانہ میں سے ایک کے سردار و پیشوا ہیں فرماتے ہیں کہ قبائل علما اور شعوب فضلا کو جن کمالات کے پانچ شعبوں میں پانچ شخصوں کا عیال سمجھنا چاہیے جنھوں نے فوائد وفضائل حاصل کئے ہیں۔(۱) علم فقہ میں ابوحنیفہ کے فضل کے ریزہ خوار ہیں۔ عیال فی الفقہ۔(۲) صنائع شعریہ میں زہیر بن ابی سلمے کے انعام کے پروردہ (۳) مغازی کے جاننے میں محمد بن اسحق سے نعمت اندوز (۴) فن نحو میں عطایائے کسائی سے بہرہ مند اور (۵) تفسیر کی تشان میں مقاتل بن سلیمان کے جرعہ خوار ہیں۔

مالک بن انس اصبحی سے جو خود ائمہ اربعہ سے ہیں پوچھا گیا کہ "جب آپ کو ابوحنیفہ سے صحبت و یکجائی کا اتفاق ہوا تو آپ نے انکے علم وفضل کو کس درجہ پر پایا" فرمایا کہ میں نے انکے قیاس واستدلال کی یہ قوت دیکھی کہ اگر میں کبھی انسے چاہتا کہ وہ اپنے دلائل و براہین سے کسی ستون کو سونے کا ثابت کردیں تو باوصف اسکے کہ حس بصر اور قوت نظر اسکے خلاف حکم دے رہی ہو وہ اسکے ثابت کردینے پر قادر تھے"۔

یحیی ابن معین کہتے ہیں کہ چند شخصوں کی بدولت علوم اس مرتبہ کمال پر پہونچے ہیں یا یوں کہئے کہ انھیں کے ساتھ انکا انحصار و انحصار ہوگیا ہے۔ سچ ہے کہ قرأت حمزہ کی قرأت ہے اور فقہ ابوحنیفہ کی فقہ اور اس بارہ میں تقریبا سب ہی مجھسے متفق الرائے ہیں"۔

حفص بن ربیع کہتے ہیں کہ میں پانچ سال تک ابوحنیفہ کے جوار (ہمسائگی) میں رہا ہوں۔ وہ اسقدر چپ رہتے تھے کہ میں نے کسی شخص کو خاموشی میں انکے برابر نہیں دیکھا۔ لیکن جب مسائل فضائل کے لیے منہ کھولتے تھے تو ایسے علوم انکی زبان ودہن سے بکھرنے لگتے تھے کہ کمالات کا سیل جاری ہو جاتا تھا"۔

عبداللہ بن مبارک ان کی مدح میں لکھتے ہیں ؎

لَقَدْ زَانَ الْبِلَادَ وَمَنْ عَلَيْهَا ۔۔۔ إِمَامُ الْمُسْلِمِينَ أَبُو حَنِيفَةَ

بِآثَارٍ وَفِقْهٍ فِي حَدِيثٍ ۔۔۔ كَآيَاتِ الزَّبُورِ عَلَى الصَّحِيفَةِ

سرچڑھایے اور مقتدی کی حرمت نہ ہوتی تو میں بحث و استدلال کرکے تجکو راہ تحقیق دکھا دیتا"

فَمَا اِنْ بِالْعِرَاقِ لَہٗ نَظِیْرٌ وَلَا بِالْمَشْرِقَیْنِ وَلَا بِکُوْفَہ

[ابو حنیفہ نے جو مسلمانوں کے پیشوا ہیں زیور آثار اور حلیہ احادیث سے صفحات بلاد و اہل بلاد کو ایسی زینت دیدی ہے جیسی کہ آیات آسمانی نے اوراق قرآنی کو۔ اُنکی نظیر نہ تو عراق میں ہے۔ مشرقین میں۔ اور نہ کوفہ میں]

تذکرۃ الاولیا میں لکھا ہے کہ فضیل عیاض، ابراہیم ادہم، داؤد طائی، بشر حافی وغیرہم آپ کے تلامذہ سے تھے۔

قاضی احمد بن خلکان اربلی اور امام یافعی لکھتے ہیں کہ ابو حنیفہ تمام کمالات سے آراستہ و پیراستہ تھے۔ البتہ علوم عربیہ میں ان کا رتبہ چنداں بلند نہ تھا۔ ان کی باتین کبھی کبھی لحن (بولنے میں خطا کر جانا یا اعراب میں غلطی کرنا) اور غلط آمیختہ ہو جاتی تھیں جس کی تمثیل و تائید میں اباعمرو بن علاء المقری النحوی کے استفتاء اور آپ کے جواب کو نقل کیا ہے۔ اس بارہ میں ایک گروہ نے اعتذار اور بجا اعتذار کیا ہے کہ ابو حنیفہ کوفہ کے باشندے تھے۔ لامحالہ اُنکی بات چیت میں کوفیین کا طرز تکلم اور اسلوب اداء نمایاں رہا چاہیے تھا۔ اہل کوفہ تو اسماء ستہ کو تینوں حالتوں میں الف کے ساتھ پڑھتے ہیں۔ جیسا کہ قول مشہور ہے ؎

اِنَّ اَبَاھَا وَاَبَا اَبَاھَا قَدْ بَلَغَا فِی الْمَجْدِ غَایَتَاھَا

دمیری شافعی نے ابن شبرمہ سے حکایت کی ہے کہ میں ابو حنیفہ کے ساتھ مدینہ طیبہ میں عتبہ عالیہ جعفر بن محمد الصادق پر مشرف حضوری ہوا۔ عرض کیا کہ "میرا رفیق فضلاے عصر اور فقہاے عراق سے ہے"۔ فرمایا "میں سمجھتا ہوں یہ وہی صاحب ہیں جو احکام الٰہیہ میں اپنی راے پر اعتماد کرتے اور نوامیس (قواعد و دستور) عدل و کرم میں قیاس سے کام لیتے ہیں۔ کیا یہ ہی نعمان بن ثابت ہیں؟" ابن شبرمہ کہتا ہے کہ مجکو اسوقت تک یہ بھی معلوم نہ تھا کہ انکا نام نعمان ہے۔ ابو حنیفہ نے آنحضرت کی تصدیق کی اور عرض کیا "اَصْلَحَکَ اللّٰہُ یَا ابْنَ رَسُوْلِ اللّٰہِ۔ ہاں میں وہی شخص ہوں"۔ فرمایا "نعمان! اعداء کے غضب سے ڈرتے رہنا۔ معاملات شرعیہ میں اپنی ناتمام عقل پر کبھی تکیہ نہ کرنا۔ دین الٰہی میں قیاس کو مستند نہ سمجھنا۔ سب سے پہلے جس نے قیاسات کا طریق اختیار کیا، ابلیس تھا۔ جب پروردگار عزاسمہ نے اسکو آدم علی نبینا و علیہ السلام کو سجدہ کرنے کا حکم دیا تو وہ بولا اَنَا خَیْرٌ مِّنْہُ [میں تو اُس سے بہتر ہوں۔ الجزو الثامن سورۃ الاعراف ع ۲۔ ۹] اسلئے کہ میرے مادہ کو آگ سے جو ایک عنصر لطیف اور جوہر درخشندہ ہے تونے پیدا کیا اور آدم کا خمیر مٹی سے بنایا ہے جو خود تاریک و تیرہ ہے [خَلَقْتَنِیْ مِنْ نَّارٍ وَّخَلَقْتَہٗ مِنْ طِیْنٍ۔ مجکو تونے آگ سے بنایا اور اُسکو بنایا خاک سے]

اے ابو حنیفہ! شیطان رجیم نے سجدہ کے بارے میں اپنی عقل و راے پر قیاس کرکے نافرمانی کی، اور ورطۂ ضلالت

میں گرا۔ عذاب ابدی میں گرفتار رہے گا۔" پھر فرمایا کہ "اچھا اپنے سَر اور تن بدن کے حال کو تو خوب جانتے ہوگے جو احکام میں قیاس لگاتے ہو" کہا "نہیں، میں نہیں جانتا" پھر دریافت فرمایا "کچھ یہ بھی معلوم ہے کہ حق تعالیٰ نے آنکھ میں شوری، کان میں تلخی، ناک میں مخاط (آب بینی) دونوں لبوں کے مابین شیرینی کیوں پیدا کی ہے" کہا "میں نہیں جانتا" فرمایا کہ "حق تعالیٰ نے اپنے حکمت بالغہ کے اقتضاء سے دونوں آنکھوں کو چربی سے خلق فرمایا اور اُس میں آب شور رکھا تاکہ مخلوق پر اپنی نعمتوں میں زیادت وافر وں بخشے۔ اور وہ نمکین رطوبات دونوں دیدوں کو انحلال و گداز (پگھلنے) سے باز رکھیں۔ کان میں تلخی اس لئے بنائی تاکہ اپنی مخلوق پر ایک نعمت کا اور اضافہ ہو۔ اگر ایسا نہ ہوتا تو چھوٹے چھوٹے جاندار کان کے اندر سے راہ پاکر دماغ کو اپنی غذا بنا لیتے اور بہت تھوڑے سے وقت میں اُسکو نابود کر دیتے۔ دونوں نتھنوں (منخرین) میں پانی اسلئے پیدا کیا کہ قابل تمدد و درازی رہے اور اُس مجرے سے دم خوب حرکت اور اچھی طرح صعود و نزول کرے اور اُس پانی کی رطوبت سے بینی (ناک) کا مزاج بھی صحت پر قائم رہے، اچھی بُری بُو کی تمیز کر سکے۔ دونوں ہونٹھوں کے مابین آب شیریں پیدا کیا تاکہ اُسکی مخلوق کھانے پینے کی لذت پائے۔" پھر پوچھا "وہ کونسا کلمہ ہے جسکا اول کفر، اور آخر ایمان ہے" کہا کہ "میں نہیں جانتا" فرمایا "وہ کلمہ لا الٰہ الا اللہ ہے۔ کہنے والا اگر لا الٰہ کہکر ساکت ہو جائے تو وجود واجب سے انکار ٹھہرے گا، جو کفر صریح ہے۔ اور اگر کلمہ الا اللہ کو بھی منضم کرے (کہہ ڈالے) تو معبود برحق کا اثبات ہو گا جو ایمان محض ہے۔" پھر فرمایا کہ "اے ابو حنیفہ حق تعالیٰ شانہ نے قتل نفس اور زنا کو حرام فرمایا ہے لیکن یہ تو بتائے کہ خدا کے نزدیک قتل نفس بڑا گناہ ہے یا زنا؟" کہا کہ "قتل نفس"، فرمایا "تو بمقتضائے قیاس یہی ضرور ہے کہ اسکا ثابت کرنا بھی عظیم تر قرار پائے۔ حالانکہ یہ بات نہیں ہے۔ حق تعالیٰ نے قتل کے ثابت کرنے کے لئے دو شاہدان عادل کی شہادت مقرر فرمائی ہے اور زنا کے لئے چار گواہوں کا اعتبار رکھا ہے۔ کہئے کہ حکم الٰہی کے ساتھ قیاس کیونکر چل سکتا ہے؟" فرمایا کہ "نماز و روزہ میں سے حق تعالیٰ کے نزدیک کون زیادہ بزرگ و افضل ہے"؟ کہا کہ "نماز" فرمایا "تو حائض پر صوم کی قضا کیوں واجب ہوئی۔ مگر نماز کی نہیں؟"

ان دونوں بزرگوں کے معارضات شیعوں کے یہاں مختلف طریقوں سے احتجاج طبرسی، و مجلسی، و علل الشرائع وغیرہ میں مرقوم ہیں۔ جسکے نقل کرنے سے اہل سنت و جماعت مورخین نے اوباً

ہونا چاہیئے اور بدرجہ کمال ہونا چاہیئے اور اُسکا اظہار بھی سرًّا وعلانیۃً جیسا کہ حضرت امام شافعی کا مشرب تھا۔

واحتراماً گریز و احتراز کیا ہے۔

صاحب درر الاصداف لکھتا ہے کہ امام ہمام جعفر علیہ السلام نے امام ابوحنیفہ سے فرمایا مجھے معلوم ہوا ہے کہ تم دین میں قیاس کرتے ہو اور سب سے پہلے جس نے قیاس کیا ابلیس تھا۔ ابوحنیفہ نے کہا انما اقیس فیما لا اجد فیہ نصًّا۔

کتاب المصائد والمطارد میں کشاجم نے بھی امام جعفر اور حضرت ابوحنیفہ کی گفتگو کو نقل کیا ہے۔

قاضی القضاۃ احمد بن خلکان نے محمود سبکتگین کے تذکرہ میں امام الحرمین کی کتاب مغیث الخلق سے نقل کیا ہے کہ سلطان محمود ابتدائے حال میں مذہب حنفی کا پیرو تھا۔ لیکن وہ علم حدیث کو زیادہ دوست رکھتا تھا۔ ہمیشہ اُس کی مجلس میں احادیث کا دَور ہوتا جن کی تفسیر خود کرتا اور تحقیق بھی کرتا جاتا تھا جب مذہب شافعی کو اُن سے زیادہ موافق پایا تو دونوں فریق کے فقہا کا مناظرہ و مباحثہ کرا کے امام شافعی کا طریقہ اختیار کر لیا تھا۔ اس سلسلہ میں قفال مروزی کا پہلے شافعی طریق پر بہ کمال خشوع و خضوع باہمہ ارکان و آداب نماز پڑھنا پھر ایک مضحکانہ و سفیہانہ روش پر نماز ادا کر کے اُسکو حنفیت سے منسوب کرنا اور ایک حکیم نصرانی کا دونوں مذہبوں کی کتابیں دیکھ کر شافعیت کے حق میں فیصلہ کرنا کتب سیر و تراجم میں مذکور ہے۔

امام ابوحنیفہ بڑے عابد و مرتاض تھے۔ بہ روایت نامۂ دانشوران ناصری و اکثر مورخین سلف (جسکے باور کرنے سے بعض سیرت نگاران حال کو انکار ہے) چالیس برس تک عشا کے وضو سے صبح کی نماز پڑھی ہے۔ آپ ہر رات دو رکعت میں پورا کلام اللہ پڑھ لیتے تھے۔ تاریکی شب کے ساتھ انکے گریہ و زاری کی آواز بلند ہو جاتی۔ ہمسایوں کو انپر رحم آتا۔ آپنے زخارف دنیوی سے ہمیشہ اعراض کیا۔ محمد بن شجاع کہتا ہے کہ منصور عباسی نے ابوحنیفہ سے کہا تھا کہ فلان روز آپ کی خدمت میں دس ہزار درہم بھیجیگے آپنے اُنکے قبول کرنے سے اُسی وقت انکار فرمایا۔ جب روز معہود آیا تو ادائے فریضہ کے بعد گھر میں آکر آپ اور کپڑوں میں لپٹ کر بیٹھ رہے۔ کسی سے بات بھی نہ کی جب حسن بن قحطبہ طائی فرستادۂ شاہی آیا اور چاہا کہ خلیفہ نے جو کچھ پیشکش بھیجا ہے اُسکو حوالہ کرے تو آپ نے گفتگو بھی نہ کی۔ اصحاب امام نے کہہ دیا کہ حضرت کی عادت و خو یہی ہے اور اشارہ کر دیا کہ اس مال کو زنبیل حریم میں

يا راكباً قف بالمحصب من منى — واهتف بساكن خيفها والناهض
سحراً إذا فاض الحجيج إلى منى — فيضاً كملتطم الفرات الفائض
إن كان رفضاً حب آل محمد — فليشهد الثقلان أني رافضي

پھر کر کے مکان کے فلاں گوشہ میں رکھ دو۔ چنانچہ امانت گزار وہاں رکھ کر چلا گیا۔ امام نے اُسپر اصلا التفات نہ فرمایا اور وہ مال ایک مدت دراز تک اُسی جگہ پڑا رہا۔

امام کو برادران دین کے ساتھ بڑی الفت تھی۔ حُسن معاشرت اور اپنی سیرت پسندیدہ سے کام لیتے اور ہر ایک کی کاربرآری و انجاح مرام میں مخلصانہ سعی فرماتے۔ اہل تاریخ نے جس کی تائید میں بہت سے واقعات نقل کئے ہیں۔

باایں ہمہ اوصاف جیسا کہ اہل کمال وفضل ہمیشہ محسود رہتے آئے ہیں آپ کے بھی مخالف و معاند تھے۔ منصور عباسی کا حاجب ربیع اور ابوالعباس طوسی اُن میں پیش پیش تھے۔ بارگاہ خسروی میں ان لوگوں نے طرح طرح سے آپ کی سعایت و بدگوئی کی لیکن اس شہسوار میدان مناظرہ و دانش کے ہاتھ سے ناکامی و محرومی اُٹھائی۔ امام کے ایک پرانے دوست حماد عجرد شاعر کی معاصرانہ چشمک اور رقیبانہ چوٹ کا لطف اُٹھانا ہو تو ابوالفرج اصفہانی کی کتاب الاغانی دیکھی جائے۔

آپ کو منصب قضا پر مقرر کرنے کے لئے خلفا نے ہمیشہ اصرار بلکہ شدید اصرار کیا۔ لیکن آپ برابر انکار فرماتے رہے۔ پہلے مروان الحمار بن محمد آخر ملوک بنی امیہ کے عہد میں یزید بن عمرو بن ہبیرہ فزاری والی عراق نے امام صاحب کو کوفہ کی قضا پر منصوب کرنے کے لئے بلایا لیکن آپ نے قبول نہ فرمایا۔ یزید بن عمر اس بارہ میں جس قدر مبالغہ وضد کرتا تھا آپ کا گریہ و تضرع بڑھتا جاتا تھا یہاں تک کہ دس دن کے اندر ایک روز دس تازیانے بھی آپ کے لگائے گئے۔ تاہم آپ کو اپنے احتراز و انکار پر بدستور اصرار رہا۔ اور یزید بن عمرو مجبور ہو کر دستکش ہو گیا یہی خواہش ابوجعفر منصور خلیفہ دوم عباسی کی طرف سے بھی قائم رہی۔ ربیع بن حاجب نے آپ کے اور منصور کے ایراد و اصرار کی کیفیت و منازعت کی تفصیل بیان کی ہے۔ جب منصور نے بغداد کی بنیاد ڈال کر اسکو آباد کیا اور کوفہ سے ہٹا کر دارالخلافہ وہاں قرار دیا جاتا تو اینٹ اور روڑے کا شمار آپ کے ذمہ کیا گیا۔ آپ نے (نرکل) کا ایک پیمانہ بنا لیا اور جس قدر سامان آتا گیا اُسی کے اندازے سے معلوم کرتے گئے۔ یہ طریقہ شمار آپ ہی کا اختراع ہے۔ آپ سے پیشتر کسی کا ذہن وہاں تک نہیں پہنچا تھا۔ جب مشرقی بغداد کی تعمیر و رونق دہی پر ولی عہد سلطنت مہدی کی توجہ ہوئی تو اُس نے ایک عظیم الشان مسجد وہاں بنوائی

پھر ایک دوسرے موقع پر فرماتے ہیں ؎

لو ان المرتضیٰ ابدیٰ محله   لصار الناس طراً سجداً له
کفیٰ فی فضل مولانا علیٍّ   وقوع الشک فیه انه اللّٰه

مسجد رصافہ" نام رکھا۔ امام ابوحنیفہ کو بلایا اور بجانب رصافہ کی قضا پیش کی۔ آپ نے انکار فرمایا۔ مہدی نے کہا قبول نہ کرو گے تو تازیانہ پھر سے سختی دبایا۔ بیچارہ ناچار منظور کر لیا۔ دو روز مجلس قضا میں نشست فرمائی۔ کوئی فریادی نہیں آیا۔ تیسرے دن ایک صفار رکابی گر مدعی بن آیا۔ امام نے معاملہ کو سنے۔ دو فریقین کے بیان و عذر کو سماعت فرمانے کے بعد دعویٰ اپنے پاس سے ادا کر دیا۔ دو روز بعد بیمار ہوئے۔ اپنے فرزند حمّادؒ کو بلا کر وصیتیں کیں اور فرمایا کہ میری وفات کے بعد یہ مدرہ (تھیلی) لے جا کر حسن بن قحطبہ کو دے دینا اور کہنا کہ تمہاری یہ امانت ابوحنیفہ کے پاس تھی (اس کا ذکر اوپر آچکا ہے) چند دن بعد دنیائے دنی سے رخصت ہوئے۔ حماد نے وصیت کی تعمیل کی اور مال لے جا کر حسن کے سپرد کیا۔ حسن نے کہا کہ خدا ابوحنیفہ پر رحمت کرے جو اپنے دین میں اتنے پکے تھے۔

امام کی کیفیت وفات اور ماہ و سال میں مورخین کا اختلاف ہے۔ بعض روز شنبہ ۴ شعبان (۵ ستمبر) اور اکثر ۱۴ رجب سنہ ۱۵۰ھ (۱۴ اگست ۷۶۷ء) لکھتے ہیں بعض لکھتے ہیں کہ جس روز ابوحنیفہ نے دوسرے عالم میں قدم رکھا تھا اسی روز امام شافعی بطن مادر سے برآمد ہوئے تھے۔ ابن الاعرابی محمد بن زیاد الکوفی نے خود ثعلب سے کہا تھا کہ ابوحنیفہ نے جس سرائے باقی کا رخ فرمایا ہے اسی شب میں میں نے دار فانی میں قدم رکھا تھا۔ مروج الذہب میں امام مسعودی لکھتے ہیں کہ ابوحنیفہ نے سجدۂ نماز میں رحلت کی ستر سال کی عمر تھی۔ صاحب تذکرۃ الاولیا ناقل ہے کہ بایں عمر ابو منصور کے حکم سے محبوس تھے اسی حالت قید میں وفات پائی۔ تاریخ یافعی میں تحریر ہے کہ ابراہیم بن عبد اللہ بن امام حسین رضی اللہ عنہم سے امام ابوحنیفہ کو اتفاق تھا اور منصور سے اختلاف۔ اس نے زہر دلا دیا تھا۔

مورخین کا اجماع ہے کہ آپ کو مقبرۃ الخیزران (خیزران زوجہ کبیر مہدی بن جعفر منصور۔ مادر خلیفہ ہادی و ہارون) کے مقبرہ کی شرقی جانب سپرد خاک کیا گیا۔ بعدہٗ سنہ ۴۵۹ھ (۱۰۶۶ء) میں شرف الملک ابو سعد محمد بن منصور الخوارزمی نے کہ سلطان جلال الدین ملک شاہ سلجوقی کا مستوفی (محاسب اعلیٰ) تھا، بغداد جدید میں مرقد ابوحنیفہ کی بنیاد ڈالی۔ ایک بلند و عالی روضہ اور اس پر قبہ تعمیر کیا۔ اس کے پہلو میں مدرسہ بنایا تاکہ آپ کے متبعین و پیرو وہاں سکونت و قیام کر سکیں آرام پائیں۔ جب تعمیر ختم ہوئی تو اس مشہد و مدرسہ

امام ابوبکر بیہقی نے ایک کتاب مناقب شافعی میں تالیف کی ہے اُس میں امام صاحب کے یہ شعر بھی نقل کئے ہیں ؎

کے دیکھنے کے لئے اعیان واکابر کی ایک جماعت کے ساتھ، وہاں پہونچا۔ شریف ابوجعفر مسعود جو بیاضی شاعر کے نام سے معروف ہے۔ اتفاقاً آگیا اور یہ شعر پڑھے ؎

اَلَمْ تَرَاَنَّ الْعِلْمَ کَانَ مُبَدَّدًا ٭ فَجَمَعَهُ هٰذَا الْمُغَیَّبُ فِی اللَّحْدِ
کَذَالِکَ کَانَتْ هٰذِهِ الْاَرْضُ مَیْتَةً ٭ فَاَنْشَرَهَا فِعْلُ الْحَمِیْدِ اَبِیْ سَعْدِ

"کچھ جانتے ہو کہ علوم کا شیرازہ متفرق و برہم تھا۔ انواع فضائل منتشر و پراگندہ تھے۔ لیکن اس ہمت ور نے جو اس وقت گور میں ہے ان سب کو منتظم و مجتمع کیا۔ اسی طرح یہ زمین بھی اراضیات مردہ میں شمار ہوتی تھی، ابوسعد کے وجود باجود سے آباد و معمور ہوگئی"

ابوسعد کو یہ دونوں شعر بہت پسند آئے اور انعام فراوان دیا۔ بعض تواریخ میں نظر سے گزرا ہے کہ مشہد ابوحنیفہ کا بانی سلطان الپ ارسلان (۴۵۵ھ تا ۴۶۵ھ) پدر ملک شاہ سلجوقی تھا۔ ان اقوال میں بالکید گر چندان منافات و تعارض نہیں۔ ممکن ہے کہ خود سلطان بانی ہو اور ابوسعد منتظم و مہتمم۔ زمانہ کا دستور ہے کہ کارکنان سلطنت منصرم و نگران امور ہوتے ہیں اور شہرت بادشاہوں کے نام سے ہوتی ہے۔

۵۱۴ امام محمد بن ادریس شافعی قرشی، کنیت ابوعبداللہ تھی ائمہ اربعہ مجتہدین سے ہیں۔ اپنی نسبت فرماتے تھے کہ "میں غزہ میں سنہ ۱۵۰ھ (۷۶۷ء) میں پیدا ہوا۔ دو سال کا بچہ تھا کہ مجھے مکہ معظمہ میں لے آئے۔ میری ماں ازد (ایک یمنی) قبیلہ سے تھی" غزہ جہاں حضرت ہاشم جد نبی صلعم کی قبر ہے بیت المقدس سے تین منزل ہے۔ دوسری روایت خود سیدنا امام سے یہ ہے کہ "میں عسقلان میں پیدا ہوا عسقلان غزہ سے تین فرسخ ہے" دونوں مقام فلسطین (شام) میں ہیں۔ مورخین کا اتفاق ہے کہ جس روز امام اعظم ابوحنیفہ سنہ ۱۵۰ھ میں داخل جوار قدس ہوئے ہیں اُسی روز امام شافعی نے اس عالم آب و گل میں قدم رکھا تھا۔

حسن بن محمد الزعفرانی لکھتے ہیں کہ امام شافعی نے اٹھاون سال کی عمر میں رحلت فرمائی لیکن صحیح یہ ہے کہ آپ کی وفات مامون عباسی کے عہد خلافت میں سلخ رجب سنہ ۲۰۴ھ (۲۰ جنوری سنہ ۸۲۰ء) کو بروز جمعہ چوّن برس کی عمر میں ہوئی۔ مصر کے قرافہ صغرے میں عربی الخندق کے مقابہ قریش میں دفن ہوئے۔

آپ عبدالمطلب (جد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کی اولاد سے تھے۔ اسی مناسبت سے آپ امام المطلبی الحجی کہلاتے ہیں دوسرا لقب عارف باللہ ہے۔ شافعی منسوب بہ شافعہ ہے جو آپ کے اجداد میں تھے۔

اذا فی مجلس تذکر علیًا — وسبطیہ وفاطمۃ الزکیہ
یقول تجاوزوا یا قوم ھذا — فھذا من حدیث الرافضہ
برئت الی المھیمن من اناس — یرون الرفض حب الفاطمیہ

امام شافعی نے یمن میں طالبعلمی کی۔ فنون شعر ونحو وغریب کو وہاں سیکھا۔ چودہ برس کے تھے کہ مدینہ طیبہ میں امام مالک بن انس کی خدمت میں پہونچے آٹھ ماہ رہے اور احادیث کو یاد کیا۔ وہاں کے مشائخ اور علماء فقہا اور حفاظ و رواۃ کی زیارت کی اور استفادہ و استفاضہ فرمایا۔ عراق میں حضرت محمد بن الحسنؒ کے پاس دوسال رہے اور پھر مدینہ منورہ چلے آئے۔ وہاں سے مکہ مکرمہ سید المسلمین ابوداؤد کے حضور میں پہونچے۔ موطا صرف نوشب میں یاد کرلیا تھا۔

دانائی و فراست میں یگانۂ زمانہ تھے۔ ایک واقعہ مفتاح التواریخ میں مذکور ہے" امام احمد حنبل کے مذہب کے مطابق جو شخص عمداً نماز ترک کرے کافر ہوجاتا ہے۔ امام شافعی کے نزدیک نہیں ہوتا لیکن اسپر عذاب کیا جاتا ہے۔ امام شافعی نے امام احمد سے پوچھا کہ جب کسی نے نماز ادا کی تو کافر ہوگیا۔ پھر کیا کرے کہ مسلمان ہوجائے فرمایا کہ نماز پڑھے۔ شافعی نے پوچھا کہ کافر کی نماز کیونکر درست ہوگی؟ امام حنبل خاموش رہ گئے" امام احمد فرماتے تھے کہ "علم کے لئے شافعی کا وجود ایسا ہے جیسے دنیا کے لئے آفتاب کا یا انسان کے واسطے صحت کا۔"

اسحق بن راھویہ کا امام شافعی سے مناظرہ یادگار ہے۔ جسکو حاکم نے اپنی تاریخ نیشاپور میں اور آبری نے کتاب "مناقب الشافعی" میں تحریر کیا ہے۔ طویل ہے۔ ان مختصر حواشی میں نقل کرنے کی گنجائش کہاں۔

ایک دلچسپ سبق البتہ یاد رکھنے کے لائق ہے۔ جس روز شافعی امام مالک بن انس کے یہاں مدینہ پہونچے اور مالک نے شافعی کے ناصیۂ اقبال سے صلاح و سداد کے آثار نمایاں پائے تو اپنا مہمان بنایا اور خود کھانا لے کر آئے اور انکے سامنے رکھا۔ غلام آفتابہ لیکر بڑھا تاکہ ضیف عزیز کے ہاتھ دھلائے۔ مالک نے لوٹکا اور فرمایا کہ اے خدا کے بندے کھانا شروع کرنے سے پہلے میزبان کے ہاتھ دھولانا چاہئے اور بعد طعام مہمان کے۔ ہونہار طالبعلم نے وجہ دریافت کی۔ استاد محترم نے فرمایا کہ میزبان نے مہمان کو بلایا ہے اسلئے اسکو خود پہلے ہاتھ دھونا چاہئے تاکہ مہمان کو حیا یا لحاظ دامنگیر نہ ہو۔ بعد طعام مہمان کے ہاتھ پہلے دھولانے میں مصلحت یہ ہے کہ میزبان سب سے آخر ہے اور تمام مہمان میزبان کے ہاتھ دھونے تک کشمکش نہ ہوں۔

اہل بیت اطہار سے بڑی محبت تھی۔ منقبت میں بہت سے اشعار لکھے ہیں جن سے خلوص و عقیدت ٹپک رہی ہے بڑے شاعر تھے۔ تصانیف کی تعداد ایک سو چالیس تک پہونچی ہے۔ جن میں مختصر و مطول

احتراز کی چیز منافسہ و منافسہ ہے۔ اس سے اجتناب لازم ہے۔ عارف[۱۷۵] روم قدس سرہ اسی کے لیے سرزنش فرماتے ہیں ؎

بہر حق کے بر تو گردد منجلی   تو گرفتار ابوبکر و علی

ہر قسم کی کتابیں داخل ہیں۔ بتفصیل معجم الادبا میں ملے گی بعض کتابیں سات سات جلد کی ہیں۔

۱۷۵ مولانا جلال الدین محمد البلخی الصدیقی الرومی، صاحب مثنوی مولوی رومی آپ کی ولادت قبۃ الاسلام شہر بلخ میں ۶ ربیع الاول ۶۰۴ھ (۳۰ ستمبر ۱۲۰۷ء) کو ہوئی۔ پانچ سال کی عمر میں الہامات غیبی ہونے لگے اور اشراقات منورہ سے آپ کو بہرہ مند کر دیا۔ اتفاقاً یہ عالم تھا کہ چھ سال کے سن میں تین چار دن بعد ایک روز افطار کرتے تھے۔ آخرکار اس فقر و مسکنت نے دولت عرفان سے مالامال کر دیا اور اکابر اہل ذوق و وجدان میں داخل۔ آپ کے والد مولانا بہاء الدین ولد نے جو بڑے عالم و عارف تھے جب ۶۲۸ھ (۱۲۳۱ء) میں رحلت فرمائی تو سلطان علاء الدین سلجوقی نے مع تمام امرا و سپاہ ملک و روسا بلاد و امصار کے مجتمع ہوکر مولانا جلال الدین کو باپ کی جگہ پر بٹھا دیا۔ مولانا بہاء الدین کے خلیفہ سید برہان الدین محقق ترمذی تھے۔ مولانا جلال الدین انھیں سید برہان الدین کے مرید تھے۔ نو سال انکی خدمت میں بسر کئے۔ انکی وفات کے پانچ سال بعد شیخ شمس الدین محمد تبریزی کی صحبت میں پہونچے۔ جب حضرت شمس بھی راہی ملک بقا ہوئے تو انھوں نے شیخ فریدوں صلاح الدین زرکوب کی ملازمت اختیار کی اور انکے بعد اپنے رفیق و مرید خاص حسام الدین چلپی قونوی کے ساتھ اپنی عمر کاٹ دی اور اس مرتبہ پر پہونچا دیا جو معلوم و مشہور ہے۔ زیارت مکہ معظمہ کے سفر میں شیخ فرید الدین عطار نیشاپوری کا شرف صحبت بھی حاصل ہو گیا تھا۔ شیخ مرحوم اسوقت شیخ ہرم تھے اور مولانا طفل و صغیر سن۔

علوم ظاہری و باطنی میں وحید عصر و یگانہ دہر تھے۔ آپ کے حلقہ درس میں چار سو طالبعلم جمع ہوتے اور ہر ایک اپنے ذوق و استعداد کے بقدر آپ سے استفاضہ فیض کرتا۔ شیخ علاء الدولہ سمنانی رسالہ اقبالیہ میں لکھتے ہیں کہ باوجود ان تمام مراتب و مدارج اور قبولیت عام کے حالت یہ تھی کہ حضرت مولوی اپنے خادم سے ہمیشہ سوال کرتے کہ ہمارے گھر میں کوئی چیز موجود تو نہیں ہے۔ اگر وہ کہہ دیتا کہ خیر سے کچھ نہیں ہے تو نہایت خوش اور منبسط ہو جاتے اور شکر کرتے کہ الحمد للہ ہمارا گھر پیغمبر اور اہل بیت کے گھروں سے مشابہ ہے اور اگر جواب ملتا کہ اسباب مطبخ مہیا ہے تو منفعل ہوتے اور فرماتے "کہ اس گھر سے خانہ فرعون کی سی بو آتی ہے۔" مرحبا بشعار الصالحین۔

مولانائے روم پر منحصر نہین خود اخلین اکابر اسلام و ائمہ کرام علیہم السلام کے مآثر و ارشادات کو دیکھ لیجئے۔

شیخ نورالدین بن علی بن محمد بن الصباغ المالکی المکی (متوفی ۸۵۵ھ) نے فصول مہمہ مین اولاد ائمہ کے احوال تحریر فرمائے ہین۔ لکھتے ہین کہ حضرت علی مرتضیٰ کرم اللہ وجہہ کے حضور مین اہل عراق سے بعض اشخاص آئے اور خلفائے ثلثہ رضی اللہ عنہم کے حق مین کچھ کہنے لگے حضرت سنتے رہے جب وہ لوگ کہہ چکے تو دریافت فرمایا کہ تم کون لوگ ہو۔ کیا مہاجرین اولین سے ہو جن کی شان مین اَلَّذِيْنَ اُخْرِجُوْا مِنْ دِيَارِهِمْ وَاَمْوَالِهِمْ يَبْتَغُوْنَ فَضْلًا مِّنَ اللّٰهِ وَرِضْوَانًا وَّ يَنْصُرُوْنَ اللّٰهَ وَرَسُوْلَهٗ ۚ اُولٰٓئِكَ هُمُ الصّٰدِقُوْنَ (جو اپنے گھر اور مال سے بیدخل کر دیئے گئے۔ خدا کے فضل اور خوشنودی کی طلبگاری مین لگے ہین اور خدا اور اُسکے رسول کی مدد کو کھڑے ہو جاتے ہین یہی تو سچے ہین۔ جز ۲۸ سورۃ الحشر ع ۱-۱ آیا ہے) کہا کہ "نہین" پھر پوچھا کیا تم وہ لوگ ہو۔ اَلَّذِيْنَ تَبَوَّءُو الدَّارَ وَالْاِيْمَانَ مِنْ قَبْلِهِمْ يُحِبُّوْنَ مَنْ هَاجَرَ اِلَيْهِمْ وَلَا يَجِدُوْنَ فِيْ صُدُوْرِهِمْ حَاجَةً مِّمَّآ اُوْتُوْا وَيُؤْثِرُوْنَ عَلٰٓى اَنْفُسِهِمْ وَلَوْ كَانَ بِهِمْ خَصَاصَةٌ (وہ مال انکا بھی حق ہے کہ ان سے پہلے مدینے مین رہتے اور اسلام

سلطان اباقاآن عرف القاخان ولد ہلاکو خان بادشاہ ایران کے عہد مین اُنہتر [۶۹] سال کی عمر مین وقت غروب آفتاب ۵ جمادی الآخرہ ۶۷۲ھ (۱۶ دسمبر ۱۲۷۳ع) کو وفات پائی۔ نورالله مرقدہ تاریخ رحلت ہے۔ مرقد مبارک اپنی خانقاہ واقع شہر قونیہ ملک روم مین ہے آپ کے انتقال کے بعد آپکے خلف الصدق بہاءالدین محمد معروف بہ سلطان ولد جانشین ہوئے۔ کتاب ولدنامہ اُنکی یادگار ہے۔

مولانا کے حالات، تواریخ ہفت اقلیم، خلاصۃ المناقب و مرآۃ الخیال و مجالس المومنین، تذکرۂ دولت شاہ سمرقندی اور رسالہ فریدون سپہ سالار مین مذکور ہین۔

مولانا نے اپنے آثار شریفہ مین ایک دیوان تیس [۳۰] ہزار شعر کا اور مشہور مثنوی سینتالیس ہزار شعر کی چھوڑی ہے۔ درویشان روم کا مشہور فرقہ (مولوی) نام آپ ہی سے منسوب ہے۔

مین داخل ہو چکے ہین جو اُنکی طرف ہجرت کرکے آتا ہے اُس سے محبت کرنے لگتے ہین اور مال (مہاجرین) کو جو دیا جاتا ہے اُسکی وجہ سے یہ اپنے دل مین کوئی طلب نہین پاتے اور اپنے اوپر تنگی ہی کیون نہ ہو اپنے سے مقدم رکھتے ہین۔ (جزو ۲۸ سورۃ الحشر ع ۴-۱)] جن کی نسبت نازل ہوا ہے"۔ عرض کیا "ہمین بھی نہین" فرمایا "تو پھر کیا تم وہ لوگ نہین ہو جو احد الفریقین (ان مین سے کوئی فریق بھی) ہونے سے بیزار ہین۔ مین گواہی دیتا ہون کہ تم لوگ اس فرمان خداوندی کے مصداق نہین ہو والذین جاءو من بعدھم یقولون ربنا اغفر لنا ولاخواننا الذین سبقونا بالایمان ولا تجعل فی قلوبنا غلا للذین آمنوا [اور اُنکا ہے جو مہاجرین اولین کے بعد آئے، دعائین مانگا کرتے ہین کہ اے ہمارے پروردگار ہمارے اور ہمارے بھائیون کے گناہ معاف کر جو ہم سے پہلے ایمان لا چکے ہین اور ایسا کر کہ جو لوگ ایمان لا چکے ہین اُن کی طرف سے ہمارے دلون مین کسی طرح کا کینہ نہ آنے پائے (جزو ۲۸۔ سورۃ الحشر ع ۵-۲)] ہٹو۔ میرے پاس سے چلے جاؤ"۔

شریف ابو نمی نے مفتی الحرمین محب طبری ؒ سے کھا کہ تم نے ابوبکر کو علی پر باوجود اُنکی مسلمہ غزارت علمی و قرب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے کیون مقدم رکھا۔ جواب دیا کہ "مین نے خود اپنی رائے سے ابوبکر کو مقدم نہین کیا اور نہ اس بارہ مین مجکو اختیار ہے تمھارے جد امجد رسول اکرم نے فرمایا ہے سدوا کل خوخۃ فی المسجد الا خوخۃ ابی بکر اور فرمایا تھا مروا ابابکر فلیصل بالناس یہ حدیثین ہم تک بسند صحیح پہونچی ہین۔ یہ بھی یاد ہے کہ جب آنحضرت نے جوار قدس کا قصد فرمایا تو صحابہ نے کھا تھا من رضیہ رسول اللہ صلے اللہ علیہ وآلہ وسلم لدیننا رضیناہ لدنیانا"۔

ابوالفرج عبدالرحمان بن علی الجوزی کتاب صفوۃ الصفوۃ مین عروہ بن عبداللہ سے نقل کرتے ہین کہ مین نے سیدنا محمد باقر بن زین العابدین سے حلیہ سیف کی نسبت دریافت کیا۔ فرمایا کہ "کچھ باس نہین ہے۔ ابوبکر صدیق نے اپنی تلوار کو محلے کیا تھا" مین نے ٹوکا۔ آپ بھی صدیق کہتے ہین؟

جست فرما کر رو بہ قبلہ ہو گئے اور کہا نعم الصدیق۔ نعم الصدیق فمن لم یقل الصدیق فلا صدق اللہ لہ قولا فی الدنیا ولا فی الآخرۃ

شعرانی فرماتے ہیں ان ابو احب علیا ان یحب اصحاب رسول اللہ صلعم تبعا لحب رسول اللہ صلعم و حب اولادھم لکن الا لحب رسول اللہ صلعم الا بحکم الطبع و نقدم اولاد فاطمہ علی اولاد ابی بکر الصدیق کما کان ابو بکر یقدمہم علی اولادہ عملا بحدیث لا یؤمن احدکم حتی اکون احب الیہ من اہلہ و ولدہ والناس

ایک جلیل القدر صحابی ابو بکر بن عیاش کہتے ہیں کہ "اگر میرے پاس ابو بکرؓ و عمرؓ و علیؓ کسی کام کے لئے آتے تو میں پہلے علیؓ کا کام کر دیتا تھا۔ اس لئے کہ ان کو آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم سے قرب ہے۔ اور اگر میں آسمان سے زمین پر گروں تو یہ مجھکو زیادہ پسند ہے اس سے کہ میں علےؓ کو اُن پر مقدم کروں"

خود حضرت ابو بکرؓ فرمایا کرتے تھے صلۃ قرابۃ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم احب الی من صلۃ قرابتی

سرور دو عالم صلعم کی یہ حدیث ابو سعید خدری نے مرفوعاً روایت کی ہے لو کنت متخذا خلیلا غیر ربی لاتخذت ابابکر خلیلا۔ اور جو متفق علیہ ہے۔

علامہ حسین الجسر صاحب حمیدیہ جو آئمہ حاضرہ میں تمام ممالک روم و شام میں علوم دینیہ و عقلیہ کے استاد کامل تسلیم کئے گئے ہیں فرماتے ہیں ؎

من طالع التاریخ مع انہ لم یتمسک باعتقاد مسلم
اصبح سنیا ۔ و لا اقل یخرج عن نہج الہدی المستقیم

اسی ذیل میں سید رشید رضا منشی المنار جنکے علم و فضل اور تفقہ و تدین کا سکہ عربی دان اور عربی خوان طبقوں میں مدت سے چل رہا ہے لکھتے ہیں۔ کہ "اہل ہوا" اور وہ لوگ جن کو حقیقت اسلام اور اُسکی نشاۃ سے آگاہی نہیں ہے اور جن کا علم محض چند مؤرخین کے اقوال پر منحصر اور مستنبط ہے

اس بارہ مین مضطرب ہین۔ وہ گروہ جو صحیح کو ضعیف سے اور حق کو باطل سے تمیز کرسکتا ہو محض حفّاظ محدّثین کا ہے جماعۃ اوّل کے لوگ علم و خبرت کی کمی کی وجہ سے، کوئی تو نواصب خوارج کی طرف مائل ہوجاتے ہین اور کوئی علاوہ شیعہ کو ترجیح دیتے ہین اکثر ممالک اسلامی مین مذاہب سُنّت کے پیرو زیادہ پائے جاتے ہین جن کو تعظیم آل بیت مین غلو ہے۔ بااین ہمہ بعض ناصبی بھی ہین جو بنی اُمیّہ کو علویین پر فضیلت دیتے ہین اور جن کا زعم یہ ہے کہ بنی اُمیہ نے اسلام کو عزت دی اور دین کو قائم کیا تھا۔ حالانکہ اہل تحقیق کا فتوے ہے کہ انکے عہد مین جو کثیر امصار و بلاد مین مسلمانون کو فتح ہوئی اور جو ان کی حسنات عظیمہ مین شمار کی جاتی ہے اسکے لئے یہ خاندان کسی تحسین و آفرین کا مستحق نہین ہے۔ اسلام کی طبیعت اسی کی مقتضی تھی، جو اصلاح اور نوع بشر کو بچانے اور راہ راست پر لانے کے لئے آیا تھا حضرت عمر بن عبد العزیز کے سوائے ان مین ایک فرمانروا بھی ایسا نہین گذرا جسنے کوئی عمل محض اقامۃ دین کی نیت و خاطر سے کیا ہو۔"

حُسنِ سلوک

میر عبد الجلیل نے اپنے نامور و بلند ہمت اجداد کی سیرت حسنہ مین حصہ وافر پایا تھا۔ بلگرام مین اُن کا دیوانخانہ و مطبخ علماء و مشائخ اور طلباء و درویشون کے لئے ہر وقت کھلا رہتا تھا صادر و وارد خانہ بے تکلف سمجھ کر آتے اور اُن کے خوان کرم سے مستفیض ہوتے تھے یہی

۱۸۶ھ اس دیوان خانہ کی شان و شوکت اور رونق و زینت دیکھنے والی آنکھین ابھی بہت سی موجود ہین اگرچہ یہ پاکیزہ عمارت صفحہ زمین پر باقی نہین ہے۔ پہلے میر عبد الجلیل کے آبائی مکان اسکونت غیر آباد ہوکر رفتہ رفتہ مسمار و منہدم ہوتے رہے۔ سامان عمارت فروخت ہوتا گیا خالی زمین پر نشانات موجود تھی زراعت نے ان کو بھی مٹا دیا۔ بالآخر دیوانخانہ بھی میر صاحب کے اعقاب کے ہاتھ سو عرض بیع مین آگیا عرصہ تک ایک بیٹے کے قبضہ مین رہا وہ سامان تجارت رکھتا اور غلّہ اور آلو بھرتا رہا۔ گردش لیل و نہار سے یہ حالت بھی تاہم رہی دیوان خانہ قائم رہا ایک غافل کمیت مقدار مسلمان نے خرید کیا۔ عمارت کھدوا ڈالی مٹین فروخت کرلیں۔ اب اس زمین پر بستا کو بوما جاتا ہے اور جلیل بلگرامی کی روح جلال رومی کی زبان سے نواسنج ہے ؎

متبرک مقام تھا جہاں تیس سال تک میر طفیل محمد نے شریعت و طریقت کا سبق دیا تھا اور مدتہائے دراز تک علم و فضل کی شمع جہاں روشن رہی تھی سلطان ابو سعید اور سید سلطان مقصود بزرگان کالپی بلگرام آتے تو یہیں قیام فرماتے تھے۔ حاجی صفت اللہ خیرآبادی جب ۱۱۳۲ھ (۲۰-۱۷۱۹ء) میں بلگرام آئے تو خود تکلیف فرمائی اور دیوان خانہ میں آکر میر عبد الجلیل سے ملاقات کی تھی۔ شاہزادہ عظیم الشان کا ہم لقب میر محمد رضا اسی میں فروکش ہوا تھا۔

ضعفا و غربا کی لڑکیاں جن کے والدین کو تزویج کی استطاعت نہ ہوتی اُن کی حیثیت و درجے کے مطابق نقد و جنس سے سامان کرا کے کدخدا کرائی جاتی تھیں۔ میر محمد یوسف اسی دست عطا اور نوال عام کی ستائش میں فرماتے ہیں ؎

بالاہ الذی حلت مناقبہ	جد سیان محمد دارس الرسم
اعطاہ رب الوری فی کفہ توسعۃ	وزادہ بسطۃ فی العلم والجسم

دار الخلافہ میں جہاں میر صاحب کا قیام خود مسافرانہ اور محض بے اطمینانی کا تھا اُنکے مائدہ نعمت پر اُن کے اہل وطن اور اہل حاجت کا ہجوم رہتا اور یہ باہمہ پریشانی و بے سروسامانی بقدر وسعت و استطاعت ہر ایک کی خدمت کرتے۔ سندھ میں تو اُن کو قابلیتاً ہر قسم کی آسایش اور فراغت خاطر میسّر تھی وہاں مہمانی و میزبانی محاظ مدارات میں کوئی دقیقہ کیسے فروگذاشت ہو سکتا تھا اُمرائے عالیشان بھی اُدھر سے گذرتے تو اُن کی دعوت و ضیافت اُن کی شان و رتبت کے موافق کی جاتی تھی۔ جب سلطان اورنگ زیب نے شہزادہ محمد معز الدین بن شاہ عالم کو صوبہ داری ملتان پر ۱۱۰۸ھ مامور کیا

بعد از وفات تربت ما در زمین مجوے | در سینہ ہائے مردم عارف مزار ماست

۱۹۱۷ء اس زمانہ میں اہل بلگرام کی ہر طرف قدر تھی جن ایام میں کہ میر صاحب بوجہ بیکاری یا بسلسلہ امیدواری شاہجہان آباد میں مقیم تھے۔ اُن کے بعض اہل وطن تلاش معاش میں دہلی پہونچے۔ حق وطن اور قرابت کے لحاظ سے میر سید محمد نے بھی اپنے والد کو لکھ دیا تھا اور سعی و سفارش کی التجا کی تھی۔ میر صاحب جواباً لکھتے ہیں کہ "صاحبزادے یہ تو خود ہی خوش نصیب و طالع مند تھے۔ جیسے ہی پہونچے میر جملہ کی سرکار میں نوکر ہو گئے۔ رسوخ یحج

توحسن علی خان کو بمرکاب جانے کی دستوری دی۔ اتفاق سے موافقت مزاج نہ ہوئی اور حسن علی لاہور کو آزردہ خاطر لوٹے۔ اُس زمانہ مین میر عبدالجلیل کا قیام بھکّر و سیوستان مین تھا حسن علی خان نے جب نواحی بھکّر سے ہوکر لاہور جانے کا قصد کیا تو میر صاحب نے اُن کے

کو آتے ۱۳ تاریخ کو نوکری مل گئی سید یار علی اور سید محمد باقر کو ڈیڑھ ڈیڑھ سو روپیہ ماہوار اور سید امام علی کو اکیسو چالیس روپیہ درماہہ کی"

۱۸۵؎ مُلتان عہد عالمگیر مین ایک صوبہ تھا۔ ایک سرکار تھی۔ یہان کے حسنتی قلعہ کا صاحب خلاصۃ التواریخ اور دیگر جغرافیہ نگاران نے خاص طور پر ذکر کیا ہے۔ مُرور زمانہ سے اب وہ ایک قسمت ڈسٹرکٹ کا صدر مقام رکھیا ہے جس کا کمشنر موسم گرما مین فورٹ منرو مین رہتا ہے۔

خاص شہر کی آبادی ۱۹۱۱ء میں ۸۷،۳۹۴ تھی جو ۱۹۲۱ء میں ۸۴۸۰۶ رہ گئی

اس قطعہ مُلک مین جنگل و بیابان زیادہ ہین قدرتاً جانوران وحشی وغیرہ مثلاً نیل گائے اور ہرن زیادہ ہوتے ہیں۔ آم بھی اچھا ہوتا ہے

ملتان کی خاک اور گرمی ضرب المثل ہوگئی ہے۔ موسم گرما عرصہ تک رہتا ہے۔ حرارت مین ملتان جیکب آباد سے صرف ایک یا دو دقیقہ کم ہے۔ ایسی شدید گرمی سارے ہندوستان مین کسی مقام پر نہین پڑتی مجموعی طور پر آب وہوا ایسی خراب نہین ہے جیسی شہرت پاگئی ہے۔ پنجاب کے دیگر مقامات کی طرح یہان کی شب بھی خوشگوار ہوتی ہے۔

ملتان کی قدامت بہودبہت بتاتے ہین۔ مشہور سیّاح اور مورخین مین سے ہیکاٹیس Hecataeus ہیروڈوٹس Herodotus اور ٹالمی Ptolemy کے سفرناموں مین اور سکندر مقدونی کے حملہ و محاربات کے سلسلہ مین ملتان کا نام بھی آتا ہے۔ دسوین صدی مسیحی یعنی ۹۱۵-۱۶ء (۳۰۳ھ) مین مشہور جغرافیہ نویس مسعودی بغدادی اس طرف سے گزرا تھا لکھتا ہے کہ ملتان مین ایک لاکھ بیس ہزار نُور وسے ہین۔

ساتوین صدی عیسوی مین ملتان بادشاہی سندھ کے ایک اہم صوبہ کا دارالصدر تھا۔ یہان کا سبدہ راجہ "رائے" کہلاتا تھا۔ ۶۳۱ء مین اس کا خاتمہ ہوا ۶۴۱ء مین برہمون کے عہد مین مشہور بودھ زائر ہیون تسانگ چینی کا یہان بھی گذر ہوا تھا۔ ۴۳ھ (۶۶۴ء) مین اہل عرب بڑھتے ہوئے یہان تک

ساتھ نہایت پسندیدہ سلوک اور شایان شان برتاؤ کیا تھا۔ سادات کیساتھ رسم و ربط کی ابتدا یہیں سے ہوئی

مُواسات و غمخواری

اہل وطن سے کوئی دہلی آتا تو سلسلۂ ملازمت ہو جانے تک اُس کا خرچ روزمرہ اور مہمانداری بلکہ دوا و معالجہ بھی میر عبدالجلیل کے ذمہ ہوتا۔ ایک خط میں میر سید محمد کو لکھتے ہیں کہ "میر کرم اللہ دہلی آئے ہیں اُن کی داہنی آنکھ میں پندرہ دن سے درد ہے۔ رات میں آرام ملتا ہے نہ دن میں آنکھ

چلے آئے اور محمد بن قاسم ثقفی نے خلفائے اسلام کے نام پر حکومت قائم کی۔ تین صدی تک ملتان اسلام اور اہل اسلام کا مضبوط اور محفوظ مورچہ سا رہا تھا کہ غزنوی خاندان ہندوستان پر حملہ آور ہوا۔ ۲۵۲ھ (۸۶۷ء) میں رہا یہ سندھ کا تشیسی وادی یعقوب بن لیث کے قبضہ میں تھا۔ بعد ازاں یہاں دو آزاد سلطنتیں قائم ہوگئیں ایک منصورہ میں، دوسری ملتان میں ۳۰۰ھ (۹۱۲ء) میں قرامطہ نے ملتان پر قبضہ کر کے فاعنہ لودی کے حوالہ کر دیا ۳۹۶ھ (۱۰۰۵ء) میں محمود غزنوی قابض ہوا۔ تین صدی مابعد یعنی مغولیوں کے دستبرد و حملہ تک ملتان کی تاریخ صاف و پاک نظر آتی ہے ۹۳۴ھ (۱۵۲۸ء) میں پورے امن و خیر کے ساتھ بابر کا تسلط ہوگیا اور باوجود متعدد شورشوں اور جدال و قتال کے کچھ مدت تک قائم رہا بہرحال ملتان اُسی وقت سے دہلی کے تخت میں ہوگیا ۶۵۵ھ (۱۲۵۷ء) میں افواج مغول نے یہاں جو خون بہادی تھی مگر حضرت شیخ بہاء الدین زکریا (معروف بہا الحق) مشہور ولی و مخدوم نے خون بہادے کر ملتان کو بچالیا اور کشت و خون کرنے والوں کو ٹالا۔

سلاطین چغتائیہ کے عہد میں ملتان برابر مصئون و مامون رہا۔ اُس زمانہ میں صوبہ ملتان میں کل جنوبی و مغربی پنجاب داخل تھا کبھی کبھی سندھ بھی شامل کر لیا جاتا تھا جب مغلوں کی قوت رو بہ زوال تھی تب بھی ملتان اُن کے تابع فرمان بنا رہا۔ ۱۱۶۲ھ (۱۷۴۸ء) میں ملتان کے قریب میر سون صوبہ دار پنجاب کے نائب کوڑامل اور شاہ نواز سے معرکہ ہوا شاہ نواز کو یہ صوبہ محمد شاہ نے عنایت کیا تھا۔ کوڑامل نے شکست پائی۔ احمد شاہ دُرّانی کے وقت سے ملتان بادشاہان کابل کے زیر نگین ہوگیا۔ اخیر انقلاب ۱۸۴۹ء کا نتیجہ سرکار انگریزی کی حکومت و فرمانروائی تھی۔

ملتان سے ساحل بحر یا کراچی کا فاصلہ ۵۷۶ میل ہے۔ شہر پناہ قائم ہے

یہاں کے مقامات مقدسہ میں مزارات مخدوم بہاؤالدین زکریا (متوفی ۲ صفر ۶۶۵ھ) قلعہ پر۔ شیخ صدرالدین مخدوم (متوفی ۷۰۹ھ) شیخ رکن الدین قریشی (قلعہ پر) اور سید زین العابدین بد سلطان سرور کے مشہور ہیں اور رنگ زیب کی تعمیر کردہ جامع مسجد کا موقع وہ بتایا جاتا ہے جہاں کبھی سورج کا مندر تھا۔ یہ مسجد سکھوں کے عہد میں

کھلتی ہی جب کھلی تو معلوم ہوا کہ آنکھ مین پردہ رقیق جو مانڈہ کہلاتا ہے پڑ گیا ہی جو بینائی مین حائل ہے۔ ہائین آنکھ مین زخم کے سبب سے ضعف بصر تھا۔ یہ اسکے علاوہ ہوا آخر ش وہ دو تکلیف ہے علاج کرتے ہین حق سبحانہ شفا دے۔ بندہ کے ہاتھ سے جو کچھ خدمت ہوسکتی ہی بجالاتا ہون برخوردار میان سنا ہے کہ شیخ عبد الجلیل دمعانی کے پاس آنکھ کے مانڈہ کا علاج نہایت نہایت مجرب ہے لازم ہے کہ مانڈہ کے علاج کی گولیان اگر انکے پاس موجود ہون تو لے کر بہ احتیاط چھوٹی ڈبی مین رکھ کر بھیجدیجئے۔ اور اگر موجود نہون تو اُس پر جو کچھ خرچ پڑے اپنے پاس سے خرچ کر کے گولیان تیار کرا کے جلد بھیجدیجئے"۔

سفارش

امین الدولہ نے جو حضور بادشاہی کا وقائع خوان تھا امیر الامرا سید حسین علی خان کی غیبت مین امیر الامرا کے خلاف کچھ عمل کیا تھا جب دکن سے امیر دار الخلافہ واپس آیا تو امین کو اس تقصیر کی پاداش دینا چاہی۔ ایک روز امین امیر کے دربار مین حاضر ہوا دروازے سے نکلتے ہی میر عبد الجلیل سامنے موجود تھے۔ میر نے امیر سے عرض کیا کہ رسول اللہ صلعم نے انصار[1] اور ذریت انصار کے حق مین دعا کی اور اُن کی مراعات کے لئے وصیتین فرمائی ہین اور ارشاد کیا ہے کہ تجاوزوا عن

بارہ وجہاتہ ساد گی بھی جو بداشت ہوگئی۔

تجارت کا سلسلہ قابل وقعت رسمی ہے فاللین ای ہیئتی کا کام خوب ہوتا ہے۔

[1] انصار معنی یاری دہندگان جمع نصیر یاری گرہش شریف و عطف اور عرف عام مین مسلمانوں کا وہ مبارک طبقہ کہلاتا ہی جس نے مدینہ طیبہ مین رسول مقبول صلے اللہ علیہ وسلم کے قدوم و میزبانی کا شرف حاصل کیا تھا انصار کے اسلام لانے کا آغاز سلسلہ یا زہم نبوت مین ہوا۔ اللہ اللہ۔ ایک وہ وقت تھا کہ نوع انسانی کا سب سے بڑا مصلح اور ہدایت کا سچا پیامبر کا ستارہ رحمت تھا نکلتا اور مختلف موسم مین مختلف قبائل و عشائر کی تلاش مین اُنکے آثار و نقش قدم پر چل کر اُن کے منازل و مقامات پر عکاظ و مجنہ و ذی المجاز مین پہونچتا اور بدائے عام دیتا کہ من یودینی من ینصرنی حتی ابلغ رسالۃ ربی ولہ الجنۃ۔ اس صلائے رحمت پر لبیک کہنے والا اور سوال نصرت پر ناصر بننے والا کوئی نہ ہوتا۔ حتے کہ انکار سے الا فراد سوال کرنے کے بعد اتمام تبلیغ

مُسیئہم یعنی ان میں کے گنہگار سے درگزر کرو۔ آپ ذوالنّسب، اولادِ رسولؐ ہیں اور امین الدولہ انصار کی اولاد سے۔ اپنے جدِ بزرگوار کی اقتدا کیجئے اور امین کا قصور معاف فرمائیے۔ اسیر الامرا نے فوراً غضب و عتاب سے درگزر کیا اور معاف فرما کر امین الدولہ پر بڑی مہربانی و نوازش کی جو اُس وقت تک

کے لئے یہی سوال قبیلہ قبیلہ سے کیا جاتا۔ گم گشتگانِ وادیٔ ضلالت اس کا جواب اقبال و اقرار سے نہیں بلکہ بحث و انکار سے دیتے اور کہتے کہ قوم ملک اعلم بالک۔ ابتلا و آزمائش کا یہ مرحلہ بھی طے ہوا تو سحابِ کرم نے رشحہ افشانی کی اور رحمتِ وبذل و عطا نے لیے سچے دین کا اظہار فرمانا چاہا تو اُس پیکرِ قدسی کو اُن لوگوں کی طرف بھیجا جو قبیلہ (بنی ایک عورت) کی اولاد، اوس و خزرج کہلاتے تھے۔ سب سے پہلے بنی خزرج نے دعوتِ اسلام قبول کی اور خدا کے راستہ پر آ گئے۔ پھر رفتہ رفتہ اوس اور بنو عبد الاشہل تو مرد و عورت سب نے ایک ہی دن شرفِ اسلام حاصل کیا تھا۔ مدینہ منورہ میں انصار نے رسولِ اقدس کے نزول اور زمانہ قیام میں اسلام اور پیغمبرِ اسلام کی خدمت کی سعادت حاصل کی۔

انصار احرار نے اپنی راستبازی، استقامت اور خلوص و صدق و محبت کا جائزہ بڑے نازک موقعوں پر دیا ہے۔ ادیان و امم کی کسی تاریخ میں "عقدِ مواخات" کی دوسری مثال نہیں پائی جاتی۔ انصار و مہاجرین میں جب برادرانہ قائم کیا گیا اور ایک ایک انصاری کے حصہ میں ایک ایک مہاجر بھائی دیا گیا تو اپنی جائداد اپنے مال و متاع اپنے سرمایہ اپنے مساکن غرض ہر نوع ہر قسم کی مملوکات و معاملات میں انصار نے مہاجرین کو اپنا بھائی اور برابر کا شریک بنا لیا۔ برضا بالمناصفہ تقسیم کر کے حوالہ کر دی۔ حتے کہ اگر کسی کی دو بیبیاں تھیں تو اُن میں سے بہتر کو طلاق دیدی اور اپنے برادر مہاجر سے خود اُس کا نکاح کر دیا۔ مختصر یہ کہ اپنے کو اور اپنے فرزندوں کو ہر طرح رسولؐ اور رفیقانِ رسولِ برحق پر نثار کر دیا ؎

مل گیا دل سے یکایک ترے سرشار کا رنگ ورنہ ملکا ہے سے رسون میں لہو ملتا ہے

یہ ہی ماحمیّت و سیر چشم گروہ کا کارنامہ تھا کہ جب سرورِ عالم نبی اکرم صلے اللہ علیہ وسلم قبیلہ بنی نضیر کے غنائم تقسیم فرمانے لگے تو انصار میں سے صرف تین حضرات کا حصہ نکالا جو فی الواقع حاجت مند اور مسکین تھے۔ باقی جماعت سے ارشاد ہوا کہ اگر غنیمت میں مہاجرین کے ساتھ حصہ لینا منظور ہے تو اپنے اثاثہ و سرمایہ و اراضی میں برادر مہاجر کو شریک و سہیم بنا لیجئے آدھا آدھا بانٹ دیجئے۔ دوسری صورت یہ ہے کہ اپنے مملوکات پر بدستور قبضہ و تصرف تمہارا رہے اور اموالِ غنیمت سے دست برداری کیجئے۔ انصار نے عرض کیا کہ ہم کو سب منظور ہے۔ ہم بانٹ بھی دینگے اور غنیمت سے حصہ بھی نہ لیں گے۔ مالِ غنیمت ہمارے برادرانِ مہاجرین کو دیدیا جائے۔ اس پر یہ آیۂ کریمہ نازل ہوئی وَالَّذِیْنَ تَبَوَّءُ الدَّارَ وَالْاِیْمَانَ

میر عبدالجلیل کی امین الدولہ سے شناسائی بھی نہ تھی۔ صرف اتنا جانتے تھے کہ وہ انصار کی اولاد سے ہیں۔ چونکہ میر کا طریقہ محدثین کا تھا اسلئے ہمیشہ پیروی سنت نبوی میں کوشش کرتے اور اپنے پر انصار کی شفاعت لازم سمجھتے تھے۔

مجربات

میر عبدالجلیل کے مجرب نسخہ جات کی تعداد زیادہ نہ تھی لیکن جس قدر نسخے تھے اُن پر اُنکو اعتماد کامل حاصل تھا۔ ان میں پہلا نمبر چورن کنکولاد کا تھا جسکو اکثر امراض میں خود استعمال کرتے اور اپنے تمام متوسلین کو اُسکے کھانے کے لئے تاکید کرتے رہتے تھے خانہ داری کی ضروریات کے متعلق ایک چھوٹی سی بیاض (نوٹ بک) بلگرام میں رکھتے تھے اُس میں اِس کا نسخہ رہتا اور

مِنْ قَبْلِهِمْ يُحِبُّونَ مَنْ هَاجَرَ إِلَيْهِمْ وَلَا يَجِدُونَ فِي صُدُورِهِمْ حَاجَةً مِّمَّا أُوتُوا وَيُؤْثِرُونَ عَلَىٰ أَنفُسِهِمْ وَلَوْ كَانَ بِهِمْ خَصَاصَةٌ قف [اور وہ مال جو بے لڑے ہاتھ آیا ہے) اُن کا بھی حق) ہے کہ (مہاجرین نے کبھی ہجرت نہیں کی تھی اور وہ) اُن سے پہلے مدینے میں رہتے اور اسلام میں داخل ہو چکے ہیں جو اُن کی طرف ہجرت کر کے آتا ہے اُس سے محبت کرنے لگتے ہیں اور (مال غنیمت میں سے) مہاجرین کو جو (کچھ بھی دے) دیا جائے اُس کی وجہ سے یہ اپنے دل میں (اُنکی) کوئی طلب نہیں پاتے اور اپنے اوپر تنگی ہی کیوں نہ ہو (مہاجرین بھائیوں کو) اپنے سے مقدم رکھتے ہیں۔ الجزء ۲۸ سورۃ الحشر ع ۱-۱]

مسجد نبوی کی تعمیر میں ایک طرف وہ پیکر نورانی اینٹ پتھر کے ڈھونے میں مصروف تھا دوسری طرف حامیان ملت حقہ کی نصرت کے لئے یہ دعا زباں پر تھی۔ اللھم لاخیر الاخیر الاٰخرۃ فانصر الانصار والمھاجرۃ۔ عبداللہ بن رواحہ انصاری نے تبرکاً وتیمناً اس دعا کو نظم بھی کر دیا ہے ؎

اللھم ان الاجر اجر الآخرۃ	فارحم الانصار والمھاجرہ
اے خدا اجر تو بس آخرت کا اجر ہے	اسلئے تو انصار و مہاجرین پر رحم فرما

صحیحین میں یہ حدیث شریف وارد ہے اٰیۃ الایمان حب الانصار (انصار کی محبت کمال ایمان کی نشانی ہے) دوسرے موقع پر یہ ارشاد اقدس ہوا تھا کہ لَوْلَا الْهِجْرَةُ لَكُنْتُ امْرَءًا مِنَ الْأَنْصَارِ (ہجرت کا شرف اگر مجھے حاصل نہ ہو جاتا تو میں بھی انصار میں سے ایک شخص ہوتا) آنحضرت صلعم مہاجرین کے طبقہ عالیہ سے تھے

اور اُسکے مطابق چورن تیار کیا جاتا تھا۔
فرجام نے میر عبدالجلیل کو اُن کی حلیلہ جلیلہ کی علالت کی خبر دی ہے کہ کھانسی اور تپ عارضی ابھی بھی منتہا ہے تو ہدایت فرماتے ہین کہ "چورن[۱۹۰] کنکولا داس عارضہ کیلئے خوب ہے اور اسکا نسخہ بیاض خاص مین موجود ہے۔ سید محمد خود جانتے ہین بنوالین اور کھلائین۔ انشاءاللہ موافق ہوگا"

رُسُوم و تقریبات

کان چھیدنے کی رسم و خوشی جو اب بہت کم بلکہ تقریباً متروک ہوگئی ہے میر عبدالجلیل کے زمانہ مین بہت مانی اور منائی جاتی تھی
میر صاحب دہلی مین تھے عرصہ سے سفر وطن کا تہیا کر رہے تھے اور جلد سے جلد اُن کا بلگرام پہونچ جانا یقینی اور قطعی تھا۔ البتہ دربار کے تعلقات اور دستورات کی طوالت سے تعین ماہ نہین کرسکتے تھے۔ عزیزان وطن کی متواتر طلب اور اپنی مجبوری پر لکھتے ہین " اگر ساعت شادی ہمشیرہ سید سلام علی اس قسم کی ہے جس مین وہان کی عورتون کی اصطلاح کے موجب تقدیم و تاخیر نہین ہوسکتی تو مبارک ہو۔ شادی سے فارغ ہوجائے فقیر بھی جس وقت یہان کے کامون سے فراغت پاجائے گا، وہان پہونچ کر طرفین کو مبارکباد کہدے گا"
یہ تقریب میر صاحب کی عدم موجودگی مین ہوجاتی ہے تو فرماتے ہین کہ " انجام شادی کنیز

باہم انصار کی قدر بہت مہاجرین سے کم نہ کرتے تھے
صحاح مین بذیل ہجرات شریفہ آیا ہے کہ رسول اکرم صلعم نے انصار سے فرمایا تھا کہ میرے بعد لوگ تم پر اورون کو ترجیح دین گے چنانچہ حضرت معاویہ کے زمانہ مین ایسا ہی ہوا۔ رضی اللہ تعالی عنہم و رضاہم عنا ۱۲

۱۹۰ف کنکولا مین الف دال اضافی یا ترکیبی ہے کنکول ہاتا اور مرچ کا نام ہے۔ اردو مین کباب چینی عربی و فارسی مین کبابہ کہتے ہین دیگر دیسی زبانون مین کالی چینی اور ستیل چینی انگریزی مین Cubebs یا piper cubeba کہلاتا ہے۔ چورن کا نسخہ قدیم و معروف ہے۔ حرو عالم کنکول ہے۔ اطباء اسکے خواص و فوائد

بوالدہ و ہمشیرہ شما مبارک باشد و ادائے قرض سودی بما ہما یون باد۔ انشاء اللہ ادا نمودہ خواہد شد''

شادی کنیہ کے متعلق اوریٹل مسلینی مطبوعہ ۱۹۰۸ء کا جامع لکھتا ہے کہ یہ رسم کان چھیدنے کی پانچ سال سے لے کر دس سال تک کی عمر میں ادا کردی جاتی تھی۔

یاد رہے کہ ابھی کچھ زمانہ پیشتر میر سید محمد کی شادی کا قرض جو میر صاحب کے ذمہ ہوگیا تھا سالہائے دراز کے بعد ادا ہو پایا تھا۔

اسی طرح تمام خاندانی مراسم اور پرانے دستوروں کی پابندی ضروری اور لابد سمجھتے تھے۔

قرض

قرض کا بار ہمیشہ کچھ نہ کچھ اس خاندان پر بنا رہتا تھا۔ روز مرہ کے اخراجات کی وجہ سے قصاتی سرا کی برادر لواری اور کنبہ برادری کی بدولت شادی، غمی و تقریبات کے غیر معمولی مصارف کے سبب سے مقروض و پریشان رہتے تھے۔ سود میں کثیر رقم ہر سال نکل جاتی تھی اور میر عبدالجلیل اور ان کے اعزہ اس کو بے تکلف برداشت کر لینے کے عادی ہو گئے تھے۔ میر غلام علی کی بہن کی، کان چھیدنے کی تقریب ہوئی یہ سرپرست اور بزرگ خاندان تھے اور ہر قسم کے مصارف کے ادا کرنے کے ذمہ دار۔ اطلاع پانے پر لکھتے ہیں کہ ''شادی کنیہ کا انجام ہو جانا تمھاری والدہ اور تمھاری بہن کو مبارک ہو۔ سودی قرضہ کا ادا کرنا ہمکو مبارک ہو۔ انشاء اللہ ادا کر دیا جائیگا''

میر سید محمد کی شادی میں بھی قرض ہوگیا تھا جب ادا ہوگیا اور میر سید محمد کے خط محررہ ۱۹ رمضان المبارک ۱۱۵۱ھ (عالمگیر) سے اس کی اطلاع پردیس میں ملی تو فرمایا کہ ''آپ کی شادی کے قرضہ سے خلاصی کی خوش خبری سُنکر شکر بجالایا۔ اب معلوم ہوا کہ خدا کے فضل سے اس مُہم عظیم سے فراغت حاصل ہو گئی''

کتیرا لکھتے اور اسکو مقوی دل مشتہی، دافع گردہ دہی و بلغم و ریاح، بیرا امراض حتیٰ میں مفید بتاتے ہیں

ایک اور خط مین بھی یہی مذکور ہے "گھنشیام تیواری کا قرضہ جو ادا کر دیا نہایت خوب ہوا- اُس کا سُود ہر روز بڑھتا جاتا تھا - باقی بالائی قرض کے لیے جس کی تعداد تین سَو روپیہ ہوگی آپنے لکھا ہے - وہ بھی خدا نے چاہا تو ادا ہو جائے گا - لیکن ہر کام ایک وقت اور ایک ہنگام پر منحصر ہے اس زمانہ مین کہ اُردوے معلّےٰ کے دریائے قُلزم مین پڑ گیا ہون اور ہر روز خرچ مبلغ در پیش رہتا ہے - یہ کام جلد صورت پذیر نہین ہو سکتا -"

لکھے بیٹا باپ سے اور باپ بیٹے کے دیکھنے کے لئے بے چین اور سخت مشتاق ہین - باپ مجبور ہے مُدّت ہوئی داخل لشکرِ شاہی ہو چکا ہے لیکن دربار سے اپنے معاملات کے سُلجھانے مین ہنوز قاصر و ناکام رہا ہے - ایک نوکر بیمار ہے - دوسرا تن تنہا میر عبدالجلیل کی خدمتگذاری کر رہا ہے - اسلئے اُس کو جُدا کرنا اور بیٹے کے بُلالانے کیلئے وطن بھیجنا دشوار ہے - اس تمام پریشانی اور بے سروسامانی مین بھی اطمینان دلایا جاتا ہے کہ " اپنے قرض کی نسبت جو لکھا ہے تمھارا قرض میرے ذمہ ہے انشاءاللہ آپ کی تحریر کے مطابق عمل کیا جائیگا خاطر جمع رکھئے گا۔"

صِلہ

اگرچہ میر عبدالجلیل کا کلام (شعری) تمام تر مدائح مین واقع ہوا ہے لیکن اُنھون نے سوائے ایک موقع کے مُدۃ العمر کسی ممدوح سے کبھی کوئی صلہ لینا گوارا نہین کیا - وہ مستثنیٰ موقع یہ تھا کہ ایک بار یہ رُباعی لکھکر سلطان اورنگ زیب کی نظر سے گذاری ؎

کسرےٰ[۱۹۱] کہ بہ عدل بود عالم پرور | بے جرم آویخت پائے زنجیر ز در
ذاتت بکمالِ عدل تجویز نہ کرد | آویختن سلسلہ ہم در کشور

---

[۱۹۱] کسرےٰ (معرب خسرو) نوشیروان عادل بادشاہ فارس کا لقب تھا جس نے زنجیر عدل ایجاد کی تھی - اسی کی تقلید مملکت ہند مین شہنشاہ جہانگیر نے کی - ایک زنجیر دارالخلافت آگرہ مین بھی نصب کی تھی - اسکی نسبت وہ اپنے تزک مین لکھتا ہے کہ طلائے خالص سے بنائی گئی تھی - تیس ۳۰ گز لمبی تھی - چار من پختہ ہندوستانی

سلطان نے قدر افزائی فرما کر دکن کے طلائی سکہ کے (جو ہون[۱۹۲] کہلاتا تھا) چار خریطے (توڑے) شہزادہ کام بخش کے حوالہ کئے اور شہزادہ نے مخلص خان میر بخشی کے ہاتھ میر صاحب کے پاس بھیج دئے۔ میر صاحب کے معتقدین لکھتے ہیں کہ میر کا تمام عمر میں ایک بار یہ صلہ لے لینا امیر خسرو[۱۹۳] کے ساتھ استکمال تشابہ کی راہ سے تھا۔ اس لئے کہ امیر بھی سلاطین و امرا سے صلہ قبول نہ فرماتے تھے اور جس کا اپنی تصانیف میں بھی ذکر کیا ہے۔ صرف ایک بار سلطان قطب الدین خلجی نے امیر کو کتاب نہ سپہر[۱۹۴] کے جائزہ میں بوزن جثہ فیل کے سونا عطا کیا تھا۔

وزن تھا۔ کڑیاں ساٹھ تھیں۔ زنجیر کا ایک کنارہ قلعہ کے برج (شمن برج شاہی) سے لٹکا دیا گیا تھا اور دوسرا کنارہ دریا کے قریب زمین سے وابستہ ہوتا تھا۔ مقصود یہ تھا کہ اگر عدالت ہائے سرکاری کے حکام انفصال قضایا میں طرفداری یا فصل خصومات بصفت گستری میں تاخیر کریں تو ستم رسیدہ فریق خود حاضر ہو کر زنجیر کو ہلا دے۔ کڑیوں کی جنبش سے صدا بلند ہو کر شہنشاہ معدلت پناہ کو آگاہ کردے گی کہ سلطنت و دولت و اقبال تک ایک مظلوم و استغاثہ ہو جانے کے لئے ایک فریادی چشم براہ ہے۔

[۱۹۲] ہون جنوبی ہندوستان یعنی دکن کا دینار یا طلائی سکہ تھا۔ مسلمان اہل لغت اس کو ہن لفظ ہند اور راجہ اپستیلے کو اس کا واضع بتاتے ہیں یہی تامل زبان میں دیراہا اور یورپی اسمہ میں پیگوڈا کہلاتا ہے۔ وہ صدی سے اسی نام (پیگوڈا) سے مشہور ہے۔ تین روپیہ سے لے کر ساڑھے تین روپیہ یا چار روپیہ قیمت تک کا ہوتا تھا۔ اس کی سطح (ٹیپی) سمت تین چھوٹے چھوٹے بتان بصفت درازی تک ہوتے تھے میدان ہموار خوشنما نہیں ہوتا تھا۔ محدب سمت اس پر چھوٹے چھوٹے نقاط ہوتے تھے۔ ٹیلویرلے ان لکھتا ہے کہ اس کی صورت بالکل (اٹھارہویں صدی کے) آتشیں گولے کی طرح ہوتی تھی۔ سونے میں اس کا واضع راجہ اچت رائے کو لکھتے ہیں"۔

[۱۹۳] امیر خسرو، ابو الحسن بن سیف الدین دہلوی کا شہرہ اور کمال سرے تعارف سے بے نیاز ہے ایک زبردست صوفی اور عدیم النظیر ادیب و شاعر کی حیثیت سے ان کو ہندوستان کا حرف شناس بچہ بچہ بھی جانتا ہے آپ کی ولادت ۶۵۱ھ (۱۲۵۳ء) میں ہوئی تھی۔ رمضان ۷۲۵ھ دسمبر ۱۳۲۵ء میں وفات پائی۔ آپ کی تصانیف بہت ہیں اور بہت مشہور ہیں۔ خالق باری، بیدنامہ، تحفۃ الصغر، سکندر نامہ، قران السعدین، عشقیہ، دولرانی خضر خان و تغلق نامہ وغیرہ۔

باوجودیکہ امیر الامرا سید حسین علی خان کے ساتھ ایسے گہرے اور مخلصانہ و بے تکلفانہ تعلقات تھے لیکن جب ۱۱۳۱ھ (۱۷۱۹ء) میں قلعہ آگرہ فتح ہوا اور شہزادہ نیکو سیر کی افواج کو شکست ہوئی تو اسکی تہنیت میں میر عبدالجلیل نے قصیدۂ غرّا لکھ کر پیش کیا۔ نواب نے پانچ ہزار روپیہ نقد اور خلعت و اسپ دینا چاہا لیکن میر نے اپنے ضابطہ و معمول کے موافق قبول نہ فرمایا۔

۱۹۴ء – سپہر امیر خسرو نے قطب الدین خلجی کے نام پر ۷۱۸ھ (۱۳۱۸ء) میں لکھی تھی۔ نو باب ہیں اور ہر باب جداگانہ بحر میں ہے۔ اسی مناسبت سے "نہ سپہر" نام رکھا ہے۔ امیر کی عمر اسوقت سٹسٹھ (۶۸) سال کی تھی اسکے ہند دیباس [illegible] میں ع مرا عمر کر شصت ہا اگر شت۔ میں اسی کا اشارہ ہے۔ یہ مثنوی مطبع یونیورسٹی انسٹی ٹیوٹ علی گڑھ میں نہایت خوب و پر تکلف چھپی ہے

۱۹۵ء خلعت (بالکسر) اصلاً وہ سلا ہوا کپڑا جو بدن سے اتار کر کسی کو پہنایا جائے۔ عرفاً وہ اعزازی پوشاک جو ملوک و امرا کسی شخص کو عطا فرمائیں۔

خلعت مختلف مواقع پر مختلف حیثیت سے عطا ہوتا تھا

(۱) عموماً اپنے سے کم کو بہ نظر اکرام،

(۲) کسی عہدہ پر ماموری یا تقرر کے وقت،

(۳) بدستور قائم و بحال رہنے کے صلہ و بحالی میں،

(۴) جلیل القدر امرا کی طرف سے اپنے مہمانوں اور آنے جانے والوں کی مجلس میں [illegible] کیا جاتا تھا

خلعت میں اکثر جامہ نادوختہ و ناتیار دیا جاتا تھا۔ بعض اوقات اسلحہ و زیورات و دیگر اشیائے قیمتی بھی اضافہ کر دیئے جاتے تھے مگر ایسی حالت میں کوئی ایسی تبدیلی اس میں نہیں ہوتا تھا۔ عمامہ و دستار ان عطایا میں ضرور شامل ہوتے تھے اور سلاح و اسپ و فیل تو مکمل خلعت کے جزو لازم تھے

رائے درایان [illegible] اپنی مجلس لکھتا ہے کہ خلعت کے تین درجے تھے

پہلا۔ چھ پارچہ کا۔ مقررہ تین پارچون کے سوا سرپیچ اور مالا اور نیمہ آستین یہ ہفت ہزاریوں کیلئے مخصوص تھا

دوسرا۔ پانچ پارچہ کا نیمہ آستین ملا دو سہ ہزاری کو ملتا تھا۔

تیسرا۔ تین پارچہ کا معمولی

بادشاہان تیموری کے آخر عہد تک یہی معمول قائم رہا۔ ان کے دربار سے بھی خلعت تیار اور سلے ہوئے کپڑوں کا

اسی طرح نواب آصف جاہ نظام الملک نے بھی اپنے قصیدۂ مدحیہ اور غزل فرمایشی کے صلہ مین پانچ ہزار روپیہ اور خلعت و اسپ مرحمت فرمانا چاہا تھا جس کو میر نے منظور نہین کیا۔ یہ دونون قصیدے مع ان دونون اُمرائے عالی شان کے حالات اور میر صاحب کے تعلقات کے اپنے اپنے محل پر نقل کیے جائین گے

معاش و خدمت

اس خاندان مین کوئی مستقل ذریعۂ معاش و بسر اوقات باقی نہ رہا تھا وہ معافیات[۱۹۶] و التمغا[۱۹۷]

دیا جاتا تھا جیسے جامہ و قبا کا۔ اور کبھی بے سلے ہوئے سادہ پارچون کا ہر صورت مین دستار یا چیرہ (رنگین و بہار دار) اور ٹیکا ضرور دیا جاتا تھا۔

وہ خلعت جس مین سر سے پانون تک سارا جسم چھپ جائے سر پا کہلاتا تھا۔ زیادہ رتبہ والون کیلئے ایک اور لباس زاید بالاپوش کے طور پر اور اس پر ایک جُبّہ مستزاد ہوتا تھا۔ یہ جُبّہ کسی قدر چھوٹا ہوتا تھا اور اسکی آستینیں بھی چھوٹی ہوتی تھین سر پا خلعت مین جُبّہ ملا کر پانچ یا چھ پارچے ہوتے تھے۔ ایک تھان ہلکی کمخواب یا زربفت کا لمبے پائے جامہ کے لئے اضافہ کیا جاتا تھا۔ مگر زبان سے اس کا اظہار معیوب سمجھا جاتا تھا۔ یہ تمام پارچے ململ کے ہوتے تھے۔ اسی پر سنہرا اور روپہلا کام اور ریشم سے گلکاری نہایت نفیس اور پرتکلف ہوتی تھی۔

مغلون کے آخر زمانہ مین خلعت میں معمولاً تین پارچہ کا دیا جاتا تھا چار پارچون کا خاص خاص موقعوں پر امتیاز کے لئے عطا ہوتا تھا مگر ہر حالت مین کپڑے بیش قیمت دیئے جاتے تھے۔

خلعت کی ایک صورت اور بھی تھی ۔ ماتمی ۔ یہ ہمیشہ ململ کا ہوتا تھا سیاہ یا سبز رنگا ہوا عطا ہوتے وقت فوراً پہن لیا جاتا تھا۔ مگر لازم تھا کہ دوسرے دن (ایک دن بعد) اُتار دیا جائے

عطائے خلعت کا رواج سلطانون مین بہت پرانا ہے۔ خلافت بنی عباس کی تاریخون مین اس کا ذکر مختلف نامون سے پایا جاتا ہے۔ رشید، اعزاز و اکرام کے طور پر ثیاب فاخرہ بھیجتا تھا۔ مصور، جوائز حسنہ کے علاوہ کسوۂ سیہ، دیگر خلعت کرتا تھا۔

[۱۹۶] معافی ۔ کے لغوی معنے عفو کنندہ کے ہین لیکن اصطلاحاً وہ اراضی مراد ہے جس کی جمع

جو سید محمد صغرے اور اُن کی اولاد کے لئے سلاطین دہلی نے عطا کی تھین کچھ تو ضبط ہوا اور کچھ پشتہا پشت کی توریث و تقسیم سے کالمعدوم ہو چکی تھین زمینداری کی قدر نہ تھی۔ آبائی پیشہ عرصہ دراز سے ملازمت چلا آتا تھا۔ غرض معاش سے فارغ البالی کبھی نہین رہی۔

میر عبدالجلیل کو باوجود اُن کے کمال علم کے قلت اسباب معیشت و کثرت اہل و عیال نے مطمئن و متوکل بیٹھنے نہ دیا۔ تینتیس ۳۳ سال کی عمر مین میر سید محمد فیض زمیندار بلگرام کے ساتھ سنہ ۱۱۰۴ھ (۹۳-۱۶۹۲ء) مین گھر سے باہر نکلے۔ دکن پہونچے اور بے نیل مرام واپس آئے۔ سید محمد فیض کی دادرسی ہو گئی مگر یہ ناکام رہے۔ سات برس بعد وہی جذبہ پھر دامنگیر ہوا۔ شاہزادہ عظیم الشان کا ہم زلف میر محمد رضا جو شاہ حسین خان کا بیٹا تھا بنگالہ سے بارادۂ حاضری آستان خلد مکان چلا بلگرام پہونچا اور میر عبدالجلیل کا مہمان ہوا۔ یہ بھی اُس کے ساتھ سنہ ۱۱۱۱ھ (۱۶۹۹ء) مین دوبارہ عازم دکن ہوئے۔ اس مرتبہ یکہ و تنہا نکلے تھے۔ چند انفار و خدام کے سوا کوئی ہم وطن رفیق نہ تھا ارادہ کر لیا تھا کہ بغیر فوز مراد و حصول مطلوب واپس وطن نہ ہون گے۔ چنانچہ طے منازل و قطع مراحل کے بعد اسلام پوری[۱۹۸] عرف برہما پوری توابع بیجاپور مین پہونچے اور عالمگیر خلد مکان کے

(مالگذاری) سرکار سے معاف ہو کوئی جائداد جو بطور وظیفہ عطا کی گئی ہو

ف۱۹۷ التمغا ترکی مین آل بمعنی سرخ، اور تمغا بادشاہ کی مُہر کو کہتے ہین۔ زمانۂ قدیم مین بادشاہ کی مُہر سیاہی شنگرف سے کیجاتی تھی۔ آل تمغا زمین و جاگیر کا نسلاً بعد نسل بخشدینا ہے۔ اسی لئے بعض محققین نے یہان لفظ "آل" عربی کا مانا ہے جسکے معنی فرزندان و اہل خانہ و پیروان کے ہین۔ تمغا بھی ترکی ہین نشان و مُہر کو کہتے ہین۔ نیز اُس محصول اور باج کو جو ممالک غیر سے آئی ہوئی اجناس و اشیا پر داخلۂ سرحد اور گھاٹون اور بندرون پر لیا جاتا ہے اور ادائگی کی مُہر لگادی جاتی ہے۔ سند عطا۔ فرمان سلطانی

ف۱۹۸ اب یہ دونوں نام بہت بدل گئے ہین۔ یہ مقام اُردو مین "اسلام پور" کہلاتا ہے اور ضلع ستارہ مین والوا تعلقہ کا صدر مقام ہے۔ ستارہ خاص سے فاصلہ اٹھائیس ۲۸ میل ہوگا۔ ستارے جبل مین اس کو "برہما پور یا اسلام پور" لکھا ہے
قصبہ کے دونون حصے ایک دوسرے سے جدا ہیں۔ اسلام پور کو مسلمانون نے مسلمانون سے آباد

لشکر مین داخل ہوے۔ یہ بادشاہ جیسا مردم شناس اور قدردان اہل ہنر تھا اسکی مثال تاریخ مین کم ملے گی۔ میرزا یار علی بیگ سوانح نگار حضور بادشاہی نے نہایت قدرشناسی اور تکریم کی اور ملازمت سلطانی مین پہونچادیا۔ ان کی تاریخ فتح ستارہ سے ان کی قابلیت و ذکا کا سکہ جم چکا تھا۔ بادشاہ نے منصب شایستہ اور ایک بڑی جاگیر محال ساتی پور مین دلگرام کے

کیا تھا۔ اُدھر دل ہیدون کا محلہ ابدا قدیم تر ہے۔ اسی مین شمہوا کو ستی کی زیارت گاہ ہے۔ یہ ذات کے بارجہ باف بڑے عابد و مرتاض تھے۔ ان سے خوارق عادات و کرامت افعال سرزد ہوتے تھے۔ اب بھی وہان میلہ لگتا ہے۔

میونسپلٹی بھی قایم ہے سنہ ۱۹۱۱ع مین مردم شماری مارہرا کے قریب تھی لیکن بیس برس بعد سات ہزار نوسوسولہ رہ گئی جس مین مسلمانون کا شمار صرف سات سو ستاسی تھا

۱۹۹۔ Royal Intelligencer مسلمانوں کے نظام مملکت مین فرمانروائی آگاہی اور باخبری کے لئے یہ سررشتہ نہایت کارآمد تھا اس صیغہ مین اعلے سے ادنی تک جو کارکن مقرر کیے جاتے تھے وہ کامل دیانت دار راستباز اور لایق اعتماد ہوتے تھے۔ ان کا تقرر بار اس حضور شاہی سے ہوتا تھا۔ یہ وقایع نگار تمام بڑے بڑے مقامات شہرون لشکرون سیدگاہون اور صوبوں میں مامور رہتے تھے اور شب و روز کے ضروری واقعات قلمبند کرکے دربار شاہی مین بھیجدیتے تھے۔ یہ لوگ آزاد دست اور آزادہ رو ہوتے تھے کسی مقامی افسر یا عہدہ دار کے ماتحت نہین۔ اسلئے بلا کسی خوف و اندیشہ کے ملک و رعایا کے حالات لکھتے رہتے تھے ممالک محروسہ کے حکام اور والی ان کی راست نگاری اور صداقت کوشی سے خائف رہتے رعایا و برایا کے ستانے کی جرأت اور احکام شاہی کی تعمیل نہ کرتے تھے۔ خود ان کی زندگی بھی خوف و خطر سے محفوظ نہین تھی۔ کوئی بداطوار و ظالم کبھی جب اپنے کسی فعل یا جرم کو چھپانا چاہتا تو ان کو لالچ بھی دیتا اور جان کی دھمکی بھی۔ غرض جو خدمات پہلے پہل میر عبدالجلیل کو سپرد ہوئی تھین نہایت ذمہ داری اور جوابدہی کی تھین جنکی انجام دہی آسان نہ تھی۔ اسی سلسلہ مین یہ بھی لکھنے کے قابل بات ہے کہ وقائع نویس سوانح نویس سوانح نگار تقریبًا ایک ہی نوع کی خدمات اور یکسان اہمیت و وقعت رکھتے تھے۔ فرق صرف اس قدر تھا کہ واقعہ نویس کی اطلاعین شایع کردی جاتی تھین اور اورون کی مخفی رہتی تھین بجز اسکے کہ مصالح ملکی ان کی اشاعت و توزیع کے مقتضی ہون، یا مرور ایام کے بعد

ترتیب مرمت فرمائی اور بخشی گری ۵۲۱ و وقائع نگاری ۵۲۲ گجرات ۵۲۳ شاہ دولہ (ملک پنجاب) کی خدمت پر

۵۲۱؎ صاحب عمل صالح لکھتا ہے کہ سال ہزار عالمگیر بادشاہ اور امیر منصب شائستہ عطا فرمود بعد چند سے
خدمت بخشی گری و وقائع نگاری گجرات سے تا دم آخر سرفراز رہا ۔

۵۲۱؎ صفی پور وا قع ضلع اُناؤ صوبہ اودھ ، کا پرانا نام ستانی پور ہے کسی زمانہ میں ان اطراف
میں راجپوتوں کا قبضہ تھا اور بدھ مذہب کا بھی اثر تھا یہ مقام آباد کیا تھا جب حضرت شاہ صفی مخدوم کا قیام
فرمایا جو شیخ مینا کے مرید تھے ۔ اس قصبہ کا نام صفی پور ہو گیا تاہم پرانا نام باقی رہا اور شہرت رکھتا ہے
اس کے بعد یہ ہوئے جب مولانا شاہ اکرم صورت و حضرت اعلیٰ شاہ صفی علیہما الرحمہ اس طرف سے
گذرے تو راجپوتوں نے اُن کو ستایا اور تنگ کیا ۔ اُن کی یا اُن کے بیٹے شاہ ابراہیم شرقی نے ایک لشکر
جرار بھیجا گیا ۔ امام موصوف دراصل راؤ کا لشکر بختی فوج تھا ستانی سوکل اور ان کا آقا اور گرسین
راجہ ادگو لڑائی میں کام آئے اور مسلمانوں میں سے نظام الدین اور سید علاء الدین شہید ہوئے ۔ اُن کا مزار پر دوات
نگاری الٹیر اب تک لوگوں کا خلائق ہے اور ہندو اور مسلمان یکسان ادب و احترام کرتے ہیں ۔
ستانی پور کا تذکرہ آئین اکبری میں پایا جاتا ہے یہ پرگنہ اُس وقت سرکار لکھنؤ صوبہ اودھ سے متعلق اور اچھی
کے تصرف میں تھا چالیس سوار اور ہزار پیادہ فوج رہتی تھی قابل زراعت رقبہ ۳۹۰۸۳ بیگھہ تھا جس پر
۲۶۲۳۵۲۸۹ دام تشخیص تھے یہی انتظام اور تشخیص عہد اورنگ زیب تک قائم رہی ۔ موجودہ رقبہ انگریزی
حساب سے ۹۶۲۷۱ ایکڑ یعنی ۱۳۲ میل مربع ہے اس میں ۱۳۵ مواضع ہیں ۔
قصبہ صفی پور کی آبادی سنہ ۱۹۱۱ء میں چھ ہزار ایک سو اٹھتر تھی تحصیل صفی پور اور تھانہ کا مستقر ہے

۵۲۲؎ انگریز مورخین نے اس کا ترجمہ Pay Master and News Writer کیا ہے

۵۲۳؎ قصبہ گجرات صوبہ پنجاب میں ضلع و تحصیل کا صدر مقام ہے ۔ دریائے جہلم یہاں سے پانچ میل
دور ہے ۔ نارتھ ویسٹرن ریلوے کا اسٹیشن بھی ہے موجودہ آبادی بائیس ہزار ہے مقامی روایات سے پایا جاتا ہے کہ
اس قصبہ کی بنیاد اودنا گری کے نام سے بچن پال ایک راجپوت نے آج سے ڈھائی ہزار سال پیشتر رکھی تھی
اسکے بعد سنہ ۱۲۰ء میں رانی گجران نے جو راجہ رسالو مشہور کی بیوی تھی اور سیالکوٹ کی بہو تھی اس کو
آباد کیا پھر تیسری بار اسکی بنیاد علی خان نے رکھی یہ وہی زمانہ ہے کہ یہ بہی اللہ خانہ بادشاہ رہا ہو جسکو سر دوات
فاتح شاہین بھی سنہ راج ترنگنی مابین سنہ ۶۰۷ ہجری (۸۹۳ء) و سنہ ۲۸۹ ہجری (۹۰۲ء) کے سنسکر دیو نے تباہی پہنچائی ہے

ممتاز و مامور کیا۔ میر صاحب نے بکمال امتنان اس سرفرازی و تعین خدمت کی تاریخ لکھی ؎

مرا از جناب خلافت عطا شد ۔ ز روے کرم خدمت عیش افزا
خرد گفت تاریخ تفویض خدمت ۔ سوانح نگاری گجرات زیبا
(سنہ ۱۲۸۱ھ مطابق سنہ ۱۸۶۴ء)

شکست دی اور شہر کو درہم برہم کر ڈالا تھا

موجودہ شہر اُسی پُرانے موقع پر آباد ہے جہاں دو شہر یکے بعد دیگرے بسے ہوے ہیں۔ سر الکیزنڈر کننگھم کا گمان ہے کہ اسی کے دوسرے شہر کو مغولیوں (تورانیون) نے سنہ ۷۰۳ھ (مطابق سنہ ۱۳۰۳ء) میں بعہد علاء الدین خلجی اپنے حملون سے تباہ کر دیا تھا۔ پھر دو سو برس سے زیادہ مدت گزر جانے کے بعد شیر شاہ نے بھی قطعات متصلہ و قرب و جوار پر نظر عنایت ڈالی اور توجہ فرمائی۔ موجودہ شہر کی تاسیس اغلباً اکبر بادشاہ کے زمانہ میں ہوئی اور اگرچہ اسکی ہر طرف چاٹون کی آبادی جمعیت تھی لیکن اس کی محافظ فوج سب سے پہلے گوجرون کی متعین ہوئی اور اسی مناسبت سے "گجرات اکبر آباد" نام رکھا گیا۔ مغلون کے بعد یہ مقام مقرب خان حاکم اول پنڈی کے قبضہ میں پچیس سال تک رہا۔ سنہ ۱۱۷۸ھ (مطابق سنہ ۱۷۶۵ء) میں سکھون کے اور سنہ ۱۲۶۵ھ (مطابق سنہ ۱۸۴۹ء) میں انگریزون کے تصرف میں آگیا۔

کشمیر سے تجارت اور میوہ جات خشک وغیرہ کی درآمد کے اعتبار سے میر عبد الجلیل کے زمانہ تک گجرات ایک قابل لحاظ مقام تھا۔ یہان کے موروثی قانون گویان کے خاندان میں انتظامات مالی سے کے جو رجسٹر یا کاغذات موجود ہین اُن سے واضح ہوتا ہے کہ گجرات ایک سرکار یا ضلع کا دار الصدر تھا۔ جس میں ۲۵۹۲ دیہات شامل تھے اور جس کی مالگذاری سولہ لاکھ تھی۔ اکبر بادشاہ نے سنہ ۱۰۱۴ھ (مطابق سنہ ۱۶۰۵ء) میں سعید عبد القاسم کو گجرات بطور "تیول" یعنی بشرط خدمت و امداد بوقت جنگ دیا تھا

میر عبد الجلیل سنہ ۱۱۱۳ھ (مطابق سنہ ۱۷۰۱ء) سے سنہ ۱۱۱۶ھ (مطابق سنہ ۱۷۰۴ء) تک گجرات مین بخشی و وقائع نویس رہے تھے خاص قصبہ اور اُسکے قرب وجوار کے مقامات مین عہد مغلیہ کی بہت سی یادگارین اب تک باقی ہین۔ اکبر کا بنوایا ہوا پُرانا قلعہ مع ایک حمام کے وسط شہر مین ہے پیر شاہ دولہ کی درگاہ قصبہ کے شمال مین ہے اور شہر کا وہ حصہ اور دروازہ آپ ہی کے نام نامی سے موسوم اور مشہور ہے۔

عہد جہانگیر و شاہجہان اور اورنگ زیب کے زمانہ مین گجرات (یا چھوٹی گجرات) ایک مشہور ولی اللہ پیر شاہ دولہ دریائی کا مسکن و قیام گاہ تھا۔ اسی وجہ سے ان بزرگ کے نام نامی کے ساتھ شہرت و نسبت پا گیا۔ میر غلام علی بحر و آزاد نے شاہ دولہ لکھا ہے مگر تحقیق اور صحیح یہی ہے کہ آپ شاہ دولہ یا دولت تھے، شاہان لودی کے پوتے آپ کی فتوحات غیبی اور بے اندازہ مصارف کی نسبت عجیب و غریب

بعد حصول خدمت ذیحجہ سال مذکور میں دکن سے سیدھے بلگرام تشریف لائے اور وہاں سے محرم ۱۱۱۲ھ (جون ۱۷۰۰ء) میں گجرات کی طرف روانہ ہوئے۔ میر طفیل محمد کو اپنے ہمراہ چلنے کی تکلیف دی۔ انھوں نے میر سید مبارک محدث سے اپنا ارادہ ظاہر کیا۔ آپنے پہلے تامل کیا پھر اجازت دیدی اُن کی معیت میں میر عبد الجلیل غرۂ ربیع الاول ۱۱۱۲ھ (۲۷ جولائی ۱۷۰۰ء) کو وارد گجرات ہوئے اور اپنی خدمات کا جائزہ لیا۔ چار برس کے قریب اُن دونوں خدمتوں کو نہایت دیانت و استقلال کے ساتھ انجام دیا۔

اقوال منقول ہیں۔ مگر اس قدر اہل تاریخ کو بھی تسلیم ہے کہ آپ کے مریدین اور معتقدین سے نذر و نیاز میں زر و مال کثیر آتا تھا اور وہ سب شہر اور اطراف شہر کی زیب و زینت میں صرف ہوتا تھا۔ مزید برآں پُرانے کھنڈروں کے متعلق بھی آپ کو علم و وقوف حاصل تھا۔ جہاں سے آپ مصالح (مسالہ) اور سنگ و خشت نکلوا لیتے اور اس سے نہایت مضبوط اور کارآمد رفاہ عام کے کام تیار کراتے تھے۔ گجرات کے متصل ایک تیز رو نالہ پر آپ نے ایک شاندار محرابی رہگذر (معبر) بنوایا تھا جو اب تک محفوظ اور اچھی حالت میں ہے۔ آپ نے بہت سے پُل ندی نالوں پر گجرات و سیالکوٹ و گوجرانوالہ کے علاقوں میں بنوائے تھے۔ تالاب کھدوائے۔ مساجد تعمیر کرائیں آپ نے ۱۰۸۸ھ (۱۶۷۶ء) میں رحلت فرمائی۔ آپکے سجادہ نشین اور خلیفہ بھون شاہ نے آپ کا مزار ۱۱۳۲ھ (۱۷۱۹ء) میں تعمیر کرایا۔ ۱۲۸۲ھ (۱۸۶۶ء) میں فرش کو بلند کر کے از سرِ نو بنوایا گیا۔ پھر ۱۳۱۶ھ (۱۸۹۸ء) میں اُس کی مکمل اور بخوبی مرمت ہو گئی

"شاہ دولہ کے چوہے" آپ کی کرامات جاریہ میں شمار ہوتے ہیں پنجاب میں ان کا دخل و وجود ہر جگہ پایا جاتا ہے۔ یہ گاڑیوں کے ساتھ ساتھ بازاروں میں گھومتے پھرتے دیکھے جاتے ہیں۔ اگر بچہ ہے تو کسی آدمی کی گود میں نظر آئے گا۔ ان کا سر چھوٹا اور گول، کان لمبے لمبے شکل و صورت چوہے کی سی ہوتی ہے۔ قریب آکر تھپکیاں دیتے اور ایک انداز سے مسکرا کر مسکوک امیض کے لئے ہاتھ بڑھا دیتے ہیں۔ مانگنے کھانے کی یہ روش و طریقے ان کو ان کے مالک سکھاتے ہیں جو ان بے شعور و بے زبان، انسان نما جانوروں کو اپنا ذریعہ معاش بناتے ہیں۔ امپریل گزیٹیر لکھتا ہے کہ اس درگاہ کی شہرت سارے صوبہ میں بلکہ باہر بھی بہت دور دور تک ہے۔ یہ مقام خلاف سرشت انسانی یا مسخ شدہ آدمیوں کی ایک تعداد کثیر کا مسکن و مرجع ہے جنکے سر چھوٹے اور عقل ضعیف ہوتی ہے "یہ شاہ دولا کے چوہے کو دور دراز مقامات اور مسافت بعیدہ سے لائے جاتے ہیں خود والدین اپنی اولاد کو اس امن حالی اور اسکے احوال کیساتھ حال بنانے کیلئے ایسے چونکے سر دباو دیتے

عزل خدمت و بازتقرر

واقعہ معزولی سنہ ۱۱۱۶ھ میں پیش آیا اور اسی سال ۵ جمادی الاول (۵ ستمبر ۱۷۰۴ء) میں میر صاحب بلگرام واپس آ گئے۔ کسی سانحہ نگار نے وجہ عزل نہیں لکھی کہ آیا معزولی کسی الزام پہ مبنی تھی یا اُن اسباب پر جن کو موجودہ ملکی و سیاسی مصطلحات میں "بغرض نفع سرکار" یا "انتظاماً" کہا جاتا ہے۔ قرینہ یہ ہے کہ کسی جرم یا خطا کا تعلق اس حکم سے نہ تھا۔ کیونکہ مرزا بابا علی بیگ نے اس مرتبہ بھی غائبانہ قدردانی کی اور اُسی سال ۱۱۱۶ھ (۱۷۰۴ء) پھر سے خدمات یعنی بخشی گری و وقائع نگاری و سوانح نویسی سرکار بھکر[1] و سرکار سیوستان[2] (ملک سندھ) کی بارگاہ خلد مکان سے ان کے متعلق کرا

۱؎ بکر یا بھکر دریائے انڈس (سندھ) میں ایک قلعہ بند جزیرہ (ضلع سکھر، ملک سندھ، صوبہ بمبئی) میں شہر سکھر و روہڑی کے واقع ہے ۱۹۰۱ء میں مردم شماری ۲۰۶۲ تھی مگر روز بروز کم ہوتی جاتی اور ویرانی بڑھتی جاتی ہے۔

بھکر ایک سفید پتھر کی پہاڑی پر آباد ہے جو شکل میں بیضاوی، آٹھ سو گز لمبی اور تین سو گز چوڑی اور تقریباً پچیس فٹ بلند ہو گی۔ دریا سے چینل جو بھکر کو سکھر کے ساحل سے جدا کرتا ہے سو گز سے زیادہ چوڑا نہ ہوگا بلکہ جب طغیانی پر نہیں ہوتا تو وسط میں صرف پندرہ فٹ عمیق رہتا ہے۔ لیکن شرقی چینل جو اسکو روہڑی سے علیحدہ کرتا ہے بہت زیادہ چوڑا ہے یعنی جب دریا اپنے سب سے کم وسعت عرض میں آ جاتا ہے تو قریب چار سو گز کے چوڑا اور وسط میں ساٹھ گز گہرا رہتا ہے۔ سرکاری تاربرقی کی لائن جو روہڑی سے سکھر کو جاتی ہے جزیرہ بھکر میں ہو کر دریا کو عبور کرتی ہے۔ ریلوے اُس پُل پر ہو کر جو زیادہ چوڑی شاخ پر بنایا گیا ہے گزرتی ہے یہ لانسڈون برج Lansdowne Bridge جو بھکر ہو کر انڈس کو عبور کراتا ہے سنہ ۱۸۸۹ء میں اُنتیس لاکھ سے زائد صرف سے تعمیر ہوا تھا۔ اس کا سب سے بڑا چشمہ یا محراب جو مابین بھکر اور روہڑی کے ہے آٹھ سو بیس فٹ کا ہو گا۔ بھکر سے کسی قدر شمال کو ایک چھوٹا سا جزیرہ "خواجہ خضر" یا "جند (زندہ) پیر" کے نام کا ہے۔ درمیان میں ایک تنگ آبنائے ہے جس پر بآسانی گزر ہو سکتا ہے۔ اس جزیرہ میں ایک نہایت متبرک مزار ہے۔ بھکر کے جنوب میں ایک جزیرہ ہے جو "سادھ بیلا" کہلاتا ہے اور برگ و بار و سبزہ و گل سے ڈھکا ہوا ہے اس میں بہت سے متبرک مقامات اور مقابر ہیں۔ تقریباً پورے جزیرہ بھکر پر قلعہ پھیلا ہے۔ دیواریں

اور سند سلطانی حاصل کرکے ایک قاصد اجیر کے ہاتھ روانہ بگرام کی اور کہلا بھیجا کہ ہم نے دو تین مہینوں کے عوض چند خدمات آپکے لئے حاصل کی ہین بہتر ہے کہ سفر دکن کی زحمت نہ اٹھایئے بلکہ وہین سے براہ راست مستقر خدمت کو تشریف لے جایئے" اُسی سند کی ایک نقل

دو بڑی ہین جنمین سے ہر ایک ۳۰ فٹ تک بلند ہونگی۔ بہت سے برج ہین۔ یہ چیزین پختہ اور چند کچا خام اینٹ سے بنائے گئے ہین اور متوازی راستہ ہین جنمین راہ گذر رکھی جاتی ہے۔ اسمین دو پھاٹک ہین ایک شرق مین دو بری کی جانب دوسرا غرب مین سکھر کے رُخ۔ دریا سے قلعہ کا نظارہ نہایت دلکش اور اچھا معلوم ہوتا ہے لیکن اب اسکی دیوارین بہت خراب ہو گئی ہین۔ آئین اکبری مین لکھا ہے سرکار بھکر پرگنہ بھکر قلعہ مستحکم دارد دوسرے موقع پر یہ تحریر ہے کہ بھکر گزین دولت آن را در کہن نامہا منصورہ نوشتہ ہر شش دریا یکجائی گزیدہ از تہ او گذرد۔ دو حصہ از جانب جنوب و یک بخش از شمال۔

اگلے زمانہ مین اپنے موقع اور جگہ کی تنہائی کی وجہ سے بھکر ایک زبردست حصن اور اہم مقام سمجھا جاتا تھا۔ اسکی تاریخ بہت سے مسلسل نزاعات اور پیہم جدالات کا نشان دیتی ہے ۷۲۷ھ (۱۳۲۷ء) مین جب سندھ سلطنت دہلی کا ایک جزو تھا تو بھکر ایک مشہور اہم اور قابل لحاظ و توجہ مقام شمار ہوتا تھا جسکے لئے سلطان محمد بن تغلق کو نہایت معتمد اور معتبر سردار اسکی حکمرانی کے لئے بھیجنا پڑتے تھے۔ شاہان سما کے عہد مین اس قلعہ پر چند بار نقل و دخل ہوا کبھی اُن کا قبضہ ہو جاتا اور کبھی سلاطین دہلی کا رہتا۔ شاہ بیگ ارغون کے زمانہ مین بھکر کی قلعہ بندی و تحصین از سرِ نو بالتقریبا کل کی گئی قلعہ الور کو توڑ کر اس کا تمام سامان قلعہ بھکر کی تعمیر و درستی کے کام مین لایا گیا۔ ۹۸۱ھ (۱۵۷۴ء) مین جلال الدین اکبر نے اس قلعہ کو فتح کیا اور ۹۸۵ھ (۱۵۷۸ء) مین یہ مقام کیشو خان کے حوالہ کر دیا گیا تھا جو شاہنشاہ اکبر کا ملازم تھا۔ ۱۱۹۹ھ (۱۷۸۵ء) مین یہ قلعہ کلہوڑا سلاطین کے قبضہ مین آیا اور کچھ دن بعد افاغنہ کے ہاتھ مین۔ افاغنہ کے قبضہ سے خیرپور کے میر صاحب نے چھینا تھا میر صاحبان سے لیکر انگریزون نے ۱۸۳۹ء مین فتح کیا۔

بھکر صوبہ ملتان مین ایک سرکار تھی۔ یہان اکبر بادشاہ نے سکہ مِسی کی ٹکسال قائم کی تھی۔ یہان کے دام اب نہایت نایاب ہین۔ صرف عجائب خانہ کلکتہ مین ایک موجود ہے۔ عموماً دام اکبری کا نقشہ ہوتا تھا وزن مین تولہ بھر مربع جیسے دلی کا چپا۔ ایک طرف معمولی نشان سے بادشاہ کا نام دوسری طرف نہایت خوش قلم خط ثلث مین دام۔ روپیہ کے چالیس دام تانبے کے قرار دئے گئے تھے۔ مقامی حالات کی نسبت ابو الفضل لکھتا ہے کہ "باران کم شود و میوہ گزین۔"

بھکر مین سرکار برطانیہ کا سلح خانہ بھی مہم افغانستان و جنگ سندھ کے زمانہ مین رہا ہے

سیدستان اب سہوان ایک ولی اللہ کا آرامگاہ اور مرجع خلائق ہونے کے سبب سے

دوسرے قاصد کی معرفت بھکّر و سیوستان بھی بھیج دی - وہاں کی رعایا اور اہل علاقہ کو میر عبدالجلیل کے تقرر اور خدمات پر سرفراز ہونے کا اعلام و اعلان کرا دیا۔ اتفاقاً میرزا صاحب کا قاصد جو میر کے پاس بلگرام سند لئے جاتا تھا اثنائے راہ میں مارا گیا جب میعاد کو بہت زمانہ گزر گیا اور اُن کو اسکی اطلاع پہونچی تو مثنے سند مرتب کرا کے پھر بلگرام بھیج دی۔

سُہوان شریف" کہلاتا ہے - صاحب جامع التواریخ نے سہواں کو سیوہان لکھا ہے سہوان صوبہ بمبئی ملک سندھ میں، ایک جدید قائم شدہ ضلع لارکانہ میں ایک حصہ ضلع کا صدر مقام ہے جسمیں تعلقہ جات دادو و جوہی و سہواں شامل ہیں قصبہ سہوان شمالی و مغربی ریلوے کا اسٹیشن اور اُس شاہراہ پر واقع ہے جو کوٹری سے شکارپور کو لارکانہ ہو کر جاتی ہے - کوٹری سے شمال و مغرب میں ۸۴ میل پر اور لارکانہ کے جنوبی و مغربی گوشہ میں ۹۵ میل پر ہوگا - اُس کی بلندی سطح بحر سے الیکسنڈرہ فیٹ ہے ۱۹۰۱ء کے شمار کے مطابق یہاں سوا پانچ ہزار نفوس کی آبادی تھی لیکن جیسا کہ تمام پُرانے مسلمان قصبات کی حالت ہے ۱۹۲۱ء میں صرف چار ہزار چار سو تیئیس (۴۴۲۳) رہ گئی۔

دریائے سندھ کسی وقت اس قصبہ کے قریب بہتا تھا اب بالکل علیحدہ اور دُور ہو گیا ہے سہوان سے چند میل دکن کی جانب لکی (لکھی) پہاڑیاں یکبارگی ختم ہو جاتی ہیں جس سے اس تعلقہ اور قصبہ کی ایک خاص ہیئت بنگئی ہے مسلمان باشندے زیادہ تر مچھلی کے شکار میں مصروف رہتے ہیں اور رہد تجارت میں - یہاں کے باشندگان کی ایک بڑی جماعت پیشہ ور گداگروں کی ہے جنکی بسر اوقات محض اُن زائرین و معتقدین کی نذر و نیاز سے ہوتی ہے جو مخدوم سید لعل شاہ باز کی درگاہ پر گذرتی ہیں۔

ان بزرگ کا مقبرہ مربع ہے جو اور عمارات سے گھرا ہوا ہے - اسکے اوپر گنبد اور قندیل سے ۷۵۷ھ و ۱۳۵۶ء میں تعمیر ہوا تھا - اس میں خوشنما مینا کاری ہے اور نہایت نفیس عربی کتبے لگے ہیں مرزا جانی بیگ حکمران ٹھٹھہ نے جو ترخان خاندان کا مایۂ افتخار تھا حضرت مخدوم کی یادگار میں ایک رفیع الشان گنبد تعمیر کرایا - تیاری و تکمیل کی نوبت ۱۰۴۹ھ و ۱۶۳۹ء میں پہونچی - تال پور کے میر صاحب کرم علی خان نے پھاٹک اور کٹہرہ پر چاندی کے پتر چڑھوائے اور گنبد پر چاندی کے کنگرے لگوائے۔

مولانا غیاث الدین محمد اپنی مشہور کتاب اللغات میں لکھتے ہیں کہ "لال شہباز، صاحب کمال درویش تھے - اکثر قلندر اُن کے ساتھ اعتقاد تمام رکھتے اور بھنگ پیتے وقت ان کو یاد کر لیتے ہیں"۔

مخدوم کی نسبت میر غلام علی آزاد ماثر الکرام میں خود اپنا تجربہ اور عالم رویا کا مشاہدہ نقل کرتے ہیں نیز یہ کہ نام نامی عثمان تھا مرند (تبریز کے ایک قریہ) کے رہنے والے تھے - سید ملک بن بابا ابراہیم

اس مژدہ تقرر کے پہونچنے پر میر صاحب جمادی الاول ۱۱۱۷ھ (اگست ۱۷۰۵ء) میں راہگرائے ملک سندھ ہوئے ۲۴ رجب ۱۱۱۷ھ (۳۱ اکتوبر ۱۷۰۵ء) کو سواد بھکر میں ان کے قدم پہونچے اور اپنی مسند خدمت پر متمکن ہوئے میر عبدالجلیل سالہا سال تک دیانت و امانت کے ساتھ ان عہدوں کا کام انجام دیتے رہے خود بھکر میں نشست اختیار کی ۔ اپنے داماد سید محمد اشرف کو

مرید شیخ جمال مجرد کے مرید ہوئے تھے ۔ ہندوستان آئے تو شیخ فرید گنج شکر شیخ الاسلام ناصر الدین زکریا اور شیخ صدر الدین عارف کی خدمت میں رہکر فیض اٹھایا ۔ قطب دین اور بارہ سید بھی کہلاتے تھے نسب شریف تیرہ واسطہ سے امام جعفر صادق رضی اللہ عنہ تک پہونچتا ہے ۔ شاہجہان نامہ و تاریخ فیروز شاہی (ضیاء برنی) میں آپکے حالات تفصیلاً مرقوم ہیں ۔ مولانا محبت علی تتوی اور صاحب تذکرہ مشائخ ہند نے بھی نقل کئے ہیں ۔ ۱۱ شعبان المعظم ۶۷۳ھ (۲۰ فروری ۱۲۷۵ء) کو وفات پائی ۔

یہاں کی ایک درگاہ او بقابل ذکر ہے ۔ یہ شیخ جمعہ علیہ الرحمہ کا روضہ ہے جو برلب دریائے سندھ واقع ہے ۔

صنادید سلعہ میں سہوان کا مشہور قلعہ ہے جس کی تاسیس و تعمیر اسکندر مقدونی سے منسوب ہے یہ ایک اسی یا نوے فیٹ بلند مصنوعی ٹیلہ ہے جسکے اوپر پہونچکر طول ڈیڑھ ہزار اور عرض آٹھ سو قدم پایا جاتا ہے ۔ اب تک شکستہ و منہدم دیواروں سے گھرا ہوا ہے ۔ اسکے اندر ٹوٹے ہوئے مٹی کے برتن اور ٹھیکرے منتشر و متفرق پڑے ہیں ۔ ٹیلہ بظاہر دست صنعت کی کاریگری نظر آتا ہے بہت سے برجوں اور مناروں کے نشانات نمایاں ہیں حصار و قلعہ نہایت بے مرمت ہو رہا ہے ۔ قلعہ کے نیچے صحابیوں کا پرانا گورستان ہے جس میں چند قبریں اور تاریخیں انیسویں صدی مسیحی کے آغاز کی پائی جاتی ہیں ۔ درحقیقت سہوان ایک نہایت قدیم جگہ ہے ۔ روایات سے پایا جاتا ہے کہ قصبہ کا وجود اس وقت بھی تھا جبکہ ۹۳ھ (۷۱۱ء) میں سندھ پر مسلمانوں کا پہلا حملہ محمد بن قاسم ثقفی کے زیر قیادت ہوا ۔ یہ وہی مقام خیال کیا جاتا ہے جو برہمن کوٹ کی فتح کے بعد ان کے قبضہ میں آیا ۔ نیرون کوٹ اب حیدرآباد کہلاتا ہے ۔ مشہور سیاح ابن بطوطہ مغربی کا بھی ۷۳۴ھ (۱۳۳۳ء) میں ان اطراف سے گذر ہوا تھا

باہر جانے والی اشیائے تجارت میں گیہوں او چاول ہے ۔ مقامی تجارت خاص کر کپڑے اور غلہ کی ہے ۔ دستکاری میں دریاں ، موٹے کپڑے اور ظروف سفالین داخل ہیں ۔ ٹھپر کندہ کرنے کا ہنر جس کا رواج پہلے بہت زیادہ تھا ، اب قریباً نابود ہو گیا ہے ۔ سندھ کے اور مقامات کی طرح سہوان میں بھی موسم گرما بہت سخت گزرتا ہے ۔ سالانہ بارش کا اوسط چھ و نو انچ کے مابین ہے ۔ ان اطراف میں مسلمانوں کی آبادی پچاسی فیصد ہے اور چورانوے ۹۴ فیصد اشخاص سندھی زبان بولتے ہیں

سیوستان مین نائب مقرر کر کے بھیج دیا جب وہ اشرف کو وہان آنے کی رخصت دی تو سید کرم اللہ نے اپنے برادر زادہ کو نیابت سیوستان کے لیے روانہ کیا سید کرم اللہ بڑے ذی علم اور ذی ہوش بزرگ تھے۔ ایک زمانہ تک یہ خاندان نیک نامی کے ساتھ بخشیگری و سوانح نگاری سرکار سیوستان کا کام انکے باپ بھی کرتے رہے۔ انہون نے اپنے اعمال کے بہت سے نشانات اور اچھے کام یادگار چھوڑے تھے درگاہ شیخ محمد کے متصل بر لب دریاے سندھ محلہ شیخ ...کاری کے نیچے ایک رفیع الشان مسجد بھی تعمیر کرائی تھی۔

عہد اورنگ زیب عالمگیر مین سیوستان کی حکومت ملتان مین داخل تھی۔ آئین اکبری مین تحریر ہے کہ "حویلی سیوستان قلعہ مستحکم است ... سہوان بزرگ کولابیست دراں اندر دورہ راہ تن اسپیور گویند ... آب سیما ساحت ... ماہی گیران بزندگی بسر برند" اس وقت سیوستان (سرکار) صوبہ ملتان کے متعلق تھا

سن ۱۸۴۲ء مین جو گزیٹیر ضلع سرکار انگریزی مرتب و طبع کیا گیا تھا اور جس کو ماضی بعید کے قریب کی تاریخ کہنا چاہیے اس مقام کی نسبت لکھا ہے۔

"قصبہ بھکر دریاے سندھ کے داہنے ساحل پر ایک شورزار میدان مین دریا سے نصف میل کے فاصلہ پر آباد ہے پہاڑیون کا ایک سلسلہ حائل ہے جو مشرق سے چلا آتا ہے اسوقت یہ مقام نہایت خستہ و تباہ حال ہو رہا ہے ہر جگہ ویرانے اور ہر طرف کھنڈر نظر آتے ہین البتہ کسی زمانہ مین بہت آباد اور بڑی جگہ رہی ہوگی بہت سے مقابر، مساجد، برج اور مینارے مع اپنی چینی کے تکلفات اور گلکاریون کے دکھائی پڑتے ہین اور میدان بھر مین پھیلے ہوئے ہین اور اسکی سابقہ عظمت و شان کا اظہار کرتے ہین دریا کے کنارے کچھ زراعت بھی ہوتی ہے جسکے ساحل پر کھجور کے درخت بار چلے گئے ہین اور نہایت خوشنما اور نظر فریب معلوم ہوتے ہین آگے چل کر یعنی جنگل کے اندر بڑھ کر سارا ملک نہایت ویران اور شورزار بیابان ہے کہین کہین خاردار جنگل وغیرہ سے گھرا ہوا ہے

دریاے سندھ کی رفتار بھکر کے پاس فی گھنٹہ تین میل اوسط گرمی کی ہوگی۔

سردی مین انتہا کی سردی ہوتی ہے یعنی جنوری مین پیمانہ ۴۵ درجہ پر پارہ ہو جاتا ہے گرمی مین گرمی بھی شدت کی پڑتی ہے۔"

خُلد مکان کی رحلت کے بعد اُن کو کوئی دشواری پیش نہین آئی۔ اُن کی قدر و منزلت تمام شاہزادگان اور ارکان سلطنت کے نقش خاطر ہو رہی تھی اپنے طبقات اور علاقہ ہاے خدمت مین بدہ نہایت عزیز و مقبول ہو رہے تھے بھکر سے نقل و حرکت کرنے کے بغیر زمانہ محمد شاہ بادشاہ تک ہر عہد مین ارکان سریر خلافت استقلال خدمت کی اسناد ان کو روانہ کر دیتے تھے۔ لیکن میر صاحب کی بعض کی تحریرات سے پایا جاتا ہے کہ انقلابات پیہم اور اہل دربار کی سازشون اور خفیہ و علانیہ ریشہ دوانیون سے اُن کو کسی وقت اطمینان و دلجمعی نصیب نہین ہوئی۔ اُن کے کان ہر وقت آستان خلافت کے اخبار پر لگے رہتے تھے۔ انکی بے اطمینانی و انتشار کا عکس اُن کے متوسلین اور اہل وطن پر بھی پڑتا تھا اور اُن کو بھی ہر وقت ان کے تعلقات و ملازمت کی جانب سے تشویش رہتی تھی۔ میر سید محمد کو ایک خط مین لکھتے ہین کہ "برخوردار! بعد بند کر دینے تمام خطوط اور ختم کر دینے اس خط کے بائیس روز مین حضور پُر نور سے یہ خبر بھکر پہونچی ہے کہ جو صاحب اشفاق الرسول نامی بیشتر سوانح نگار بھکر کے تھے اور اس زمانہ مین پھر اسی خدمت کے متلاشی اور خواہان تھے بفضل الٰہی اس خدمت سے موقوف رہے۔ سوانح نگاری شہر ندیر سفر ہو گئے ہین۔ بارے اس خبر سے فی الجملہ

حضرت خواجہ سید عبداللہ حسینی بھکری اور اُن کے والد خواجہ سید اسداللہ المعروف بہ سلطان گنج نشین بھکری کے انتساب و توطن سے اس خطہ کو شرف و برکت حاصل ہے۔ سید وہی بھکر کو معظم و قابل احترام مانتے ہین مولانا ظہیر الدین بکری یہان کے مشاہیر علماء سے تھے۔

شیخ ابوالفضل لکھتا ہے۔ "میان سیوی و بھکر ریگ دشتے است، ہنگام تابستان سہ ماہ سموم وزد" "جزیرہ در بھکر و آن نواحی غیر از چلہ زمستان عرداں باشد۔"

مشہور افریقی سیاح ابن بطوطہ یہان ۷۳۴ھ (۱۳۳۳ء) مین وارد ہوا تھا

۵۲۵ سید کرم اللہ سواد سیال کوٹ مین ۱۲ محرم الحرام ۱۱۳۴ھ ۱۲ اکتوبر ۱۷۲۱ء کو شہید ہوے اور حضرت امام الحق کی درگاہ مین فرست دروازہ کے متصل مدفون ہین۔ میر عبدالجلیل کے بڑے سمدھی یعنی سید عنایت اللہ کے باپ تھے۔ سید صاحب بہت سی ایک یادگارین چھوڑی تھین۔

اطمینان خاطر ہو گیا ہے لیکن اس دور کی خدمات پر مطلقاً اعتماد نہیں ہے۔"

عارف لبید نے اسی حقیقت یعنی دنیا کی ناپائداری کے راز کو اسی زبان میں آشکار کر دیا ہے

الا کل شیء ما خلا اللہ باطل — و کل نعیم لا محالۃ زائل

ف ۵۲ قصبہ سرہند تحصیل فتح گڑھ یا سرہند، نظامت امرگڑھ، ریاست پٹیالہ ملک پنجاب میں واقع ہے ریلوے اسٹیشن ہے۔ آبادی ۱۹۰۱ء میں ساڑھے پانچ ہزار نفوس کی تھی جو ۱۹۲۱ء میں چار ہزار چھ سو رہ گئی۔ سرہند کا املا حال کی ایجاد ہے اور سمجھا جاتا ہے کہ "سر" اور "ہند" (سرِ ہندوستان) سے مرکب ہے۔ یہ نام غالباً اس مقام کی خوبی اور موقع کی مناسبت کے لحاظ سے قرار دیا گیا ہوگا۔ عہد اسلام کے مورخین اسکو سہرند (بکسر سین مہملہ و سکون ہا و کسرہ را و سکون نون و دال مہملہ) لکھتے اور بروئے جغرافیائی طریق اظہار پر اس شہر کا موقع مابین دہلی و لاہور شارع اعظم پر تحریر کرتے ہیں۔ اہل ہند اس کا تلفظ سہرند کرتے اور سہرند کے معنی "شیر کے جنگل" کے بتاتے ہیں ایک روایت سے پایا جاتا ہے کہ اس کا بانی ساہیرائے فرمانروائے لاہور تھا جو کرشن جی سے ایک سو چھیاسٹھویں (۱۶۶) پشت میں تھا۔ ابوالقاسم فرشتہ کا خیال ہے کہ یہی جگہ قلعہ جے پال کی مشرقی حد تھی جو اُس عہد کا رئیس بادشاہ تھا۔ مگر بعض مورخین نے اسی کو بھٹنڈا یا سرہند سمجھا ہے۔ مسلمانوں کی فتح کے بعد یہ دہلی کا ایک جزو ہو گیا تھا۔ سلطان رضیہ بنت شمس الدین التمش کے عہد میں ملک التونیہ والی سرہند نے بغاوت کی۔ ملکہ اُسکے مقابلہ کیلئے خود گئی۔ امرائے غداری اور کافر نعمتی کی۔ ملک التونیہ سے مل گئے۔ امیر جمال الدین یاقوت حبشی (رسالدار لشکر رضیہ) کو مار ڈالا اور ملکہ کو گرفتار کر کے قلعہ سرہند میں قید کر دیا۔ اُسنے مجبورانہ ملک التونیہ سے نکاح کر لیا۔ کچھ زمانہ بعد فیروز شاہ ثالث نے اپنے مرشد جلال الدین بخاری کے ارشاد سے اسکی بنیاد از سر نو ڈالی قلعہ تعمیر کرایا جس کا نام فیروز آباد رکھا ۷۶۲ھ (۱۳۶۱ء) میں وہ ایک جدید سرکار (ضلع) کا صدر مقام ہو گیا جو پرانے "سنام" و "سمانہ" کو تقسیم کر کے بنائی گئی تھی۔ فیروز شاہ نے ایک نہر بھی کھدوائی تھی۔ یہ نہر اب بھی ہے جو قصبہ کے قریب سے گذرتی ہے سرہند ہمیشہ ایک مضبوط اور اہم مقام سلطنت دہلی میں رہا ہے ۸۱۸ھ (۱۴۱۵ء) میں خضر خان نے جو دہلی کا سب سے پہلا فرمانروا خاندان سادات سے تھا اپنے بیٹے ملک الشرق ملک مبارک کو فیروز پور سرہند کا گورنر اور ملک سدھو نادرہ کو اسکا نائب مقرر کیا۔ ۸۱۹ھ (۱۴۱۶ء) میں ملک سدھو کو طغان رئیس اور دوسرے ترکوں نے قتل کر ڈالا لیکن زیرک خان گورنر سمانہ نے

عزل مکرّر و بحالی خدمات

عہد فرخ سیر بادشاہ مین نیرنگی قدرت الٰہی سے ایک عجیب واقعہ پیش آیا پرگنہ جھونی ۱۱۲۵ھ اعمال (ضلع) بھگّر مین مصری کے ریزے جو چھوٹے چھوٹے اولون دژالہ خرد) کے برابر تھے ابر سے برسے - اس حلاوۂ غیبی کے نزول سے ایک عالم کے کام وزبان شیرین ہو گئے سانحہ نادر وغریب تھا میر صاحب نے یہ رُباعی لکھ کر فرد وقائع مین مندرج و معروض کر کے بارگاہ شہنشاہی کو روانہ کر دی ؎

دوسرے سال اس بغاوت کا استیصال کر دیا ۸۴۵ھ (۱۴۴۲ء) میں خضر خان نے سرہند مین سیارنگ خان باغی کو شکست دی، سرہند اُس وقت ملک سلطان شاہ لودی کی گورنری کے تحت تھا یہی مقام ہے جہان ملک بہلول لودی نے ۸۵۵ھ (۱۴۵۱ء) مین سلطان کا خطاب اختیار کیا تھا - سلاطین مغلیہ کی دولت مین سرہند نہایت سرسبز اور بارونق شہروں مین شمار ہوتا تھا اور ”بلدۂ معظمہ“ بارھوین صدی ہجری کے وسط تک لکھا جاتا تھا - اسمین تین سو ساٹھ مساجد، مقابر اور سرائین تھیں - حمامات تھے - ریلوے اسٹیشن سے ایک میل چل کر اس کے کھنڈر شروع ہو جاتے اور کئی میل تک چلے جاتے ہین عہد اورنگ زیب عالمگیر مین صوبہ دہلی کے متعلق ایک سرکار تھا صاحب آئین اکبری لکھتا ہے ”سہرند ار نامور شہرہا - دباغ حافظ رخنہ لساط افزائے نظارگیان - سرکار - قلعہ دار دار خشت پختہ“

اسی قصبہ میں ۱۱۱۷ھ (۱۷۰۵ء) میں بازید خان گورنر سرہند نے ماتا فتح سنگھ اور زورآور سنگھ پسران گورو گوبند سنگھ کو دیوار مین اینٹون سے زندہ چنوا دیا تھا - اُسی زمانہ سے یہ جگہ آج تک سکھون کی نظر مین مقہور و ملعون ہے اور سُرہند سے موسوم - ۱۱۲۰ھ (۱۷۰۸ء) مین بندا بیراگی نے سرہند پر تاخت کی اور بازید خان کو قتل کر ڈالا احمد شاہ دُرّانی نے ۱۱۷۴ھ (۱۷۶۱ء) میں زین خان کو صوبہ دار سرہند مقرر کیا مگر جمادی الاول ۱۱۷۷ھ (دسمبر ۱۷۶۳ء) مین سکھون نے اس شہر پر قبضہ کر لیا اور زین خان کو ایک موضع متصلہ مہیر مین قتل کر ڈالا - پھر یہ شہر اور ملحقہ علاقہ راجہ الا سنگھ کے قبضہ مین آگیا - قدیم ترین عمارات مین دو عالیس در رُجے معتبر ہین جو مرشد اور مریدہ کے کہے جاتے ہین اور وضع و قطع سے چودھوین صدی عیسوی کی تعمیر معلوم ہوتے ہین - بہلول لودی کی لڑکی کا مقبرہ (جو ۹۰۳ھ مطابق ۱۴۹۷ء مین فوت ہوئی تھی) اب بھی موجود ہے - شہر کے قریب ایک نہایت محترم و مقدس

فرخ سیرآن شہنشۂ بابرکات	چرخ از ادب او شدہ شیرین حرکات
در سند زمین عہد عشرت ہند ست	بارید سحاب، ریزۂ قند و نبات

میر جملہ سمرقندی اس زمانہ میں تمام مہمات سلطنت کے راتق و فاتق تھے حضور معلیٰ کے سوانح بھی انھیں کے متعلق تھے دبالآخر جمیع ممالک ہندوستان کے صدر الصدور ہو گئے تھے) بمجرد ملاحظہ فسرد وقائع بغیر اسکے کہ تحقیق و تفتیش کا حکم دیتے، حلاف واقع پر محمول کر کے میر جملہ نے اوائل ۱۱۲۶ھ (۱۷۱۴ء) میں میر عبدالجلیل کو معزول کر دیا۔ میر صاحب نے

گورستان میں شاہ زمان، فرمانروائے کابل بھی دفن ہیں

مسلمانانِ عالم کی نگاہوں میں سرہند کی عظمت و حرمت اس فرد فرید کی جائے ولادت اور اس کا آخری راحت گاہ ہونے کی وجہ سے ہے جو علوم صوری و معنوی کے آسمان پر آفتاب بن کر چمکا تھا اور جس نے حقائق و معارف الٰہیہ کے راز یگانہ و بیگانہ کے لئے آفتاب سے زیادہ روشن کر دئے تھے۔ میری مراد مولانا شیخ احمد بن شیخ عبدالاحد فاروقی رحمہما اللہ مجدد الف ثانی کی ذات اقدس سے ہے۔ اولیاء اللہ میں حضرت شیخ فرید ثانی اور حضرت شیخ محمد معصوم کابلی اور علما میں مولانا عبدالقادر سرہندی اور شعرا میں شیخ ناصر علی نے بھی اپنے مولد و موطن (سرہند) کا نام خوب روشن کیا۔

سرہند کے مفصل حالات حلیفہ محمد حسین کی دلچسپ تاریخ پٹیالہ (مطبوعہ ۱۸۷۸ء) اور مسٹر الجیسرائے زید کے گزیٹیر ریاست ہائے پھولکیان (مطبوعہ ۱۹۰۸ء) میں مرقوم ہیں

۵۲۱ ختوی، کے واقعہ کی طرح آج اسکا موقع بھی محتاج تحقیق ہو گیا ہے سرو آزاد (مطبوعہ رفاہ عام لاہور ۱۹۱۳ء) میں پرگنہ "ختوی از اعمال بھکر" لکھا ہے۔ مآثر الکرام (مفید عام آگرہ ۱۹۱۰ء) میں پرگنہ ختوی از توابع سرکار بھکر، اور مفتاح التواریخ (مطبوعہ نولکشور کانپور ۱۸۶۸ء) میں پرگنہ ختہ از اعمال بھکر،

ہندوستان کے مکمل اور ضخیم گزیٹیر کے دیکھنے سے اس اقلیم میں ختوی، نام کا کوئی پرگنہ پایا نہیں جاتا اگر کسی غیر معروف یا غیر معین قطعہ یعنی محض منسوب بہ جنوب پرگنہ سے مراد ہو تو دو ڈھائی صدیوں کے عظیم انقلابات و تغیرات کے بعد وثوق کے ساتھ اب اسکی حد بندی و تعیین دشوار ہے

ختوی، اگر صحیح مانا جائے تو اسکی دو صورتیں ہوتی ہیں (۱) ختوی۔ بلوچیوں کا ایک قبیل فرقہ

مستعجلانہ بھکر سے دار الخلافہ شاہجہان آباد[۲۱۲] کی جانب نقل و حرکت فرمائی ۱۰ رجب سنہ ۲ جلوس فرخ شاہی (۲۸ شعبان ۱۱۲۶ھ) کو وہان پہونچے اپنے لڑکے کو لکھتے ہین کہ "ستدائد[۲۱۳] این راہ دور و دراز کہ در عرصہ چہار ماہ طے نمودہ شد تا بجائولیہ مفصل از زبانی بایدے چشتا من واضح خواہد شد" اس زمانہ مین دہلی کا قیام روح فرسا و جان گسل تھا یہان کے گرانی ارزاق اور کثیر اخراجات سے سخت پریشانی کا سامنا رہا تاہم تسلی دیتے ہین کہ "احوال قلت و گرانی شہر دہلی القین کہ شنیدہ باشند

حیدر آباد سندھ میں ہے جسکی لودو ماتی کا صدر مقام دار الور شکار پور سے سیل پورب کو ہے۔ اس علاقہ مین اعلی درجہ کی پیداوار ہوتی ہے درائع آبپاشی متعدد ہین۔ یہ لوگ ریاست خیرپور و ضلع سکھر و سرحد سندھ بالائی تک پھیلے ہوئے ہین (۲) ایک موضع جتوئی تحصیل علی پور ضلع مظفرگڈھ صوبہ پنجاب مین ہے۔ اسکی بنیاد عالمگیر بادشاہ کے عہد مین میر محمد خان نے ڈالی تھی۔ اصل مقام تو دریائے سندھ نے غرق و نابود کر دیا مگر اسی نام سے آبادی دوسری جگہ قائم ہے۔ یہ قصبہ کچھ روز تک ریاست بہاولپور کے متعلق رہا پھر سکھوں نے چھین لیا موقع پاکر جتوئی کے باشندوں نے بغاوت کی اور بڑی دلیری و ہمت سے کام لیا۔ اس کو "شہر جتوئی" بھی لکھتے اور بولتے ہیں۔

ایک تیسری صورت اور ہو سکتی ہے۔ جتوئی، حسیوان کے متصل ملحقات سکھر میں، ضلع لاڑکانہ ملک سندھ میں ایک تعلقہ ہے اس میں مسلمانون کی آبادی بہت زیادہ ہے اور یہاں کی اراضی مین بہت سی قسم کی فصلیں پائی جاتی ہین۔ بارش حسب حال ہو تو ایک ہی تخم ریزی سے تھوڑے تھوڑے دنوں کی فصلیں متواتر پیدا اور تیار ہوتی ہین۔ زیادہ صحیح اور قابل اعتنا جتوئی معلوم ہوتا ہے جیسا کہ میر سید محمد نے اپنے بزرگوار کے "عنایت نامہ" کے ذیل میں تحریر کیا ہے اور جسکو انگریزی مترجم نے Perguna'z of Joy-too-ee in Sircar Bukkur لکھا ہے یعنی جتوئی جو دولت آئین اکبری سرکار بکھر میں ایک پرگنہ تھا

[۲۱۲] سنہ ۲ ھ قاضی عبد اللہ تورانی (فرخ سیر کا استاد) پہلے جہانگیر نگر ڈھاکہ کی قضا پر مامور تھا۔ فرخ سیر نے اسکو موتمد خان میر جملہ کا منصب و خطاب دے کر اپنا ہمدم و ہمراز بنا لیا تھا۔ پھر صوبہ دار بہار بنا دیا گیا۔ سادات بارہہ کی ملالت و ناخوشی کے باعث پایہ تخت کو چھوڑ کر کچھ روز لاہور جا کر رہا تھا۔ محمد شاہ کے جلوس کے پہلے سال مین صدر الصدور مقرر ہوا سنہ ۱۰ جلوس یعنی سنہ ۱۱۴۲ھ (سنہ ۱۷۳۰ء) میں انتقال کیا صدارت کل یا صدر الصدور کا عہدہ سلاطین اسلام کے زمانہ مین نہایت معزز و با اختیار تھا جملہ امور دینی داد و قانون اور جاگیرات مذہبی کا انصرام و انتظام اس کی خدمت مین داخل تھا وظائف خیر و مقاعات و امداد معاش کے معاملات اور سادات و مشائخ اور فقرا و علما و فضلا کے تقاضا یا اسی کی معرفت فیصل ہوتے تھے۔

بے جگری (بے جاگیری ؟) و بے کاری موجب تشویش خاطر گردیدہ حق سبحانہ بفضل خود آسان گرداند"

میر شیر علی افسوس اپنی کتاب آرایش محفل مین لکھتے ہین کہ "تب میر مذکور خبر مسطور کی صداقت کے لئے وہان کے قاضی مفتی بلکہ اکثر اشراف و ثقات کی مُہرون سے ایک محضر کروا کر حضور مین لے آیا اور مورد الطاف ہو کر اُسی خدمت پر پھر سرفراز ہوا" محضر کا تیار کرانا اور اُس کی ضرورت قرین قیاس ہے لیکن اس واقعہ کو نہ تو میر عبد الجلیل اپنے خطوط و حالات مین لکھتے ہین نہ آزاد اور دیگر تذکرہ نویس اس کا کچھ حوالہ دیتے ہین ان سب کی تحریرات کا ملخص تو یہی ہے کہ امیر الامرا سید حسین علی خان کی سعی و وساطت سے میر عبد الجلیل پھر اپنی خدمات پر بحال ہو گئے جسکی کسی قدر تفصیل نوّاب نامدار کے حالات و تعلقات کے ضمن مین ملے گی ۔ میر کا دعوے تو یہ ہے کہ

میر جملہ بڑا شاعر، صاحب دیوان تھا

۲۱۲ دہلی کو بارھوین مرتبہ ۱۰۴۹ھ (۱۶۳۹ء) میں شاہجہان نے از سر نو آباد کیا اور شاہجہان آباد نام رکھا تھا قلعہ کی بنیاد ۱۰۴۸ھ مین (۱۲ اپریل ۱۶۳۹ء کو) ڈالی گئی ساٹھ لاکھ روپیہ کے صرف سے قلعہ اور دیگر عمارات کی تعمیر ۱۰۵۸ھ (۱۶۴۸ء) میں ختم ہوئی میر یحییٰ شاعر نے تاریخ لکھی ع شد شاہجہان آباد از شاہ جہان آباد

۲۱۳ ۱۸۶۲ء کا امپیریل گزیٹیر لکھتا ہے کہ بھکر کا قلعہ بند جزیرہ دریائے انڈس (سندھ) کے وسط مین واقع ہے ۔ سطح بحر (سمندر) سے اسکی بلندی تقریباً دو سو فٹ ہوگی پرانا راستہ فیروزپور ہوکر جانے کا تھا جسکی مسافت چار سو چالیس میل ہی ہوگی ۔ راستہ ستلج اور انڈس کے ساتھ ساتھ دریا کے کنارے ہو کر جاتا تھا ۔ یہ ایک پتلی سی گردن زمین کی ہے جو ان دونون دریاؤن کے بیچ مین چلی گئی ہے اور صحرائے اعظم مین داخل ہے ۔ یہ حصہ کم سر سبز زمین کا ہے اور وہ بھی صحرا سے تین میل سے لے کر تیس میل کی چوڑائی میں ہوگا اوسطاً دس میل کے قریب مان لیجیے لیکن بہت سے مقامات پر صحرا بالکل دریا کے ساحل کے ساتھ ساتھ آ جاتا ہے اور اکثر قصبات و دیہات کو تباہ کر ڈالتا ہے

اس کا مقابلہ زمانہ حال کی سہولتوں سے کیا ہو سکتا ہے اب ذرائع سفر متعدد اور بہت آسان ہیں

پروانگی بحالی آمد چون الشان (امیر الامرا) و قطب الملک و بادشاہ بحال کردند دیگر جائے دم دن
نماند۔ با آن کہ بدع ہر گرہ استدعائے بحالی این خدمت نکردہ بود اما بر قسمت خود راضی نماید
ما شاء اللہ کان۔

میر صاحب نے شیخ محمد رضا بھکری کو اپنی نیابت پر مقرر فرمایا اور سوانح نگاری کی سند
اُن کے پاس بھیج دی وہ اُس وقت بخشی و وقائع نگار بھکر کے تھے۔ بعد کو دفتر سوانح حضور
سے معلوم ہوا کہ ماہ جمادی الاول ۱۱۳۰ھ میں بھکر و سیوستان میں میر صاحب کا عمل ہو گیا
اور وہاں کے سوانح کا "تلوہ" (پیکٹ) میر صاحب کی مہر ثبت ہو کر حضور پُر نور میں پہونچا
کچھ زمانہ بعد میر نے اپنے دوسرے داماد سید محمد نوح (پدر آزاد) کو بھکر و سیوستان روانہ کیا۔
وہ وہاں سات سال تک نائب رہے۔
میر عبدالجلیل سندھ کے قیام و تعلق سے ہمیشہ پریشان و دل برداشتہ رہے۔ اپنے اعزہ و اہل وطن سے
برابر شکایت ناسازی آب و ہوا کرتے اور لکھتے رہتے تھے کہ "راہ نیابت دور و دراز از خانہ تا سواد بھکر بہم جا

(۱) دریائے سندھ (۲) بہت سی پختہ سڑکیں (۳) نارتھ ویسٹرن ریلوے (۴) حیدرآباد جودھپور کی لائن جو سرحد کو جودھپور
سے کا میر ریلوے سے ملاتی ہے اور اس طرح سندھ راجپوتانہ، مشرقی و وسطی ہندوستان و گجرات سے ملحق ہے۔
میر عبدالجلیل کے وقت میں بھی ہرکارے اور پیادے دہلی سے بھکر بائیس روز میں پہونچ جاتے تھے
سنہ ۷۴۲ھ دہلی کی آبادی و بربادی کی طرح دہلی کے قحطوں کی تاریخ بھی دلچسپ و طویل ہے۔ سب سے بڑا اور پہلا قحط جس کا
تذکرہ حالات ماضیہ کے سلسلہ میں کیا جاتا ہے سنہ ۷۴۶ھ (۱۳۴۵ء) میں بعہد محمد تغلق پڑا تھا جب آدمی کو آدمی کھا جاتا تھا
اسکے بعد سنہ ۱۰۴۰ھ (۱۶۳۰ء) میں شاہجہان کے وقت میں واقع ہوا پھر سنہ ۱۰۷۱ھ (۱۶۶۱ء) میں جو اورنگ زیب کا ابتدائی زمانہ
تھا یہ قحط بھی سخت تھا محمد شاہ کے وقت میں سنہ ۱۱۵۲ھ (۱۷۳۹ء) میں قحط پڑا۔ آفت پر آفت یہ آئی کہ اسکے بعد ہی نادر شاہ کا
حملہ ہوا پھر سنہ ۱۱۸۴ھ (۱۷۷۰ء) اور سنہ ۱۱۹۹ھ (۱۷۸۴ء) میں قحط پڑے۔ انگریزوں کی عملداری میں سب سے پہلے
سنہ ۱۸۳۷ء میں قحط پڑا اسکے بعد کے قحط جتنے سالیان تقریباً اکثر اہل علم حضرات کو معلوم ہیں
میر عبدالجلیل جس (سنہ ۱۱۲۸ھ والی) مصیبت و تکلیف کا ذکر کرتے ہیں ظاہر ہے کہ اس گرانی نے بھی اس زمانے کی
سیاسیات و تجارت و اخلاق ملکہ باشندگان کی صحت و عافیت پر کتنا خراب اثر ڈالا ہوگا۔ یہ وہی گرانی تھی جسکے
فسق و فجور کی فراوانی و فلاح کے اعداد و اخبار قلم زریں سے لکھے گئے ہیں۔ شہنشاہ اکبر کے عہد میں آٹا روپیہ کا پانچ من
اور گھی سوا دو روپیہ من فروخت ہوتا تھا اور ایک شخص کے اوقات بسر کرنے کیلئے صرف پانچ آنہ ماہوار کافی تھا ایسٹ
انڈیا کمپنی کے ابتدائی عہد کے کاغذات سے پایا جاتا ہے کہ گھی چھ روپیہ فی من بکتا تھا اور گندم فی روپیہ ۳۹ سیر
نخود ایک من انیس سیر۔

دریں راہ خوف۔ ومن ہم از بودن اینجا نا محظوظ و دل کندہ، شب و روز دریں فکر کہ بخیریت ازینجا برآیم۔"

۱۱۲۶ھ (۱۷۱۴ء) یعنی اوائل عہد محمد فرخ سیر میں میر عبدالجلیل بھکر سے دہلی تشریف لائے اور بادشاہ کی ملازمت حاصل کی۔

۱۱۳۰ھ (۱۷۱۸ء) میں اپنی خدمات سے سبکدوشی حاصل کی۔ استعفا منظور ہوا اور دربار شہنشاہی سے اِن کے عہدے ان کے فرزند رشید میر سید محمد کے حوالہ و تفویض کر دیے گئے۔ میر سید محمد اپنے پدر بزرگوار کے حسب الطلب سند تقرر پاکر وطن سے ۲۴ ربیع الاول ۱۱۳۱ھ (۴ مارچ ۱۷۱۸ء) کو روانہ بھکر ہوئے ۲۶ تاریخ (یعنی ۱۶ مارچ کو) قصبہ دانسہ پہونچے اور شاہجہان آباد سے آنے والوں کی زبانی سُنا کہ نواب حسین علیخان دکن سے مراجعت کر کے سواد دہلی میں دائرہ رکھتے ہیں۔ میر سید محمد نے اُدھر کا رُخ کیا۔ ۲۷ تاریخ کو شہر میں داخل ہوئے شیخ فرید کے کٹڑے میں اُترے۔ ۲۸ کو سورج گرہن پڑا۔ ان کو خیال ہوا کہ ایسے منحوس دن میں "میر صاحب قبلہ حقیقی" کی ملازمت کیا حاصل کریں کل مبارک گھڑی کے ساتھ جاکر حاصل کریں گے۔ ۲۹ کو بوقت چاشت یہ تو تھکیا سواری میں تھے کہ خود میر عبدالجلیل کٹڑہ میں سید محمد کی فرودگاہ پر تشریف لائے اور اُن کو اپنے قدموں پر سر رکھ دینے کا شرف عطا فرمایا۔ دربار کے معمولی مراسم و آداب سے فارغ ہو کر میر سید محمد اپنی جائے خدمت پر

اِس سے پیشتر کے نرخ و اعداد تو آج افسانہ و داستان معلوم ہوتے ہیں اور تاریخ فرشتہ، تاریخ سالک المصباح، فتوحات فیروز شاہی، آئین اکبری اور پُرانے گزیٹیرون کو پڑھ کر تو اِس صدی کا انسان متحیر رہ جاتا ہے۔

فیروز شاہ کے عہد میں گیہوں ۷ من، جو ۲۰ من، گھی ۳ سیر فروخت ہوتا تھا۔

محمد شاہ تغلق کے وقت میں گیہوں ۱۰ من، جو دس پیسے من، گھی روپیہ کا چودہ سیر

علاء الدین خلجی کے زمانہ میں گیہوں چھ آنہ من، جو ۷ من، شکر روپیہ کی ۲۲ سیر، گھی ایک روپیہ کا ۳۳ سیر پختہ، دودھ ایک روپیہ کا چھ من ملتا تھا۔

پرتھوی راج کے عہد میں گھی ایک روپیہ من پختہ بکتا تھا اور میں بھی آج کل کے من سے بڑا تھا

غدر سے پہلے دہلی میں بڑے سے بڑا ہاتھی تین سو روپیہ میں ملتا تھا۔

چلے گئے خود کام کرنا شروع کیا اور سید محمد نوح کو وطن واپس بھیج دیا۔ میر سید محمد اپنے ماموں کی نیابت میں، میر غلام علی آزاد بھی ۱۱۴۳ھ (۳۱-۱۷۳۰ء) سے ۱۱۴۵ھ (۳۳-۱۷۳۲ء) تک وہاں کام کرتے رہے۔ یہ تعلقات یا بادشاہی خدمات جن کا ۱۱۱۶ھ (۱۷۰۴ء) میں آغاز ہوا تھا چالیس سال قائم رہے۔ انقلاب روزگار سے نادر شاہ کے تسلط پر ۱۱۵۵ھ (۱۷۴۲ء) میں اس دودمان کا آب و خور ملک سندھ سے اٹھ گیا اور کلیتاً قطع تعلق ہو گیا۔

بازآمد۔ وطن اور اہل وطن سے سولہ سال دُور رہنے کے بعد میر عبدالجلیل ۱۱۳۲ھ (۲۰-۱۷۱۹ء) میں بلگرام تشریف لائے۔ ایک سال کے قریب (بلکہ صرف دس ماہ) وہاں قیام و توقف فرمایا۔ بعض مصالح ذاتی اور اغراض سیاسی کی وجہ سے نیز استحفاظ آیندہ کے خیال سے شاہجہان آباد کو چلے جانے اور اعالی و موالی دربار کے قریب، اہل حل و عقد کی ہمسائگی میں دارالخلافہ میں موجود رہنے اور قیام کرنے کا عزم مصمم کر لیا ؎

بِکُلٍّ تَدَاوَیْنَا فَلَمْ یَشْفِ مَا بِنَا　　　عَلٰی اَنَّ قُرْبَ الدَّارِ خَیْرٌ مِّنَ الْبُعْدِ

[ہم سب کچھ کر کے دیکھ چکے کسی سے ہماری تشفی نہ ہوئی تاہم دُوری سے قرب مکانی بہتر ہے]

سنہ ۳ جلوس فرخ سیر سے لے کر شروع سنہ محمد شاہی تک یعنی گیارہ سال تک سفر حضر میں میر عبدالجلیل حاضر حضور رہے۔ صرف دس ماہ کیلئے ایکبار وطن کو تشریف لے گئے تھے سید حسین علی خان کا قضیۂ قتل ان کے عقب میں گذرا۔

دوران قیام شاہجہان آباد میں اُن کے نواسے میر غلام علی اور میر محمد یوسف مع ایک اور عزیز میر عظمت اللہ بے خبر کے ۱۱۳۴ھ (۲۲-۱۷۲۱ء) میں میر عبدالجلیل کے پاس آئے نواسوں نے اُن کے سایۂ تربیت و شفقت میں دو سال بسر کئے۔ جن علوم کی تحصیل کا سلسلہ ۱۱۳۲ھ (۲۰-۱۷۱۹ء) میں بزمانۂ قیام بلگرام چھیڑا تھا اُنکو دو برس یہاں رہکر انجام کو پہونچایا۔

---

۲۱۵ لشکر۔ فرودگاہ اُمرا۔ کیمپ

جاگیر اور اضافۂ تنخواہی

میر عبدالجلیل کی خانگی تحریرات سے دو وسائل آمد کا اور پتہ چلتا ہے مگر وہ دونوں غیر مستقل اور غیر معین صورت میں ہیں۔ ایک جاگیر[۲۱۶] دوسرا اضافۂ تنخواہی

میر سید محمد کو ایک بار اُن کے والد بزرگوار نے لکھا تھا۔ کہ "بغیر جاگیر کے فقیر کا یہان سے چلنا دشوار ہے میں چاہتا تھا کہ نواب امیر الامرا سے جاگیر کے لئے التماس کرون کہ اس اثنا میں قضاء الٰہی سے نورالدین علی کا واقعہ ہو گیا۔ نورالدین، نواب صاحب کا بیس برس کا جوان بھتیجا تھا۔ اس قضیہ کے بعد ہی امیر الامرا کے لڑکے کا حادثہ ہوا۔ اسی وجہ سے جب تک کچھ روز اور زمانۂ ماتم کے گذر نہ جائیں التماس کا پیش کرنا موقوف ہے مجھے ۰ وہ وقت سوار ہو کر جانا پڑتا ہے"

(۲) "اس زمانہ میں پرگنہ ملاوہ[۲۱۷] سرکار لکھنؤ سے دو لاکھ دام[۲۱۸] کا پروانہ وکالت خان کے تغیر سے فقیر کے

ف۲۱۶ جاگیر (جائے گیر) عطیۂ ملک جو تعین منصب کے وقت سرکار بادشاہی سے اس کے لئے مخصوص و معین ہو جاتا تھا [لفظاً اسی معنی میں متاخرین اہل ایران کی تحریرات میں بھی پایا جاتا ہے]۔ (۲) اراضی کا کوئی عطیہ جس کو حکومت نے کسی شخص یا اہل خدمت کے لئے بطور انعام یا مخلد وہ کسی کار نمایاں کے صلہ میں دیدیا ہو۔ اس قسم کی جاگیر اراضی یا جواگی مع اراضی، سرکار برطانیہ ہند میں بھی کسی قدر رائج ہے (۳) جو جاگیر کسی خاص عہدہ یا مرتبہ کے متعلق ہوتی تھی جاگیر منصب کہلاتی تھی۔

سلاطین سلف کا دستور تھا کہ مساجد میں امام، خطیب، پرہیزگار و متقی، ذی علم اور عالی خاندان لوگوں کو مقرر کرتے اور اُن کے لئے مدد معاش اور جاگیرین معین کرتے تھے۔ ایسے فرامین پر صدر الصدور کی تصدیق و دستخط ہونا لازم تھا۔ اور اس تاریخ سے ظاہر ہے کہ جاگیرین اور عطیات کا دینا اگر مسلمانوں کی ایجاد نہیں تو کم سے کم بہت ... میں بہت پرانا چلا آتا ہے۔ رحمت عالم ہی الکریم ... نے حضرت ... حضرت ... کسی ... خوش ... صحابیون کو ایک ایک قطعہ اراضی جاگیر کے طور پر عطا فرمایا تھا۔ خلفاء ... اونیس رضی اللہ عنہم اجمعین نے بھی بعض مصالح اور ضرورتوں سے ... ہایوں میں عربستان اور دیگر ممالک مفتوحہ میں جاگیریں مرحمت فرمائی تھیں اس کا رواج بنی امیہ میں زیادہ اور بنی عباس میں کم کم قائم رہا۔ سلاطین سلجوقی و ... وغیرہ نے اسکو خوب ترقی دی تھی

ف۲۱۷ ملاوہ اسے عموماً ملانوان لکھا جاتا ہے پرگنات تحصیل بلگرام ضلع ہردوئی صوبہ اودھ سے متعلق ہے

نام دفتر دیوانی سے تیار ہو کر آگیا ہے۔[۲۱] اسکی نقل قاضی القضاۃ[۲۲] کی مہر سے تصدیق کی گئی ہے اور دو روپے کے

اور اسی قدیم سڑک پر واقع، جو دہلی سے سارس کو دیلے گنگ کے شمال ہوتا ہوا جاتا ہے۔

اکبر کے عہد میں اس پرگنہ میں ۲۲۰۸۳ بیگہ رقبہ زیر زراعت تھا، مالگذاری ۱۳،۲۵۹۸ دام تشخیص تھی

تیس سوار و ہزار پیادہ فوج رہتی تھی۔ بیس بھاکوڑں کا ملکیہ اراضی قبضہ تھا۔ آئین اکبری میں اسکا ذکر ہے

یہی انتظام کم و بیش اورنگ زیب کے زمانہ تک قائم رہا۔ موجودہ پرگنہ کا رقبہ انگریزی پیمائش سے ۹۱۶۱۲ ایکڑ

یا ۱۴۳ میل مربع ہے جس میں ۱۳۰ مواضع داخل ہیں

مسلمانوں کی آبادی خاص ملاوان میں سکندر لودھی کے وقت سے ہے۔ قانون گویان و چودھریان پرگنہ کا

صدر مقام تھا۔ شیر شاہ سوری جب ۹۵۱ھ (۱۵۴۴ء) میں یہاں آیا تھا تو شیخ عبدالقدوس کو دس بیگھہ اراضی

معافی، بود و باش اور اقامت صوم و صلوٰۃ کی شرط پر دی تھی

سید سالار مسعود غازی بھی ۴۲۳ھ (۱۰۳۲ء) میں تشریف لائے تھے، ان کے بعض رفقا کے مزارات

موجود ہیں شاید اسی مناسبت سے یہ آبادی کبھی غازی پور کے نام سے موسوم تھی

شہنشاہ عالمگیر بھی ادھر سے گذرا ہے۔ ۱۱۳۸ھ (۱۷۲۶ء) میں شتاب رائے دیوان بہادر شاہ ملاوہ کا

چکلہ دار تھا۔

خاص قصبہ میں عہد کہن کی یادگار ہندوؤں کے پرانے مندر کے سوا چند مساجد اور مزارات باقی ہیں۔ دو

امام باڑے بھی ہیں مخدوم شاہ کی درگاہ اور ان کے تلمیذ رشید قاضی بھکاری کی مسجد سنگین نہایت خوشنما ہیں

درگاہ کے پیچھے کنکر کا چبوترہ ہے اس پر ہیبت ساخت کے آٹھ مارک ستون قائم ہیں جس پر نہایت عمدہ گلکاری کی گئی ہے

گنبد سادہ ہے، پھاٹک کی وضع تعمیر کا ہے۔ اسی کے قریب ایک نہایت پرانا اور عمدہ کنوان کنکر کا بنا ہوا ہے۔ درگاہ

کی مرمت و درستی کیلئے معافی باقی ہے۔ حضرت مخدوم ایک جہانگیر و جہان گشت سیاح تھے۔ مصباح العاشقین لقب

تھا۔ شیوخ کے قیام کی بنیاد ۸۱۸ھ (۱۴۱۵ء) میں اُن کے قدم سے پڑی۔ شاگرد کا نام مصباح الاسلام

عرف بھکاری تھا جنکو لودی سلطان کی طرف سے ۸۸۱ھ (۱۴۷۶ء) میں خدمت قضا سپرد ہوئی اور معافی ملی تھی۔

جامع مسجد عہد اکبری کی تعمیر از شکستہ حالت میں ہے قلعہ کا ٹیلہ باقی ہے جس پر زراعت ہوتی ہے

قصبہ ملاوہ کسی وقت پر بارونق تھا۔ اہم سمجھا جاتا تھا ۱۸۰۲ء میں ایسٹ انڈیا کمپنی کی افواج کی چھاؤنی

یہاں قائم کی گئی تھی جو بعد کو کانپور چلی گئی اودھ کے الحاق اور سرکار برطانیہ کے قبضہ کے بعد ۱۸۵۶ء میں ملاوہ

اس ضلع کا صدر مقام قرار پایا تھا۔ لیکن بعد غدر دفاتر ضلع، ہردوئی کو منتقل کر دئیے گئے۔

ملاوان کی آبادی ۱۹۱۱ء میں نو ہزار چھ سو پانچ (۹۶۰۵) تھی

[۲۱] چالیس دام ساڑھی ایک روپیہ سکہ کے ہوتے تھے حقیقت یہ ہے کہ دام کی قیمت مختلف

تفاوت سے ایک خط قاضی محمد باقر کے نام بھی لکھ دیا گیا ہے جسکے ساتھ نقل پروانہ منسلک ہے
بہتر ہے کہ آپ پروانہ کی نقل جو اس خط مین ملفوف ہے قاضی جیو کے پاس ملاخطہ بھیج
دین تاکہ مطابق اس نقل کے محصول جاگیر کا حساب وکالت خان کے اجارہ دار[۲۲۱] یا عامل[۲۲۲] سے
کرکے اپنے خاطر نشین کرلیں عنقریب پروانہ درگاہی مع پروانہ نواب عالی جناب دیوان
دو حصدار[۲۲۳] لکھنؤ کے نام ہوگا آپ کے پاس بھیجدونگا قاضی جیو کا آدمی یہان موجود ہے
اُن کی بحالی کا پروانہ بھی تیار ہو رہا ہے عنقریب مل جاوے گا۔"

اوقات میں مختلف ہی ہے کبھی پیسہ کے برابر بھی مانا جاتا تھا

ف ۲۱۹ دفتر دیوانی ۔ دفتر یعنے فہرست دکاغذات ۔ یا کوئی سرکاری رپورٹ یا تحریر جو امور مالیہ عامہ کے متعلق ہو کسی سرکاری کام یا کاروبار کی جگہ ۔ پیر ملہ ۔ دیوان ۔ بالکسر حسب روایت غیاث اللغات دیوان دیا سے معرب ہے یا لوگون کے جمع ہونے کی جگہ، دربار یا اجلاس شاہی امرا و ملوک کی نشستگاہ ۔ نیز ۔ وزیر مال ۔ صدر عہدہ دار ریاست محکمہ مال یا خزانہ کا اعلے عہدہ دار ۔ دفتر دیوانی مسلمانوں کے عہد سلطنت میں بڑا ضروری محکمہ تھا تمام معاملات مالی او انتظامی کا حساب وکتاب اسی دفتر کے متعلق رہتا تھا [زمانہ موجودہ مین لفظ "دیوانی" عموماً سول کی عدالتون، اور معاملات نقد و جنس، اور حقوق کے متعلق انصاف گستری کے لئے استعمال ہوتا ہے] عالمگیر اپنے رقعات (کے نمبر ۷) مین لکھتا ہے کہ "دیوان را میان صاحب جاگیر و رعایا دعامل امین گفتہ ۔ گفتہ اند دیوانی کردن آسان و امین بودن مشکل"۔

ف ۲۲۰ قاضی القضاۃ یا اقضی القضاۃ ۔ وہ قاضی جو اور قاضیون سے مرتبہ قضا مین بلند ہوتا تھا [قاضی یعنی حکم دینے، الایا ادا کرنے والا مجسٹریٹ یا عہدہ دار دیوانی] عہد شاہی مین قاضی وہ جج ہوتا تھا جو شریعت اسلامی کے احکام وحدود کے مطابق انفصال خصومات کرتا تھا محکمہ رجسٹری (تصدیق وتسجیل اسناد وتائق وقبالہ جات) بھی اُسکے تحت مین تھا ۔ سرکار برطانیہ نے قاضی القضاۃ یا ہیڈ قاضی کا عہدہ اٹھا دیا ہے اب قاضی صرف نکاح پڑھاتا یا عقد وازدواج کو درج رجسٹر کرتا ہے اُسکا کوئی سرکاری عہدہ یا کوئی اختیار و اقتدار باقی نہین رہا ہے۔

ف ۲۲۱ اجارہ دار ۔ کسی زمین کا ٹھیدار یا ٹھیکہ دار ۔ یا جسکو کلیۃً پورا اختیار دیدیا گیا ہو ۔ اجارہ کسی گانوں یا ضلع کی مالگزاری کا ٹھیکہ یا پٹہ ۔ نیز رسوم یا کسی اور قسم کے مطالبہ خراج کی تحصیل وجمع کرنے کا اختیار دینا مثلاً کسی معینہ فیس بلا الاونس یا ابواب کا وصول وجمع کرنا ۔

(۳) اب امید ہے کہ جاگیر کی آمدنی بھی وصول ہوگی تو سب مشکلیں آسان ہو جائیں گی۔ جاگیر کا اصل پروانہ دفتر معلّٰی سے درست ہو کر نواب قطب الملک کی مہر سے مکمل ہو کر مل گیا ہے نقل پیشتر بھیج چکا ہوں۔ اصل پروانہ اب رستم وغیرہ سپاہیوں کے بدست بھیجتا ہوں۔ اس پروانہ کو اس لئے روک رکھا تھا کہ نواب عالی جناب کا پروانہ بھی فوجدار و دیوان لکھنؤ کے نام مل جائے تو یہی پروانہ درگاہی کے ساتھ ساتھ بھیجدوں چونکہ ماہ ربیع الاول میں نواب صاحب اکثر متوجہ خدمت گذاری جناب اقدس حضرت رسالت پناہی صلی اللہ علیہ وسلم رہتے ہیں اور شب و روز اسی کام میں صرف کرتے ہیں، وقت نہ ملا کہ ان پروانوں کی "روانگی" حاصل کر لیتا اور سپاہیان معتمد گھر روانہ ہو رہے ہیں اس لئے اصل پروانہ بھیج دیا گیا۔ اسکے متعاقب نواب کے پروانے بھی حاصل کر کے بھیجدیے جائیں گے۔ جب اصل پروانہ پہونچے تو کسی معتمد کے ہاتھ پرگنہ ملانوہ کو بھیج دیجیے گا تاکہ قاضی محمد باقر[۲۲۴] حسب صوابدید اس کو جے دھر لون[۲۲۵] اور قانونگویان کو دکھا دیں پھر جب واپس آجائے تو اپنے پاس حفاظت سے رکھئے گا۔ اس قدر توقف کرنا مناسب ہے کہ پروانہ نواب عالی جناب کا دیوان لکھنؤ کے نام اس بارہ میں آپ کے پاس پہونچ جائے اسوقت لکھنؤ روانہ کیجیے گا تاکہ پروانہ مطابق لے آئے اس پروانہ کی نگہداشت میں احتیاط کیجیے گا کہ سند درگاہی "(بادشاہی)" ہے اور غالب ہے کہ فوجدار کا گماشتہ، جاگیر کا تحصیل

ف۲۲۲ عامل کوئی سپاہی یا اہل قلم عہدہ تحصیل کیسدہ مالگذاری اُس زمانہ میں صیغۂ انتظام کا ایک ماتحت اہلکار ہوتا تھا۔ سندھ میں یہ لفظ اب بھی ہندو اہل قلم کے لئے بولا جاتا ہے۔

یہاں ایک ضروری بات اور لکھ دینا چاہتا ہوں چکلہ داری یا چکلہ دار کا عہدہ عمل اسرکار یا گورنمنٹ کا ایک جزو ہوتا تھا۔ یہ عہدہ سب سے پہلے شاہجہان کے عہد ۱۰۶۸ھ تا ۱۰۳۷ھ ۱۶۲۸ء تا ۱۶۵۸ء قائم ہو گیا تھا۔ زمانہ حال کے ایک ضلع سے چکلہ بڑا ہوتا تھا، موجودہ زمانہ کی قسمت یا کمشنری سے چھوٹا۔ دوسرا چکلہ دار کے بعد ہی اس کا ماتحت ہوتا تھا عامل کہلاتا تھا۔ اسکی عملداری تقریبًا اتنے ہی قطعۂ ملک پر ہوتی تھی جتنی آجکل ایک تحصیل ہوتی ہے یہ عامل تحصیل وصول مالگذاری کا مستاجر بھی ہوتا تھا اور جبکہ اسکو تفویض ہوتا تھا اُسکا حاکم منتظم بھی۔

ف۲۲۳ فوجدار شاہی زمانہ میں، ایک گورنر ماتحت ہوتا تھا اور جسقدر رقبہ ملک کا اسکے حدود دخل

کے دستور پر مشترض احوال نہ ہوگا ورنہ فوجدار کے نام پروانہ متعاقب پہونچا ہوا سمجھیے گا۔"

(۱) مراسلت کا وہ حصہ تو اب مہیا نہیں ہے جس سے میر صاحب کی اس تصدیع و زحمت کا نتیجہ معلوم ہو سکے عملاً وہ کامیاب ہوئے ہوں گے کیونکہ اُنکی ایک تحریر سے قیاس ہوتا ہے کہ وہ اس کام کے انصرام وانجام کے بدون دہلی سے نہ ہٹے ہوں گے" بدون کار جاگیر برخاستن بندہ ازین جا نمی شود کہ کار جاگیر پر ضروری است و بر آمدن جاگیر محال محض شدہ معاملے درین خیال سرگردان است امیدوارم کہ بفضل الٰہی کار جاگیر بہتر صورت گیرد" اس کے متعاقب اطلاع دیتے ہیں "باہم بعد دخیل شدن گماشتہ در جاگیر علاوہ بوطن می رسیم"

خطوط میر عبد الجلیل (مطبوعہ ۱۹۴۰ء) میں اُنکی تحریر کی تاریخیں درج نہیں ہیں لیکن اگر تسلیم کر لیا جائے (جیسا کہ دعویٰ ہے) کہ انکے رقعات تاریخوں کے سلسلہ سے مرتب کئے گئے ہیں تو عنایت نامہ شمارہ ستم سے پتہ چلتا ہے کہ جاگیر کے عنایت کرنے کا پروانہ ملنے پر میر صاحب نواب امیر الامراء کا خلوت خاص کو وقت، شکریہ و تسلیمات بجالائے اور اشعار عربی و فارسی و ہندی جو شکریہ میں لکھے تھے پڑھ کر سنائے نواب نہایت محظوظ ہوئے اور بہت تحسین و آفرین کی۔

(۵) فرد اضافہ بحالی کہ حضرت خلد مکان عالمگیر غفر اللہ لہ کے خط خاص میں ہے دفتر میں بھی بڑی تلاش سے بجنسہ فقیر کو دستیاب ہوگئی۔ میں کوشش میں ہوں کہ فرد مذکور کو منظور کرائے

یا دائرہ اختیار کے اندر ہوتا وہ فوجداری کہلاتا تھا یعنی کسی ضلع کی سپاہ فوجی کا منتظم و نگران۔ عصر موجودہ میں عدالت ہائے مجسٹریٹی و جی صیغہ موجودہ و نیز ان جرائم پر "فوجداری" کا اطلاق رکھا ہے۔

اسی ذیل میں مورخین لکھتے ہیں کہ پیمائش ممالک محروسہ کے بعد شہنشاہ اکبر نے یہ انتظام کیا تھا کہ جس قدر زمین کا محصول ایک کروڑ تنکہ ہو وہ ایک معتبر کے حوالہ کی جائے جو کروڑی کہلاتا تھا کروڑی سے بالاتر کارکن فوجدار ہوتا تھا۔

۲۲۴ چودھری۔ عہد گزشتہ میں صیغہ مال کا ایک اہلکار ماتحت ہوتا تھا نیز بعض اشخاص کو خطاب کے طور پر دیا جاتا تھا آجکل معمولاً کسی پیشہ یا حرفہ یا ذات کے مکھیا یا سرغنہ کے لئے مستعمل ہوتا ہے لفنسٹن صاحب Elphinstone تاریخ مرتبہ کاول Cowell کے ضمیمہ نمبر ۲ حاشیہ میں لکھتے ہیں کہ

سے یا بہ بحالی حاصل کرلون "

(۶) "اضافہ کے مقدمہ مین نواب امیر الامرا سے عرض کیا تھا منظور فرمایا اور اپنے پیشکار کو پروانگی دیدی ہی پیشکار مذکور نے حقیقت (رپورٹ) دفتر سے لکھالی ہی۔ غالب ہی کہ عنقریب فرد حقیقت دستخط اضافہ سے مزین ہوجائیگی۔ بعنایت الٰہی اس کام سے بھی خاطر جمع ہوجائے گی "

(۷) "حضرت خلد مکان انار اللہ برہانہ نے بابت تغیری گجرات کے سندون میں لکھی کہ بحال فرما کر پچاس کا اضافہ دیا تھا۔ چونکہ ہمیں و بعد عالمگیر جلد شاہ کا واقعہ ہوگیا۔ سند دفاتر معلٰے مین مرتب نہین ہوئی تھی۔ اس زمانہ مین خلد مکان کی دستخطی فرد حسب دستیاب ہوگئی تو مین نے نواب امیر الامرا کے ملاحظہ کے لئے پیش کی۔ ازراہ توجہ منظور فرما کر حقیقت دفتر سے تحریری طلب کی۔ ۲۰ ربیع الآخر سنہ ۲۴ جلوس کو دستخط بحالی کی اضافہ پنجاہی کی بموجب دستخط عالمگیر کے فرد حقیقت پر کردئے۔ الحمد للہ کہ یہ عقدہ حل ہوگیا۔ اب انشاء اللہ جیدہ دفتر مین تعلیق ایک سو پچاس عہد عالمگیری دفاتر معلٰے سے مرتب ہوکر آجائے گی "

ان وسائل کے سوا ایک خفیہ مستقل ذریعہ آمد و رفت یہ تھا جب دلی مین تھے تو نواب اخلاص خان[۲۲۶]

چودھری کا خطاب پہلے ایک پرگنہ کے افسر اعلیٰ کو بطور موروثی ملتا تھا

۲۲۵ قانونگو۔ قانون سریانی یا یونانی مین ہر چیز کی اصل یا مسطر کتاب و جدول کو کہتے ہین مجازاً قاعدہ و دستور کہلاتا ہے۔ قانونگو مال کا ایک افسر معائنہ یا پرگنہ کا جس کے متعلق حقوق مالکانہ و مراعات کے صحیح اندراجات و نگہداشت کا نگران ہوتا تھا انگریزی عملداری مین بھی یہ عہدہ قائم ہے لیکن اسکی خدمات اور اختیارات مین بالکلیہ تغیر ہوگیا ہے

۲۲۶ اخلاص خان ایک ہندو مرتد تھا جو سلطنت اسلامیہ دستاہی امیر تھا مورخین اسکی وضعداری اور روش صلح جوئی کی ستایش کرتے ہیں صاحب سیر المتاخرین اور حاجی مصطفےٰ اسکو نہایت دانشمند و قابل و فرزانہ و دانشمند لکھتے ہیں۔ قطب الملک کا ندیم و معتمد تھا۔ سادات کی مودت و وابستگی اور زمانہ کے رنگ و کیفیت سے نہایت دلشکستہ اور دنیا سے متنفر ہوگیا تھا اس کا اثر طبقہ ہر فریق اور ہر جماعت پر نمایاں تھا سب اسکا احترام کرتے تھے۔ بالآخر ترک ملازمت ترک منصب و خدمت کرکے مشاغل علمی اختیار کرلیے تھے۔ فرخ سیر نامہ (عہد فرخ سیر کی تاریخ) لکھا کرتا تھا
فرخ سیر نے جب حسین علی خان خلاف حکم شاہی امیر الامرا دکن سے ہندوستان آرہا ہے سوائے بغاوت اسکے سر مین بھری ہوئی ہے تو فرخ سیر نے اخلاص خان کو امیر الامرا کے سمجھانے اور اس ارادہ سے باز رکھنے کے لئے

کی سرکار سے دو روپیہ روزانہ ان کو ملتے تھے۔ مگر یہ رقم اُن کے خرچ کیلئے کبھی مکتفی ہوتی تھی۔ بلکہ اسکے سوا ایک روپیہ اور ہر روز خرچ ہو جاتا تھا۔ نوکروں اور کہاروں کی تنخواہ، دربار کا خرچ، اور دیگر اخراجات اسکے علاوہ تھے۔ بارہا ایسا ہوتا تھا کہ دہلی میں مقروض ہو جاتے تھے اور جب ان کے مستقر الخدمت سے ہنڈوی آتی تھی تو سب سے پہلے یہ قرض بیباق کیا جاتا تھا۔

مخارج

میر عبد الجلیل جہاں کہیں رہتے تھے خرچ سے تنگ رہتے تھے۔ خود اپنا خرچ، اُحلا اور شرفائے پائے تخت کے اُمرا و عمائد سے ہر وقت کا ملنا جلنا اور سرکار کا برتاؤ۔ اُس پر گرانی اور مصارف، وارد و صادر اشخاص، اعزہ اور امیدواران ملازمت کی مہمانداری، فرمائشات اہل وطن کی ہمرسانی ان کا ہاتھ ہمیشہ خالی رہتا تھا۔ فوری اور ہنگامی ضرورتوں کا پورا کرنا دشوار ہو جاتا تھا۔

وطن میں جانی و درگاہی دونوں نوکر بیمار پڑے ہیں۔ میر سید محمد نے انکے لئے خرچ مانگا ہے یہ جواب دیتے ہیں کہ بالفعل بیس روپیہ بھیجدیے ہیں۔ اسکے بعد اور بھی بھیجوں گا خاطر جمع رکھیں گا اسوقت اس سے زیادہ میسر نہیں آیا۔"

ایک دوسرے موقع پر لکھتے ہیں کہ "الحمد للہ آپ کا قاصد عین انتظار میں پہونچا تعلق خاطر کو رفع کیا وطن میں گرانی غلہ اور درماندگی خرچ روزمرہ اور دیگر خصوصیات کی نسبت جو کچھ لکھا تھا معلوم ہوا برخوردار من مجلو کسی لحظہ اور کسی لمحہ اپنے سے غافل نہ جانیے گا۔ اس سے قبل جو کچھ قلیل کہ میسر آیا تھا دستگیر داری اور فیض اللہ کو روانہ وطن کر دیا تھا بفضل الٰہی بخیریت پہونچ گئے ہوں گے۔ میں

بھیجا تھا۔ میر سے اخلاص خاں کو ربط و رسم خاص تھا وہ میر کو بڑے اصرار و جد سے اپنے ہمراہ لے گیا تھا۔

خیال ہے کہ یہی نام (محمد اخلاص خاں) کا ایک امیر عالمگیر اورنگ زیب کا بھی معتمد خاص اور دستار تھا۔ بادشاہ کے اخیر انفاس حیات میں بھی اُسکے قریب موجود تھا اُسے اور عنایت اللہ خاں سے بہت سے انعامات و حالات حمیدیہ نقل کیے ہیں۔

چاہتا تھا کہ بہ مجرد پہونچنے قاصد کے فکر کرکے جلد اُس کو رخصت کر دیتا۔ لیکن ہر چند سعی کی کچھ فائدہ نہ ہوا۔ حتیٰ کے چندروز ضرورتاً توقف کرنا پڑا۔ اب اخوی میر کرم اللہ نے بڑی کوشش کرکے جزوی رقم حاصل کرکے سیوستان سے بھیجدی ہے۔ قاصد کو روانہ وطن کرتا ہوں۔ حق سبحانہٗ بخیریت پہونچا دے۔ چونکہ تمھارا بھیجا ہوا قاصد گھاسی چنداں ہوشیار معلوم نہیں ہوتا تھا۔ اس لئے مہاجن کی معرفت ہنڈی روانہ کی گئی۔ اور اُس کو خطوط کے ساتھ وطن رخصت کر دیا۔ برخوردار! بھکر[۲۲] میں کوئی مہاجن ایسا نہیں ہے کہ ہنڈوی اکبرآباد یا قنوج کو لکھ دیوے ہنڈوی یہاں سے ملتان اور ملتان سے لاہور اور لاہور سے اکبرآباد اور وہاں سے قنوج چلتی لکھی جاتی ہے۔ اس صورت میں چار جگہ ہنڈوی کو باحتیاط بقید جنس وسکہ وسند کے لکھانا پڑتا ہے۔ اور یہ امر گھاسی کی عقل وسمجھ سے باہر نظر آیا۔ اس لئے ہنڈوی جوابی لکھا کر مہاجن کی معرفت بھیجی گئی ہے۔"

میر سیّد محمد کو اپنی کیفیت سے اطلاع دیکر نصیحت فرماتے ہیں "یہاں کے احوال نوع دیگر نظر آتے ہیں کہ تمام لوگ حضور پرنور میں ہماری خدمت کی تلاش کے لئے رہتے ہیں بلکہ یہ شہرت ہو رہی ہے کہ ہماری خدمت حضور سے کسی دوسرے کے نام مقرر ہو گئی ہے۔ لہٰذا لکھا جاتا ہے کہ زیادتی اخراجات سے ہاتھ کوتاہ رکھئے اور اس طرح کیجئے تاکہ شرم رہ جائے۔ ہمارے جاگیر نہیں ہے خدانخواستہ اگر ہم یہاں سے اُٹھ کھڑے ہوں تو اُسی دن سے بے روزگار رہ جائیں گے۔

[۲۲] بھکر حاکم نشیں شہر تھا۔ دولت مند لوگ رہتے تھے۔ میر صاحب کے وقت کے حالات معلوم نہیں لیکن ۱۸۷۴ء کا گزیٹر سندھ بالائی کے ذیل میں لکھتا ہے کہ یہاں تین قوم کے لوگوں کی آبادی ہے ہندو، سندھی، بلوچی۔ تمام تجارتیں نہ صرف بڑے بڑے شہروں اور قصبات میں ہندوؤں کے ہاتھ میں ہیں بلکہ تمام ضروریات زندگی اور مایحتاج انسانی کو دیہات اور مفصل میں یہی لوگ پورا کرتے ہیں۔ کوئی چھوٹے سے چھوٹا گاؤں بھی ایسا نہ ہوگا جس میں بنئے کی دوکان نہ ہو۔ ہندوؤں کی حالت جیسی کچھ مسلمانوں کے ملک میں ہوتی ہے معلوم ہے۔ یوں بھی گرے ہوئے اور پست درجے اور متحمل طبقہ کے سے ہو رہے ہیں لیکن سارے ملک میں دولت جمع کرنا بھی یہی جانتے ہیں۔ ان ممالک میں ہندو اسقدر کارآمد ہیں کہ انکی جان ومال کا بہت لحاظ وادب کیا جاتا ہے۔ بلوچیوں میں سے بڑے سے بڑا بدمعاش، رشت اعمال وسیہ کار بھی بالعموم ان کا خیال رکھتا ہے۔ شکارپور کے مہاجنوں کو دیکھئے۔ جو اپنی دولت وثروت

اس لئے کہ نوکری کا مدار جاگیر پر ہے اور بے جاگیر والا نوکر گویا نوکر ہی نہیں ہے۔ اس بات پر نگاہ رکھ کر گزران کرنا چاہئے۔ جب کچھ کشایش ہو جائے اُس وقت اختیار ہے۔ غرض کہ ان مراتب کو خوب خاطر نشین رکھ کر عاقبت بینی اور دور اندیشی کو ہاتھ سے نہ دیجئے گا۔"

حضرت دہلی

میر عبد الجلیل کو دربار شہنشاہی میں آداب و مجرا بجا لانے کا اعزاز چند بار نصیب ہوا تھا۔ پہلی مرتبہ جب کہ زنجیر عدل والی رباعی لکھ کر عالمگیر خلد مکان کے حضور میں پیش کی تھی جس کا صلہ چار توڑے ہُون ملا تھا۔ دوسری مرتبہ جب کہ قلعۂ ستارہ کی فتح کی تاریخیں لکھ کر نذر کی تھیں۔ غالباً اُس وقت سوائے خشک ستایش و آفریں کے کوئی خلعت یا انعام بارگاہ خسروی سے عطا نہیں ہوا نہ کسی سوانح نگار نے اس کا ذکر کیا ہے۔ اسکے بعد جب سے میر دار الخلافۃ

اور ساہوکارانہ کاروبار اور رسوخ کے لحاظ سے تمام ہندوستان اور ممالک مغربی و شمالی میں شہرت رکھتے ہیں ایسے بازار بہت کم ہوں گے جہاں ان ساہوکاروں کے گماشتے موجود نہ ہوں۔ کلکتہ سے لے کر چینوا تک کی ہنڈویاں یہاں مل جاتی ہیں۔

۲۲۸ شہر دہلی کی آبادی ۱۹۰۱ء میں ۲۰۸۵۷۵ تھی۔ ۱۹۱۱ء میں برطانی ہند کا دار الملک یہاں منتقل ہوا۔ اور اُسوقت سے روز افزوں ترقی اور عظیم تعمیر و عروج شہر کو حاصل ہے۔ کاروبار تجارت، ورکارخانجات او سلسلۂ تعمیرات میں انقلاب وارتقاء عظیم نمودار ہو رہا ہے۔ ۱۹۲۱ء میں مردم شماری ۲۴۴ ۳ پر پہونچی تھی

وہ رقبہ جہاں اراولی پہاڑیوں کا شمالی حصہ جمنا سے آکر مل گیا ہے مدت ہائے دراز بلکہ زمانۂ قدیم در قدیم سے یکے بعد دیگرے کسی نہ کسی بڑے شہر کا موقع ہوتا چلا آیا ہے۔ یہاں پہلے شہر اندرپرستھ آباد تھا جسکی بنیاد ایک پانڈو راجہ جودھسٹر نے ڈالی تھی۔ ملا قاسم فرشتہ مشہور مورخ لکھتا ہے کہ دہلی یا دلی کی بنیاد اسکندر مقدونی کے حملہ سے پیشتر راجہ دھلو نے ڈالی تھی۔ راجہ اننگ پال نے شہر آباد کیا اور لال قلعہ بنوایا جہاں اب قطب مینار استادہ ہے۔ وہ متھرا سے لوہے کی لاٹ لایا اور ۱۰۵۲ء میں یہاں نصب کی۔

۵۸۷ھ (۱۱۹۱ء) میں شہاب الدین محمد غوری کو شکست دینے کے لئے رائے پتھورا اپنے رفیقوں اور حلیفوں کی زبردست و پُرشوکت جماعت لیکر بڑھا لیکن فیصلہ کُن جنگ سال مابعد میں ہوئی اور ہمیشہ کے لئے دہلی ہمود راجگان کے

(دہلی) چلے آئے تھے کئی بار شرفِ حضوری میسر ہوا تھا۔ میر کی تحریرات سے واضح ہوتا ہے کہ دربار کی رسائی بہت مشکل بات تھی اور جو خلعت و انعام عطا ہوتا تھا اُس کا وصول ہوجانا اور بھی دشوار تھا۔ اس کے لئے بھی قواعد و ضوابط معیّن تھے۔ جن کا مرعی رکھنا اور پورا کرنا دِقت

ہاتھ سے نکل گئی۔ ۵۸۹ھ (۱۱۹۳ء) میں قطب الدین ایبک (محمد شہاب الدین بن سام کے غلام) نے دہلی پر قبضہ کیا اپنے آقا کی وفات پر ۶۰۲ھ (۱۲۰۶ء) میں دہلی خاندان غلامان کے بادشاہوں کا دارالملک ہوگئی پُرانی دہلی کے سب سے بڑے اور شاندار کھنڈر اور ویرانے اسی نامور خاندان کی یادگار ہیں۔ پہلے مسجد جامع قطب الدین کی تعمیر شروع ہوئی تین سال تکمیل میں صرف ہوئے۔ التمش کے عہد میں اُسکی توسیع ہوئی۔ جو قطب الدین کا داماد تھا اور اس نسل کا سب سے بڑا فرمانروا مانا جاتا ہے۔ قطب مینار بھی اسی بلند حوصلہ اور عالی ہمت بادشاہ کی یادگار رہے۔ اسی کے قریب التمش کا مقبرہ اور سلطان علاء الدین کا غیر تکمیل یافتہ منار واقع ہے۔ منار کا آغاز ۷۱۱ھ (۱۳۱۱ء) میں ہوا تھا۔ ۶۸۹ھ (۱۲۹۰ء) تک خانوادہ غلامان کا عمل و دخل رہا۔ پھر جلال الدین خلجی نے ایک نئے خاندان کی بناڈالی جلال الدین اور اُسکے کافر ست بھتیجے اور جانشین علاء الدین کے عہد میں تورانیوں نے وسط ایشیا سے اس ملک پر بار بار حملہ کیا برابر گھستے اور بڑھتے چلے آئے مگر بالآخر ناکام رہے اور پسپا ہوئے۔

۷۲۱ھ (۱۳۲۱ء) میں خاندان تغلق نے مملکت ہند پر قبضہ پایا۔ اُسکے بانی غیاث الدین نے ایک نیا دارالصدر (تغلق آباد) کے نام سے ایک پہاڑی کی بلندی پر پورب کو چار میل پر آباد کیا اُسکی عظیم الشان محلسرائوں قلعوں اور وسیع ایوانات کے نشانات اور پُرانی بنیادوں کے آثار اب بھی نمایاں ہیں۔ یہ تیسرا دارالسلطنت تھا غیاث الدین تغلق نے ۷۲۵ھ (۱۳۲۵ء) میں وفات پائی اور اُس کا بیٹا محمد بن تغلق سلطان الغ خاں تخت نشین ہوا اُس نے دارالحکومت کو ہٹانے اور دہلی کی پوری آبادی کو دولت آباد ملک دکن میں اٹھائے جانے کی ایس بار کوشش کی۔ فاصلہ آٹھ سو میل سے زائد تھا اور آب و ہوا ناسازگار۔ ناکام رہا۔ ابن بطوطہ مشہور مغربی سیاح نے دہلی کو اُسکی آبادی پر بادی کے ڈیڑھ سو برس بعد دیکھا تھا قطب الدین کی مسجد کو بے نظیر بتاتا ہے۔ وہ شہر کی ویرانی و بربادی اُسکے عظیم الشان ویرانوں، سربفلک عمارات اور اُسکے غیر آباد اور خالی مکانات کا دردانگیز تذکرہ کرتا ہے۔ فیروز شاہ تغلق پھر دہلی کو ہٹاکر ایک دوسرے مقام فیروز آباد پر اٹھالے گیا جو مقبرہ ہمایوں اور پہاڑی کے مابین تمام و کمال پھیلا ہوا تھا۔ اس بادشاہ کے ویران محل و کوشک، مقابر و مساجد اور اشوک کی لاٹ جو حضرت مسیحؑ سے تین صدی قبل بنائی گئی تھی اب بھی یہاں نظر آتی ہے۔ وہی اب فیروز شاہ کی لاٹ کہلاتی ہے۔ اس دہلی کی تکمیل ۷۵۵ھ (۱۳۵۴ء) میں ہوئی۔

جمادی الاولیٰ ۸۰۱ھ (دسمبر ۱۳۹۸ء) میں جب کہ خاندان تغلق کے دو رقیب دعویدار سلطنت کے باقی ماندہ ریزوں کے لئے جنگ و پیکار کر رہے تھے تیمور صاحبقران کے دل بادل عساکر دہلی پہونچے۔ محمود شاہ ثانی جو

اور شفقت دونوں کا طالب و متقاضی تھا۔ صدر در فرمان شاہی کے بعد بھی جاگیر تو ایک بڑی چیز اور دیرپا بخشش و موہبت تھی، معمولی چیزوں کے ہاتھ آنے میں بھی بہت دیر لگتی تھی۔

جو رائے نام بادشاہ تھا گجرات بھاگ گیا اُسکی فوجوں نے عین شہر پناہ کے پیچھے شکست کھائی۔ تیمور شہر میں فاتحانہ داخل ہوا۔ قتل عام و غارتگری تمام کا بازار چار روز تک گرم رہا۔ گلی کوچوں میں جوئے خون رواں تھیں اور کشتوں کے پشتوں سے راستے بند تھے۔ جب منگولیوں (تورانیوں) کی آتش عقاب کچھ سرد ہوئی اور یہ حملہ آور واپس ہوئے تو عورتوں اور مردوں کی ایک کثیر تعداد کو اسیر دام و غلام بنا کر کشاں کشاں ہمراہ لے گئے۔ دو مہینے تک دہلی میں نہ حکومت تھی نہ حاکم۔ محمود شاہ واپس آیا اور اپنی بچی کھچی سلطنت کے ایک ٹکڑے پر قدم جمائے ۸۱۵ھ (۱۴۱۲ء) میں اُسے وفات پائی اور سادات نے جو منگولیوں کے زیر فرمان بلکہ حلقہ بگوش تھے دہلی اور اُس کے اطراف و جوانب میں ایک مختصر سی مملکت پر قبضہ کر لیا۔ ۸۵۵ھ (۱۴۵۱ء) میں خاندان لودی نے عناں حکومت پائی۔ ۹۰۹ھ (۱۵۰۳ء) میں سکندر ثانی نے اپنی سلطنت کا دار الصدر آگرہ بنایا۔ تاہم دہلی کی عظمت و شوکت کم و بیش قائم رہی۔ ۹۳۲ھ (۱۵۲۶ء) میں پانی پت کے مقام پر بابر بادشاہ نے لودیوں کے اخیر تاجدار ابراہیم ثانی کو شکست دی اور دہلی میں داخل ہوا۔ اُس نے اپنی بود و باش زیادہ تر آگرہ میں رکھی ہمایوں پھر دہلی چلا آیا۔ اور اُس نے اندرپتھ کے موقع پر پرانے قلعہ کی ترمیم و تجدید بلکہ تعمیر شروع کی۔ ۹۴۶ھ (۱۵۴۰ء) میں شیر شاہ سوری افغان نے ہمایوں کو ہند بدر کیا اور شہر کے گرد نیا حصار بنایا اور قلعہ کی تحصین کی۔ لال دروازہ اُسی کا تعمیر کردہ پھاٹک ہے جو بڑی سڑک کی ایک سمت موجودہ جیل خانہ کے رخ پر یکہ و تنہا موجود اور قائم ہے۔ سلیم گڈھ کے قلعہ سے شیر شاہ کے ایک بیٹے کی یاد تازہ ہو جاتی ہے گرد و نواح کی شکستہ حال عمارات اور کھنڈروں میں مقبرۂ ہمایوں نہایت عبرت خیز اور اثر ڈالنے والی یادگار باقی ہے۔

اکبر اور جہانگیر تو معمولاً آگرہ، لاہور یا اجمیر میں رہتے تھے۔ شاہجہاں نے شہر کو موجودہ موقع پر از سر نو بسایا۔ قلعے درست اور تعمیر کئے۔ شہر کا نام اپنے نام پر شاہجہاں آباد رکھا۔ جامع مسجد تعمیر کرائی۔ نہر حسن غربی کو حفر کرا کے پھر جاری کیا۔ چند ایام کو چھوڑ کر اُس زمانہ سے برابر دہلی سلاطین مغلیہ کا دار الصدر رہی ۱۱۵۱ھ (۱۷۳۸ء) میں بعہد محمد شاہ بادشاہ باجی راؤ مرہٹہ پیشوا دہلی آیا۔ دو سال بعد نادر شاہ فاتحانہ سرور و تمکنت کے ساتھ شہر میں داخل ہوا اور قتل عام و خونریزی کے بارہ میں تیمور کی تقلید اور اُس کے مراسم جہانداری و جہانبانی کی تجدید کی اس ایرانی فتحمند یا غارتگر نے اٹھاون ۵۸ دن تک سیل خون بہائے۔ غریب و امیر سب کو لوٹا اور لٹوایا۔ وہ جس وقت دہلی سے ہٹا ہے تو اُسکے مال غنیمت کا اندازہ چھتیس ۳۶ کروڑ (تیس ۳۰ ملین اسٹرلنگ) کیا گیا تھا۔ ۱۱۷۰ھ (۱۷۵۶ء) میں اس شکستہ حال سلطنت کے تجزیے سے قبل اس آفت نصیب دار السلطنت میں دو بار خانہ جنگیاں ہوئیں۔ احمد شاہ دُرانی نے جو کچھ پایا لوٹ مار کر لے گیا اور رہا آخر غارتگری

فرخ سیر کے متعلق لکھتے ہیں۔

"۴، ماہ ربیع الآخر ۴ سنہ جلوس (۱۱۲۸ھ) کو دیوان خاص میں حضرت ظل سبحانی کی ملازمت حاصل کی۔ ازراہ فضل و کرم تبرک یعنی خلعت بالاندہ مرحمت فرمایا اور تعلقہ خدمت کی رخصت دی۔ خلعت اور رخصت دونوں کے لئے آداب و تسلیمات بجالایا۔ اب بادشاہ ظل اللہ سے کوئی کام باقی نہیں رہا۔"

ایک اور موقع پر ذکر کرتے ہیں "یہاں کی روئداد یہ ہے کہ سیاہہ بحالی خدمات کا دفتر خالصہ شریفہ سے نواب قطب الملک کے دستخط کے بموجب 'دفتر بخشی الممالک' و 'دفتر سوانح حضور انور' میں لکھوادیا تھا چونکہ خدمت سوانح بدستور نواب میر جملہ کی سپرد ہی اور نواب نے کو کیطرفسی نیابتاً مرزا غلام محمد کام کرتے ہیں

کا خاتمہ مرہٹوں کے ہاتھ پر ہوا۔

۱۱۷۳ھ (۱۷۵۹ء) میں عالمگیر ثانی قتل ہوا جو واقعی بادشاہوں میں سے آخیر کہا جاتا ہے۔ شاہ عالم ثانی جس نے یہ خطاب خالی خولی اختیار کر لیا تھا اپنا اقتدار و اختیار دہلی میں بھی نافذ نہ کر سکا۔ حتّٰے کہ شہر برابر افاغنہ اور مرہٹوں کا صیدگاہ بنا رہا۔ ۱۱۸۵ھ (۱۷۷۱ء) میں مرہٹوں نے شاہ عالم کو اُسکے آباء و اجداد کے گھر لے جاکر آباد کیا مگر ۱۲۰۰ھ (۱۷۸۵ء) میں مرہٹوں کی فوج محافظ محل شاہی میں مستقل طور پر مقیم ہوگئی۔ شاہ عالم بیچارہ سندھیا کے پنجہ میں اسیر و مقید رہا۔ ۷ ذیقعدہ ۱۲۱۸ھ یعنی ۱۴ مارچ ۱۸۰۳ء کو مرہٹوں کو شکست دے کر لارڈ لیک دہلی میں داخل ہوا اور بادشاہ کو اپنی حفاظت و حراست میں لے لیا۔ مفتوحہ و مقبوضہ علاقہ جات پر بادشاہ کے نام سے انگریز عملداری کرتے رہے۔ صرف محلسرا کے اندر بادشاہ کا حکم نافذ تھا۔ ۱۸۵۷ء کے غدر اور ابوظفر بہادر شاہ کی شرکت یا الزام بغاوت نے اس برائے نام بادشاہ و بادشاہی کا بھی خاتمہ کر دیا۔ فاعتبروا یا اولی الابصار۔

دہلی کی عمارات اور پرانے کھنڈروں کے متعلق پوری تفصیل سر سیّد احمد خاں بہادر کی مشہور کتاب آثار الصنادید میں ملے گی۔ لیکن اسی ذیل میں فرگس صاحب کی "تاریخ عمارات ہندوستانی و مشرقی" (مطبوعہ ۱۸۷۶ء) اور ہیتا صاحب کی "دہلی سابق و حال" (مطبوعہ ۱۹۰۲ء) بھی قابل ملاحظہ ہیں۔ اُن کو اسی آئینہ کا عکس سمجھنا چاہئے۔ اُمرا کے محلات، بادشاہوں کے قلعے اور ایوانات تو صفحۂ عالم سے اکثر محو و نابود ہو چکے لیکن اولیائے کرام کے مزارات و مقابر دہلی مرحوم کے نام کو اب تک روشن کر رہے اور یار و اغیار کو آستاں بوس بنائے ہوئے ہیں ؎

بر زمینے کہ نشان کف پائے تو بود　　سالہا سجدہ گہ اہل نظر خواہد بود

مرزا پہلے خواصان عالی شان کے داروغہ تھے۔ اب سہ ہزاری منصب رکھتے ہیں اور قابلیت و استعداد سے خالی نظر نہیں آتے۔ فقیر نے اُن کی خدمت میں رجوع کیا۔ اُنھوں نے سند کے دینے میں تعلل کیا اور اس مقدمہ کو پھر عرض کیا۔ آجکل بادشاہ نے یہ مقرر کر رکھا ہے کہ جب کوئی عرضی مکرر جاتی ہے تو یا تو اُسمیں کچھ کمی کر دیتے ہیں یا قطعاً نامنظور فرماتے ہیں۔ خدا کے فضل سے فقیر کی عرضی پر دستخط خاص سے یہ فقرہ مزین فرمایا کہ "بدستور سابق بحال تبرک بہ دہند"۔ اب مرزائے مزبور نے سیاہہ تبرک داروغۂ خلعت خانہ کے لئے بندہ کو دیدیا ہے۔ تبرک سرپیچ یا شال[۲۲۹] مرحمت ہوگا۔ داروغۂ خلعت خانہ اشرف علی خاں ہیں اور وہ کسی تقریب کی وجہ سے کئی روز سے دربار میں نہیں آئے تھے۔ اُن کے نائب سے رجوع کیا گیا۔ نائب صاحب چنداں متوجہ نہیں ہوئے اور فرمایا کہ بالفعل جنس موجود نہیں ہے، چند روز کے بعد آئیگی۔ اس لئے ایک آشنا کی معرفت اشرف علی خاں کے گھر پر گیا تو ...... اپنے نائب سے تاکید کردی کہ انکا کام آج ہی انجام کرادیا جائے..... دربار کے کام کوئی اختیاری بات نہیں ہیں۔ ایک دن کے کام میں ایک مہینہ لگتا ہے اور ایک عالم سرگرداں پھرتا ہے.....

دہلی میں میر صاحب کا قیام شیخ فرید[۲۳۰] کے کٹرے میں رہا۔ کوئی حویلی کرایہ کی میسر نہیں آتی تھی بسرائے کا رہنا جو بازار کے برابر تھا انکو کبھی پسند نہیں آیا لیکن کیا کرتے کہ ہر چیز کی قلت اور گرانی لشکر میں انتہا درجہ کی تھی۔

---

۲۲۹ شال نفیس و قیمتی شے جو بخوبی مشہور ہے۔ یہ چادریں کشمیر و پنجاب میں اُونکے مال سے مختلف رنگ و وضع کی بُنی جاتی ہیں۔ ہمیشہ دو فرد (پرت) ملاکر فروخت کی جاتی ہیں یا تحفتاً پیش یا اعزاز اعطا کی جاتی ہیں یہی دوشالہ کہلاتا ہے۔

۲۳۰ شیخ فرید بخشی۔ نقوی سید صحیح النسب آل عبا۔ نواب اُمرائے اکبری سے تھے۔ جوہر شناس بادشاہ کے دربار میں وفاداری و خیرخواہی سے کام لیا تھا خدمات شایستہ انجام دیکر اس منصب بلند (بخشی گری) پر ترقی پائی تھی جہانگیر کے عہد میں بہت سے معرکے مردانہ سر کیے اور کمال بہادری دکھائی تو مرتضیٰ خاں کا خطاب عطا ہوا تھا۔

کٹرہ ہندی لفظ ہے۔ مارواڑی زبان میں کٹلو کہلاتا ہے۔ اصل میں بازار کی جگہ یا بازار کو کہتے ہیں۔ مجازاً محلہ کے معنی میں بھی استعمال ہوتا ہے۔

میر صاحب کے لئے ایک بڑا کام فراہمی فرمایشات کا تھا میر سید محمد بھی آئینہ کے لئے لکھتے تھے کبھی سند وتحفہ کیواسطے۔ آئینہ عمدہ موجود تھا وہ میر صاحب نے بھیج دیا۔ سند وتحفہ کی تلاش وغیرہ بھی ملتوی رکھی تھی۔ کبھی پارچہ کی ضرورت پڑتی تو یہاں سے گٹھری بند ہو کر سربمہر کسی ہرکارے کے ہاتھ یا کسی معتمد دوست کے ساتھ بھیجنا پڑتا تھا اور وہ سخی اپنی کو تہ آسینا ہیں

میر سید محمد اس قسم کی تصدیع کے شروع سے عادی تھے۔ جب آپ کے باپ بھکر میں تھے اُس وقت بھی یہی کیفیت تھی۔ ایکمرتبہ سرمہ منگوایا۔ میر نے ان کا خط بخشی خان صاحب مہربان شفیق بیسال امین الدین خاں (فوجدار سرکار بھکر) کو دکھایا۔ انھوں نے از راہ مہربانی سرمہ نفیس عنایت فرمایا۔ اُن کی سرکار کا سرمہ نہایت خوب ہوتا تھا۔ بہت آدمی جن کی آنکھیں چیچک سے کی ڈ پھول پڑ گئے تھے اسی سرمہ کی مداومت سے صحت پا گئے تھے۔ اسی کے ساتھ خان موصوف نے ایک ا حلقہ کمان بھی میر سید محمد کے لئے عنایت فرمائی۔

حُسنِ تدبیر و حُسنِ عمل

میر عبد الجلیل کی ذات جملہ اوصاف وکمالات سے متصف تھی۔ جہاں سازشوں اور گروہ بندیوں سے دُور رہتے تھے۔ وہاں یہ خوبی بھی ان میں موجود تھی کہ ہر جماعت میں سے نکلتے اثر اور احترام رکھتے تھے۔ میر دربار میں ان کی رسائی تھی۔ اگر نواب قطب الملک اور امیر الامرا احترام کرتے تھے۔ تو اسی وقت میں میر جملہ سمرقندی جو ان سیدوں کا مخالف بلکہ دشمن تھا اور جس نے کبھی خود میر عبد الجلیل کو خدمات بھکر سے معزول کر دیا تھا۔ میر کو آنکھوں پر جگہ دیتا اور انکی پرورش ومعاش کی فکر وتدبیر کرتا تھا۔ دربار شاہی میں بھی ان کو بار حاصل تھا اور اکثر امرا ان سے بذات خاص واقف اور ان کے کمالات کے معترف تھے۔ میر کی اس دانشمندانہ روش کا حوالہ کسی تذکرہ نویس نے نہیں دیا نہ میر سید محمد و میر غلام علی نے ذکر کیا ہے لیکن اس کا پتہ اُن خطوط سے چلتا ہے جو اُس وقت تو خانگی و نخفی طور پر محض اپنی حالت اور ہنگامی مجبوریوں کے

اظہار کے لئے لکھے گئے تھے مگر میر سید محمد نے اُن کی نگہداشت کی اور اس طرح اپنی اور اپنے باپ کی قابل قدر یادگار چھوڑی ہے۔ بعض کے دلچسپ اور ضروری اقتباسات ذیل میں دیئے جاتے ہیں۔

(۱) [بحالت علالت سخت]۔ احوال بدن چنیں و رسیدن درلشکر و بیکار نشستن بغایت دشوار۔ و در سلطنت نو ہیچ یک از اُمرائے نو مارانمی شناسند و فضل کمال را کسے نمی پرسد۔ و قواعد قدیمہ سلطنت ہمہ برہم خوردہ و کارہائے خلائق ہمہ بند۔ مگر کسے کہ زر بسیار داشتہ باشد۔ وآں ہم عالمے ست کہ زر خرچ کردہ باز نقصان کشیدہ و خاک بر سر خود انداختہ می گردند۔ عامہ خلق بایں حالت گرفتار از قبیل مضمون کریمہ است ۲۳۱ فَصَعِقَ مَنْ فِي السَّمٰوٰتِ وَمَنْ فِي الْاَرْضِ اِلَّا مَنْ شَاءَ اللّٰهُ۔ الغرض از جملہ اُمرائے ایں زمان نواب دلیر دل خاں کہ در بھکر بخدمت ایشاں روشناسی بہم رسیدہ بود آشنا بودند...... خدمت صوبہ داری ملتان بہ نواب مقرر شد۔ مربّی کہ دراُردوے معلے بود آنہم بیروں رفت ...... یا لفعل آمد و رفت بدربار امیر الامرا دارم۔ اما بسیار تنگ بار و عالی شان واقع شدہ اند ....

(۲) آج دوشنبہ دوسری ذی الحجہ کو اگرچہ طاقت و توانائی نہ تھی ایک ماہ سات دن بعد سوار ہو کر شیخ لالن ۲۳۲ مدار علیہ سرکار میر جملہ کے یہاں گیا تھا..... لشکر کی روداد یہ ہے کہ ارکان سلطنت کے عناصر اربعہ بمقتضائے تضاد طبعی ایک دوسرے سے ناسازش رکھتے ہیں۔ اسلئے قطب الملک اور امیر الامرا دونوں بھائیوں نے استعفا منصب کر دیا۔ لوگوں نے اس بات کو عرض اقدس میں بہ نوع دیگر پہونچایا چنانچہ کئی روز تک ہنگامۂ عظیم برپا رہا۔ قلعہ میں سات چوکیاں (پہرے) شب و روز موجود رہتی تھیں۔ چونکہ نفس الامر میں سادات کی طرف سے کوئی بات نہ تھی۔ اس لئے حضرت ظل سبحانی کی والدہ نواب قطب الملک کے گھر تشریف لے گئیں اور استمالت کر کے قطب الملک کو حضور پر نور میں لے آئیں۔ حضرت بدولت نے ان کے حال پر مہربانی کمال مبذول

۲۳۱ تو جو آسمانوں میں ہے اور جو زمین میں ہے اُن پر بے ہوشی طاری ہو جائے گی مگر جس کو خدا چاہے۔
(جزء ۲۴ - سورۃ الزمر - ع - ۷ - ۴)

فرمائی خلعت و سرپیچ مرصع اور پانچ گھوڑے دو ہاتھی مرحمت کیے۔ لیکن امیرالامرا[۲۳۲] نے اب تک ملازمت نہین کی ہے۔ ابھی ملازمت کو ایک شق پر منحصر رکھا ہے کہ میر جملہ بنگالہ کو چلا جائے اور مین دکن کو۔ جب میر جملہ رخصت بنگالہ لے کر روانہ ہو جائے گا مین بھی ملازمت کر کے دکن کو رخصت ہو جاؤن گا۔ اسلئے یہ قرار پایا ہے کہ ۱۱ ذی حجہ کو میر جملہ رخصت ہو جائے"۔

(۳) "دربار کی حقیقت یہ ہے کہ میر جملہ عید اضحے کے دن ظل سبحانی سے بنگالہ[۲۳۳] کو رخصت ہو گئے چند روز سرانجام باربردار وغیرہ لوازم سفر کے لئے توقف کرنا پڑے گا۔ ساعت دیکھ کر بنگالہ کو روانہ ہون گے۔ سبحان اللہ عجب قسمت ہے کہ انھین دونون درباروں سے روشناسی حاصل ہو گئی تھی اور چاہتا تھا کہ اب کسی مہینے خدمت کر لی ہے تو اپنے کام کے لئے التماس کرون کہ یہ مقدمہ پیش آیا۔ گویا آج شاہجہان آباد مین اجل مع ہوں۔ اب از سر نو کوئی اور فکر کرنا پڑے گی۔ نواب امیرالامرا سے خوب روشناسی ہو گئی تھی لیکن کیا فائدہ کہ اب یہ دکن روانہ ہو رہے ہین اس زمانہ مین کامون کے ازدحام اور کثرت سے ان کے حواس متفرق ہین آج کل ان کے دربار مین اس قدر کثرت ہوتی ہے کہ جتنی دربار شاہی مین بھی نہین ہوتی۔ اس پر بھی ہر روز مجرے کے لئے خلوت مین جاتا ہون"۔

(۴) "متواتر ماتم کے سبب سے کہ امیرالامرا کا جوان بھتیجا اور لڑکا واصل رحمت الٰہی ہو گیا عرض کرنے کا موقع میسر نہ آیا۔ نواب صاحب سلخ ماہ ربیع الاول سنہ ۔۔ سے شہر شاہجہان آباد سے باہر نکل آئے ہین اور حضرت سلطان المشائخ کی درگاہ کے قریب دائرہ (لشکر و خیمہ) مین فروکش ہین۔ باوجود ناتوانی بدن کے کہ ہرگز اصلی حالت پر نہین آیا ہے ہمیشہ سوار ہوتا ہون

---

[۲۳۲] سیچ لائن "رنعتیا ہوائی بستگاہ" لکھے جاتے تھے اور محمدی خان خطاب ملا تھا

[۲۳۳] آزاد دہلوی لکھتے ہین سلاطین چغتائیہ مین یہ آئین تھا کہ جس امیر پر خفا ہوتے تھے اسے بنگالہ پھینک دیتے تھے کچھ اس سبب سے کہ گرم ملک تھا سیر ہوا مرطوب، بیمار ہو جاتے تھے۔ اور کچھ اس سبب سے کہ ولایتی لوگ اپنے ملک سے دوری اور بُعد مسافت سے بہت گھبراتے تھے اور ماہی محض کی سبب سے اس ملک میں تنگ رہتے تھے

صبح کو سوار ہو کر امیر الامرا کے لشکر کو جاتا ہوں پھر وہاں سے دربار شاہی پر آتا ہوں خدا کرے کہ سب کام خاطر خواہ صورت پذیر ہو جائیں۔ اگر امیر الامرا چند ماہ اور کچھ زمانہ تک رہ جاتے تو تمام مطالب پورے ہو جاتے ۱۴ ربیع الاول سنہ ۶ کو سند خدمت سوانح نگاری بھکر وسیوستان کی مرتب ہو کر مل گئی مگر سند بخشی گری و وقائع نگاری سرکار سیوستان کی ہنوز بخشی صاحبان کے دفتروں میں رجوع ہے۔"

(۵) "امیر الامرا روانہ دکن ہو گئے جب تک شاہجہان آباد سے چار پانچ کوس پر رہے فقیر برابر مجرے کیلئے جاتا اور دوپہر تک شاہجہان آباد آجاتا تھا۔ اب کہ دور پہونچ گئے ہیں آمد و رفت کے قابل مسافت نہیں رہی ارادہ ہے کہ ۹ تاریخ کو گھر سے کوچ کر کے اُن کے لشکر کو چلا جاؤں اور اُن کی خدمت میں چند روز رہ کر رخصت ہو کر شاہجہان آباد آ جاؤں باوجود نحافت بدن اور قوت نہ ہونے کے دونوں وقت سوار ہوتا ہوں۔"

(۶) "نواب قطب الملک نے ہمارے اور آپ کے کام کے اجرا کی پروانگی رائے خوشحال چند پیشکار نواب امیر الامرا کو کہ بخشی الممالک ہیں دیدی ہو کہ بندہ کا منصب اور خدمات آپ کے لئے مقرر کر دی جائیں اور بندہ کو دستک تعیناتی نواب بخشی الممالک کی دیدیں چونکہ ان دنوں بخشی گری اول کی نیابت پر نواب صمصام الدولہ[۲۲۴] خان دوران بہادر مقرر ہیں اس لئے ان کی اطلاع کے بغیر کام کی صورت نہیں نکلتی آپ رسید محمد کی عرض حقیقت کے لئے جو عرضی دی گئی تھی اسکو جب نواب خان دوران نے دیکھا تو پوچھا کہ سید محمد کہاں ہیں؟ ان کو لے آئیے تاکہ بموجب تحریر امیر الامرا

۲۲۴ یہ خان دوران چہارم شاہ فرخ سیر کے عہد کے بڑے امراء میں شمار ہوتا ہے محمد شاہ کی تخت نشینی، سید حسین علی خان کے قتل اور اُس کے بھائی قطب الملک کے قید ہو جانے پر امیر الامرا مقرر ہوا ۱۱۳۲ھ/۱۷۲۰ء میں صمصام الدولہ خطاب پایا اور ایک سال بعد خان دوران بہادر، اصلی نام خواجہ محمد عاصم ... منصور جنگ بھی کہلاتا ہے۔ نادر شاہ کے معرکہ میں نہایت شجاعت و مردانگی سے لڑا حتیٰ کہ مجروح ہوا تین دن درد و تکلیف برداشت کر کے ۱۷ ذی قعدہ ۱۱۵۱ھ (۱۶ فروری ۱۷۳۹ء) کو اس دار ناپائیدار سے رخصت ہوا۔

عرض کی کہ منصب و خدمات کا تقرر کرا دیا جاوے۔ بنا برین راے خوشحال چند سے بہ تاکید کردی ہی کہ آپ کے صاحبزادے کا کام تیار رہے اُنکو بلا لیجئے تاکہ تصدیق منصب و سند خدمت اُن کو دیدی جاے۔ تمہارے منصب و خدمت کا بحال رہنے سے اس زمانہ مین بہت بڑا کام تھا سو توجہ امیر الامرا و فضل الٰہی سے امید ہی کہ بہ آسانی صورت نکل آئیگی۔ ابھی بے وسیلگی اور دربار کے رنگ کو دیکھ کر اس کام کو مین نے بہت غنیمت سمجھا ہی اور مین نے اسی واسطے کہ تمہارا قدم جم جاوے مین نے دکن کا سفر اختیار کیا"

(۲) "سواری دو وقت او سفر ہمراہی نواب امیر الامرا کے سبب سے کہ جنکے ساتھ مین بائیس روز دہلی اور شاہجہان آباد سے چھ منزل چل کر رخصت فرمایا تھا بہ ضرورت میرے خیال سے اُتر گئی تھی۔"

اقتباسات بالا کو مین نے حتی الوسع فارسی سے بلفظہا ترجمہ کر دیا ہے تاکہ قارئین محترم اُس زمانہ کے اصول انتظامی و قواعد ملک داری سے آگاہ ہو سکین۔ اسی ضرورت سے بعض کلمات بدستور رہنے دیے ہین جن مین سے کچھ تو دفاتر سرکار کی مصطلحات ہین اور کچھ اہل غرض اور امیدواران کی اختراعات۔ ان سے یہ بھی پتہ چلتا ہی کہ باوجود انقلابات و بے اطمینانی شدید کے تبادلہ خدمت اور اجراے احکام رد و بدل و بحالی جاگیر و مدد معاش مین کس قدر احتیاط کی جاتی تھی۔ حتیٰ کہ باوصف میر صاحب کے ذاتی رسوخ و رسائی کے اُن کے فرزند ارجمند کی حاضری و موجودگی لازم سمجھی گئی اور وہ دار السلطنت کو بلاے گئے تھے۔ راے خوشحال چند کی مہربانی اور نواب خان دوران بہادر کی سرپرستی و عنایت اُن کی اعانت نہ کر سکی۔ دربار شاہی اور خود بادشاہون کی کیسی ہی کچھ حالت ہو لیکن ارباب حل و عقد اپنے عمل مقررہ اور دستورات مستمرہ سے سر مو تجاوز نہ کرتے تھے اور اپنے فرائض کو بلا لحاظ و رعایت انجام دیتے تھے۔

وفات

بھکر کی آب وہوا[۲۳۵] امیر عبد الجلیل کے موافق مزاج نہ تھی۔ خاص کر سردی کا موسم نہایت دشواری اور بہت سی شکایات جسمانی مین گزرتا تھا۔ وہان سے نکلے تو چار ماہ مین بھکر سے شاہجہان آباد کا سفر طے ہوا۔ اُس کے شدائد وصعوبات کو ناقابل بیان لکھتے ہین پہونچنے کے سوا مہینہ بعد بیمار ہوے اور سخت بیمار پڑے۔ خدا خدا کرکے صحت پائی۔ پائے تخت کے قیام کا وہ زمانہ نہایت پُرفتن اور پُرشور وشر تھا۔ بادشاہ گردی اور اُمرا کی سازشوں اور پُرپیچ چالون سے کوئی ساعت خالی نہین جاتی تھی۔ یہ عشرہ جھلکہ مین گام زن تھے۔ دہلی کی آب وہوا، درد انگیز گرانی اور اخراجات سے تنگدستی وحیرانی، روز افزون تھی تندرستی قائم نہ رہ سکی، اعتدال مزاج باقی نہ تھا۔ بارہا علیل ہوئے اور اچھے بھی ہو گئے عمر کی آخر منزل یعنی ستھوین سال مین ایسے بیمار پڑے کہ پھر بستر مرگ سے اُٹھ نہ سکے وہ مرض، مرض الموت ثابت ہوا۔ بہت سے ملازم، سچے رفیق و وفادار ساتھ تھے۔ منا حیجھی

۲۳۵ف میر عبد الجلیل بھکر میں انتہا درجہ کی سردی ہونے کے شاکی ہیں اور لکھتے ہیں کہ ہوائے بھکر از حد چہار سال این قدر مختلف شدہ کہ در نوشتن نمی آید خصوص در موسم سرما این قدر تغیر فاحش در مواسم رسید کہ ہیچ متنفسے از ادوار سالم نمی ماند این معنی را از مداری فیض اللہ کہ تازہ می رسد تحقیق نمایند۔ مجھے اُس کے زمانہ کی کوئی تاریخ ماثر میرا ایسی نہیں ملی جس سے مزید تحقیق و انکشاف ہو سکتا۔ البتہ آج سے ایک صدی پیشتر "سلسلۂ جدید رہنمائے سالانہ و گزٹیر صوبجات بنگالہ و آگرہ" کا جو کام اعظم لارڈ آکلینڈ گورنر جنرل New Series of the Bengal and Agra Annual Guide and Gazetteer, Calcutta, 1842 شروع کیا گیا تھا اور جس کو بعد تکمیل ولیم رشٹن کمپنی نے اپریل ۱۸۴۲ء مین شائع کیا اُس سے پایا جاتا ہے کہ "جنوری مین یہاں ۴۵ درجہ پر سردی پڑتی ہے۔ اسیطرح گرمی بھی انتہا کی ہوتی ہے" ایک دوسرے موقع پر لکھا ہے کہ "بھکر مین مئی کے اکتیس دن کا اوسط مقیاس حرارت بہت زیادہ تھا۔"
شیخ علی حزین جہان آباد سے کشتی پر بھکر کے قریب دریائے سندھ کے کنارے یہ شہر بھی ہے حیدر آباد کی راہ پر واقع ہے یہاں کے باشندگان کے اوضاع و اطوار کی شکایت کرنے اور طبائع کو ملائمت و لطافت سے ماہر پاتے ہیں۔

حوت کیا تیرا بھی طبیب و معالج، مزاج شناس، کہنہ مشق، ہمدرد و مہربان تھے لیکن یہ سب
مداوا بے کار ثابت ہوا

کیسی دوا، کہاں کی شفا، یہ بھی چند روز　　قسمت میں تھا کہ نام مسیحا اُٹھائیے!

چھیاسٹھ سال چھ ماہ دس روز عمر پاکر میر عبدالجلیل نے شنبہ کی شب میں ۲۳ ربیع الآخر ۱۱۳۸ھ
مطابق ۷ دسمبر ۱۷۲۵ء کو شاہجہان آباد میں رحلت فرمائی۔ ضلع ہردوئی کے گزیٹیر طبع ۱۹۰۴ء میں
سال وفات ۱۷۲۳ء تحریر ہے۔ صاحب مفتاح التواریخ ۱۱۳۶ھ (ہزار و یکصد و سی) وفت (لکھنؤ
نقیر (محرر سطور ہذا) نے میر غلام علی آزاد کی تحریرات پر اعتماد کیا ہے اسی کی تائید و تکمیل سلسلۂ چلد

Visit to the Court of Sinde

ڈاکٹر برنس Dr Barns اپنی کتاب مشاہدہ دربار سندھ
میں لکھتے ہیں کہ پرانی تاریخوں میں اس ملک کا نام سندھ سدیت التحریر یعنی وہ زمین جو دریا سے برآمد ہوئی ہے
دریائے سندھ کی رعایت سے اس قطعہ کا نام سندھ پڑا اور اسی بنا پر اہل یونان اس کو Scindomona کہتے
ہیں۔ یہاں تین موسم ہوتے ہیں (۱) بہار (۲) تابستان یا گرما (۳) برسات یا سرما۔ بارش بھی کبھی کبھی جون جولائی میں ہو جاتی ہے
مالائی سندھ کی بیماریاں = چونکہ موسم سرما میں بارش بہت ہوتی ہے اور سردی بھی بشدت پڑتی ہے اس لیے یہاں
بیماریاں بہت پھیلتی رہتی ہیں۔ وجع مفاصل کے حملے نہایت سخت اور دورے دیر پا بلکہ نا مفارق ہوتے ہیں۔ بخار کے
خود سندھ میں یہی بیماری سب سے زیادہ پھیلتی ہے۔
جب بخار پھیلا ہوتا ہے تو اسکے بعد ہی طغیانی آب کے فرو ہو جانے کی وجہ سے ماہ ستمبر و اکتوبر میں دگھیا کی فصل شروع ہو جاتی ہے
جو کبھی کبھی آخر ماہ نومبر تک ختم نہیں ہوتی۔ یہ ایک ایسا زمانہ ہوتا ہے کہ جب اس ملک کا ہر ایک باشندہ کم و بیش اس قسم کی شکایات میں
تپ و لرزہ و ناسازگاری موسم کا اچھا خاصہ شکار ہو جاتا ہے جس کا نتیجہ اکثر جال کا پڑ جانا ہوتا ہے۔ ما آستقا، امراض سینہ
اور آشوب کا نقص خاص خاص موسموں میں برقرار رہتا ہے اور بہت سی بیماریاں (جن میں تعلق ... وغیرہ کے) اور تپ دق میں
یہاں کے بہت سے باشندے مبتلا نظر آتے ہیں۔
با ایں ہمہ مصنف تحفۃ الکرام آب و ہوائے سندھ کی ستائش کرتا ہے ع سرفطرت سلیم او ارحق سلام باد۔ اس کو اختیار
تھا کہ وہ سندھ کو دوسرا کشمیر لکھے لیکن تاریخی واقعات پر پردہ کون ڈال سکتا ہے معاصر بادشاہوں کے احکام کو دیکھیے شیخ
کمال بیابانی سے اگر غضب ہوا تو اُن کو ٹھٹھہ بھیج دیا تھا شیخ حسین احمیری سے بدگمانی ہوئی تو وہ بھی ٹھٹھہ کو جلا وطن کیے
گئے۔ سید محمد میر عدل بھکر اس خیال سے بھیجے گئے کہ ملک کا کنارہ ہے
اسکے متعلق گذشتہ صدی میں انگریز سیاحوں اور فوجی افسروں نے اپنی سرگزشت اور یہاں کے حالات تصنیف تمدید کئے ہیں

اوّل (Oriental Miscellany, Vol I) مطبوعہ کلکتہ ۱۷۹۸ء کے دیباچہ نگار مکانقیب کی روایت سے ہوتی ہے۔

ان کی وصیت کے موافق نعش وطن بھیجدی گئی۔ بلگرام میں جمعہ کے بعد البتہ عصر کے اوّل وقت ۲ جمادی الاول سال مذکور (۲۱ دسمبر ۱۷۲۵ء) کو ان کا جسم خاکی پیوند خاک کر دیا گیا باغ محمود گورستان آبائی میں اپنے بزرگوار میر سید احمد کے پاس جگہ پائی۔ خیالات روحانی ماکرجو اشارہ واقعہ ہوا تھا وہ یہ تھا کہ ان کے ہمعصر و ہوس قدسی صفات سید طفیل احمد نے قبرین آمادہ تھا۔ میر غلام علی آزاد ماٰثر المریان اور ید بیضا میں میر عبدالجلیل کے آثار نشر لکھیں کے ذیل میں لکھتے ہیں کہ ان کا جسد تابوت سے سالم و درست نکلا تھا کسی عضو میں صدمات کوئی تغیر یا خرابی نہیں ہوئی پائی تھی۔ آفتاب کی تپش اور چودہ دن کے سفر کو خیال کیجیے تابوت سے نکال کر نعش چارپائی پر لی گئی۔ جیسا کہ تازہ میت کو لے جاتے ہیں۔ لب قبر لائے۔ زیر کر چادر ڈال کر لحد میں آتارا۔

اہل حکمت کا دعویٰ ہے کہ عالم کا آغاز و انجام معلوم نہیں لیکن شاید میر عبدالجلیل کو اپنے آغاز و انجام یا کم از کم اپنی آرامگاہ خاکی سے کچھ آگاہی تھی۔ ان کی مثنوی امواج الخیال در تعریف بلگرام کا مطلع ہے ع

آب و گل من کہ فیض عام است — از خطۂ پاک بلگرام است

اہل عقیدت داور اک نے اس کی تفسیر فرمائی کہ عنصر لطیف نے اپنے مسقط الراس کی طرف رجوع کیا اور فرع نے اصل کی جانب بازگشت فرمائی۔ سچ ہے کل شئ یرجع الیٰ اصلہ

(۱) میجر اوٹرم Major Outram کا محاصرہ سندھ و افغانستان ۳۹-۱۸۳۸ء" مطبوعہ ۱۸۴۰ء

(۲) ٹی پوسٹنس T. Postans کے سندھ میں ذاتی تجربات" مطبوعہ ۱۸۴۳ء

(۳) سندھ کے متعلق سرکاری مراسلت" ۱۸۳۶ء تا ۱۸۴۳ء" مطبوعہ ۱۸۴۳ء

تواریخ وفات

موت التقی حیوۃ لا انقطاع لہا   قد مات قوم وہم فی الناس احیاء

میر عبدالجلیل کے اہل وطن و متوسلین و متعلقین کو ان کے انتقال سے جس قدر صدمہ ہوا اس کا اظہار ہی ان کا دائرہ اہل علم کا دائرہ تھا اور بڑا تھا تقریباً ہر ایک خواہ اور مداح نے ماتم گساری میں حصہ لیا اور اپنے درد دل کا اظہار مختلف پیرایوں میں کیا ہے انہیں سے چند جو انشا پردازی یا فن استخراج تاریخ کا عمدہ نمونہ ہیں یہیں یکجائی ہیں۔

میر غلام علی آزاد نے آیات کریمہ سے نکالی تھیں۔

(۱) لِلَّذِیْنَ اَحْسَنُوا الْحُسْنٰی وَزِیَادَۃٌ ۱۱۳۸ھ [واسطے ان لوگوں کے کہ نیکی کرتے ہیں نیکی ہے اور زیادتی ہے جزو ۱۱ سورۂ یونس ع ۹]

(۲) اُولٰٓئِکَ لَہُمْ عُقْبَی الدَّارِ جَنّٰتُ عَدْنٍ [یہی لوگ ہیں جنکی دنیا کا انجام ہے ہمیشہ رہنے کے باغ۔ جزو ۱۳ سورۃ الرعد ع ۳-۹]

آزاد نے ایک مرثیہ مثنانہ (قصیدہ) بھی لکھا تھا جسمیں ایک سو ایک شعر اور چار مطلعے تھے اور ہر مصرع سے تاریخ نکلتی تھی ایک مطلع یہ ہے۔

رسید روز گداز ہموم برق بیان   کباب شد جگر نار و لالہ بریان

ف ۲۳۶ الحسنی الجنۃ و الزیادۃ ہو اللقاء ربیضاوی لِلَّذِیْنَ اَحْسَنُوا ان لوگوں کے واسطے جنہوں نے نیکی کی یعنی ایمان لائے۔ الحسنی جزا خیر اور نیکی کی مکافات یعنی بہشت ہے وَزِیَادَۃٌ نیکی کی جزا میں وہ افزونی جو طریق تفصیل مرتب ہوگی۔ اہل علم لکھتے ہیں کہ حسنے جزائے نیک ہے ایک کے بدلے ایک اور زیادہ وہ ہے جو ایک کے بدلے میں دس یا اس سے بھی زائد عنایت ہو یا حسنے کو مغفرت سمجھئے اور زیادہ کو خوشنودی حضرت حق سبحانہ۔ تفسیر مدارک میں لکھا ہے کہ زیادہ مومنوں کے قلب میں کی وہ محبت ہے جو دنیا میں عطا ہو اور جس کا آخرت میں حساب نہ لیا جائے بعض فرماتے ہیں کہ وہ ایک سحاب (ابر) ہے جو اہل بہشت پر سے گذرے گا اور جو خواہش کرینگے

ایک اور تاریخ بھی لکھی تھی ؎

میر عبد الجلیل کرد وفات　　　　ورضوا عنہ گفت سال ممات

ایک دائرہ تاریخی بھی بنایا تھا جس میں لاتعد ولاتحصے تاریخیں برآمد ہوتی ہیں اس کی تقریب آزاد ان الفاظ میں کرتے ہیں۔

"وعبارت دائرہ مشتمل است بر صحت اِطراد یعنی اسامی، اما ترتیب تا چار نیست آمدہ بلکہ تاریخ نیست زیرا کہ نام پدر سید محمد سید حسین است پس لفظ حسینی در نگنجاید و اعتبار آیت یکے نسبت امام حسین علیہ السلام و دیگر نسبت بہ پدر سوائے آن متعذر است بر اظہار نسب مقام اصل و مسکن حال ہیچ خالی از ندرت نیست دائرہ را با طریق استخراج ثبت می کنم۔

طریق استخراج تاریخ ازین دائرہ این است کہ از خانہائے چہاردہ گانہ ہر خانہ را کہ خواہند مبدأ قرار دہند و ہر عددے کہ بخاطر برسد شمار نمایند سوائے واحد و چہاردہ و مضاعف و اول یا آخرین و ہر خانہ کہ شمار تمام شود عددش بگیرند پس عددے کہ بران شمار مقرر شدہ اگر فرد باشد باز خانہ منتہی را مبدأ گردانیدہ بتعداد بنمایند مرۃً بعد اخرٰی و دورۃً فدورۃً تا آنکہ منتہی مبدأ اصل گردد اکنون مقدار عددش بگیرند کہ مجموع اعداد حاصلہ تاریخ شود۔ و اگر زوج باشد خانہ مابعد منتہی را مبدأ گردانند و بہمین نمط شمار منجر شود تا آنکہ منتہی خانہ ماقبل مبدأ اصل گردد پس ازین مجموع اعداد حاصلہ تاریخ شود۔

مخفی نماند کہ مراد از اضعاف در اعداد مستثنی مثلین و سہ مثل و صاعدا باشد و اطلاق ضعف از روئے لغت بر

اس پر برس جائے گا۔ جمہور محققین کا خیال یہ ہے کہ زیادہ سے مراد حق تعالیٰ کا دیدار ہے جو محض اپنے کرم و لطف سے بہشت والوں کو نصیب فرمائے گا

مثل فصاعداً آمدہ است برخلاف مصطلح علماء حساب فی القاموس الضعف بالکسر المثل الی ما زاد ویقال لک ضعفہ یریدون مثلیہ وثلثۃ امثالہ لانہ زیادۃ غیر محصورۃ

آزاد سبحۃ المرجان میں ایسے دائرہ تاریخی کی نسبت لکھتے ہیں کہ اس کے واضع کا نام مجھے دریافت نہ ہو سکا۔ سب سے پیشتر میں نے جس چیز کو دیکھا تھا وہ ایک دائرہ فارسی زبان میں تھا جس کو اُس کے مؤرخ نے ہندوستان کے ایک مشہور عارف[۲۲۳] باللہ کے لئے لکھا تھا جس نے ۱۰۶۱ھ (۱۶۵۱ء) میں وفات پائی تھی۔

مصر دواکر بلگرام کے شاعر بھاکا و عالم سنسکرت نے اپنے ارتباط قدیم و محبت صمیم کے تعلق سے ایک دوھہ (دوہرہ) میر صاحب کے ماتم میں نظم کیا تھا

نہ ہوا ہے اور نہ ہوئے گا ایسو کہیں سُشیل
جیسو احمد نند جگ ہوئے گیو میر جلیل

न हुआ है औ न होवेगा ऐसा कहीं सुशील
जैसो अहमद नन्द जग ह्वै गयो मीर जलील॥

اتفاق غریب یہ ہوا کہ جب اس دوہے کے اعداد نکالے گئے تو بلا کمی و بیشی تاریخ نکل آئی۔

---

۲۲۳ حضرت امیر ابو العلا نقشبندی اکبرآبادی سے مراد ہے۔ آپ کی تاریخ وفات کتاب ملاح دین رہنما میں ۹ صفر ۱۰۶۱ھ روز سہ شنبہ لکھی ہے۔ مفتاح التواریخ و تحفۃ الابرار و انوار العارفین و خزینۃ الاصفیا میں بھی ۱۰۶۱ھ اور عمر ۷۱ سال لکھتے ہیں۔ امیر ابو العلا کا سال ولادت ۹۹۰ھ اور مولد سرائے نعلہ متصل دہلی تھا۔ آپ کے دادا امیر عبد السلام حسینی اکبر بادشاہ کے عہد میں سمرقند سے ہندوستان آئے تھے۔ یہاں سے زیارت بیت الحرام کیلئے تشریف لے گئے اور وہیں رحلت کی۔ اُن کے بیٹے امیر ابو الوفا نے فتحپور سیکری میں وفات پائی اور نعش دہلی لے جا کر لعل دروازہ کے مدرسہ کے متصل دفن کی گئی۔ امیر ابو العلا نے اپنے والد کی وفات کے بعد اپنے ماما خواجہ محمد یحییٰ کے زیر سایہ تربیت و تعلیم پائی۔ خواجہ صاحب عہد اکبری میں راجہ مان سنگھ صوبہ دار بنگالہ کے ہمراہ تھے اور بردوان کی فوجداری پر متعین۔ ماما کی شہادت کے بعد سہ ہزاری منصب مع سہ ہزار سوار آپ کو تفویض ہو گیا تھا۔ جہانگیر کے اوائل عہد میں دنیا کی ہوا و ہوس کو ترک فرما کر اجمیر چلے گئے وہاں سے آگرہ تشریف لائے اور مسند ارشاد و ہدایت کو زینت دی۔

ہیچ پروہ نیست نباشد نوائے تو
عالم پُر است از تو و خالی است جائے تو

تذکرۂ علامہ میر عبدالجلیل بلگرامی

موسُوم بہ

حیات جلیل

حصّہ دوم

جسمیں میر مبرور کے کلام اور تصانیف کا بسوط تذکرہ، اور اُن پر نقد و تبصرہ کیا گیا ہے۔
نیز اولاد و احفاد و اعقاب و معاصرین قدر فرمایان کے مفصّل حالات مندرج ہیں

از

مولوی سیّد مقبوُل احمد صاحب صمدنی
لیٹ ممبر رایل ایشیاٹک سوسائٹی آف گریٹ برٹین اینڈ آئرلینڈ۔ و۔ فیلو رایل سوسائٹی
آف آرٹس، مینوفیکچرس اینڈ کامرس، لندن وغیرہ

کیوں اہل حشر ہو کوئی نقاد سوز دل
لایا ہوں دل کے داغ نمایاں کیے ہوئے

فہرست عناوین مضامین تذکرۂ علامہ میر عبدالجلیل بلگرامی حصہ دوم

فہرست حواشی و فوائد تحت المتن تذکرہ میر عبد الجلیل بلگرامی حصہ دوم

بعض تصحیحات کتابت حصۂ دوم

صفحہ	سطر متن	سطر نوٹ	خطا	صواب	صفحہ	سطر متن	سطر نوٹ	خطا	صواب
ا	فہرست	۱۴	اسکی، وجہ	اسکی وجہ،	۳۳	۷	۰	نزدو	نزدو
۵	〃	۹	اہتزار	احتراز	۳۶	۰	۲	۹۲۰ھ	۹۲۱ھ
۲	۰	۳	ملکی	کی	۳۷	۳	۰	بالسّناط	بالتّناط
۴	۰	۱۶	میری	سیری	۴۴	۷	۰	انجھامہ	انجھامہ
۱۴	۱۹	۰	مفر	سفر	۴۴	۰	۴	سنہ ۱۶۷۳	سنہ ۱۶۷۳ع
۱۵	۸	۰	بیتی	ببستی	۴۹	۶	۰	محفوظ	محظوظ
〃	۱۹	۰	۱۸۵۴-۱۵۳	۱۸۵۲-۵۳	۵۱	۸	۰	نست	نیست
۱۹	۱۹	۰	العلا	العسلا	〃	۱۵		بتھادیا	بٹھادیا
۲۰	۶	۰	خوارند	خواندند	۵۳	۱		ہزبر	ہزبر
〃	۱۰	۰	تقتید	تقیید	〃	۰	۲	موتم، فہیم	موتم، نہیم
۲۲	۱۰	۰	پیشتر	بیشتر	۵۴	۸	۰	نصرت	نصرت
۲۴	۰	۷	عہدکی	عہدکے	۵۵	۰	۹	یعرف	یعرف
〃	۰	۹	موتیامحل	مٹیامحل	〃	۰	۱۱	فحول	فحول
〃	۰	۱۱	سید محمد قنوجی	سید محمد قنوجی متوفی	۵۶	۰	۱۰	سر	۲ ہر
				۲۲ شوال سنہ ۱۱۰۱ھ	۵۷	۶	۰	تبع	تبع
۲۵	۰	۵	۰۸۸ھ	۱۰۸۸ھ	۶۴	۷	۰	مجھے	مجھے سے
۲۶	۰	۲	لڑکے کا	لڑکے سید نور شمس	〃	۰	۷	Biggs	Briggs
				مخاطب بہ امجد خاں کا	۶۵	۴	۰	بودوباش	بودوباش ۵۲
〃	۰	۱۴	روایت	رفاہیت	۶۸	۹	۰	تخییل	تخیل
۳۳	۷	۰	جاہلاگو	جاہلاگو	۷۴	۱۱	۰	مفقدین	معتقدین

صفحہ	سطر متن	سطر نوٹ	خطا	صواب
۷۷	۵	۰	نہیاء نماز	نہیہ نماز
۷۷	۰	۳	۱۶۷۲ء سمبت	۱۶۷۲ سمبت
۸۰	۱۱	۰	نہ ہوا تھے	نہ ہوا ہے
〃	〃	۰	کنین	کہیں
۸۲	۰	۰	چار	چہار
۸۳	۱۶	۰	बेहार	बेहात
۸۹	۱۴	۰	گرد	گِرد
۹۰	۷	۰	پیس	بس
۹۲	۰	۳	حدف تحتانی	حذف تحتانی
۹۵	۱۴	۰	شاگردن	شاگرداں
۹۷	۰	۱۳	فرمولی	فرملی
۹۹	۰	۱۹	کے سمت	کی سمت
۱۰۲	۰	۶	دیگر مسجد	دیگر مسجد
۱۰۳	۱۳	۰	مصاحبت سے	مصاحبت کی جہت سے
〃	۰	۱۹	سنہ ۱۶۰۸ھ	سنہ ۱۶۰۸ھ
۱۰۹	۰	۱۳	سنہ ۱۰۰۰	سنہ ۱۰۹۸ھ
۱۱۴	۳	۰	تخیل	تخییل
۱۱۵	۱۷	۰	نصیبا	نصیبا
۱۲۱	۱۴	۰	بگلرار	بگلزار

صفحہ	سطر متن	سطر نوٹ	خطا	صواب
۱۲۲	۵	۰	جنوبی	جنوئی
۱۲۳	۷	۰	نوسو	نوسو
۱۲۴	۱۱	۰	نواھی	نواحی
〃	۰	۷	آں بگلانہ	آں را بگلانہ
۱۲۷	۰	۴	اور دیگر	و دیگر
۱۲۸	۰	۸	۹۸۱	سنہ ۹۸۱ھ
۱۳۱	۰	۱۲	سنہ ۱۳۳۶ھ	سنہ ۱۳۲۶ھ
۱۴۰	۰	۳	فوجیں	فوجی
۱۵۳	۲	۰	معہ	مع
۱۵۳	۰	۹	صدی کے	صدی مسیحی کے
۱۵۵	۱۳	۱	کے مابین	نوٹ کی فاصل لکیر
۱۵۹	۲	۰	نَعم	نِعَم
〃	۷	۰	المتنطفیٰ	المسطفیٰ
۱۷۵	۰	۱۸	وبات	دہات
۱۸۰	۵	۰	فما القادوت	فما التفادت
۱۷۳	۹		qutidissime	putidissime
۱۷۳	۹	۰	qater	pater

بسم اللہ الرحمن الرحیم

ازواج و اعقاب

میر عبدالجلیل کا ازدواج سید مرتضیٰ بن سید فیروز بلگرامی کی دختر سے ہوا تھا۔ اس قران سعید کی یادگار ایک لڑکا اور دو لڑکیاں تھیں۔ لڑکے کا نام سید محمد تھا۔ جو اپنے باپ کے خلف الصدق اور علم و فضل و سخنوری میں خاندان کا شرف تھے۔ ان کا تذکرہ کسی قدر تفصیل کے ساتھ جدا لکھا جائیگا۔ میر عبدالجلیل نے وقتاً فوقتاً جو خطوط دوران سفر سے ان کو لکھے تھے اور جن کو مرتب دیکر انھوں نے یکجا کیا تھا محل مناسب پر ان پر بھی تبصرہ کیا جائے گا۔ کہتے ہیں کہ تاریخ واقعات کو دہراتی ہے میر عبدالجلیل کے باپ (سید احمد سید عبداللہ کے) متبنیٰ تھے۔ میر عبدالجلیل کے بیٹے کو بھی یہی صورت و ضرورت پیش آئی۔ سید محمد کے کوئی اولاد صلبی نہ تھی۔ انھوں نے اپنے بھانجے سید غلام امام صادق (غلام علی آزاد کے سب سے چھوٹے بھائی) کو متبنیٰ کر لیا تھا۔

میر عبدالجلیل کی (۱) بڑی لڑکی سید محمد اشرف[۵۲] (پدر محمد یوسف[۵۳]) ابن سید عبدالعزیز بھتہ سے

۵۱ شجرہ طیبہ۔ جلد دوم

۵۲ جب میر عبدالجلیل بھکر میں بتعیناتی مقیم تھے تو محمد اشرف کو سیوستان میں اپنا نائب کر دیا تھا محمد اشرف جب وطن آئے تو سید کرم اللہ اپنے برادر عم زاد کو نیابت سیوستان پر چھوڑ آئے تھے

۵۳ محمد یوسف میر غلام علی آزاد کے حقیقی خالہ زاد بھائی اور ہم عمر و ہم سبق تھے۔ ایک مدت دراز تک دونوں یکجا رہے تھے جوانی اور بقیہ ایام حیات تقاضائے آب و خور سے آزاد نے سفر سیاحت دکن میں بسر کئے اور یوسف نے وطن میں۔ یوسف نے بعد کو شاہجہان آباد جا کر علوم ریاضی ہیئت و ہندسہ و حساب وغیرہ تحصیل کئے۔ الفرع النابت [illegible] الاصل الثابت آزاد کو لکھ ... بیمار ہوئے علاج کیلئے لکھنؤ گئے۔ ۲۳ جمادی الآخر سنہ ۱۱۷۲ھ (۱۲ جنوری ۱۷۵۹ع) کو لکھنؤ میں انتقال کیا نعش بلگرام آئی اور ہمراہ مذکور کو دفن کی گئی۔ یوسف و آزاد کے باہم بڑی محبت تھی۔ ایام مفارقت میں بڑی درد انگیز اور ولولہ خیز منظوم مراسلات و عرائض ایک دوسرے کو بھیجتے تھے۔ آزاد نے تاریخ وفا لکھی ہے

مات حبر الزمان یوسفنا + وہ داحۃ و رحمۃ   اذ تقاصد ... + قال قلبی علیہ صلوا

(۲) منجھلی سید محمد نوح بن سید فیروزؒ بھتہ (والد غلام علی آزاد) سے اور (۳) چھوٹی سید عنایت اللہ بن سید کرم اللہ سے بیاہی گئی۔ سید غلام صادق کے بڑے لڑکے میر اولادؒ محمد ذکا، زوجۂ اولیٰ سے تھے۔ دوسری بی بی سے بھی اولاد ہوئی جس کا سلسلہ باقی و قایم ہے

سید نوح، اُن کے لڑکے اور متوسلین خود کو "بلگرامی" فخریہ بتاتے تھے لیکن بزرگان بلگرام کو اس دعوے انساب پر ہمیشہ اعتراض رہا۔ منشی غلام حسنؒ ثمین شرائفؒ عثمانی مین لکھتے ہین۔

"بزرگ حضرت آزاد مذکور از قصبۂ سمدن، در عہد ملک بہلول لودیؒ در بلگرام برای تحصیل علم بر آمدہ بعد چندی بوجہ اخلاق اہالیان بلگرام طرح توطّن انداختہ، این معنی بر جمہور قدمای بلگرام ہویدا و ہویداست"

۵۴ سید محمد نوح سات سال تک بھکر، سیوستان مین میر عبد الجلیل کے نائب رہے تھے محرم ۱۱۶۵ھ (۱۹ نومبر ۱۷۵۱ع)، کی تب مین ستر سال کی عمر مین بلگرام مین ناگہان وفات پائی۔ کچھ دن تک نواب میر ملک جان ملکی ملازمت و رفاقت مین بھی رہے تھے۔ الہ آباد متعلق خدمت تھا۔

۵۵ سید فیروز نے رجب ۱۱۲۷ھ (جولائی ۱۷۱۶ع) مین وفات پائی

۵۶ میر اولاد محمد ذکا، آزاد کے حقیقی بھتیجے تھے۔ ۲۰ رجب ۱۱۵۱ھ (۳۱ اکتوبر ۱۷۳۸ع) کو پیدا ہوے اپنی تاریخ ولادت خود لکھی تھی ؎

روزے کہ نمود بندہ را حق ایجاد | اولاد محمدؐ پدرم نام بہاد
گفتم تاریخ خویشتن را من خود | در ماہ رجب تولدِ ما رُو داد

آزاد نے ان کو ۱۱۷۲ھ (۱۷۵۹ع) مین اپنے پاس بُلا لیا تھا۔ وہین اورنگ آباد مین زیر سایۂ عم محترم تعلیم و تربیت پائی۔ خوش لیاقت و خوش گو تھے۔ آزاد نے تذکرہ خزانۂ عامرہ ۱۱۷۶ھ (۱۷۶۲ع) مین اُنکی فرمایش سے لکھا تھا

۵۷ غلام حسن صدیقی فرشوری تھے۔ ماموں حامد انی قاضی، اور اہل علم تھے۔ آزاد کی مآثر الکرام فی تاریخ دلسب سادات، بلگرام کے جواب مین وہان کے شیوخ کی ایک مبسوط تاریخ شرائف عثمانی نام ۱۱۷۹ھ (۱۷۶۵-۶۶ع) مین لکھی تھی۔ ان کا تذکرہ سرو آزاد مین بھی ہے (صفحہ ۳۰۵) شرائف عثمانی ایک مستند کتاب ہے، اکثر مؤرخین و تذکرہ نگاران نے اس کا حوالہ دیا ہے

۵۸ افسوس ہے کہ یہ تاریخ اب تک طبع نہین ہوئی۔ بلگرام و سمدن و سندیلہ وغیرہ مین اس کے متعدد نسخے پُرانے رؤسا و شرفا کے یہان محفوظ ہین، سیر انگلستان مین انڈیا آفس لائبریری اور برٹش میوزیم مین ولیم اروین نے کوارتیج کے نیلام گھر سے ایک نہایت صحیح و مکلّف نسخہ خریدا تھا۔ جس پر بعض پُرانے اُمرا کی مُہرین اور عالی مرتبت انگریز عہدہ داران فوجی و ملکی کے دستخط ثبت تھے۔ مفتاح التواریخ مین مسٹر طامس ولیم بیل نے اس کتاب کا اکثر

سمدرن ضلع فرخ آباد کی مقامی روایات اور پرانے اسناد و مقالات وسقامات بھی ثنین کے قول کی تصدیق کرتے ہین۔ عہد اسلام کے نامور مورخ و محقق ولیم آروین نے جو فرخ آباد مین مدت تک حاکم اعلیٰ رہے تھے۔ واقعات احمد شاہ ابدالی و وزیر عماد الملک کے انگریزی ترجمہ[۱۱] کے دیباچہ مین اس امر کو اپنے مخصوص انداز مین بیان کیا ہے۔

فرزندان مجازی

اس صنف مین فرزانگان پیشینہ نے عموماً تلامذہ و خوشہ چینان خرمن علم کو شامل و داخل کیا ہے میر عبد الجلیل کے شاگردون کا شمار بہت کم تھا اور ظاہر ہے کہ جس شخص کی عمر باحیات علمی کا بڑا حصہ مشاغل خدمات اور حضوری دربار مین گذرا ہو جسکے اوقات عزیز ادائے فرائض و سنن کے بعد تمامتر حل و عقد امور حکومت و نظم اور عوالم رزم و بزم مین بسر ہوئے ہون اپنے امدۂ فیض سے شائقین علم و فن کے لئے صلائے عام دینے کا موقع کہان پا سکتا تھا تاہم وہ تھوڑا سا وقت جو میر صاحب بچا سکے اور جس مین اپنے ہونہار اعزہ کو اپنے ہمراہ یا زیر نظر رکھ سکے بہت قابل قدر تھا اور حقیقتاً وہ نہایت عمدہ مصرف و شغل مین گذارا گیا۔ میر عبد الجلیل کے دونون جگر گوشے (دختر زادے)

حوالہ دیا ہے اور بہت سے بلگرامی حضرات کے حالات اسی سے نقل کئے ہین۔ اسکا ایک عمدہ اور مکمل نسخہ بنگال ایشیاٹک سوسائٹی کلکتہ کے کتب خانہ مین موجود ہے۔

[۹] سلطان بہلول نے ۸۵۵ھ (۱۴۵۱ع) سے ۸۹۴ھ (۱۴۸۹ع) تک یعنی ۳۸ سال ۷ ماہ ۷ روز سلطنت کی تھی

[۱۰] تمین لے چند واقعات چشم دید کو ۱۷۵۷ع (۱۱۷۱ھ) مین کپتان جوناتھن اسکاٹ کی فرمایش سے قلمبند کیا تھا۔

[۱۱] Ahmad Shah Abdali and The Indian Wazir Imad-ul-Mulk (1756-57), by William Irvine —1907. Bombay Education Society's Press.

غلام علی آزاد اور محمد یوسف بلحاظ تعلیم و تربیت اُن کے خلف صالح اور بہترین یادگار ثابت ہوئے ہیں۔ آزاد کا ترجمۂ احوال و سوانح مستقلاً اس تذکرہ میں دیا جائیگا۔ یوسف کا مختصر تذکرہ حواشی ذیل میں آچکا ہے۔

ان کی تعلیم و تعلّم کی حالت بھی یہ تھی کہ جب سنہ ۱۱۳۳ھ (سنہ ۱۷۲۱ء) میں سولہ سال کے بعد میر عبد الجلیل بلگرام آئے تھے تو آزاد سترہ سال کے تھے اور یوسف آزاد سے چھ ماہ چھوٹے۔ دونون نے اپنے سن شعور میں ان کو پہلی بار دیکھا تھا۔ بلگرام کے دس ماہ کے قیام میں جو کچھ سیکھا ہوگا اسکو محض شرف تلمذ یا اجراء سعادت کہنا چاہئے۔ اسی عمر میں اسی استعداد و قابلیت کیساتھ دونون نے میر صاحب[۵۱۲] سے سند حدیث مسلسل بالاولیۃ اور حدیث[۵۱۳] اسودین کی

۵۱۲ حدیث رحمت مسلسل بالاولیت یہ ہے الراحمون یرحمہم الرحمن تبارک وتعالی ارحموا من فی الارض یرحمکم من فی السماء اس کی تضمین بہت سے ائمہ و حفاظ حدیث نے فرمائی ہے۔ شیخ ابو الخیر محمد بن محمد بن علی الشہیر بابن الجزری کہتے ہیں۔

تجنب الظلم من كل الخلائق في　　كل الامور فياويل الذي ظلما
وارحم بقلبك خلق الله كلهم　　فانما يرحم الرحمن من رحما

حافظ ابو القاسم علی بن الحسن بن ہبۃ اللہ بن عساکر دمشقی فرماتے ہیں۔

بادر الى الخيرات يا ذا اللب مغتنما　　ولا تكن عن قليل الخير محتشما
واشكر لمولاك ما اولاك من نعم　　فالشكر يستوجب الافضال والكرما
وارحم بقلبك خلق الله وارعهم　　فانما يرحم الرحمن من رحما

۵۱۳ محدثین کے نزدیک بالاتفاق اَسْوَدَین (دو کالی چیزون) سے مراد کھجور اور پانی ہیں۔ ظاہر ہے کہ عرب کی عمدہ اور نفیس کھجور سیاہ ہوتی ہے۔ اُس کی مجاورت و مقارنت کے سبب سے پانی کو بھی سیاہ سے تعبیر کیا جاتا ہے۔ کلام عرب میں اس طرح اکثر آتا ہے جیسے اَبَوَین اور قَمَرَین۔ اسیکو تغلیب کہتے ہیں

مآثر الکرام میں حدیث اسودین کی سند کا حاصل کرنا لکھا ہے۔ وہ حدیث یہ ہے عَنْ عَائِشَةَ قَالَتْ تُوُفِّيَ رَسُوْلُ اللهِ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ وَمَا شَبِعْنَا مِنَ الْأَسْوَدَيْنِ متفق علیہ حضرت عائشہ فرماتی ہیں کہ پیغمبر خدا نے وفات پائی اور ہم نے دو سیاہ چیزون یعنی کھجور اور پانی سے پیٹ نہیں بھرا (یعنی یہ قوت بھی بطریق سیری نہ ملا) اس کو بخاری و مسلم نے نقل کیا ہے۔

مسلسلات میں بھی ایک حدیث متعلق بہ اسودین داخل ہے جو حدیث مسلسل بالضیافۃ علی الاسودین

حاصل کی۔ اکثر کتب احادیث کی بھی اجازت پائی۔ اِس کے بعد یہ دونون رسالہ نزاد بھائی جو ہم عمر اور ایک ہی سال کے پیدا تھے اور ہمیشہ ایک جگہ رہے تھے ۱۱۳۴ھ (۲۲-۱۷۲۱ع) مین میر عظمت اللہ بلگرامی کو ساتھ لے کر شاہجہان آباد گئے اور وہان دو سال کے قریب اُن کی صحبت مین رہے اور بعض کتابین حدیث و سیرۃ نبوی و ادب و دیگر فنون کی پڑھین لغت بالخصوص قاموس جس کے میر صاحب ماہر فرید سمجھے جاتے تھے۔ انھین سے پڑھی طریق تحصیل یہ تھا کہ ہمیشہ دو کتابین یا ایک ہی کتاب دو مقام سے بالکید گر پڑھتے تھے۔ ایک سامع ہوتا تھا دوسرا قاری۔ دونون کی رفتار سلم یکسان و برابر رہتی تھی احیاناً اگر ان مین سے ایک بیمار پڑجاتا یا کوئی اور امر مانع پیش آجاتا تو دوسرے کا سبق بھی ناغہ کر دیا جاتا، معرض توقف مین رکھا جاتا۔ اسکے ساتھ یہ روش بھی جاری رہتی کہ یہ دونون جب موقع پاتے تو اورون کو بھی پڑھاتے تھے۔

میر عبدالجلیل کے جامع کمالات و فنون بیٹے میر سید محمد کو بھی اِن کے فیضان صحبت اور ارشاد و ہدایت سے کافی حصّہ پہنچا تھا۔ اُنھون نے اپنے باپ کے پارہائے جگر یا نزادوں کی طبع کے القاء و ترتیب مین حصّہ لیا تھا اسلئے وہ بھی جداگانہ تذکرہ کے محتاج و مستحق ہین۔

یا حدیث مُسلسل بالاضافۃ علی الاسودین کہلاتی ہے وہ یہ ہے

قال علی بن ابی طالب کرم اللہ وجہہ اضافنی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم علی التمر والماء ثم قال من اضاف مومنا فکانما اضاف آدم علیہ السلام ومن اضاف مؤمنین فکانما اضاف آدم وحوا ومن اضاف ثلاثۃ فکانما اضاف جبرئیل ومیکائیل واسرافیل ومن اضاف اربعۃ فکانما قرأ التوراۃ والانجیل والزبور والفرقان ومن اضاف خمسۃ فکانما صلی الصلوۃ الخمس فی جماعۃ من اول یوم خلق اللہ عزوجل الخلق الی یوم القیامۃ ومن اضاف ستۃ فکانما اعتق ستین رقبۃ من ولد اسماعیل علیہ السلام ومن اضاف سبعۃ غلقت عنہ ابواب جہنم السبعۃ ومن اضاف ثمانیۃ فتحت لہ ثمانیۃ ابواب الجنۃ ومن اضاف تسعۃ کتب اللہ لہ حسنات بعدد من عصاہ من اول یوم خلق اللہ الخلق الی یوم القیمۃ ومن اضاف عشرۃ کتب اللہ لہ اجر من صام وصلی وحج واعتمر الی یوم القیمۃ -

جب تک دار الخلافہ میں قیام تھا بعض جلیل القدر مشائخ و عمائد بھی ان کے حلقۂ درس میں حاضر ہوتے اور مائدۂ فیض سے زلہ ربائی کرتے رہتے فقر و تصوّف کی کتابیں پیش نظر ہوتیں۔ مجاہدات و ریاضت و تزکیۂ نفس و مکاشفات کے مسائل زبان حال سے بیان ہوتے، غوامض و نکات حل کئے جاتے۔ انوار و برکات کا نزول ہوتا۔ ایک طرف دونوں نور دیدہ (آزاد و یوسف) علم و ادب کے سبق لیتے۔ دوسری طرف سیّد غلام مصطفےٰ شہید (معتمد و مصاحب نواب مبارز الملک سربلند خان تونی ناظم گجرات)، مثنوی مولانا روم کا ورد کرتے سبقاً سبقاً پڑھتے اور اجازت و سند لیتے تھے، میر آزاد ید بیضا میں لکھتے ہیں "مستعدانے کہ در وادی علوم علم مہارت می افراشتند اکثر مشکلات لاینحل خود را برای عقدہ کشای آنجناب عرض می داشتند"

میر عبد الجلیل کے بعض خواص تلامذہ اور نیازمند احباب یہ تھے

(۱) میر احمد لاہوری متخلص بہ فائق۔ عالمگیری منصب دار اور لاہور میں مہتمم خزانۂ سرکار تھے بڑے طبّاع و ذہین، نظم میں سلیقہ وافر رکھتے تھے جس زمانہ میں کہ میر صاحب شاہ دولا گجرات میں تشریف رکھتے تھے میر احمد اپنے اشعار انکے پاس بھیجا کرتے تھے اور بڑے عجز و عقیدت سے اصلاح کیلئے درخواست کرتے تھے۔ انکے بعض مسودات کے آخر میں انکے قلم سے لکھی ہوئی یہ عبارت ملی تھی

"سیّدا، ملاذا، مستفقا، مہربانا! درین ولا از شغل باز ماندہ از گفتنی ہا گذشتہ غزلے چند نوشتہ شدہ بطر اصلاح خواہد در آمد۔"

۵؎ نواب سے اور مہاراجہ ابھے سنگھ والی مارواڑ سے احمد آباد گجرات کے قریب ۸ ربیع الآخر ۱۱۴۳ھ (۱۷۳۰ع)، میں جنگ شدید ہوئی اُسی میں شہید ہوئے تھے نعش مبارک ہر چند تلاش کیگئی نہیں ملی۔ شہادت سے پہلے یہ رباعی کہی تھی جسمیں حال آیندہ کی خبر دی تھی ؎

در خلوت ما، ورائے ما پائے نیست | یعنی کہ بعرش و فرش اغیارے نیست
ما چون جانیم پاک زآلایش مرگ | ما را بہ جنازہ و کفن کارے نیست

میر عبد الجلیل کے ہموطن اور بڑے مرتاض اور عالم ربّانی تھے گو بظاہر سپہ گری کے پیرایہ میں بسر فرماتے ابتدا میں فارغ تخلص کرتے تھے پھر ترک کر دیا تھا۔ غزل اور رباعیات کا دیوان مکمل ہو چکا تھا۔ توحیدی رباعیات

فائق کا خاندان بھر شاعر، اور شہرت یافتہ شاعر تھا میر جلال الدین سیادت، ان کے حقیقی بھائی تھے لیکن فائق نے ایک بیگانہ سے تلمذ و اصلاح پسند کی۔ بھائیون سے رجوع نہین کیا یہ محض قدر کمال اور نظر انتخاب کی کشمش تھی۔

(۲) سید محمد زمان راسخ سہرندی، بڑے پایہ کے شاعر اور خوش گو تھے۔ انکی شہرت اور ناموری ایران تک پہونچی تھی۔ مرزا طاہر نصیرآبادی نے اپنے تذکرۃ الشعرا مین ان کو یاد کیا ہے۔ شاہزادہ محمد معظم بن عالمگیر بادشاہ کی سرکار مین منصب ہفت صدی ذات پر سرفراز تھے اور حسن شمائل و لطف خصائل سے متصف میر عبدالجلیل اور راسخ سے بڑا ارتباط تھا کچھ روز تک دونون آگرہ مین اقامت گزین رہے تھے اُس وقت کا اختلاط و وداد آخر تک قائم رہا۔ اسی زمانہ سے راسخ اپنا کلام میر کو دکھاتے تھے سنہ ۱۱۰۷ھ (سنہ ۱۶۹۵ع) مین سہرند مین وفات پائی۔ "راسخ بمرد" تاریخ ہے۔ مثنوی خوب کہتے تھے یادگار شایستہ چھوڑی تھین۔ راسخ ہی نے ناصر علی کو چمکایا اور دہلی بھجوا دیا تھا۔ شیخ محمد معصوم نے ناصر علی کو ایک باغ مین شراب پیتے دیکھا اور پوچھا "کیا ہے؟" جواب ملا کہ "وہ شراب جس کو ملائکہ پیتے ہین"۔ شیخ نے تو درگزر فرمایا لیکن صوفیون اور علماء نے تکفیر کی بناپر محضر قتل تیار کیا راسخ مع اپنے اقربا کے مسلح ہو کر گئے اور ناصر علی کو ساتھ لے جاکر سہرند سے دہلی روانہ کر دیا۔

راسخ کے لڑکے میر معصوم مخاطب بہ عالی نسب خان متخلص بہ وجدان بھی مشہور شاعر تھے ارادت خان اور میر غازی شہید دونون راسخ کے شاگرد تھے۔

(۳) شیخ محمد رضا جن کا ذکر پیشتر آچکا ہے اصل مین شستر کے رہنے والے تھے۔ بھکر مین توطن اختیار کر لیا تھا۔ عربی فارسی مین استعداد کامل رکھتے تھے۔ عالمگیر بادشاہ کے عہد سے لے کر محمد شاہ کے زمانہ تک بھکر کے اکثر عہدے مثلاً فوجداری بھکر وغیرہ اصالتاً و نیابتاً ان کے تعلق رہے تھے۔ میر عبدالجلیل سے اعتقاد تمام رکھتے تھے اور بے انتہا انقیاد و اطاعت سے پیش آتے، اپنا کلام شاگردانہ دکھاتے تھے۔ سنہ ۱۱۴۳ھ (سنہ ۱۷۳۰-۳۱ع) مین وفات پائی۔ میر عبدالجلیل جب

کے لکھنے مین سلیقۂ عالی رکھتے تھے حکیم سحابی کی تقلید مین ایک پورا دیوان رباعیات کا مرتب کر لیا تھا۔

ہندوستان چلے آئے تھے تو بھکر میں شیخ کو اپنی خدمات پر نیابتاً مقرر کر آئے تھے۔

(۱۴) شیخ سیف الدین محمد طبیعت تخلص، اعیان و مشائخ الور[15] سے تھے۔ ان کے والد شیخ غلام محی الدین، صاحب فضل و کمالات تھے جو علوم متداولہ اور فنون متعارفہ میں دستگاہ کامل رکھتے تھے۔ عربی و فارسی ہندی کی نظم میں سلیقہ خوب رکھتے تھے۔ شیخ سیف الدین نے اوائل میں مختصرات متداولہ مختصر المعانی تک اپنے والد سے پڑھی تھیں۔ اس کے بعد میر عبد الجلیل کی صحبت میں پہونچے اور ان سے فضائل و کمالات اکتساب کئے۔ علوم ادبیہ میں پوری مہارت اور عربی و فارسی کی نثر میں ید طولیٰ رکھتے تھے۔ میر غلام علی آزاد جب ۱۱۴۷ھ (۱۷۳۵-۳۴ع) میں سفر سندھ سے واپس آرہے تھے تو شیخ سے ملاقات کا اتفاق ہوا۔ تین ماہ کے قریب شب و روز صحبت رہی

[15] الور ریاست ہائے راجپوتانہ میں ایک بڑی ریاست ہے جس کے اطراف میں صوبہ پنجاب، دریائے جمنا، بھرت پور، ڈھولپور، جے پور، ٹونک، پٹیالہ و نابھہ واقع ہیں۔ یہاں کی پہاڑیوں میں بعض بہت عمدہ قسم کے پتھر برآمد ہوتے ہیں۔ شہر الور، راجپوتانہ مالوہ ریلوے لائن پر واقع ہے۔ الور کا تلفظ مختلف طور پر کیا جاتا ہے اور مختلف وجوہ تسمیہ بتائی جاتی ہیں۔ بعض کہتے ہیں کہ پہلے اس کا نام الپور یعنی مضبوط شہر تھا۔ بعض کا قول یہ ہے کہ اس کا پرانا نام اربل پور یعنی شہر اربلی منسوب بہ اروبلی (سلسلہ کوہ) تھا جس کے ساتھ الور کی پہاڑیاں وابستہ ہیں۔ جنرل کننگھم کا خیال تھا کہ یہ نام قبیلہ سلوس سے نکلا ہے۔ پہلے سلوہ پورہ تھا پھر سلور پھر الور اور بالآخر الور ہو گیا۔ شہر کے پانچ پھاٹک ہیں۔ اس کے گرد فصیل و خندق ہے۔ صرف ایک موقع پر اسی طرف اتنی جگہ رہ گئی ہے جو سلسلہ کوہ سے محفوظ ہے اور جس طرف سے قلعہ ہر قسم کے حملوں سے بچا ہوا ہے۔

۱۹۰۱ع میں اس کی آبادی ۵۶۰۱۰ تھی مگر گذشتہ مردم شماری (۱۹۲۱ع) میں ۴۴۷۶۰ رہ گئی۔

عمارات قدیمہ میں ایک پرانا مقبرہ ہے۔ کہا جاتا ہے کہ ۷۹۵ھ (۱۳۹۳ع) میں ترنگ سلطان کی یادگار میں بنایا گیا تھا۔ فیروز شاہ تغلق کا بھائی تھا۔ بعض کہتے ہیں کہ ناہر خان میواتی کا بیٹا تھا۔ چند قدیم مساجد بھی ہیں۔ کئی کتابے ستا بہ حال وسقال ہیں۔ ان میں سے حسب ذیل قابل تذکرہ ہیں۔ (۱) ہنود مسجد، جو دائرہ کی مسجد کہلاتی ہے قریب ۱۵۷۹ع (۹۸۶ھ) کی تعمیر ہوئی ہوگی جب اکبر کا گذر اس طرف سے ہوا تھا۔ یہی اکبری مسجد بھی کہلاتی ہے اور محلات کے قریب ہے (۲) اورنگ زیب کی بنوائی ہوئی مسجد (۳) قلعہ نہایت مستحکم و استوار ایک ہزار فٹ کی بلندی پر واقع ہے۔

میر آزاد ان کی خوبی و فضائل و حسن شمائل تہذیب اخلاق مکارم آداب شیوۂ تمکین و وقار ہر بزرگ کی تعریف میں رطب اللسان ہیں سچ کہتے ہو کہ میں مدت سے میر عبدالجلیل کے کمالات کا شہرہ سن رہا تھا اور ان کی محبت غائبانہ میرے دل میں پیدا ہو گئی تھی اور بڑھتی جاتی تھی ۱۱۲۵ھ (۱۷۱۳ع) میں میں وارد دہلی ہوا اتفاقاً جہاں فروکش ہوا تھا اسی کے قرب و جوار میں میر مرحوم بھی اقامت گزین تھے مجھے جیسے ہی اسکی اطلاع ملی میں نے آپکی خدمت میں رقعہ لکھا۔ اس میں یہ دو شعر استاد مرحوم کے بھی داخل کر دیئے تھے ۔ ؎

سلام علی من ساقنی بوصاله | وان لم افز الا بطیف جماله
عشقت وما ابصرته غیر انني | سمعت من الحاکین وصف کماله

رقعہ بھیجکر بعد خدمت میں حاضر ہوا اور سعادت ملازمت حاصل کی میں نے جو کچھ پایا ہو یہ سب میر کے فیض تربیت سے ملا ہے۔

خدام

عالمگیر سا باجبروت و جوہر شناس شہنشاہ اپنے رقعات میں ہر جگہ کار دان و کار آمد آدمی کے نہ ملنے کا اعتراف کرتا اور کہتا ہے کہ "آدم خوب نایاب است" اسکی زبان پر یہ شعر بار بار آجاتا ہے ؎

آنچہ بر جستیم و کم دیدیم بسیار است و نیست | نیست جز آدم، درین عالم کہ بسیار است و نیست

یہ تو ڈھائی سو برس پہلے کی بات تھی۔ اب اس زمانہ میں کہ ہر طرف سے قحط الرجال کی شکایت کی

گنبد مزار احمد خان نے اسکو بنوایا تھا جو [illegible] کے تسلط سے پہلے یہاں [illegible] حکمران تھے ریلوے اسٹیشن [illegible] قریب ایک بڑی قبر ہے جو [illegible] جنگ کی [illegible] سادہ بھی تھا ارادہ تھا لیکن اس کا سلسلہ [illegible] سے عیاں ہے سنہ ۹۵۴ھ (۱۵۴۷ع) [illegible] اور ناگری ہے [illegible] مربع ہے [illegible] طول و عرض [illegible] ستارہ [illegible] سب سے اوپر ایک [illegible] جو [illegible] کی قدر کم ہے اسکی [illegible] صراحی دار گردن سے ابھرا ہوا [illegible] ہے اس پر ایک چھوٹا سا مربع بنا ہوا ہے جو ایک رنگ [illegible] پر قائم ہے

صدائے دلخراش اور بھی بلند ہو رہی ہے کون شخص اُس خوش نصیبی کا اندازہ کر سکتا ہی جو میر عبدالجلیل کو اپنے ملازمان خدمت اور مقربان صحبت کے بارہ مین حاصل تھی۔ اُن کے خطوط سے جو میر سید محمد کو لکھتے ہین پایا جاتا ہی کہ ان القاب وار ذال کی تعداد کثیر تھی مسلمان چاکرون سے ہندو نوکرون اور کہارون کا شمار زیادہ تھا جو ہر قسم کی خدمت بجالاتے اور وطن اور عزیزان وطن کی خبر اور ڈاک برابر لاتے رہتے تھے۔ اُن خطوط سے معلوم ہوتا ہی کہ فرجام حسین۔ مداری و فیض اللہ خدمتگار ذاتی تھے گھاسی قاصد تھا فرید پانڈے چنتامن۔ جمال داموں بھی ہم وطن اور معتمد ملازمان خدمت سے تھے۔ ہنچ کا کوئی خط ان لوگون کے ذکر سے خالی نہین جاتا تھا کبھی اصرار کرتے ہین کہ ان رفیقان دور افتادہ از وطن کے گھر یران کی خبر خیریت پہونچا دینا کبھی فرزند رشید کو لکھتے ہین کہ "جانی و درگاہی کے بارہ مین آپنے لکھا تھا بالفعل مین روپیہ بھیجتا ہون۔ اس کے بعد اور بھی بھیجون گا۔ خاطر جمع رکھو گا اس وقت اس سے زیادہ میسر نہوا"۔ کم از کم ہر تحریر مین یہ تاکید ضرور ہوتی تھی کہ "مردم ہمراہی" کے گھر بنام خیریت کہدینا اور سلام پہونچا دینا۔ اہل وطن سے کسی کا قاصد جب کبھی خبر خیریت لے کر گھر سے آتا تھا تو اُسپر بھی نگاہ لطف و کرم مبذول ہوتی تھی میر صاحب معمولاً اپنے خدمتگاران کو نفر لکھتے تھے اور سپاہی چپراسی کو پیادہ۔

نین سکھ اُن کا منشی اور مقرب خاص تھا جس زمانہ مین دربار کی حاضری دونون وقت دینی پڑتی تھی اور میر صاحب عدیم الفرصت تھے تو افسوس کرتے تھے کہ "مین سکھ بیمار ہے لہذا جواب خطوط مرقوم

اکبر کے زمانہ مین الور صوبہ آگرہ میں ایک سرکار تھا اور اسے مفصل لکھتا ہی۔ "اور قلعہ دارد در سنگ بالای کوہ" ہز ہائی نس راج رشی بھارت دھرم پربھاکر سوائی مہاراج سر جے سنگھ جی دریندر دیشٹر کوئی بالقابہ کے عہد دولت مین شہر اور ریاست الور نے کمال رونق و ترقی حاصل کی ہے حضور ممدوح بڑے علم دوست، ہنر پرور، بیدار مغز اور روشن خیال فرمانروا ہین۔ الور سے ممتاز و مامور رئیس کو جو دلچسپی اسے علوم مشرقیہ کے ساتھ رہی ہے اور جس کا جلوہ مرزا غالب اور دیگر انشا پردازون کی نیازمندانہ و شکرانہ تحریرات مین نظر آتا ہے۔ وہی التفات و سرپرستی سرکار عالی بھی مبذول فرماتے ہین۔

آنجا کہ میرسد نمی شود کہ بنویسیم۔ ہر کدام عذر خواہند گفت" دوسرے خط میں لکھتے ہیں کہ "میں مسکھ
بتاریخ ششم جمادی الآخر سنہ ۴ بقضای الٰہی فوت شد۔ تاسف بسیار نمودم بجز صبر چارہ نیست"
کوئی نوکر مرجاتا تو ان کو بے حد قلق و الم ہوتا۔ میر عبدالجلیل کا ایک پروردہ یا غلام تھا جس نے
سفر دکن میں بہت خدمت کی تھی اور بکمال وفاداری ثابت قدم ثابت ہوا تھا۔ قضائے الٰہی سے
خلد مکان کے لشکر میں وبا پھیلی۔ ایک عالم تاراج فنا کے حوالہ ہوا اس غریب کا پیمانۂ عمر بھی لبریز ہو گیا
میر نے اس رفیق دیرینہ کے ماتم میں ایک نہایت پُرسوز مثنوی لکھی جس کا مطلع یہ تھا ؎

بیا اے خامۂ ماتم روایت   پریشان ساز گیسوئے حکایت

میر ناصر علی[۱۱۶] سرہندی سے ایک روز اس مثنوی کا ذکر آگیا۔ سن کر نہایت محظوظ ہوئے نقل کی
استدعا کی۔ میر عبدالجلیل نے ایک نسخہ بھیج دیا۔ ناصر علی نے اسکی رسید میں یہ شعر فی البدیہہ کہہ کر اور
زرافشان کاغذ کے شقہ پر لکھ کر بھیج دیا۔ ؎

ندانم تا چہا از دست آشوب تو می آید   کہ بوئے خون مظلومان ز مکتوب تو می آید

ہزار رحمت اس گمنام غلام پر جس کی موت اُسکے بقائے نام کا باعث ہوئی اور شہرت دوام کی خلعت میں
فرخ جام اُن کا ملازم ذات تھا۔ بلگرام میں بیمار پڑ گیا تو برابر اسکی مزاج پرسی کرتے اور دعا کے ساتھ یہ کہلا
بھیجتے ہیں کہ "اگر خوب تندرست ہو گئے ہو اور سفر کی طاقت ہو تو یہاں آنا۔ ورنہ وہیں ٹھہرنا تکلیف نہ کرنا"

---

۱۱۶ شیخ ناصر علی سرہندی اسید تھے مشیخت و بزرگی کے اعتبار سے شیخ کہلاتے تھے بڑے مشہور اور قادر الکلام
شاعر تھے علوم و فنون ظاہری کے سوا کمالات باطنی میں بھی پایہ بلند حاصل تھا شیخ محمد معصوم خلف الصدق حضرت
مجدد سے استفادہ کیا تھا۔ سلسلۂ علیائے نقشبندیہ میں منسلک تھے۔ اپنے وطن سرہند میں پیدا ہوئے۔ وہیں درس و
تعلیم پائی۔ ابتدا میں مرزا فقیر اللہ مخاطب سیف خان بدخشی متخلص بہ والا کے یہاں ملازم رہے جب مرزا صوبہ
الہ آباد کی حکومت پر مامور ہوا تو شیخ بھی اُس کی رفاقت میں الہ آباد چلے آئے اور چند روز تک یہیں کی سیر
و تفریح سے دل و دماغ تازہ کرتے رہے۔ سیف خان خود جوہر قابل اور قابل دوست تھا۔ فن موسیقی اور
رقص ہندی میں ایک نہایت نفیس کتاب فارسی زبان میں "راگ درپن" نام لکھی ہے اُس کے ساتھ
شیخ کی خوب بسر ہوئی۔ اُسکی وفات پر سنہ ۱۰۹۳ھ (۱۶۸۲ء) میں شیخ بیجاپور چلے آئے اور امیر الامرا

اولادِ معنوی

اس ذیل میں میر عبدالجلیل نے کچھ بڑا سرمایہ نہیں چھوڑا۔ اس کے وجوہ بھی یقیناً وہی تھے جو فرزندانِ مجازی کے تذکرہ میں بیان ہو چکے ہیں۔ تاہم یہ عنوان بھی خالی نہیں رہا بلکہ اسکی بحث و تحصیص و تبصرہ نے اس ناچیز تالیف کے چند اوراق سے زیادہ حصہ لے لیا ہے۔ اس ہیچمدان نے ہر صنفِ کلام کو جدا جدا رکھنا اور ان پر نظر ڈالنا چاہا ہے۔ میر صاحب کے نتائجِ طبع سے چند مختصر مثنویاں چند قصائد چند رباعیاں چند معمے۔ اور چند قطعات تاریخ یادگار ہیں

مثنویات میں سے صرف مثنوی شادیِ فرخ سیر بادشاہ ایک مستقل کتاب ہے جو طبع ہو چکی ہے جس پر جداگانہ تبصرہ کیا جاویگا۔ اسیطرح مثنوی کتخدائی ارشاد خان اور مثنوی امواج الخیال اور یہی چند چیزیں ہیں جو آزاد کے زندہ جاوید قلم کے طفیل میں کم و بیش ہم تشنہ کامانِ علم و ادب تک پہونچی ہیں۔

باوجودیکہ میر عبدالجلیل اپنی خدمات شاعرانہ و ثنا گستری کا صلہ نہیں لیتے تھے تاہم بوجہ تعلقات دربار و ملازمت سرکار آپ کو امرا کی قصیدہ خوانی بارہا کرنی پڑتی تھی۔ ان کے بعض قصائد اپنے اپنے موقع پر حسب ضرورت نقل کیے جائینگے۔ ان کے قصیدے متوسط درجہ اور حیثیت کے ہوتے تھے جنمیں کوئی زور یا خاص شانِ سخنوری یا لطافت ادا نہیں پائی جاتی۔

باقی چیزیں (تاریخیں رباعیاں قطعات اور معمیات)، نہایت مختصر اور متفرق ہیں جن کو اس خاندان کے علمی متروکات سے ڈھونڈھ کر نکالنا پڑا ہے۔

ذو الفقار خان بن اسد خان وزیر اعظم اورنگزیب و شاہ عالم بسیر شریف خان صدر کل و عصمت خان کی قدر شناسی و زرپاشی سے رفاہ و آسایش گذاری۔ الآخر ایک فقیر مجذوب شاہ حمید کے کہنے سے دکن سے ہندوستان چلے آئے شاہجہان آباد میں قیام اختیار کیا قلندرانہ زندگی بسر کرتے تھے ۲۰ رمضان ۱۱۰۳ھ (۱۶۹۲ء) کو ساٹھ سال کی عمر میں رحلت فرمائی مرقد حضرت سلطان المشائخ کے حوالی میں دفن ہوئے۔ ان کی مثنویوں کو اہلِ سخن بڑی قدر اور لطف سے دیکھتے اور پڑھتے ہیں بعض حضرات نے انکی تقلید بیروی بھی کی مگر ناکام رہے۔

میر غلام علی آزاد سبحۃ المرجان مین میر عبد الجلیل کے تفردات سے ایک دلیل ہندی کا بھی حوالہ دیتے ہین جو مسئلہ جبر لاتجزا کے ابطال کے بارہ مین ہے۔ اس رسالہ تک ہمین کو دسترس نہ ہو سکا ورنہ کچھ اُس سے بھی التقاط و استنباط کیا جاتا۔ آزاد نے جس قدر نقل کیا ہے۔ وہ عام فہم نہ ہونے کی وجہ سے قطعًا دلچسپ نہین۔

بیل صاحب کی انگریزی تاریخ مطبوعہ ایشیاٹک سوسائٹی بنگال ۱۸۹۱ء مین دو کتابون کا نام اور لیا گیا ہے (۱) آداب المرسلین (۲) تبصرۃ الناظرین (حالانکہ تبصرۃ الناظرین میر سید محمد کی تحریر ہے)

میر غلام علی آزاد اور دیگر تذکرہ نویسون نے میر عبد الجلیل کی تصنیفات مین ان دونون کتابون کا ذکر نہین کیا اور اس لئے ان کو میر عبد الجلیل سے منسوب ماننے مین تامل ہوتا ہے۔

ایک اور چیز بھی مستقل تذکرہ اور تبصرہ کی محتاج و مستحق ہے اور جس کی نسبت آزاد نے مآثر الکرام مین مژدہ[1] دیا تھا کہ "میر سید محمد سلمہ اللہ تعالیٰ خلف الصدق الشان پارہ از منشآت والا جمع کردہ اند"۔ یہ خطوط وہی ہین جو میر صاحب نے اپنے صاحبزادہ کو سفر نبیشن تر پایہ تخت دہلی، سے لکھے تھے اور جن سے زیادہ تر ذاتی معاملات اور تعلیمات اور خاندانی احوال پر روشنی پڑتی ہے اور کاتب اور اُسکی ناجمعیت خاطر اور دربار کے پُر آشوب حالات کا پتہ چلتا ہے۔ لکھنے والے کو قلم اُٹھاتے وقت، یہ وہم و گمان بھی نہ ہوگا کہ یہ تحریرات خانگی عوام کے ہاتھون مین کسی وقت پہونچین گی۔ اور دو ڈھائی سو برس بعد اُن حالات و کیفیات کو طشت از بام کرین گی جنکی بروقت خبر و شہرت ہو جاتی تو ہنگامہ برپا ہو جاتا اور سیل خون روان ہو جاتے۔ ان کے علاوہ کچھ اور منتشر و متفرق رقعات تلاش سے ایسے بھی ملتے ہین جو اپنی عالمانہ انشاپردازی اور عارفانہ نکتہ طرازی مین بے مثل ہین اور جنکا نقل کرنا ناچیز جامع اوراق نے ناگزیر سمجھا ہے۔

---

[1] مآثر الکرام مطبوعہ مطبع مفید عام آگرہ ۱۳۲۸ھ (۱۹۱۰ء) صفحہ ۲۶

انشائے جلیل

میر عبدالجلیل کی جملہ تصانیف معلومہ مین غالباً یہی پہلی ہے اس لیے اس نقش اوّل کا ذکر بھی سب سے پہلے کیا جاتا ہے۔

نام کی وضع و اسلوب کا اقتضا تو یہ تھا کہ یہ انشا میر کے رقعات خطوط کی متضمن ہوتی لیکن اسکے علی الرغم مصنّف فاضل نے اسمین شہنشاہ اورنگ زیب کی بعض لڑائیون اور فتوحات دکن کو تحریر کیا ہو عبارت کا طرز وقائع نعمت خان عالی سے ملتا ہے۔ فرق یہ ہے کہ وقائع کی طرح اسمین تلازمہ کی صنعت ملحوظ نہین رکھی گئی ہے۔ وہ کمی کثرت آیات قرآنی، احادیث نبوی اور اقوال عرب سے پوری کی گئی ہے۔ اپنے اور دوسرون کے طبع زاد اشعار بھی حسب ضرورت درج کیے ہین۔

واقعات تمام تر وہی ہین جو اس ناچیز تذکرہ مین محل مناسب پر مذکور ہو چکے ہین۔ میر محمد رضا کی رفاقت مین ۱۱۱۱ھ دسمبر ۱۶۹۹ع مین میر عبدالجلیل وطن سے نکل کر مقام "پرسرور اسلام پور" پہنچے میر امیر محمد علی کی وساطت سے نواب تیما الملک مخلص خان کی ملازمت بعدازان بادشاہ دین پناہ کی حضوری کی عزت حاصل کی میر نے اپنے مربیون اور محسنون کے سلسلہ مین ملتفت خان حوص، جملۃ الملک ...ند خان، بخشی الملک بہرہ مند خان، روح اللہ خان میرسامان۔ تربیت خان میر آتش، خدا بندہ خان افسر جوتیات، مرزا یار علی بیگ داروغہ ڈاک، شیخ نور الحق محتسب، وغیرہم کے نام لیے ہین اور ان کا اور انکی عنایات و توجہات کا ذکر اپنے اپنے مقام پر کیا ہے۔ مضامین مین سے چند کے عنوان یہ ہین۔

عرض مطالب سلطنت۔ ہنگامہ مزاحمت جوبداران داحوال خود و دیگر مردم (مین زیادہ شکایت مسلمان؛ مدارون کی ہے) کا ستارہ کعبہ کی راہ بند کر دینے والے فرنگیون، سے کسی طرح کم نہ تھا۔ میر کی عمر اس تک عہد عالمگیر فراغت مین گذری تھی، اُن کے لئے سفر دور و دراز، نیاز کشتی و زحمت کوشی کا یہ دوسرا موقع تھا یہی پریشانی و سرگردانی ۱۱۲۰ھ مین ان کو ناکام و نامراد واپس لائی تھی۔

نازپرورد تنعم نہ برد راہ بدوست + عاشقی ست شیوۂ رندان بلاکش باشد (لطیفہ استادہ شدن وتقدیم و تاخیر) مین اپنی سرگذشت لکھتے ہین صف دوم مین ان کو جگہ دینا قرار پایا تھا مگر اس ہنگامہ رستخیز مین از اسو اتفاق سے درجۂ چہارم مین کھڑے کیے گئے اس کے بعد (کوچ از بنگاہ، اور فتح بسنت گڈھ، کا بیان ہے میر صاحب نے فتح کی پانچ تاریخین کہی تھین جنمین سے چار اس لطیفہ مین درج کی ہین (اور جامع احوال نے ان کو اس تذکرہ مین تحت عنوان مناسب نقل کر دیا ہے)

۱۶ جمادی الآخر کو حضرت کی سواری "سیر بسنت گڈھ" کے لئے جاتی ہے۔ نواب صاحب میر عبدالجلیل کے بارہ مین گذارش کرتے ہین۔ میر نیاز عقیدت یعنی اپنی تاریخین پیش کرتے ہین۔ پڑھنے کیلئے ارشاد ہوتا ہے صلہ ایک لطیفہ بن کر سامنے آتا ہے بخشی الملک مخلص خان "جا ہستی" عرض کرتے ہین۔ قدرشناس بادشاہ "منصب صدی" مرحمت فرماتا ہے۔

مزید واقعات ان عنوانات سے واضح ہون گے۔

محاصرۂ قلعہ ستارہ سوختن باری قلعہ ناگیر بتاہی مورچال غنیم کا مقابلہ۔ لڑائی کی تفصیل ۲۰ ذیقعدہ کی شام کا معرکہ۔ تسخیر۔ یورش قلعہ۔ فتح قلعہ پرلی۔

استدادجہات سے اسی دوران مین برسات کا موسم آجاتا ہے جو فوج کشی، زور آزمائی اور صف آرائی کے منافی و متناقض ہے "افواج کی مراجعت کا فرمان صادر ہونے سے" ہنگامہ بار برداری بلند ہو جاتا ہے۔ دریای کشنا کا عبور اور تعدی جماعہ اوزبکیہ، کی روداد بھوشان گڈھ پہنچ کر بند ہو جاتی ہے مگر خود اس قلعہ (بھوشان گڈھ) کی تفصیل، اس کے استحکام و استواری کی تشریح کچھ دور تک ختم نہین ہوتی۔

باین ہمہ تفصیلات و تعدد مضامین و عنوانات کتاب محض مختصر ہے ضخامت سینتیس ۳۷ صفحات سے متجاوز نہین۔ مولوی مسیح الزمان لکھنوی نے اپنے مطبع مسیحائی (لکھنؤ) مین ۱۲۶۹ھ (۱۸۵۲-۱۸۵۳ء) مین طبع کرائی تھی حاشیہ پر رقعات کی شرح موسوم "کلمات النبیل" مطبوع ہے جو مولوی سید امیر حیدر بلگرامی متخلص بہ امیر (میر غلام علی آزاد کے پوتے، میر عبدالجلیل کے سرتاتی) نے ۱۸۰۶ھ (۱۷۶۲ء)

مین قلمبند کی تھی۔ مطبع کے خطاط لالہ رنگین لال شاداب نے کتاب نہایت پاکیزہ واضح، خوشخط اور حتی الوسع صحیح لکھی ہے تحشیہ حافظ سید محمد عباد اللہ کے قلم سے ہوا۔ اشیای عتیقہ اور کمیاب کتابون کے دلدادہ، مولوی سید مسعود حسن رضوی ادیب، پروفیسر لکھنؤ یونیورسٹی کے نفیس ذخیرہ مین اس کا ایک سال خوردہ نسخہ کمال احتیاط و عرق ریزی کے ساتھ تجلید کیا ہوا موجود ہے۔

آخر کتاب مین میر غلام علی آزاد کے چار قصیدے شامل کر دیے گئے ہین چارون مطلعے ملا کر ایک سو ایک شعر ہین جن سے تاریخ وفات (۱۲۰۰ھ) نکلتی ہے، میر سید محمد کو بھی اسمین یاد کیا اور اُن کا نام نامی لیا ہے تاریخ کی پابندی اور اہتمام کے باعث سے آزاد کے اکثر شعر بے لطف بلکہ بعض مطالب دستانی کی رفاقت و رقابت سے بے نیاز و آزاد نظر آتے ہین، یا ایسے پیچیدہ، دقیق اور عسیر الفہم ہو گئے ہین جن پر المعنی فی بطن الشاعر کا اطلاق ہو سکتا ہے

منشآت جلیل

انشائے جلیل کو چھوڑ کر نثر کی دوسری یادگار یہی ہے۔ وہ توقعات جو انشائے جلیل کے نام سے پیدا ہوئی تھین کچھ نہ کچھ اس مجموعہ سے پوری ہو جاتی ہین گویا کہ اُس مبتدا کی یہ خبر ہے۔ میرے نزدیک یہ مکاتیب انشائے جلیل سے زیادہ کارآمد اور قابل قدر اس اعتبار سے ہین کہ ذی فہم پڑھنے والے کو یہ کہ وقت یہ ادب و انشا کا بھی سبق دیتے ہین اپند و اندرز کا بھی علم و عمل کا بھی اسی کے ساتھ ان سے اُس گئے گذرے زمانہ کی بہت سی غیر معروف باتون اور معاملون کا پتہ چلتا ہے ان سے صرف ایک متنفس (کاتب خطوط) کی زندگی کے ہر پہلو اسکی عزیمت و استقلال جرأت و استقامت کا اظہار ہوتا ہے بلکہ یہ سبق بھی ملتا ہے کہ دنیا مین افراد انسانی کو کیونکر رہنا اور بسر کرنا چاہیے جس کا ماحصل حافظ کی زبان مین یہ ہے ؎

آسایش دو گیتی تفسیر این دو حرف ست　　با دوستان تلطف با دشمنان مدارا

میں نو اس نایاب مجموعہ کو بارھویں صدی ہجری کے ممتاز علمی و ادبی کارناموں میں شمار کرتا ہوں
میر غلام علی آزاد نے مآثر الکرام میں بذیل ترجمہ میر عبدالجلیل لکھا تھا کہ "میر سید محمد سلمہ اللہ تعالیٰ
خلف الصدق ایشان پارۂ از منشآت والا جمع کردہ اند"، افسوس ہے کہ وہ سب خطوط (جنکی ترتیب و
تہذیب میر سید محمد کے ہاتھوں ہوئی تھی) دستیاب نہیں ہوتے۔ زیر نظر مجموعہ صرف بائیس خطوط مختصر
و مطول کا ہے جو میر عبدالجلیل نے اپنی بکاری و اسیدواری کے ایام میں اپنے فرزند دلبند میر سید محمد
کو سفر سے بھیجے تھے جن کا حوالہ اس تذکرہ میں پیشتر بھی دے چکا ہوں۔
محب فرزانہ مولوی حافظ محمد عثمان صدیقی (استاد معاون، گورنمنٹ انٹرمیڈیٹ کالج الہ آباد)
کے کتب خانہ میں ایک نادر الوجود چیز اور نیل سلیڈنی نام The Oriental Miscellany I
یعنی نخبۃ الشرق حصہ اول ہے جس کا آج کوئی دوسرا نسخہ ہندوستان کی مشہور لائبریریوں میں پایا نہیں
جاتا جیسا کہ نام سے ظاہر ہے اس میں بعض کتب و مکتوبات شرقیہ سے التقاط و قیاس کیا گیا ہے
اور اصل فارسی عبارت کے ساتھ ترجمہ انگریزی کو بھی صفحات مقابل پر رکھ دی ہے یہ کتاب
دار الامارۃ کلکتہ میں ۱۷۹۸ع میں طبع اور غالباً بزیر اہتمام افسران سرکار ایسٹ انڈیا کمپنی شائع ہوئی
تھی پیش نظر جلد ۱۸۰۱ع میں فورٹ ولیم کالج کے طلبہ کے مصرف کیواسطے حوالہ کی گئی تھی اس
میں بعض منتخبات تاریخی و علمی و ادبی و سیاسی کے سوا شہنشاہ اکبر اور سلطان اورنگ زیب
عالمگیر کے چند کمیاب فرامین بھی ہیں نیز ایک مکمل و مبسوط تحریر کا انگریزی ترجمہ ہے جو سید امیر حیدر
بلگرامی نے جب وہ صدر نظامت عدالت کے مفتی کے منصب پر مامور تھے در بارہ حقوق مالی
سرکار و محاصل کاشت اراضی وغیرہ بحوالہ کتب فقہیہ و احکام شریعت اسلام علیٰ صاحبہا الصلوٰۃ
والسلام فارسی میں قلمبند فرمائی تھی میرے نزدیک جس حصہ پر فی الواقع جامع کتاب کو ناز
و مباہات ہونا چاہیے وہ (میر عبدالجلیل کے) یہی منشآت اصلی میں جو مع ترجمہ ۴۲ صفحات پر
چھپے ہیں اور مختلف مضامین و مباحث پر مشتمل ہیں۔ ان خطوط سے ان ایام کی اکثر تاریخی و ملکی افعات
کے علاوہ میر کے خاندان کی اندرونی حالت، سادہ و بے تکلف طرز معاشرت، اور قصباتی شرفاء

کے ماند و بود کی کیفیت اور سچے اخلاص و مودت کا اظہار ہوتا ہے بطور دیباچہ یا تعارف انگریزی مین تین صفحہ پر میر کے مختصر حالات بھی درج کر دیے ہین۔ اُن کی بے نیازی اور شان استغنا کی بالخصوص تحسین و مدحت کی ہے۔ جامع متفرقات لکھتا ہے کہ "میر عبد الجلیل نے یہ خطوط میر سید محمد کو لکھے تھے میر سید محمد نے ان کو سلسلہ تاریخ سے یکجا کر لیا تھا پھر اپنے بھانجے[۱۹] کے حوالہ کیا تاکہ اس کے منشیانہ انداز پر نظر ڈال لین۔ اصل فارسی کا طرز تحریر سلیس و صحیح ہے۔ انداز کلام نہایت شاندار اور پُر اثر واقع ہوا ہے۔ دربار دہلی کے بعض واقعات و حالات جو اثنائے مکاتبت مین سپرد قلم ہو گئے ہین بغایت دلچسپ ہین۔ بنظر بر جمیع حالات یہ مجموعہ فارسی زبان کے نوجوان شائقین کو بیحد مفید و کارآمد ثابت ہوگا اور انگریزی خوانون کو بھی پوری دلچسپی و تفنن کا ذخیرہ اس مین فراہم ملے گا۔"

قرینۂ غالب ہے کہ اس کتاب "داور نٹیل سلینی" کی تجویز و ترتیب مین مفتی میر امیر حیدر کی شرکت و اعانت ضرور رہی ہوگی اور یہ خطوط انھین کے ذریعہ سے انگریز مؤلفین کو دستیاب ہوئے ہون گے۔ مگر ان خطوط کی ترتیب ٹھیک نہین پائی جاتی۔ ان کے آخر مین تاریخ تحریر، تحریر ہے اس لئے ان کے سلسلہ و ترتیب کے متعلق تیقن کے ساتھ کچھ نہین کہا جا سکتا۔ یہ بھی پتہ نہین چلتا کہ میر سید محمد، میر غلام علی یا میر امیر حیدر نے اس مجموعہ خطوط کا نام کیا رکھا تھا۔ انگریزی مؤلف نے "مختلف معاملات پر باپ کے اصلی خطوط بیٹے کے نام" سے ان کا تعارف کرایا ہے۔ "منشآت جلیل" کا عنوان جامع تذکرہ (فقیر مقبول) کا مجوزہ ہے۔ سہولت و دلچسپی کے لئے بعض خطوط یا اُن کے مضامین کا اقتباس پیش کیا جائے گا۔ کچھ شک نہین کہ بہت سی باتین چھوٹی چھوٹی اور معمولی ہین مگر انھین کے پڑھنے اور جاننے سے روشن ہوتا ہے کہ دُنیا کی رفتار اور ہمارے ملک کے متوسط طبقہ کے زندگی بسر کرنے کا رنگ ڈھنگ ڈھائی سو برس پہلے بھی کم و بیش ایسا ہی تھا جیسا کہ آج ہے۔

۱۹ غالباً میر غلام علی آزاد سے مُراد ہے

اگرچہ خطوط تمامتر خانہ داری کے ترددات، اور دنیوی معاملات کی خبرگیری و خبرداری کے حامل ہین اور ظاہر ہے کہ انھین ضرورتون سے معرض ترقیم مین آئے ہونگے تاہم کوئی رقعہ اخلاقی تربیت، دینی تعلیم علمی نصائح اور آداب و تہذیب آموز ہدایات سے خالی نہین پایا جاتا فرزند سعادت منش کی کوئی ضرورت یا فرمایش پوری کرتے ہین تو اسی کے ساتھ پند و موعظت بھی کرتے جاتے ہین اور ہر حال مین تحصیل علوم پر کمال سعی مبذول رکھنے کی تاکید کرتے ہین ایک طرف میر سید محمد کے لئے سرمہ چشم تلاش کر کے یا امین الدین خان صاحب فوجدار سرکار بھکر سے لے کر بھیجتے ہین تو دوسری طرف کتابون کو دھوپ دینے اور بیش قیمت و کمیاب نسخون پر لحاظ خاص اور توجہ کامل رکھنے کے لیئے قدغن فرماتے ہین حفاظت و نگہداشت کے لئے محض تاکید ہی نہین ہوتی بلکہ اس کی تفصیل و تشریح کا کوئی جزئیہ ترک نہین ہونے پاتا۔ جیسا کہ روضۃ الناظر اور رسالہ کلمہ طیبہ کے بارہ مین نقل ہو چکا ہے۔

تشویق تحصیل علم باوجودیکہ میر سید محمد پختہ عمر پر پہونچ چکے ہین خود بھی ذی فہم و ذی علم ہین لیکن پدر شفیق کا بزرگانہ ارشاد یہی ہے۔

در شغل تحصیل علم سعی بر کمال نمایند و محط نظر علم تفسیر و حدیث و فقہ و اصول باشد و اضراب از علوم دیگر بالکلیہ باید نمود۔ اقل مرتبہ این است کہ مصطلحات ضروری علوم دیگر البتہ استماعی تمام حاصل باید۔ اگرچہ حمیرا بہ تحصیل علوم دینی قرار باید داد اما از رہ گیری منطق و حکمت لقدر کفایت و دیگر علوم متعارف روزگار غافل نباید بود بالجملہ مضمون این شعر رنگین را مد نظر باید داشت

احرص علی کل علم تبلغ الاملا ولا توانس بعلم واحد کسلا

یعنی حریص باش بر ہر نوع علم تا رسی امید خود را و الفت مگیر بعلم واحد از روے کاہلی

النحل لما وعت من کل فاکھۃ ادت لنا الجوھرین الشمع والعسلا

مگس شہد ہر گاہ می چرد از ہر میوہ، ظاہر می گرداند برای ما دو قسم جوہر را یکے موم و دیگر شہد

الشمع باللیل نور یستضاء بہ والشھد یبری باذن الباری العللا

جوہر موم در تب نورے است کہ طالب روشنی کرامی شود دارائی بود و جوہر شہد صحت می بخشد بحکم خدائے آفریدگار بیمار را۔

ترہیب و ترغیب - ایک دوسرے والا نامہ میں نصیحت فرماتے ہیں

در باب خواندن نحو کہ رسالۂ اعلام الہدیٰ میخواستند نوشتہ بودید معلوم شد۔ برخوردارا۔ خواندن رسالہ ہائے غیر متعارف فائدہ ندارد۔ باید کہ کتب درسی متعارف بتحصیل باید کہ ہمین کتب درسی خواندہ شد رسالہائے غیر متعارف خود بخود آسان می شود مثلاً شرح عقائد۔ اگر خواندہ در نگرید کہ اعلام الہدیٰ حل می شود سعی نمائید کہ تحصیل علم بترتیب بود کہ این معنی ضروری ست و ہمین ایام تحصیل کمالات است باز این وقت بدست نخواہد آمد۔

ایک تیسرے موقع پر ایک سچی اور سادہ زبان ترجمانی دل یون کر رہی ہے "عربی پڑھنے مین جوانی تقصیر کا حال لکھا تھا سو سبب انشراح خاطر ہوا حق تعالیٰ میری زندگی مین تمکو کمال انسانی پر پہونچا دیوے تاکہ ہماری آنکھون کو روشنی حاصل ہو۔"

صلاح نیک - میر سید محمد کو عینک کی ضرورت ہے یا محض شوقیہ فرمائش میر عبد الجلیل بھکر مین تلاش کرتے ہین نہین ملتی ہے معذرت کرتے ہین اور لکھتے ہین یا این ہمہ تلاش باقی ہے جسوقت میسر ہوگی بھیجدون گا مگر خیال رہے کہ جس وقت آنکھ خیرگی کرنے لگے تو رات کو مطالعہ موقوف رکھے گا۔ آنکھ کی محافظت بھی ضرور ضرور چاہیئے۔"

خیر اندیشی و شفقت - میر عبد الجلیل از خود جتنے تحائف وہدایا بھیجتے تھے اُن مین ضروریات ذاتی یا مصنوعات مقامی یا دیگر اشیائے کارآمد کے سوا کوئی نہ کوئی سلاح یا سپاہیانہ ہتھیار ضرور رہتا تھا چنانچہ بھکر سے سُرمہ اور ایک جلد شرح مُلّا کے علاوہ ایک حلقہ کمان بھی فرید ملازم کے ہاتھ بھیجا گیا تھا۔ یہ چیز فوجدار صاحب نے میر سید محمد کے لئے خاص کر بہم پہونچائی تھی۔

مالی مشکلات و وصول نقد

بھکر سے اکثر ہنڈوی آٹھ سو روپیہ کی آیا کرتی تھی معمول یہ تھا کہ جب کوئی معقول رقم جمع ہو جاتی تھی تو شیخ محمد رضا نائب خدمات خرچ کے لئے میر صاحب کے پاس بھیجا کرتے تھے لیکن ہنڈوی کا بھنانا اور مہاجنوں سے روپیہ کا منگانا ایک کار اہم ہوتا تھا جس کے منگانے اور لانے کیلئے خاص آدمی بھیجا پڑتا تھا اور جسمیں بعض اوقات صرف بھی زائد ہو جاتا تھا۔ ایک مرتبہ ایک ہنڈوی آٹھ سو روپیہ کی آئی تھی جس میں سے ماحصہ صرف ہنڈیاون کے بابت بھکر میں خرچ ہو گیا تھا باقی روپیہ شاہجہان آباد سے اکبر آباد میر صاحب کے پاس پہنچا اور ان کے کام آیا

ایک دشواری وطوالت اور بھی تھی کہ بھکر میں کوئی مہاجن ایسا نہ تھا کہ اکبر آباد یا قنوج کو براہ راست ہنڈوی لکھ دیتا بھکر سے ملتان، اور ملتان سے لاہور، اور لاہور سے اکبر آباد، اور وہاں سے قنوج چلتی، ہنڈوی لکھانا ہوتی تھی اور اس صورت سے چار جگہ ہنڈوی کو باحتیاط لفظ جنس و سکہ و سنہ لکھانا پڑتا تھا

سید محمد نوح جب تک سیوستان میں رہے خطوط اور ہنڈوی شاہجہان آباد بھیجتے تھے۔ یہاں بھی وہی مرحلہ پیش آتا تھا کہ ایک معتبر آدمی بھیجکر روپیہ وصول کیا جاتا اور پھر ہنڈوی قنوج بھیجی جاتی تھی میر عبدالجلیل کے بعض رقعات میں سید محمد نوح اور ان کے خطوط کا حوالہ ہے۔ ان کے خطوط ایسے مفصل ہوتے تھے کہ بلگرام کو ان کا باصلہ بھیجنا ضروری سمجھا گیا تھا

ایک بار سید نوح نے سیوستان سے کچھ روپیہ بھیجا تھا۔ ہنڈوی شاہجہان آباد کے مہاجن کے نام تھی وہاں تک قاصد کے بھیجنے اور روپیہ منگانے میں دیر ہوتی تھی ضرورت شدید تھی۔ آخر میر عبدالجلیل نے وہیں اکبر آباد میں کسی مہاجن کے ہاتھ کچھ نقصان اٹھا کر رخصت کر دی۔ ایک ہزار بتیس روپیہ وصول ہوئے آٹھ سو سینتالیس [۸۴۷] روپیہ کی ہنڈوی قنوج کو میر سید محمد کے نام روانہ کی گئی۔ مبلغ فرخ سیری سکہ اٹاوہ لکھائے گئے تین سو چھ [۳۰۶] روپیہ اکبر آباد میں تقاضا دار لوگوں کو ادا کیا گیا اس قرض و تقاضا کی وجہ میر عبدالجلیل یہ لکھتے ہیں کہ نواب اخلاص خان کی سرکار سے جو دو روپیہ روز ملتا ہے اس میں

کیسے پورا پڑ سکتا ہے ایک روپیہ روز اوپر خرچ ہو جاتا ہے۔ نوکروں کی تنخواہ (طلب نفران)، خرچ دربار اور دیگر ابواب اسکے علاوہ۔ آٹھ سو تئیس ۸۲۳ روپیہ جو گھر بھیجے ہیں۔ اُس کے خرچ کی تفصیل و مدات بتاتے ہیں کہ پانچ روپیہ سر صاحب و قبلہ شاہ لطف اللہ کو، اور تین سو ساٹھ ۳۶۰ روپیہ برخوردار سید محمد نوح کے گھر میں (میر عبد الجلیل کی مجھلی بیٹی کو)، اور بیس ۲۰ روپیہ اپنی بڑی بہن اور بیس روپیہ چھوٹی ہمشیر کو اور چار سو بائیس ۴۲۲ روپیہ اپنی والدہ کو گھر کے خرچ کے واسطے دینا۔ اس روپیہ میں جو ضروری اور ناگزیر اخراجات ہوں اُن کو مقدم رکھا جاوے اور جو رقوم دس بیس روز کے توقف سے ادا ہو سکتی ہوں ان میں توقف کر دینا میں چند روز کی رخصت لے کر وطن آرہا ہوں اُس وقت جیسا مناسب ہوگا انجام دیا جائے گا۔"

نئی چیز:- عینک کی تیلیوں کی چھڑیاں ہماری یاد کی بات ہیں اور خال خال اب بھی نظر آجاتی ہیں۔ مگر دو ڈھائی سو برس پہلے کے عجائبات میں۔ یورپ کی عینک لکڑی کے فریم کی ہوتی تھی اور بڑی قدر و احتیاط کی چیز تھی۔ میر عبد الجلیل دہلی میں عینک کے محتاج ہیں۔ فرزند رشید کو پیشتر بھی لکھ چکے ہیں اور اب پھر لکھتے ہیں کہ "یوں تو دہلی میں عینکیں بہت ہیں بہت ملتی ہیں۔ لیکن نگاہ کی موافقت معدوم۔ ایک نہایت عمدہ عینک بلگرام میں دستیاب ہوگئی تھی اُس کو نوکروں نے گم کر دیا۔ ہر چند اسباب میں ڈھونڈھا نہیں ملتی ہے۔" فرنگی عینک حلقہ چوبی، کی گھر پر چھوڑ آیا تھا اس نظر سے کہ بڑی نفیس شے تھی اور اُس وقت میں چنداں محتاج بھی نہ تھا سمجھتا تھا کہ گھر پر باحتیاط رکھی رہے گی۔ ممکن ہے کہ تم نے کسی اور کو دیدی ہو اگر اُس سے واپس لینا ممکن ہو تو مسترد کر لو وہ میری آنکھوں کے بہت موافق تھی۔ ادیم اسمار، تک نظر آتا تھا۔ میں یہاں سے دو عینکیں خرید کر کے تمھارے لئے بھیجتا ہوں۔ بابت معلوم ہے صرف موافقت چشم کی وجہ سے اِس درجہ مبالغہ کر رہا ہوں۔ حسین خدمتگار سے پوچھے گا کہ آخر بھکر والی عینک کیا ہوگئی قلمدان میں طاق پر رہا کرتی تھی۔ کس نے اٹھائی۔ کہاں رکھدی۔"

دوسروں کی خدمات قبول کرنے سے گریز تیرھویں عنایت نامہ میں تحریر فرماتے ہیں جب نواب میر جملہ روانہ بنگالہ ہوگئے تو رفعت پناہ عوالی دستگاہ شیخ لالن نے جنکو حال میں محمدی خان کا خطاب ملا ہے منزل (کیمپ) فرید آباد سے خدمت سوانح نگاری سرکار امتیاز گڈھ عرف اودی اور سرکار قمر نگر عرف

کرنول مضافات بیجاپور کی سند بندہ کے نام تیار کر کے بھیجدی اور معذرت فرمائی کہ "اگر ہم شاہجہان آباد رہجاتے تو آپ کے لئے ضرور کوئی خدمت ہندوستان کی حاصل کرتے۔ اب کہ نواب بنگالہ جا رہے ہیں ناچار یہی بھیجی جاتی ہے۔ ہر چند دور ہے مگر خدمت اچھی ہے۔ بندہ وہاں کے جانے نہ جانے میں متردد تھا۔ مکنون خاطر یہ تھا کہ اگر سرکار نواب امیر الامراء سے کوئی خدمت کم و بیش ہندوستان کی میسر ہو جاتی تو قناعت کر لیتا۔"

طریق سفر

قنوج[۱۹] کے شارع اعظم پر واقع ہونے کی وجہ سے بلگرام سے آنے جانے والوں کی پہلی منزل وہیں ہوتی تھی۔ میر عبدالجلیل اور ان کے سب اہل خاندان کا بھی معمول یہی تھا جب دہلی سے میں کچھ عرصہ رہکر اور کوشش کر کے سید محمد کو اپنی جگہ کرا دیا ہے تو اُن کو دہلی بلا رہے ہیں ضرورت شدید

۱۹۔ قنوج کسی وقت شمالی ہند کا دار الملک، اور سب سے بڑا اور پرانا شہر تھا۔ اب ضلع فرخ آباد میں ایک چھوٹا شہر یا بڑا قصبہ رہ گیا ہے۔ پرگنہ و تحصیل کا صدر مقام ہے۔ دریائے گنگ کے دہنے کنارے پر ایک پرانی بلند پہاڑی پر آباد تھا۔ مگر اب دریا چار میل پورب کو ہٹ گیا ہے۔ شارع اعظم شاہی اور ریل اسٹیشن سے پختہ سڑک شہر تک گئی ہے تقریباً دو میل کا فاصلہ ہے

گذشتہ صدی کے اندر اس کی آبادی میں تغیر نمایاں ہوتا رہا ہے ۱۸۴۶ع میں ساڑھے سولہ ہزار نفوس کی تھی۔ ۱۸۵۳ع میں بائیس ہزار پائی گئی ۱۹۰۱ع میں ۱۸۵۵۲ اور ۱۹۲۱ع میں ۱۸۰۸۲ تھی باشندگان قریب دو ثلث کے ہندو اور ایک ثلث مسلمان ہیں رقبہ مسکونہ دو سو اٹھانوے (۲۹۸) ایکڑ پانچ مواضع قنوج و کندر دلی و تاج پور و کانت و علاء الدین پور و عمر پور کی اراضی میں پھیلا ہوا ہے آبادی کی شکل مثلث نما واقع ہوئی ہے پرانے شہر کے کھنڈروں ویرانوں، مساجد و محلات کے ٹکڑوں پر اکوسوں تک ہر طرف جدھر نظر پڑتی ہے خشت پارے اور سنگ ریزے ہر جگہ سنگ راہ ہوتے ہیں۔ پرانے کھپرے پرانے سکے۔ مورتوں کے ٹوٹے ہوئے حصے اطراف کے کھیتوں اور خالی زمینوں میں دور تک ملتے ہیں۔ کرنیل ٹاڈ Colonel Tod لکھتے ہیں کہ کبھی اس شہر کا حصار تیس میل سے زائد تھا۔ مگر دیگر اہل فرنگ مورخین اس کو مبالغہ پر محمول کر کے باور نہیں کرتے چینی سیاح ہیون تھسانگ کی مفصل تحریر اور زمانہ موجودہ کے کھنڈروں سے ثابت ہوتا ہے کہ پرانا قنوج گنگا کی پرانی پہاڑی پر تین میل سے زیادہ طول میں آباد رہا ہوگا آبادی تمام تر نشیب و فراز اور پست و بلند واقع ہوئی ہے۔ بہت سے نالے کھالے زمین کو کاٹتے ہوئے دریا میں جا کر مل گئے ہیں بہت سے مکانات جو اس وقت نیم ویران غیر آباد و شکستہ حال نظر آرہے ہیں کسی وقت نہایت شاندار مرتفع اور مستحکم عمارات رہی ہونگی۔

تعمیرات محدثہ میں نالے پر ایک پل ہے جس کو سمبت ۱۷۵۸ (۱۷۰۱ع) میں چند اگروالہ دولتمندوں نے

تاکید کرتے ہیں اور لکھتے ہیں کہ "پرانا گھوڑا اب سواری کے قابل نہیں رہا ایک منزل پہل وطن سے قنوج تک کے لئے کرایہ کرلو اور محض ضروری (لابدی) اسباب لے کر چلے آو۔" آگے چل کر تسلی دیتے ہین کہ "جب انشاء اللہ منصب و خدمت تمہارے نام ہو جائیگی تو یہاں سے بھکر سے تمہاری ضروریات سفر کا سرانجام کرا کے پالکی کی سواری پر روانہ بھکر کرا دینگے۔ وطن سے صرف ضروری سامان لے کر چلیا ہو۔ چند کمتر و کمتر آسودگی ہے ہیتہ، انشاء اللہ جب لیے تعلقہ حدمت ہین یا ملتان تک پہونچ جاؤ گے تو جو کچھ چاہو گے سب میسر و مہیا ہو جائے گا۔ بالفعل یہاں خود جریدہ پہونچ جاؤ، پھر خیال آتا ہے کہ دہلی جلد تر پہونچنے کی ضرورت ہے تاکید بھی کر رہا ہوں پہل آہستہ آہستہ چلیگی۔ دیر مین پہونچین گے تو تاکید و ہدایت فرماتے ہین کہ "جا کہار جوان زود رو کرایہ کر کے جو پالکی مین تنہا ہمارے پاس چلے آو۔ دو دست جت پوشاکی دربار سوائے پارچہ پوشاکی خانہ مطلوب ہین۔ اگر موجود ہون تو بہتر۔ ورنہ فرحام کے ہمراہ جو سامان

بنوایا تھا۔ ڈائمنڈ جوبلی ہائی اسکول اس کا زراعتی فارم اور ویٹنگ روم کلکٹر گھر شفاخانہ اور کوتوالی قصبہ عام عمارات ہیں۔

قنوج جیسا قدیم اور عظیم شہر رہا ہے اس کی مناسبت سے یہاں کے آثار صنادید بہ تو عتیق ہیں کثیر التعداد ہے۔ سبب اسکی کہن سالی اور تاریخی عظمت کے اعتبار سے اس سے زیادہ کی توقع کی جاتی تھی۔ اگر یہ دن کی رائے ہے کہ ہندوؤں کے زمانہ کی یادگاروں اور مذہبی عمارات کو تو دسوین صدی مین محمود غزنوی کے غیظ و غضب اور بے پناہ تیغ و تبر نے غارت و تاراج کر دیا تھا۔ اسلئے جو کچھ آثار قدیمہ باقی ہین وہ صرف مسلمانون کے عہد کی ہیں۔ بلحاظ اہمیت یا وسعت جو قابل لحاظ ہین حسب ذیل ہین

(۱) نواب بہادر خان شاہجہانی امیر کی تعمیر کردہ سرائے کا مغربی پھاٹک اور چند کوٹھریان

(۲) رنگ محل یا موتیا محل جس کو سید محمد قنوجی استاد اورنگ زیب و بانی سرائے میران نے سنہ ۱۰۹۶ھ ۱۶۸۵ء مین تعمیر کرایا تھا۔ عمارت تقریباً نابود ہو چکی۔ بنیادین اور کچھ دیوارین قائم ہین

(۳) مقبرہ سید محمد قنوجی مذکور۔

(۴) جامع مسجد جسکی نسبت ہندو سیتا کی رسوئی ہونے کا دعوی کرتے اور پانڈو نسل کے راجگان کی تعمیر بتاتے ہین۔ ایک بلند پہاڑی پر پرانے قلعہ کی ناف مین واقع ہے ملک الشرق ابراہیم شاہ والی جونپور نے

بھیجا گیا ہے اس میں سے جو پسند ہوئے کر جامہ اور دوتہی تیار کرا کے لیتے آو۔ اگر پہلے سے تیار ہوں تو نئے کپڑے بنوانے کی احتیاج نہیں ہے خواہ مخواہ دیر ہوگی جب تعلقہ خدمت پر پہونچ جاؤ گے تو وہاں بہت سے کپڑے اور دوتہی میسر آجائے گی" ہر چند سبکباری تر آسودگی بیشتر وار وسواس راہ فراغت کامل تر۔"

مودت و محبت اولاد و عیال کی الفت جو فطرت انسانی کا خاصہ ہے۔ میر عبدالجلیل پر بھی بدرجہ غایت غالب تھی۔ ہر چند کہ سادہ بیانی اور احتیاط سے کام لیتے تھے لیکن جذبات دل کی جھلک ہر ہر قدم پر نمودار ہو جاتی تھی۔ یہ وہ انداز تحریر نہیں ہے جو کہ اکثر انشا پردازوں میں نظر آجاتا ہو بلکہ حقیقت حال کا اظہار کرتا ہے۔ میر عبدالجلیل نے ان تمام رقعات میں میر سید محمد کو ایک ہی

اس کی ترمیم واصلاح ۱۰۴۶ھ (۱۶۳۶ء) میں کرائی تھی۔ جنرل کننگھم نے اس کو پہلے ۱۸۳۸ء میں، اور بعد مرمت ۱۸۶۲ء میں دیکھا تھا۔ اپنے سیاحت نامہ میں دونوں حالتوں کا فرق دکھایا ہے۔

(۵) روضہ شیخ کبیر بالا پیر، متوفی ۱۰۵۴ھ (۱۶۴۴ء) سنگ در سے سال تعمیر ۱۰۵۳ھ (۱۶۴۳ء) پایا جاتا ہے۔

(۶) روضہ شیخ محمد مہدی (فرزند شیخ کبیر) بعہد اورنگ زیب ۱۰۸۰ھ (۱۶۶۹ء) میں تعمیر ہوا تھا۔ شیخ مہدی نے ۱۰۸۶ھ (۱۶۷۶ء) میں انتقال کیا۔

(۷) عالمگیری مسجد جو ۱۰۶۸ھ (۱۶۵۷ء) میں شیخ مہدی نے رنگین پتھروں سے تعمیر کرائی تھی۔ مسجد مذکور کا بیرونی دروازہ ۱۰۸۱ھ (۱۶۷۰ء) میں تیار ہوا تھا۔

(۸) درگاہ شیخ ماگاہ ۱۰۲۹ھ (۱۶۲۰ء)

(۹) مسجد مخدوم جہانیاں جہان گشت، بخاری۔ مقبرہ سید جلال وغیرہ۔

(۱۰) روضہ اولاد مخدوم۔ صدر دروازہ کے کتبہ سے واضح ہے کہ اس کو سید راجو نے ۸۸۱ھ (۱۴۷۶ء) میں بعہد سلطان حسین شرقی تعمیر کرایا تھا۔ مع مقبرہ وغیرہ۔ ان عمارات کو زلزلہ سے نقصان پہونچا تھا ۱۲۰۹ھ (۱۷۹۴ء) میں کامل مرمت ہوگئی۔

(۱۱) روضہ مخدوم اخی جمشید۔ واقع رجگیر ۸۴۳ھ (۱۴۳۹ء) کی تعمیر ہے۔ اورنگ زیب نے درستی کرادی تھی۔

(۱۲) روضہ حیدر شہید واقع اسمٰعیل پور نور الدین جس کی تعمیر بابر بادشاہ نے کرائی تھی۔ مابین ۹۳۳ھ و ۹۳۷ھ (۱۵۲۶-۳۰ء)۔

(۱۳) سید محمد قنوجی کی تعمیر کردہ پختہ سرائے جو محمد آباد کبیر معروف بہ سرا میران میں بر لب شارع اعظم قنوج سے

مختصر طرز سے برابر مخاطب کیا ہے " برخوردار سعادت اطوار میر سید محمد سلمہ اللہ تعالی " مگر تیسرے خط میں قلم کی متانت و سنجیدگی پر دل کی بے چینی و بیقراری غالب آگئی ہے۔ میر صاحب ضبط نہیں کر سکے ہیں۔ فرماتے ہیں :۔

" برخوردار سعادت اطوار کامگار میر سید محمد عمر دراز باد بعد دعوات مزید حیات و ترقی درجات و شوق ملاقات کہ بیرون از احاطۂ عبارت است مشہود و خاطر عزیز آنکہ خطوط آن برخوردار مصحوب فرحام و تحسین متواتر رسیدند۔ از خبر خیریت آن برخوردار خاطر را مسرور گردانیدند۔ الحمد للہ علی ذالک شوق ملاقات

کوس کھر پور رب واقع ہے سنہ ١٠٩٤ھ (سنہ ١٦٨٣ع) میں تیار ہوئی تھی۔

(١٤) سرائے مذکور کے قریب ایک باغ اور احاطہ کے اندر سید موصوف کے لڑکے کا عالی شان مقبرہ۔

(١٥) میر بنگالی کی عظیم الشان حویلی جو ایک نالے میں کمال رفعت و استحکام کے ساتھ بنائی گئی تھی اب صرف چار دیواری، برج اور پھاٹک باقی ہے۔

عہد ہنود کے آثار میں "بڑا قلعہ" ہے جو عام طور پر راجہ جے چند راٹھور کا قلعہ کہلاتا ہے۔ ایک انجینیر اور سپاہی جنرل کننگھم کا قول ہے کہ وہ اسکا موقع نہایت مستحکم اور مضبوط ہے۔ توپ کی ایجاد اور استعمال سے پہلے اس نے قنوج کو ایک زبردست اور اہم مقام بنا رکھا ہوگا " اب اس میں صرف بھیشم کلی برج کے کچھ نشانات باقی رہگئے ہیں رنگ محل کا سدر قلعہ کے اندر سب سے پرانی یادگار ہے اسکی جگہ جنرو پرانی ہر مگر تعمیر جدید مختصر ہے۔

مسلمانوں میں سب سے پہلے محمد بن قاسم ثقفی نے سنہ ٩٢ھ (سنہ ٧١١ع) میں قنوج پر حملہ کیا اور بعہد خلیفہ ولید اسلامی جھنڈا نصب کیا تھا۔ مسلم مورخین و سیاحین میں سے ابن وہاب جسکا سفرنامہ اب نایاب ہے مگر ابوزید نمیری بصری تیسری صدی اسلامی کا مورخ اُس کا حوالہ دیتا ہے چوتھی صدی کے سیاح و تاجر وجغرافی ابن حوقل موصلی اسی عصر کے مؤرخ مسعودی بغدادی۔ آٹھویں صدی کے لغوی ومحدث فیروزآبادی نے اپنی تالیفات میں قنوج کا ذکر کیا ہے۔ اسی صدی کا نامور سیاح ابن بطوطہ طنجی مغربی بھی یہاں آیا تھا اپنے رحلہ و سفرنامہ میں اسکی ویرانی و بربادی پر آنسو بہاتا ہے۔ تاریخ فرشتہ نے قنوج کی سرسبزی و وسعت آبادی و روایت اور کے بہت سے حالات لکھے ہیں جن کے ماننے میں صاحبان نظر اور اہل تحقیق کو کلام ہے۔ آئین اکبری میں لکھا ہے " قنوج با حویلی قلعہ از خشت پختہ دارد۔ از امصار بزرگ ہندوستان "

ممالک غیر کے مورخین میں سے ٹالمی Ptolemy نے اس کو کنیا جیزا Canogiza کے نام سے یاد کیا ہے چینی بودھ زائر فاہیان Fa Hian یہاں پانچویں صدی عیسوی کے آغاز میں آیا تھا

آن برخوردار در عرصۂ تحریر گنجایش پذیر نیست شعر

کتبت وکدت من شوق وتوق — الیک اکون سطرا فی الکتاب

یعنی نوشتم من حصار را و قریب بودم از شوق و آرزومندی که بسوی تست، اینکه شوم من سطر در خط خود۔ بیت

دل جدا، دیدہ جدا، سوی تو پرواز کند — گرچہ من در قفسم، بال و پرم بسیار است

حق سبحانہ این آرزو را کہ منتہیٰ اہم است بخیر وخوبی زود بر آرد۔

تیسرے خط میں تعلق خاطر اور اشتیاق دیدار یوں ظاہر فرماتے ہیں :۔

برخوردارا! در خط الٰہی حسین خدمتگار از کسل جسمانی خود نوشتہ بودند کہ اکثر علیل می باشند بار آن ارادہ سفر این طرف دارند۔ برخوردارا! خود می دانید کہ در بساط ما همین شما اید کسے کہ یک پسر داشتہ باشد باختیار خود جدائی پسر را قبول ندارد۔ تمام آرزوے ما همین ست کہ شما را سیر بینیم اما اسباب مختلفہ و دواعی متفرقہ می گزارند کہ شما را بطلبم۔

ہیون تھسانگ Hewen Thsong ساتویں صدی عیسوی میں بعہد ہرش وردھن آیا تھا اُس وقت قنوج منتہائے عروج و ترقی پر تھا۔ اُس نے پوری تفصیل کے ساتھ یہاں کے حالات ماضیہ و عصریہ لکھے ہیں۔ انگریز مورخین سیاحین میں سے پادری ٹیناٹ Rev Mr. Tennant اٹھارہویں صدی کے ختم کے قریب اور مسٹر ولیم ہنٹر William Hunter اُن کے بعد ہی آئے تھے مشہور صناع دانیال Daniell نے قنوج کا نقشہ کندہ کر کے سنہ ۱۸۳۵ع میں شائع کیا تھا میجر تھارن Major Thorn نے ۱۸۰۵ع میں جنگ مرہٹہ کے زمانہ میں قنوج کو دیکھا تھا

عصر موجودہ میں قنوج فی الجملہ ترقی کر رہا ہے۔ تجارت عطر و عطرسازی، روغن خوشبو، تیاری عطردان چوبی صندوقچہ منقش و گلکاری، پارچہ دیسی و بچھونے ولیناپ پوستین وغیرہ کی چھپائی کے لئے بہت شہرت رکھتا ہے۔ سواد و مضافات شہر میں دور دور تک سلسلہ چنبیلی اور گلاب کے باغات وقطعات چلے گئے ہیں۔

انگریزی کا ہائی اسکول اور سنسکرت و عربی کے متعدد مدارس شائقین علم اور طلبہ کو فیض عام پہونچا رہے ہیں۔

میر عبدالجلیل کو اپنے نواسہ کے ساتھ بھی بڑی محبت و الفت تھی باوجود پریشانی خاطر اسکا جلوہ اکثر مواقع پر نظر آتا ہے۔ میر سید محمد کو لکھتے ہین

برائے علاج درد گوش برخوردار سید غلام علی قلمی بود۔ الحق بسبب سواری دو وقتہ و سفر ہمراہی نواب امیر الامرا کہ بیست و دو روز ہمراہ ایشان ماندیم و ازش سرل شاہجہان آباد در حصت فرمودند از خاطر رفتہ بود۔ الحال انشاء اللہ از حکیم جیو[۲] حقیقت ظاہر نمودہ نسخہ گرفتہ دوا تیار کردہ می فرستد۔

اعتراف منت یہ حکیم جیو، حکیم صاحب مہربان حکیم محمد جعفر تھے جنکی سعی و توجہ سے ذی قعدہ ۳ جلوس (غالبا ۱۱۳۱ھ) مین شدید علالت اور تپ محرقہ سے میر عبدالجلیل کو نجات ملی تھی۔ میر صاحب دہلی پہونچتے ہی سخت بیمار ہوگئے تھے۔ نو وارد تھے نہ کوئی یار تہا نہ مددگار۔ نا آشنا لوگون سے واسطہ و سابقہ تھا۔ کسی خطون مین اس بیماری، اپنی تکلیف بخار کی شدت تیمم سے نماز ادا کرنے تیل کا استعمال چھوڑ دینے سخت پرہیز کرنے اور بعد صحت ایک ضیافت و دعوت کی تقریب مین پرہیز توڑنے کی تفصیل لکھی ہے ہر موقع پر اس معالج مہربان کا بار بار شکر ادا کرتے اور سعی ارا[ئے] آزار کی ستایش و تحسین فرماتے ہین۔

---

[۵] ہندوستان بلکہ تمام ممالک عرب و عجم مین اس شریف پیشہ کی بڑی عزت و توقیر تھی۔ اُس وقت تک اطبا کا یہ فیض رسان و کریم النفس طبقہ طمع و آز سے پاک و بے نیاز تھا۔ حکما کی مدد معاش اور بہ اطمینان گذر اب کے لئے سلطنت کی طرف سے سیر حاصل جاگیرین، اور معافیان عطا کی جاتی تھین۔ امرا اور اہل دول وظائف و سالیانے مقرر کر دیتے تھے۔ اطبا جواہ کسی درجہ و شان کے ہون اُس کار خیر کی انجام دہی کے لئے کوئی مزد یا اجر لینا اپنے مرتبہ سے فروتر اور باعث ننگ و عار سمجھتے تھے۔ سلاطین عہد ان کو بڑے بڑے خطاب حکیم الملک، حاذق الملک، شفاء الملک وغیرہ دیتے تھے۔ ان کا رتبہ وزرائے سلطنت سے بالاتر مانا جاتا تھا۔ حکیم الملوک، بہادر شاہ اور عظیم الشان کا طبیب خصوصی تھا اور شیخ محمد حسین شیرازی متخلص بہ شہرت، اعظم شاہ اور شاہ عالم بہادر شاہ کا۔ فرخ سیر نے اسکو حکیم الممالک خطاب دیا تھا۔ مرزا محمد ہاشم شیرازی مخاطب بہ سید علوی خان معتمد الملوک، عالمگیر و محمد اعظم و شاہ عالم کا حکیم تھا۔ محمد شاہ نے اسکو سونے مین تلوایا تھا شش ہزاری منصب رکھتا تھا۔ تین ہزار درماہہ نقد پاتا تھا۔ اسکے کمال اور حذاقت کی وجہ سے نادر شاہ قہرمان ایران اسکو بڑی کوشش سے اپنے ساتھ لے گیا تھا۔

حکیم جعفر غالبا میر کے ہموطن تھے۔ تیسرے رقعہ مین لکھتے ہین کہ اب شاید حکیم صاحب بھی شاہجہان آباد

شکر صحت نویں والا نامہ میں دو کلمہ خیریت باعزہ صحت اپنے قلم سے اپنا اس زمانہ کی محاورہ کے موافق ' بخط خود ') لکھ کر اہل خاندان کو بھیجتے ہیں تاکہ خاطر جمع ہو ہر خط میں از سر نو زندگی پائے اور موہبت الٰہی کا دل و زبان سے شکر بجالانے کے لئے اپنے تمام متعلقین کو تاکید کرتے اور لکھتے ہیں کہ " ایک من آرد کی روٹی پکوا کر فقرائے بلگرام کو بانٹ دینا۔

نحمداللہ ثم نحمد اللہ علی ما حبانا من الابتلا "

خدا کا شکر ہے پھر خدا کا شکر ہے کہ ہمکو بیماری سے صحت بخشی۔

عنایت نامہ ردیف بست و دوم اس سلک گوہرین کا واسطۃ العقد ہے یہ مجموعہ منشآت اس خط پر ختم ہو جاتا ہے میر عبدالجلیل ایک مدت مدید تک وطن سے دور اور اہل وطن سے مہجور رہکر اب بلگرام پہونچنا چاہتے ہیں جہاں شاہی دربار کے مخصوص امرائے دولت کی سازشوں اور نفاق اور پرشور و شر حوالی سے ماموں محفوظ رہنے کی توقع ہے۔ خود تو گھر پہنچنے اور گھر والوں اور متوسلوں کو دیکھنے کی عجلت و بیقراری ہے مگر اُن پر اصرار و تاکید ہے کہ اپنے جذبات و شوق کو روکیں، اُن کے استقبال کے لئے دور تک نہ آئیں گھر کے قریب مل لیں۔

برخوردار کامگار میر سید محمد سلمہ اللہ تعالیٰ۔ بعد دعوات مزید حیات مشہود آنکہ روز پنجشنبہ دوم جمادی الآخر ۱۱۳۲ھ از جناب عالی متعالی مرخص شدہ روانہ وطن گردیدہ چہارشنبہ ہشتم ماہ مزبور بخیر و عافیت بقنوج رسیدیم شنبہ ۲۷ جمادی الاولیٰ قاصد جوہر داراب دیروانہ جاگیر خود و شما روانہ وطن کردہ از آمدن خود اطلاع دادہ بودم والحال وعدہ کہ پیش از رسیدن خود بوطن بہ پنج شش روز خبر خواہم داد بجا آوردم۔ صاحبی میر کرم اللہ و میر اشرف بسواری دو بہل کرایہ تا قنوج رسیدند۔ آدم پیش آن برخوردار فرستادہ شد امروز کہ پنجشنبہ است انشاء اللہ بوطن می آرم دو سواری اسپ از برادران بعاریت بدست آوردہ برائے ہر دو کس تا آب گنگ بفرستند

آگئے ہوں گے اُن سے ملاو اور تدبیر ازالہ مرض کرنا چاہیے "

کہ از آروے آب بہ بیابان سوار شدہ بوطن برسند بتثیر برخوردار میر محمد اعظم برائے بار برداری بار کہ بر بہل بود باشلیتہ ورسن تیز نفرستند یک سیر روز برآمدہ بیدہ از قنوج دانہ ملگرام خواہد شد شاید تا ظہر آن روے آب رسیم آن برخوردار و ہر کس کہ ہمراہی شما کند ہرگز ارادہ آمدن تا لب آب گنگ نخواہید کرد کہ ہوا بسیار گرم است بس خود انجا میرسم آخر روز اگر بہ تحدد در آمدن باشید تا گرانی ہا بسعد الا شیع اذ سیار نسبت بہ اگر گذر راہی نسبتم ہمان جا ملاقات خواہد کرد کہ خوشنودی مادریت بہ یاد بخیر شوق چہ نویسد و السلام

شاعری

سید عبدالجلیل کو شاعری میں چندان شغف نہ تھا نہ اس میں کوئی دلچسپی و شگفتگی تھی آپ کا شعر کہنا محض "تفریحی" ہوتا تھا مدتین گذر جاتین اور ایک مصرع موزون کرنے کی نوبت بھی نہیں ہو پہنچتی تھی لیکن جب کوئی تقریب پیش آجاتی تو اندک توجہ سے معانی و مضامین سحر و حاضر نظر آتے تھے۔ آپ کی طبیعت قدرۃً معنی آفرین واقع ہوئی تھی شعر گوئی محض تفنن خاطر کے لئے ہوتی تھی یا اس خیال سے کہ کوئی صنف کمال ان سے باقی نہ رہجائے۔ وہ شاعری کو اپنے مرتبہ سے پست و حقیر سمجھتے تھے جیسا کہ اپنے "قصیدہ نسبی" مین فرماتے ہین ؎

مقصود من تفنن طبع است از سخن — ورنہ سزا ئے رتبہ من نیست شاعری

اصل یہ ہے کہ یہ قصیدہ ان کے تمام قصائد مین ممتاز اور خوبیون سے مالامال ہے اسمین متانت و استواری و پختگی کلام کے ساتھ خیال آفرینی، نزاکت ادا اور حسن ترکیب نمایان ہے بندشین دلآویز ہین۔ باقی قصائد مین کوئی مابہ الامتیاز شے نظر نہین آتی ہے ظاہر ہے کہ ان مین آورد کا حصہ آمد سے غالب رہتا تھا جو کثیر المشاغل اور مختلف المقاصد شخص دوراندکار باتون سے زبان کو آلودہ کرنا ہو وہ ترجیحات شاعرانہ پر کب توجہ کرے گا لیکن نخاہ مخواہ شعر کہنے کا باعث اور ارباب

احتیاج مانتے نہ تھے مجبورانہ اُن کی تشنگی و ضرورت رفع کر دیجاتی تھی۔ چنانچہ قصیدہ فتح اگرہ مین لکھتے ہین ؎

شعر گر فضل من نہ پوشیدے — می شدم در فن سخن اقدم
گر بہ پرسی زجا سعیت من — میر خسرو دہد جواب نعم

میر صاحب نے ضرورتاً قصائد زیادہ کہے ہین۔ ان کے کلام مین، کہین کہین ابوطالب کلیم ملک الشعرائے شاہجہانی اور حاجی محمد جان قدسی کے رنگ کی جھلک پائی جاتی ہو۔ معاصر نہی یہ دونون قریب العہد ضرور تھے۔ اگر ان کے کلام و کمال کا گہرا رنگ میر عبد الجلیل پر چڑھ گیا ہو تو تعجب کی بات نہین۔ البتہ تشبیہات کی ندرت اور استعارات کی شوخی یہان کمیاب ہے کم مشقی اور کم توجہی ان تقصیرات کی ذمہ دار ہے۔ ورنہ جودت طبع، ذہانت اور وسعت نظر و معلومات مین میر صاحب کس سے کم تھے ؟

میر عبد الجلیل ہفوات شاعرانہ سے نہایت احتراز کرتے اور اپنے فرزندان و تلامذہ پر اس قسم کے لوث و آلودگی سے محفوظ رہنے کے لئے سخت تاکید رکھتے تھے بالخصوص انبیا علیہم السلام کی شان مین حضرت یوسف پر معشوق مجازی کو ترجیح دینے اور صبر ایوب پر عاشق کے طعن کرنے پر نہایت سرزنش کرتے (علیہما السلام) اگر کسی جگہ اس قسم کے ترہات و اباطیل نظر سے گذرتے تو سورہ شعرا کی آیۂ خاتمہ زبان پر آجاتی تھی۔ یعنی وَسَيَعْلَمُ الَّذِينَ ظَلَمُوا أَيَّ مُنْقَلَبٍ يَنْقَلِبُونَ (اور جنھون نے لوگون پر ظلم کیے ہین اُن کو عنقریب معلوم ہوجائے گا کہ کیسی جگہ اُن کو لوٹ کر جانا ہے۔ جزو ۱۹۔ سورۃ الشعرا ع ۱۵-۱۱)

میر صاحب کا کلام عربی و فارسی و ترکی و ہندی چار زبانون مین پایا جاتا ہے اور انصاف یہ ہے کہ باوجود عدم اعتنا و فقدان توجہ کے انھون نے اپنا کمال کمال دکھادیا ہے۔ بیشک وہ غزل کم کہتے تھے۔ لیکن باقی تمام اقسام سخن مین بے مثل جواہر بکھیر دیئے ہین اور ثابت کیا ہے کہ شخص واحد کو تمام انواع شاعری پر اس درجہ دسترس و عبور رکھتے ہوئے دیکھنا دشوار ہے وہ مشقی رکھتے

بلکہ زاہد خشک، لیکن آغاز شباب میں رنگین مزاجی و ظرافت میں بھی کامل تھے۔ ع

ہم آج پیر ہوئے کیا کبھی شباب نہ تھا؟

تخلّص میر عبدالجلیل ابتدا میں "طرازی" تخلّص کرتے تھے پھر اس مناسبت سے کہ سید واسطی الاصل تھے "واسطی" قرار دیا لیکن زیادہ تر دیکھا یہی گیا ہے کہ وہ اپنا پورا نام "عبدالجلیل" اور کبھی کبھی "میر جلیل" داخل کلام کرتے تھے۔ وہ دونوں تخلص ان کی جوانی اور انکی شاعری کی جوانی کے یادگار تھے اور نام کا لینا یا نظم کرنا بسبب انحطاط عمر یا زمانہ پختگی کلام و کمال میں اختیار کیا تھا صاحب حیات الشعراء نے ان کا نام میر جلیل لکھا اور ان کو حرف میم میں ذکر کیا ہے خود میر نے ایک موقع پر فرمایا ہے ؎

خدنگ غمزۂ شوخ مغ صنوبر قد ... رکند شست سر خستہ جان میر جلیل

عروض

میر عبدالجلیل کی مہارت فن عروض عربی و فارسی میں بدرجہ نہایت تھی شیخ سعدی کا شعر ہے

وَاِنْ سَلِمَ الْاِنْسَانُ مِنْ سُوْءِ نَفْسِہٖ ... فَمِنْ سُوْءِ ظَنِّ الْمُدَّعِیْ لَیْسَ یَسْلَمُ

میر نور اللہ احراری نے اس قول کی شرح میں لکھا ہے کہ لَیْسَ یَسْلَمُ سے لَا یَسْلَمُ زیادہ فصیح معلوم ہوتا ہے۔ اس لئے کہ بحالت لَیْسَ ہونے کے مصرع گر جاتا ہے۔

میر عبدالجلیل نے اس قول پر معارضہ کیا اور یہ حاشیہ لکھا ہے۔

"مخفی نماند کہ این بیت بوزن دوم از اوزان ثلثہ بحر طویل است کہ عروض و ضرب آن مقبوض می آید و تقطیع مصرع ثانی کہ مناط گفتگو ست ذکر زول بوزن فعولن مفاعیلن فعولن مفاعلن باشد چنین است فَمِنْ سُو فعولن ءِ ظَنْنِلْ مُدْ مفاعیلن دَعِیْ لَیْ فعولن سَ یَسْلَمُ مفاعلن۔ وچون تقطیع مذکور معلوم گردید ظاہر شد کہ واجب و متعین است کہ نسخہ لیس یسلم باشد نہ لا یسلم چنانچہ میر گمان بردہ چہ حرف لام و یا از حرف لیس در تقطیع با لفظ دعی مرکب شدہ

فعولن خواہد شد وتسلیم بر وزن فاعلن خواہد ماند و فاعلن در ضرب بحر طویل نمی آید چنانچہ بر تتبع عروض پیداست چہ ضرب بحر طویل تام می باشد یا مقبوض یا محذوف۔ و فاعلن ازین ہر سہ قسم خارج ست پس آنچہ میر نوشتہ کہ از نسخہ لیس مصرع زیادہ می شود موافق میزان طبع میر است نہ موافق میزان عروض طرفہ آنکہ مصراع در صورتیکہ لا تسلیم باشد کم می شود۔

وجہ مناسب این مقام است بیتے کہ خلیل بن احمد واضع فن عروض در مثال وزن دوم بحر طویل آوردہ ؎

سَتُبْدِی لَکَ الْاَیَّامُ مَا کُنْتَ جَاهِلًا   وَیَاْتِیْکَ بِالْاَخْبَارِ مَنْ لَّمْ تُزَوِّدِ

وعبارت میر کہ لا تسلیم فصیح تر از لیس یسلم می باید چہ در نسخہ لیس مصراع زیادہ میشود انتہی محل تامل ست۔ زیراکہ منطوق عبارت دلالت دارد برین کہ زیادت مصراع منافی فصاحت ست و وزن عروضی را وجوداً و عدماً در فصاحت و عدم آن دخلی ست و حال آنکہ ہیچ یکے از علماء معانی این معنی را در فصاحت کلمہ و کلام و عدم آن اعتبار نہ کردہ۔ بہ فرض تسلیم مقصد عبارت میر آنست کہ بر تقدیر زیادت فصاحت مرتفع می گردد و حال آنکہ لفظ فصیح تر کہ برائے تفضیل است دال ست برین کہ نسخہ لیس یسلم ہم فصیح ست پس فصاحت این نسخہ با زیادت وزن باعتقاد میر چہ قسم جمع می تواند شد اَللّٰھُمَّ اغْفِرْ ھَفَوَاتِیْ وَاعْفُ عَنْ زَلَّاتِیْ "

حُسنِ طلب

میر عبد الجلیل کو ایکبار زمخشری[۵۲۲] کی کتاب ربیع الابرار[۵۲۳] کی ضرورت ہوئی خواجہ عبد الباسط دہلوی سے منگائی اور یہ قطعہ لکھ کر بھیجا ؎

---

۵۲۱ عنقریب زمانہ تجھ پر بہت سی نامعلوم باتیں ظاہر کرے گا اور تجھے وہ شخص خبریں دیگا جس کو تو نے اس غرض سے بھیجا ہیں۔ سبعہ معلقہ" قصیدہ تابطرفہ بن عبد البکری۔

۵۲۲ زمخشری، ابو القاسم جار اللہ محمود بن محمد بن عمر خوارزمی طریقتاً حنفی عقیدتاً معتزلی تھے۔ المرکوبین

یا باسط الایدی ایا عیت المدی — صیرت مزرعۃ العطا مربعا
لا عروان ارحوا الرسم نفصلکم — فالغیب یعطی العالمین ربیعا

خواجہ صاحب نے کتاب مذکور فوراً اسیر صاحب کی خدمت میں بھیجدی جو اُن کے کتبخانہ مین مدت تک موجود رہی۔

ٍلہ نسخہ المرجان میں مصرعہ یوں لکھا ہے لا عروان اطلب دسیعاملکم

مربع بروزن ربیع سرسری ظاہر امربعہ کہنا چاہیئے تھا برعایت مزرعۃ ارض مربعہ مخصبۃ کو کہتے ہین

داخل ہین۔ ان کا دعویٰ تھا کہ اُن کی تصانیف نحویہ اپنی جامعیت کے لحاظ سے سیبویہ کی کتابون سے کسی طرح کم مرتبہ نہین رکھتی ہین۔ اسی کے ساتھ وہ بڑے بلند پایہ لغوی، ادیب و مفسر بھی تھے۔ ابوعمرو عامر بن حسن سمسار کہتے ہین کہ زمخشری روز چہارشنبہ ۲۷ رجب ۴۶۷ھ (۲۲ مارچ ۱۰۷۵ع) کو بمقام زمخشر ملک خوارزم پیدا ہوے رات عرفہ ۵۳۸ھ (۲ اردسمبر ۱۱۴۳ع) مین قصبہ جرجانیہ خوارزم میں وفات پائی (جرجانیہ معرب ہے اصل نام فارسی کاکرکانج تھا۔ دریای جیحون کے کنارے واقع ہے) فاضل ابومضر کے شاگرد تھے استاد شفیق کی رحلت پر مرثیہ رثائیہ لکھا تھا

وقائلۃ ما ھذہ الدرر التی — تساقطھا عیناک سمطین سمطین
فقلت لھا الدر الذی کان قد ملا — ابومضر اذنی تساقط من عینی

حج بیت اللہ کی غرض سے جب زمخشری بغداد ہوکر گذرے تو اُن کی آمد پر شیخ شریف ابوالسعادات ابن شجری مبارکباد کیلئے آئے اور چند اشعار پڑھے زمخشری کی مدح وثنا کی۔ زمخشری خاموش بیٹھے سنتے رہے حتی کہ شیخ نے اپنی تقریر ختم فرمائی تو زمخشری نے اُن کا شکر ادا کیا تعظیم دی اور اپنی جانب سے تواضع و انکسار کا اظہار کیا۔ اسکے بعد ایک روایت بیان کی کہ حضرت زید الخیل بارگاہ نبوت میں حاضر ہوئے اور جمال مبارک دیکھا تو بے اختیار بآواز بلند شہادت پڑھنے لگے۔ آنحضرت نے فرمایا کہ اے زید الخیل ہر مرد کہ جسکی مجھسے توصیف کی گئی ہو مین نے اُس کو اُن صفات سے دون و فروتر پایا مگر تم کو کہ تم بیشک اُن اوصاف سے جو سُنے تھے فوق و بالاتر ہو پھر زمخشری نے کہا کہ یہی کیفیت ہمارے شیخ شریف کی بھی ہے اور اُن کو دعائین دین اور ثنا و صفت کی۔ شیخ شریف اپنی مجلس ہین و تورد صاحب ہیبت حسن تھے آدب نفس اور آداب درس سے خالی کوئی کلمہ زبان سے نہین نکالتے تھے اس لئے حاضرین متعجب تھے کہ سلار اصوت کا ایک وجیہ مُعمّر معزز شخص یہان شعرین پڑھ رہا ہے اور سکے روبرو ایک ادیب و شاعر سا سب حال حدیث بیان کرتا ہے

زمخشری اور ابن عطیہ کے ساتھ جو باہتمام اثیر الدین ابوحیان اندلسی نے کئے تھے ان کو ابوحیان کے شاگرد

لیکن فعیل مذکر و مونث دونون کے لئے آتا ہے جیسے إِنَّ رَحْمَةَ اللَّهِ قَرِيبٌ مِّنَ الْمُحْسِنِينَ (خدا کی رحمت خلوص رکھنے والون سے قریب ہے ترجمہ سورۃ الاعراف ع ۷-۱۴۱) صاحب قاموس نے رسل کے مادہ مین اس قاعدہ کی تصریح کی ہے۔ لاعرو بمعنی لاعجب۔ رشید وطواط نے حدائق السحر مین تاکید المدح بمایشبہ الذم کی مثالون مین بدیع ہمدانی سے یہ مثال نقل کی ہے ؎

هُوَ الْبَدْرُ إِلَّا أَنَّهُ الْبَحْرُ زَاخِرًا   سِوَى أَنَّهُ الضِّرْغَامُ لَكِنَّهُ الْوَبْلُ

اور لکھا ہے کہ مین نے یہ شعر بلخ مین ابراہیم غزنی شاعر کے روبرو پڑھا اُس نے یاد کر لیا اور ایک ہفتہ سے زیادہ اس کے مثل کہنے کی فکر کرتا رہا مگر ناکام رہا اور اپنے عجز کا اعتراف کیا اور اقرار کیا کہ بدیع سے پیشتر نہ تو کسی نے ایسا کہا اور نہ اب کہہ سکے گا۔ میر عبد الجلیل فرماتے ہین کہ اس نفی تابیدی سے تعجب ہے جو رشید وطواط نے غزنی سے نقل کی ہے۔ چنانچہ اسی طرز پر ایک شعر خود نظم کیا اور اسمین مراعات نظیر کا حق ادا کر دیا ہے ؎

هُوَ الْقُطْبُ إِلَّا أَنَّهُ الْبَدْرُ طَالِعًا   سِوَى أَنَّهُ الْمِرِّيخُ لَكِنَّهُ الشَّمْسُ

شیخ تاج الدین احمد بن عبد القادر بن مکتوم نے قلمبند کر لیا تھا۔ در اللقیط نام رکھا تھا۔ زمخشری و وطواط سے بھی مناظرہ ہوا تھا۔ اُس کی روئداد کا ایک ورق مدینہ منورہ مین عارف حکمت بے کے کتبخانہ مین محفوظ ہے۔ ابن وہاس سلیمانی فقیہ مکّی کا قصیدہ زمخشری کی مدح مین مشہور ہے۔

زمخشری کی بہت سی تصانیف موجود ہین۔ ربیع الابرار و نصوص الاخبار، متشابہ اسامی الرواۃ، النصائح الکبار، النصائح الصغار، ضالۃ الناشد والرائض فی علم الفرائض، شقائق النعمان فی حقائق النعمان، شافی العی من کلام الشافعی، القسطاس فی العروض، معجم الحدود، منہاج فی الاصول، مقدمۃ الادب، کتاب الکشاف عن حقائق التنزیل (تفسیر مین) کتاب المفصل فی النحو، کتاب المفرد والمولف (نحو مین) اور اطواق الذہب عام شہرت سے محتاج تعارف نہین۔ ان کے سوا کتاب الفائق (تفسیر حدیث مین) اساس البلاغۃ (لغت مین) اور کتاب اسماء الادویہ والجبال، مقامات الزمخشری اور اعجب العجب شرح لامیۃ العرب (للشنفری) بھی قابل ذکر ہیں۔

ف حضرت زید الخیل الطائی کا نام نامی حضور اقدس صلعم نے "زید الخیر" رکھا تھا۔ آپ کے حالات استیعاب اور اصابہ وغیرہ مین ملتے ہین۔ عرب کے نامور شاعرون مین سے تھے۔ الشعر والشعراء مطبوعہ لیڈن مین (صفحات ۵۶ الغایتہ ۱۵۸ پر) آپ کے اخبار و احوال بالتفصیل مرقوم ہین۔

اشعار متفرق

(فارسی)

وِردِ خود نام خدا با نام احمد کردہ ام — دانۂ تسبیح از میم محمد کردہ ام

(۱)

بجز مژگان ندارد چشم بیمار تو غمخوارے — بلاگردانی برگشتہ مژگانت تماشا کن

(۲)

سرت گردم اگر فہمی سواد نامۂ رنگگون — چو دود آہ در لختِ جگر پیچیدہ می آید

(۳)

شام غم را در سواد نامہ پنہان کردہ ام — صبح محشر می دمد از صفحۂ مکتوب ما

(۴)

خزان بہار ندارد، ولے حنائے نگار — خزان چو گرد، نماید بہار نیلوفر

(۵)

بانتظارِ قدوم تو، لالہ در گلشن — ستادہ قہوہ بکف در پیالۂ یاقوت

(۶)

۵۲۳ ربیع الابرار، اب تک حلیۂ طبع سے معرّیٰ ہے البتہ تلاش سے کہیں کہیں اسکے خطیہ نسخے مل جاتے ہیں پانچ چھ سو صفحات کی ضخامت ہوگی عربی سے فارسی میں بھی ترجمہ ہوا ہے محمد بن یعقوب نے سنہ ۹۲۱ھ (۱۵۱۵ع) میں اصل عربی کا اختصار کرکے روض الاخیار المنتخب من ربیع الابرار کے نام سے موسوم اور سلطان سلیم خان بن بایزید خان عثمانی سے منسوب کیا تھا۔ یہ مختصر سنہ ۱۲۸۰ھ میں مصر میں طبع ہوا تھا۔ بعض لکھتے ہیں کہ ابوالحسن الواحدی نے متنبی کی شرح لکھی تھی زمخشری نے اس سے التقاط کیا قاضی نور اللہ نے مجالس میں ربیع الابرار کا حوالہ دیا اور ذکر کیا ہے مولانا ابوالحسنات عبدالحی فرنگی محلی نے بھی ابراز الغی [illegible] میں ربیع الابرار کا نام لیا ہے

مُستزاد

یہ رُباعی چارون زبانون مین محض اپنی تفریحِ طبع کے لئے بصنعت مُستزاد کہی تھی ؎

جَاءَ النَّیْرُوْزُ بِالْبِسَاطِ الْاَوْفٰی فِیْ خَیْرِ قُدُوْمٍ سالِ نو کا دن بڑی خوشی کیساتھ آیا نیک آنکے ساتھ
پھولین دُرم ہیل کہلہی بن اولہا تُرورر رہی جھوم شاخین بچھونوںسے لدگئین جنگل لہلہانے لگا درخت بنا سر نکلنے لگے
نیکی کندوز کلدی یری بولدی لیش قتلغ بُوسُوم نئے سال کا دن آیا بیابان سرسبز ہوگیا مبارک ثابت ہو
چون شہپر طاؤس گُل اندر صحرا آورد ہجوم ہو رہی کھلی ہوئی دُم کی طرح جیسے جنگلمین پھول اکٹھے ہوگئے ہین

۹۳ نوروز ماہ کا پہلا دن ہے۔اس روز آفتاب برج حمل مین آتا ہے۔
مولوی محمد حسین آزاد دہلوی دربار اکبری مین لکھتے ہین کہ ”نوروز کو ایشیا کی ہر قوم و ملت اور ہر ملک کے لوگ ہمیشہ عید مانتے اور مناتے رہے ہین۔موسم بہار مین طبائع انسانی مین ایک ولولہ و جوش پیدا ہو جاتا ہے خواہ ترکان جنگیری ہون یا زرتشتیان ایرانی اسی لئے بادشاہان تیموری بھی نوروز کے دن شاہانہ فر و سطوت و شکنت سے جشن کیا کرتے تھے۔اکبر نے اس کے اہتمام و احتشام کو زیادہ چمکا دیا تھا۔نوروز سے لے کر اٹھارہ دن تک امرا اسکے تکلفات و ضیافت مین مشغول و مصروف رہتے تھے۔رقص و طرب کی محفلین گرم ہوتی تھین، اور وہ سب رُسوم ادا کیجاتی تھین جو اکبر کے نزدیک ہندوستان کی دلدہی اور استمالت کے لئے ضروری تھین۔راجہ مہاراجہ ایک طرف، ایرانی تورانی سردار دوسری طرف، اپنی شان و شوکت اور بہادری و شجاعت کی نمایش کرتے تھے پہلے شاہزادوں کی پھر امرا کی درجہ بدرجہ نذرین گزرتی تھین تخت گاہ تک پہونچکر آداب زمین بوس بجالاتے شعرا قصائد پیش کرتے صلہ و خلعت پاتے بادشاہ کا تُلا دان سونے کی ترازو مین سونا چاندی سے کیا جاتا۔“
شاہجہان نے اس رسم کو بالکل اُٹھا دیا تھا۔شاہزادہ ولیعہد محمد معظم بہادر شاہ نے ایک مرتبہ یہ جشن منایا تھا عالمگیر کو خبر ملی تو فرزند سعادت توام کو ان الفاظ مین سرزنش فرمائی۔

”از عرض بے غرضے ظاہر شد کہ امسال نوروزے بطور اہل ایران تکلف کردہ اند بفضل الٰہی عقائد خود درست دارند۔این بدعت تازہ از کہ آموختہ اند ظاہر آن عرب کہ خود را سنّی گویند تعلیم کردہ باشند۔بہرحال چون این روز از اعیاد مجوس ست و اعتقاد ہنود در روز جلوس بکرماجیت و بعد از تاریخ این عہد بہ عمل باید چنین جہالت بعمل نہ گرایند۔“

اشعارِ عربی

میر عبدالجلیل کا کلام عربی کبھی مُدوّن نہین ہوا متفرق اشعار جابجا تذکرون مین ملتے ہین بعض منتخب نقل کیے جاتے ہین ؎

یا صاح لا تلم المتیّم فی الھوی | ھو عاشق لا ینتی عن حلہ
تابی الدواء سقامہ کعیونہ | وعلی الطبیعۃ یا معالج حلّہ

حبیبی قوس حاجبہ کنون | وصار یدا ابن مقلۃ شکل عینیہ
لعمری انہ نصّ جلیّ | علی ان الرمایۃ حق عینیہ

کسی شاعر کے دو شعر مشہور ہین اُس رنگ مین فرماتے ہین

حبیبی ثغرہ کالسین شکلا | وکالمیم المدور شکل فیہ
ھما اسم ویا عجبا حیاتی | اذا ما ذقتہ لاشک فیہ

میر غلام علی آزاد لکھتے ہین کہ اسمین ضمیر مذکر حیوۃ کیطرف راجع کردی گئی ہی اسمین اصلاح اس طرح پر ہو سکتی ہے

ہ رفع بدعت نوروز وبدیل آن بجشن نشاط افروز جلوس مبارک" کے عنوان سے مفتی محمد کاظم بن محمد امین نے عالمگیر نامہ (مطبوعہ کلکتہ کالج پریس ۱۸۶۸ء صفحہ ۳۹۹) مین ان احکام ہدایات شاہی کا ذکر کیا ہے

شاہ دین پناہ کی رحلت کے ساتھ جب مہمات مملکت مین تخلل اور اساس سلطنت مین تزلزل آیا تو یہ بدعات ورسوم پھر تازہ ہو گئین

دولت وحشمت کے ایسے کرشمے تو دورِ زمانے بہت دیکھے ہین ؎

این چنین بسیار کرد است وکند | سبحہ را زنّار کرد است وکند

ہندوستان مین سال شمسی کے آغاز پر نوروز ۲۲ یا ۲۳ مارچ کو ہوتا تھا اور مغلون کے آخر عہد تک بڑے ترک و احتشام سے منایا جاتا تھا

وتاہ تعرها کالسیر بتشکلا　　وکالمیم المدور سکل فیها
هماسمٌ وما عجبا حیاتی　　اذا ما ذقته لا شك فیها

مُعَمّے

یدِ بیضا مین لکھا ہے کہ میر عبد الجلیل کے معمّیات چارون زبانون مین ہین اور بکثرت ہین منجملہ اُن کے یہ دو معمّے نقل بھی کئے ہین جن کا آیات قرآنی سے استخراج کیا تھا

(۱) علی کے نام کا وَجُمِعَ الشَّمْسُ وَالْقَمَرُ ۙ يَقُوْلُ الْاِنْسَانُ يَوْمَئِذٍ اَيْنَ الْمَفَرُّ [اور سورج اور چاند ایک جا کر دیے جائین۔ اُس دن آدمی بول اُٹھیگا کہ اب کدہر کو بھاگ جائین جزو ۲۹۔ سورۃ القیمہ۔ ع ۱-۱۷] شمس سے مراد عین ہے اور قمر سے ماہ۔ اور ماہ سے تیس۔ اور یس سے لام اور یقول کی تحلیل سے دو چیزین پیدا ہوئین ایک ی، دیا، اور دوسرا قول بمعنی قیل دکھا گیا، کہ جب نام علی نکل آیا تو اس کے یہ معنی یہ ہوئے "جب وہ لایا جائے جو انسان کامل ہے۔ آج اُس سے گریز کہان ممکن ہے"

(۲) بصیر کے نام کا۔ اِذْهَبُوْا بِقَمِيْصِىْ هٰذَا فَاَلْقُوْهُ عَلٰى وَجْهِ اَبِىْ يَاْتِ بَصِيْرًا [میرا یہ کُرتا لے جاؤ اور اس کو والد صاحب کے مُنہ پر ڈال دو کہ وہ دیکھنے لگین گے جزو ۱۳۔ سورۂ یوسف۔ ع ۱۰-۴] 'ابی' سے مراد اُس کا مرادف 'والدی' ہے۔ عدد لقمیصی' اور 'والدی' کے 'بصیر' کے اعداد کے برابر ہین تو معمّا کے معنی یہ ہون گے "۔ بس اس کو میرے والد (باپ) کے اوپر ڈال دو۔ جو 'ابی' کا مرادف ہے" اور آیۃ کی عبارت سے بھی لفظ بصیر کا خروج ظاہر ہے۔ آج یہ تکلفات باگران، اور نازک خیالیان روح فرسا ثابت ہو رہی ہین لیکن ڈھائی سو برس پہلے یہی مغز کاویان صنعت کا رِان معیار کمال اور حُسن کلام سمجھی جاتی تھین۔

مُلّا محمد قاسم کاہی نے ایک پورا رسالہ فن معمّامین لکھا ہے۔ اسمین نبی کے نام کا یہ معمّا تحریر کیا ہے

بره شعر تا مشتافته ام　　از محمد نبی ستگافته ام

میر عبدالجلیل نے بھی اسی طرز پر معمّا امام کے نام کا نکالا ہے ؎

در معمّا چو کام یافتہ ام — من علی۔ا۔امام یافتہ ام

علی کے نام کا یہ معمّا ناصر علی سے منسوب ہے جس مین اعراب کی بھی تصریح ہے۔ ؎

چشم بکشا، زلف بشکن، جان من — بہر تسکین دل بریان من

عمل ترادف چشم علین۔ و کبشا بمعنی افتح۔ یعنی علین کو فتحہ دیجیے۔ زلف عمل تشبیہ سے لام ہوجاتی ہے بشکن عمل ترادف سے بمعنی اکسر یعنی لام کو کسرہ دیجیے۔ دل بریان، یا ہی تسکین، سکون دینا حاصل کل عَلِیْ ہوا۔

آزاد نے بھی ایک معمّا باسم ممنون لکھا تھا جس پر میر عبدالجلیل نے صاد کیا تھا ؎

غم من بے نتیجہ بود اوّل — شکر ایزد نتیجہ داد آخر

غم من، اول شکل منطقی ہے یعنی غم صغریٰ و من کبریٰ۔ اوّل بے نتیجہ ہوگیا یعنی غین کا نون جاتا رہا، مم، کہ حد اوسط ہے باقی رہا۔ آخر نتیجہ غین، نون ہوا۔ نون رہا۔ ممنون حاصل ہوا۔

متصوّفانہ مکاتبت

سید اسمٰعیل[۲۵] بلگرامی خلیفہ شاہ عبدالرزاق بانسوی نے ایک رقعہ میر عبدالجلیل کو لکھا تھا سوال یہ تھا کہ یقظہ (بیداری) افضل ہے یا نوم (خواب)؟

میر صاحب مشفق مہربان فیض رسان سلامت حقیقت نوم و یقظہ برارباب معانی منکشف

---

۲۵ میر سید اسماعیل سادات حسینی واسطی کے عشیرہ پنج بخیہ سے، بلگرام محلہ میدان پورہ کے باشندے تھے ابتدائے حال مین کتب درسی پر عبور حاصل کیا اور فضائل رسمی کو اکتساب فرمایا تھا میر طفیل محمد بلگرامی کے علاوہ دیگر اساتذہ سے مختلف مقامات مین بھی تحصیل علوم کی تھی۔ خدا طلبی کی شورش حب سے بڑھی تو شیخ عبدالرزاق بانسوی کی خدمت مین پہونچے شرف بیعت حاصل کیا اور مورد عنایات خاص ہوے بارہ سال کے قریب شیخ کے زیر سایۂ تربیت رہ کر ریاضت ہائے شاقہ فرمائین اور دائرہ فیوض سے گنجہا معارف

وہویداست بعضی نوم را بر تیقظہ ترجیح دادہ اند و بعضے تیقظہ را بر نوم۔ این ضمن را مستر وحا تحریر فرمایند والسلام علیکم وعلیٰ من لدیکم۔

میر صاحب نے اس کا جواب حسب ذیل تحریر فرمایا۔

بیدار دل، خوابیدہ ہوا، ثابت مقام تسلیم و رضا سلامت۔ از معارضہ قوم و تفضیل تیقظہ بر نوم نگارش رفتہ رمز آگاہا! اگرچہ منطوق کلام اَلنَّاسُ نِیَامٌ فَاِذَا مَاتُوْا انْتَبَھُوْا و حدیث شریف اختصام ملاء اعلیٰ، تصعید عمل متیقظ بہ بالا روی باختلاط و رجبہ جواب دارد ع چشم تو بہ نسبت ماست پر خواب چرا ست

پہونچ گئے شیخ کے انتقال کے بعد سجادۂ خلافت کو زینت دی حضرت شیخ کے تمام خلفا اور مریدان کو ایسا مقتدا سمجھتے اور مانتے تھے اعتقاد کامل رکھتے اور ادب و احترام کرتے تھے حسب روایت مآثر الکرام علامۃ العصر مولوی نظام الدین خلف الصدق مولانا قطب الدین شہید سہالوی نور اللہ ضریحہما نے بھی شیخ کی وفات کے بعد میر کی خدمت میں رجوع کیا تھا۔ میرے سولی (ضلع بارہ بنکی)، تابع لکھنؤ، میں قیام اختیار فرمایا تھا لیکن بلگرام بھی اکثر تشریف لاتے اور ارشاد و ہدایت میں مشغول رہتے تھے۔ ارادتمندان عقیدت کیش کی تعداد اکثر تھی۔ ۴ ذوالحجہ سنہ ۱۱۶۴ھ (۲۵ اکتوبر سنہ ۱۷۵۱ع) کو سولی میں استراحت دائمی پسند فرمائی۔

۵۲۶ شاہ عبدالرزاق، وہیں قصبہ محمود آباد (جوار بانسہ) کے رہنے والے تھے، بانسہ، تابع لکھنؤ رحال واقع ضلع بارہ بنکی، کے شیوخ قدوائی میں آپ کا ننھیال تھا اسی ارث مادری کے علاقہ سے بانسہ میں توطن فرمایا تھا شروع راہ میں پیشہ نوکری اختیار کیا تھا کسب معاش فرماتے رہے پھر ترک ملازمت فرما کر ایک عمر سیر سیاحت میں گذار دی سواد احمدآباد گجرات میں شاہ عبدالصمد خدانما کی خدمت سے مشرف ہوئے۔ مرید ہو کر مقاصد اعلیٰ پر پہونچے۔ وہاں سے وطن مالوف واپس آئے۔ لباس ہیئۃ اہل دنیا کی طرح پہنتے اور شغل کاشتکاری سے قوت حلال بہم پہونچاتے تھے حضرت کی حالت دیکھ کر ہر وضیع و شریف مطیع و منقاد ہو جاتا تھا علمائے متبحر اور فضلائے عصر آپ کے حلقہ بگوش اور ارادتمند تھے با این کہ امی محض تھے آیات قرآنی کو اور پڑھتے اور ایسا حیرت تفسیر فرماتے تھے ایسے حقائق و معارف و اسرار بیان کرتے تھے کہ جنکو سن کر عقلا و دانشمند متحیر رہ جاتے تھے۔ بروایت میر غلام علی آزاد ۵ شوال سنہ ۱۱۳۶ھ (۲۶ جون سنہ ۱۷۲۴ع) کو اور حسب تحریر بزرگان فرنگی محل ۶ شوال روز چہارشنبہ کو رحلت فرمائی۔ مدفن شریف بانسہ میں ہے مزار و تبرک ہے۔

۵۲۷ اختصام ملاء اعلیٰ حدیث شریف میں آیا ہے کہ ثمن اعمال کے لیجانے میں ملائکہ باہم خصومت جھگڑا کرتے ہیں اطعام الطعام وقلیل الکلام والصلوٰۃ باللیل والناس نیام کما ... کذا ...

اما مضمون کریمہ وَتَحْسَبُهُمْ أَيْقَاظًا وَّهُمْ رُقُودٌ وَّنُقَلِّبُهُمْ ذَاتَ الْيَمِينِ وَذَاتَ الشِّمَالِ باعتبار کفالہ تقلیب کہ مشتمل است سراسر عجیب، دلالت بر رفعت شان از خود خوابیدگان دارد ع

نے مراتب خوابے کہ بہ زبیداری است ۔

واگرچہ بظاہر خطاب قم یا نوماں ناظر بہ تہدید است اما قطعیہ بہ فضل عبا ستعر بہ غایت تعظیم دہیم چنین مضمون این منظومہ ہندی ع یار آیو تب گاؤن سوے کبہین بھلت پراپت ہوے، اگرچہ ایمائے بہ تنقیص نوم دارد اما فحوائے دوہرہ ؎

سُپنین دیکھوں پیہ مین کُھل گیی آنکھ جاگ اور گنواوت سوئی سب سوں تو گنواوے جاگ

از غایت نزاکت کاری مبنی است بہ تفضیل نوم بر بیداری ؎

خوشا حالت آن عاشقے کہ در شب ہجر بہ خواب شد آئی و او شد مسار از بر خیزد

تحقیق مقام آنکہ تا سرے بہ خیال او داری اگر بیداری است بہ از نوم، واگر نوم است بہ از بیداری نمک ریزی شبلی در چشم و متردد برای رفع خواب و خوابیدن عبود ہشت سال و اوّل در آمدن او بہ جنت، ہر دو صواب است۔ این ست ما حضر فکر مستقیم وَفَوْقَ كُلِّ ذِي عِلْمٍ عَلِيمٌ ۝

(۳) نمازنوافل تب جس وقت کہ لوگ سو رہے ہوں یہ حدیث تمامہ مشکوٰۃ کی تیسری فصل، باب المساجد و مواضع الصلوٰۃ میں موجود ہے ۔

۵۲۸ اور تو ان کو سمجھے کہ جاگتے ہیں حالانکہ وہ سوے ہیں اور ہم داہنی طرف کو اور بائیں طرف کو اُن کی کروٹیں بدلواتے ہیں (جزء ۱۵- سورۃ الکہف ع ۳- ۱۵)

۵۲۹ قم یا نوماں غزوہ خندق میں کفار کے فرار کی شب میں اندر سردی سخت اور ہوا نہایت تند تھی حضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے حذیفہ الیمان کو کفار کے لشکر کی خبر لگانے اور پتہ چلانے کو بھیجا اور دعا فرمائی حتی کہ سردی اور بھوک انکی دور ہوگئی۔ پھر وہ جیسے ہی لوٹ کر آئے جاڑے کا اثر پیدا ہو گیا حضرت صلعم نے بفضل عبا یعنی اُس لباس گلیم کا جو دوش مبارک پر تھا گوشہ ذرا اُنکو اڑھا دیا اور پائے مبارک اُنکے سینہ پر رکھدیا تسکین ہوگئی اور سو گئے جب نماز صبح کا وقت قریب آیا تو آپنے فرمایا "قم یا نوماں"، یعنی اے بہت سونے والے اٹھ"

۵۳۰ عبود دفعتہ عین وقت بیدار معصوم ایک حبشی غلام تھا جو سات سال تک سوتا رہا اور سب سے پہلے بہشت میں داخل ہوا سبب یہ ہے کہ اس زمانہ کے پیغمبر کو انکی اُمت نے ایک کنوئیں میں بند کر دیا تھا عبود

بعض تاریخین

میر عبد الجلیل کو تاریخ گوئی مین بڑا ملکہ تھا۔ ان سے سنکر اس فن کی ابتدائی تاریخ آزاد نے سبحۃ المرجان مین درج کی ہی۔ ان کے دائرہ تاریخی کا ذکر اور اُسکے متعلق شیخ غلام نقش بند کی ستایش بیشتر حوالہ قلم کر چکا ہون یہان صرف چند تاریخین جو خوبی فن اور لطافت محاضرات کے لحاظ سے قابل لحاظ ہین نقل کی جاتی ہین۔

تہنیت فتح یا جلوس مین بارگاہ شاہانہ مین پیش کی گئین۔

سلطان اورنگ زیب عالمگیر نے جب ۱۳ ذی قعدہ سنہ ۱۱۱۱ھ (۲۲ اپریل سنہ ۱۷۰۰ء) کو مرہٹون کو شکست دیکر قلعہ ستارہ گڈھ[۵۳۲] (واقع دکن) فتح کیا تو اُسی شب مین میر عبد الجلیل نے عربی و فارسی و ہندی مین یہ تاریخین گیا۔

اُس پر ایمان لایا اور عام قوم سے چھپا کر اُن کی خبرگیری و خدمت کرتا رہا صاحب قاموس نے اس کا پورا قصہ مادہ شب میں ذکر کر دیا ہے

۵۳۱ اور ہر ایک واما سے بڑھ کر دوسرا دانا ہے (جز ۱۳ سورہ یوسف ع ۹-۳)

۵۳۲ ستارہ ریاست ستارہ۔ اسی ضلع کا صدر مقام صوبہ بمبئی مین) دریای کرشنا اور دینا کے اتصال پر واقع ہے۔

ستارہ کا مضبوط قلعہ ایک چھوٹے سے ڈھالو مگر سنگلاخ کوہچہ کی چوٹی پر نصب کیا ہوا نظر آتا ہے ہندو مورخین لکھتے ہین کہ اسکا نام ستارہ، اسکی سترہ (۱۷) دیوارون، برجون اور پھاٹکون کے شمار و ساخت سے پڑا تھا جو اُن کی تحریر کے مطابق اس قلعہ مین تھے

مسلمانون کا پہلا حملہ دکن پر سنہ ۱۲۹۴ء (سنہ ۶۹۳ھ) مین ہوا تھا۔ دیوگری کا یادو خاندان سنہ ۱۳۱۸ء (سنہ ۷۱۸ھ) مین برباد ہوا تو مسلمانوں کا تسلط بخوبی ہو گیا۔ سنہ ۱۳۴۷ء (سنہ ۷۴۸ھ) مین بہمنی خاندان نے عروج پایا سولھوین صدی کے آخر مین بہمنیون پر زوال آیا اور ہر سردار نے خود ذی اختیار بن بیٹھا حتی کہ سلطنت بیجاپور قائم ہوئی جسکے تحت مین مرہٹون نے بڑھنا شروع کیا۔ ستارہ مع اضلاع پھلٹن، پونا اور شولاپور کے مرہٹون کی قوت کا مرکز بن گیا ستارہ اور اُس کے متصل کے قطعات کو دکن مین مرہٹون کی تاریخ کے بہت سے اجزا، اور اُن کی اعمال و افعال، وقوع پذیر ہوے ہین سیواجی کو پہلے پہل اس طرح شہرت نصیب ہوئی کہ اُس نے جاولی (متصل مہابلیشر) کے راجہ کو قتل کر ڈالا اور واسوتا کا زبردست قلعہ اور جاولی کو فتح کر لیا۔ سنہ ۱۶۵۶ء (سنہ ۱۰۶۶ھ) میں

لکھیں اور رسالہ ترتیب دے کر بادشاہ کے حضور میں پیش کیں اور خسروانہ تحسین کے مورد و مستحق ہوئے۔ رسالہ کا نام گلزار فتح شاہ ہند۔ طوطی نامہ فیروزی شاہ عالمگیر رکھا تھا خوبی یہ ہے کہ ان دونوں ناموں سے بھی تاریخ ۱۱۱۱ھ برآمد ہوتی ہے پہلی تاریخ عربی کی اور دوسری فارسی کی تقریباً ایک ہیں۔ ان کا اختراع صنعت تعمیہ کے عجائبات میں شمار ہوتا ہے

فی العربیۃ ؎

لمّا توجّہ سلطان الانام الی ۔۔۔ دکّ السموات فی تائید اسلام
اقرانہامہٗ فی اصل خصرہٖ ۔۔۔ لورد یا قادر افتاح اکمام
فصار حین افتتاح الاسم مفتتحا ۔۔۔ حصن لمن عبّہ و احجار اصنام

سیواجی نے پرتاپ گڈھ کا مشہور و مضبوط حصار تعمیر کیا جس پر بادشاہ بیجاپور نے بسرکردگی افضل خان مرہٹوں کے استیصال اور اس قلعہ کے فتح کرنے کیلئے فوج بھیجی سیواجی مشاورت و مصالحت کے حیلے سے قلعہ کی دیوار کے نیچے افضل خان سے ملاقی ہوا اور اُس کو اپنے مشہور خنجر "داگھ نکھ" (ناخن) سے ہلاک کر دیا فوج منتشر و پریشان ہوگئی۔ ۱۶۷۳ء (۱۰۸۴ھ) میں اُس نے ستارہ فتح کیا۔ راے گڈھ میں اپنی آزاد بادشاہی کی راجدھانی قائم کی ۱۶۷۴ء (۱۰۸۵ھ) میں تاج پوشی کی رسم ادا کی ۱۶۸۰ء (۱۰۹۲ھ) میں اس نے وفات پائی۔ سنبھاجی جانشین ہوا ۱۶۸۹ء (۱۱۰۰ھ) میں اورنگ زیب نے حملہ کر کے اُسکو گرفتار کرا کے قتل کرا دیا۔ عالمگیر کی سیل رواں طاقت کو کون روک سکتا تھا۔ اُس نے ۱۷۰۰ء (۱۱۱۱ھ) میں قلعہ ستارہ بھی فتح کر لیا اور مرہٹوں کو شکست فاش دی ۱۷۰۷ء (۱۱۱۹ھ) میں اورنگ زیب نے وفات پائی

پیشوا کی لڑائی کے اختتام کے قریب خفیف مزاحمت کے بعد ستارہ انگریزوں کے قبضہ میں آگیا مگر فاتحین نے اسکو مع قطعات متصلہ کے پھر سیواجی کے خاندان کے قائمقام کے حوالہ کر دیا ۱۸۴۸ء میں اخیر راجہ کی وفات اور اولاد نرینہ نہ چھوڑنے پر یہ ریاست بحق سرکار برطانیہ منضبط ہوگئی

شہر ستارہ کی آبادی بھی روبہ زوال ہے ۱۹۰۱ء میں چھبیس ہزار کے قریب تھی ۱۹۲۱ء میں ۲۲۴۵۴ رہ گئی۔ یہ قلعہ جس پہاڑی کے دامن میں آباد ہے ۱۸۹۲ء میں اسکا ایک حصہ ایک کوچہ سے الدوس مکانات کا تھا جس میں کچھ مکین تھے اور کچھ حشمت بخش نے رنج کی شکست کے بعد رفتہ رفتہ آبادی میں زوال شروع ہوگیا۔

نظرت في الآفاق وهي أربعة — من فوق إبهامه من عبد إبهام

وحدتهن لعام الفتح حينئذ — رقما على سنة من مد إبهام

لله تلك يد بيضاء قد نزعت — للناظرين فيا المعجز الساري

هذا التاريخ من التاريخ إشاعة — عبد الجليل بتائيدات إلهام

اہل اوراد کا داب و دستور یہ ہے کہ جب اناملِ پوروں کا شمار کرنے لگتے ہین تو خنصر انگشت سبابہ کی جڑ سے ابتدا کرتے ہین میر صاحب نے ابہام (انگوٹھا) کا خنصر کی جڑ مین ٹھہرانے کا ارادہ کیا ہے جس سے تاریخ کی خوبی اور بھی بڑھ گئی ہے یعنی اس سے سنہ کی صورت پیدا ہو جاتی ہے پھر رقم کے الف اس پر درج کر لیجیے جیسا کہ اکثر نسخ نویسان کا معمول ہے۔ رقما علی سنۃ من مد ابہام مین اسی طرف اشارہ ہے۔ اس مین شک نہاین کہ یہ تاریخ بہترین قسم کی ہے جو تری عرق ریزی جوض سے کسی کو مل سکتی تھی اگر اسکے حسن کو اشعار مین بھی ظاہر نہ کر دیا ہوتا تاہم اس کی خوبی و شان و جدت اختراع روشن تھی۔

اسی کے ہم مضمون اور ہم شکل ذیل کی فارسی تاریخ مین جو انگلیون کی شکل سے نکالی ہے ایک جدت آفرینی کی ہے اور بکمال طباعی و ذہانت دکھائی ہے ؎

چو شہ ابہام زیر خنصر آورد — بورد اسم اعظم در شمارہ

قلاع کفر شد مفتوح فی الحال — ز تیغ او عدو شد پارہ پارہ

ز انگشتان شہ بر مد ابہام — برابر چار الف کردم نظارہ

بعینہ بود شکل سال ہجری — پئے تاریخ تسخیر ستارہ

چنین تاریخ گفتن اختراع است — شد از عبد الجلیل این آشکارہ

اس نوع کی تاریخ کو استنباط[۵۳۳] کہتے ہین۔ اعداد کی صورت مین سال تاریخ بیان کر دی ہے یعنی بادشاہ کی چارون انگلیون کو چار الف تصور کیا کہ جس سے اعداد سال ہجری یعنی گیارہ سو گیارہ

آثار گذشتہ مین صرف راحہ کا محل باقی ہے جس مین اب جج صاحب کی کچہری ہوتی ہے۔

۵۳۳ میر حمزہ اسکندر نے بھی خواجہ محمد کی وفات کی تاریخ (صوری و معنوی) اسی پیدا کر کی تھی یعنی مرتسمہ احاد و عشرات و مأت کے روائق مصرع دوسرا رقم ہے۔ مایہ موسی حب و کے ہندسے کو تین بار لکھا جاوے تو نو سو ساٹھ ہوا یعنی صد و نود دوم ۔ دوسرا مصرع ہے کہ مصرع کے اعداد حس کے حساب سے بھی وہی ہوتے ہیں ہندی کو کسی طرح ہندسہ نود مضمون کہ بیان اس قدر خوب اکثر ہو [illegible]

کی صورت پیدا ہوئی اور ابہام (زانگشت) کو سہ کی شکل مانا کہ جس پر وہ چاروں الف مرقوم تھے۔ اس تاریخ فارسی نے عربی تاریخ سے بھی زیادہ شہرت وقبولیت پائی۔

ایک اور تاریخ تعمیہ کے ساتھ یہ ہے ؎

چو شاہ عالمگیر آفتاب عالم تاب | کہ تیغ اوست بگیتی کلید فتح الباب
ستارہ قلعۂ کفار را محاصرہ کرد | بعزم آنکہ نماید بنائے کفر خراب
چنان بزلزلہ آمد زمین زہیبت او | کہ کوہ گشت چو دریا و قلعہ شد گرداب
چو فتح شد، پی تاریخ فکر می کردم | برآمد از تہ دریائے فکر دُرِ خوش آب
چو از درون ستارہ چنود شرک برفت | طلوع کرد درو آفتاب عالم تاب

یعنی لفظ "ستارہ" کے اعداد سے "چنود شرک" کے اعداد خارج کر دیجیے اور "آفتاب عالم تاب" کے اعداد شامل کر دیجیے تو تاریخ فتح بے تکلف برآمد ہو گی

یہ ایک قطعہ ہے جس سے چار مرتبہ تاریخ نکلتی ہے ؎

چو محی الدین محمد شاہ غازی | ستارہ فتح و موداراستارہ
رقم کردم زکلک فکر بیتے | کز و شد چار تاریخ آشکارہ
بود ہر مصرعہ اش تاریخ منقوط | ہمان عاطل ہمان شد در شمارہ
محمد شہ اساس سطح راکند | برآمد باطل از حصن ستارہ

آخر کے دونوں مصرعوں سے از روئے حساب جمل جداگانہ تاریخ برآمد ہوتی ہے اور اگر اس شعر کے حروف منقوطہ یا غیر منقوطہ کو لیجیے تو بھی وہی تاریخ نکلے گی۔

بطریق تعمیہ یہ تاریخ بھی ہے ؎

جشن سہ بارہ گیر بہ فتح ستارہ گڑھ | نظارہ کن جوانب و اطراف بوستان
این بیت را بہ تعمیہ گیرد اگر کسے | تاریخ بالفظ شود از لفظ او عیان

یعنی لفظ جشن کو اگر تین بار حساب کیا جائے تو اس سے ۱۰۵۹ حاصل ہوتا ہے بوستان کے اطراف

'ے'، 'د' 'ون' ہین کہ جن کے اعداد دو اور پچاس ۵۲ ہوتے ہین مجموعہ ایکہزار گیارہ ہوا جو تاریخ کا عدد ہے اور مادہ تاریخ الفاظ جبن 'ب ون' ہے کہ ان میں سو سہرا ایک منقوط ہو

تاریخ سہ جیزہ ذیل بھی بطور تعمیہ ہے ع

چو سیوا و سنبھا و رانا بہ گیتی | تاریخ شہنشاہ گشتند پارہ

الف ہای این راجہ ہارا بیک جا | نوشتیم تاریخ فتح ستارہ

یعنی ایک الف اسم سیوا اور ایک الف اسم سنبھا و دو الف اسم رانا کہ جن کا مجموعہ چار الف ہوتا ہے جب یکجا لکھے جائین تو سال ہجری کے اعداد یعنی ۱۱۱۱ کی شکل پیدا ہوگی۔

فتح بسنت گڈھ کی پانچ تاریخین لکھی تھین۔ انشای جلیل مین چار نقل کی ہین۔

نثر عربی مین صَادَ دِیَارُ الکُفرِ مَکَانَ الاِسلَامِ

نظم عربی ع

جَاھَدَ السُّلطَانُ بِالوَجہِ الاَتَمِّ | صَادَ دَارُ الکُفرِ طَمسًا بِالیَقِینِ

قُلتُ لِی تَارِیخَ ھٰذَا الاِفتِتَاحِ | مُحَمَّدٌ نَصرُ اللّٰہِ وَالفَتحُ المُبِینِ

نثر فارسی فتح بسنت گڈھ بمدد ایزدی

نظم فارسی ع

شاہ اورنگ زیب عالمگیر | چون کمر از پی جہاد بہ بست

کرد فتح بسنت گڈھ بغزا | سال تاریخ کوہ کفر شکست

میر عبد الجلیل نے فرخ سیر بادشاہ کی تخت نشینی کی تاریخین بھی چارون زبانون مین لکھی تھین۔ آیہ کریمہ یُوتِیہِ مَن یَّشَاءُ سے اس کا استخراج کیا ہے ع

قَد تَوَلّٰی فَرُّخ سیر مُلکَ ھٰذَا | المُعِزُّ عَونَ القَدیرِ اعتِلَاءَ

وَاقتَبَسنَا تَارِیخَہٗ مِن کَلَامِ | صَمَدِی یُؤتِیہِ مَن یَّشَاءُ

ہمروئے شمار و حل حساب ہے سال جلوس ۱۱۲۴ ہجری تھا

مفتاح التواریخ اور بیلیس اورینٹل بیاگرفی کل ڈکشنری مین زمانہ جلوس جنوری ۱۷۱۳ء

سورۃ جس کو چاہتا ہے اس کا وارث بنا دیتا ہے دحرز ۹ سورۃ الاعراف ع ۱۵-۱۵

مطابق ۱۱۲۵ھ لکھا ہے یہ صریحاً غلط ہے فرخ سیر کی تخت نشینی قلعۂ دہلی میں جمعہ ۲۳ ذیحجہ ۱۱۲۴ھ کو ہوئی تھی جو ۹ جنوری ۱۷۱۳ء کے مطابق ہوتا ہے۔ غالباً مسٹر بل نے انگریزی سے سال ہجری بنانے میں غلطی کی ہے۔

خطاب

نواب غازی الدین خان نظام الملک آصف جاہ کو جب شاہ عالم نے صوبہ داری اودھ اور فوجداری لکھنؤ پر متعین کیا اور "خان[۳۵] دوران بہادر" خطاب دیا تو میر عبدالجلیل نے تاریخ عطائے خطاب "خان دوران بہادر" سے نکالی ۱۱۲۴ھ

ولادت

میر سید نور الحق خلف الصدق سید العارفین شاہ لدھا بلگرامی کی ولادت از لفظ "بخت مند" ۱۰۹۶ھ

میر غلام نبی میر صاحب کے خواہر زادے[۳۶] بلگرام میں ۲ محرم ۱۱۱۱ھ (۲۰ جون ۱۶۹۹ع) کو تولد ہوے میر صاحب اسوقت اُردوے عالمگیری کے ساتھ نواحی قلعہ ستارہ میں تشریف رکھتے تھے خبر پہنچی تو تاریخ نکالنے کی فکر ہوئی۔ اسی خیال میں سو گئے عالم رویا میں بچہ کی صورت نظر آئی زبان سے کہہ رہا تھا ع نور چشم باقر عبد الحمیدم۔ بیدار ہونے پر اعداد کا شمار کیا۔ پوری تاریخ تھی تین مصرعے اور لگا کر بحر رمل مسدس سالم میں جو تین بار فاعلاتن ہوتی ہے قطعہ نظم کر دیا ہے

---

۳۵ دولت تیموریہ کے تیسرے امیر تھے جنکو یہ خطاب عطا ہوا تھا مفصل تذکرہ اپنے موقع پر آئیگا۔ خان دوران خواجہ عاصم صمصام الدولہ عبد الصمد خان، بہادر جنگ تھا۔

۳۶ میر غلام نبی۔ علاوہ قرابت کے میر عبد الجلیل کے تلمذ سے بھی شرفیاب تھے میر سید محمد کے بعض خطوط میں بھی انکا تذکرہ ہے اور بڑی محبت و اشتیاق کیساتھ یاد کیا ہے پایان عمر میں نواب صفدر جنگ کے رفقاء و متوسلین میں ہو گئے تھے افاغنہ کے معرکہ میں ۲۲ شوال ۱۱۶۳ھ (۱۷۵۰ع) کو اس خاکدان ہستی کو چھوڑا نعش کانپور میں چلا۔ ہندی میں تخلص رس لین کرتے تھے یعنی رس میں محو، متعدد تصانیف چھوڑی ہیں ... انگ درپن بالخصوص قابل ذکر ہے ہندی شعرا کے تذکروں میں انکا نام ممتاز اور جوٹی کے لوگوں میں ہے ... بھی انکو عزت و اختصاص کی جگہ دیگئی

نورِ چشم میر باقر گفت با من | چون گل نو رستہ دیدم در عالم
سال تاریخ تولد خود بگفتم | نورِ چشم باقر عبد الحمیدم

۱۱۱۱ھ

باقر بایپ کا نام اور عبد الحمید دادا کا تھا اہل وطن کو لکھا کہ یہ مولود مسعود شاعر ہوگا۔ جیسا انہوں نے فرمایا تھا آخر ویسا ہی ہوا۔ میر غلام نبی شاعر غرّا ہوئے نبی تخلص تھا موسیقی اور ساز ہندی میں ماہر کامل تھے۔ میرزا جان جانان مظہر دہلوی فن شعر ہندی میں اُن کے شاگرد تھے۔ میرزا محمد امین ان کا بڑا معتقد تھا۔ غلام نبی کے ہندی اشعار اور غلام علی کے عربی قصائد سُنکر نہایت محظوظ ہوتا تھا اور یہ قطعہ نظم کیا تھا ؎

درین زمانہ کہ ارباب فضل کمیاب ست | ز بلگرام دو شخص اند در سخن اُستاد
یکے امام زمان سیّد غلام علی | کسے بہ شعر عرب مثل او ندارد یاد
دگر جہان ہنر سیّد غلام نبی | رسا ند نظ ست او شعر ہند را بمراد
نگاہدار الٰہی ہمیشہ ایشان را | بمُرسَلِ عَرَبیٌّ وَ آلِہِ الْاَمجَادِ

میر عبد الجلیل کو اسد کی ذوالشان کی تعمیل میں کبھی دریغ نہ ہوتا تھا۔ سیّد محمد دتن ساکن سانڈی کے یہاں لڑکا پیدا ہوا جس کی میر سیّد محمد رسا ندوی نے اطلاع دی اور تحریر قطعہ تاریخ کے لئے استدعا کی۔ چنانچہ یہ تاریخ تولد اُن کو لکھ بھیجی گئی ؎

حق تعالیٰ بہ محمد روشن | پسرے داد سعادت میلاد
سال تاریخ چو جستم ز خرد | گفت از دیدۂ چشم پدر روشن باد

سنہ ۱۱۲۶ھ

متعلق وفات

میر سید مبارک محدث بلگرامی ؎

مقدس گہر میر سید مبارک | چو عزم مود در بحر رحلت ستناہ
پئے رحلت آن مطہر سرشت | خرد گفت تاریخ رضوان پناہ

سنہ ۱۱۱۵ھ

سید عربی بلگرامی اور میر سید احمد (بن سید بدہ) بلگرامی نے ایک سال میں رحلت فرمائی دونوں کی

تاریخ بھی ایک ہے ؎

میر سید احمد آن بحر سخا — مولوی سید عربی دین پناه
ہر دو زین گلشن سرائے بی بقا — تا بہ فردوس سفر کردند راه
عالم اندر دیدہا تاریک شد — مردمک پوشید رخ، ہم سیاه
تا قیامت از دل پرشور خلق — ہر مزار ہر دو سوزد شمع آه
خواستم از بہر شان تاریخ سال — گفت ہاتف ہر دو خلد آرامگاه
۱۱۱۷ھ

سید محمدی بلگرامی اور قاضی محمد حافظ بلگرامی کی مشترک تاریخ ہے

چون میر محمدی و قاضی حافظ — بردند بیک سال سوی جنت راه
گفتند رضوان الٰہی واصل — ہاتف تاریخ گفت، رضوان الله ۱۱۲۳ھ

بندگی سید محمد حسن بلگرامی ایما تخلص جوان نازک و نازنین تھے۔ دھول پور کی لڑائی میں جو عالمگیر کی رحلت پر شاہ عالم اور اعظم شاہ کے مابین ۲۰ ربیع الاول ۱۱۱۹ھ (۱۰ جون ۱۷۰۷ء) کو ہوئی یہ شاہزادہ عظیم الشان بن شاہ عالم کے ساتھ تھے اور ان کے باپ سید محمد اشرف درگاہی شاہزادہ محمد اعظم کے نوکر تھے۔ شاہ عالم فتحیاب ہوا لڑائی سے فارغ ہو کر ۲۱ تاریخ کو سید محمد حسن قیامگاہ پر پہونچے ہتھیار سب بدن پر سجے ہوئے تھے۔ گرمی اور تابش آفتاب اور حرارت موسم کی تاب نہ لا سکے خیمہ پر آتے ہی رفقا سے کہا کہ میرے سلاح اتار لو۔ اب تاب و طاقت باقی نہیں رہی، سیدھے سیدھے لیٹ گئے اور چراغ حیات گل ہو گیا۔ تجہیز و تکفین کر کے دھول پور کے دروازہ پر دفن کر دیا جب آمد و رفت کے لئے راہ کھلی تو سید درگاہی لڑکے سے ملنے گئے وہ جوان مرگ زیر خاک تھا۔ رنج و الم کیا بے سود تھا میر عبد الجلیل نے تاریخ رحلت آیۂ کریمہ انما اشکوا بثی و حزنی الی الله میں پائی (سو بیتابی اور رنج تکلو ہے اسکی فریاد خدا ہی سے کرتا ہوں جز ۱۳ سورۂ یوسف ع ۱۰-۸۶) اور بد نصیب باپ کو لکھ کر بھیجدی

اورنگ زیب بادشاہ کے تولد کی تاریخ کلیم کاشانی نے آفتاب عالم تاب بتعمیہ نکالی تھی

جب بادشاہ تخت سلطنت پر چالیس سال کی عمر میں بیٹھا تو تاریخ جلوس خود "آفتاب عالمتاب" نکالی اور جب نوے سال کے سن میں رگرائے عالم بقا ہوا تو میر عبدالجلیل نے تاریخ رحلت وسنے آفتاب عالمتاب نکالی نے بفتح قالمعنی سایہ زوال آفتاب ہے

انتباہ اشتباہ

ریزہائے نبات والی بارش کی رباعی

فرخ سیر آن شہنشۂ بابرکات | چرخ از ادب او شدہ بے حرکات
و رسند ز یمن عہد عشرت مہد ش | بارید سحاب ریزہ قند و نبات

کی نسبت نواب حاجی سید جعفر علی خان، خلاصۃ المفتاح میں لکھتے ہیں و تعجب ست کہ دریں مصرع تاریخ ہم باشد چرا کہ اعداد مصرع ۱۱۲۳ھ می شوند نواب صاحب ایک کہنہ مشق تاریخ گو تھے اس لیے اُن کی نگاہ زود رس اس مصرع کی معنوی خوبی اور تاریخی احتمال پر پہونچ گئی لیکن کوتاہ بین سیرت نویس اس امر سے قطع نظر نہیں کرسکتا کہ واقعہ عہد فرخ سیر کا ہے جو خود ذیقعدہ ۱۱۲۴ھ میں تخت نشین ہوا تھا اس لئے اس کا زمانہ ۱۱۲۵ھ یا ۱۱۳۱ھ ہونا چاہیے۔

قصیدہ فتح آگرہ

نکوسیر ابن محمد اکبر خلد مکان قلعۂ آگرہ میں محبوس تھا ۱۱۳۱ھ ۱۷۱۹ء میں صفی خان قلعدار اور ہزاری متر سین وغیرہ دیگر واقعہ طلبان نے اسکو قلعہ سے نکال کر تخت پر بٹھا دیا تھا۔ امیر الامرا حسین علی خان دہلی سے لشکر جرار لے کر آگرہ پہونچا اور تین ماہ سے زائد محاصرہ کر کے رمضان میں قلعہ کو فتح کیا۔ میر عبدالجلیل نے اسپر یہ قصیدہ[۳۷] لکھا۔ نواب پانچ ہزار روپیہ اور خلعت و اسپ اس کے صلہ میں باصرار دیتا رہا لیکن میر عبدالجلیل نے صلہ لینا کسی طرح گوارا نہ کیا۔ ـــ ہ

مژدہ اے دوستان کہ در عالم | نقد دست نسیہ بہار ارم

---

[۳۷] نواب سید صدیق حسن خان نے بھی اس قصیدہ کا ذکر اپنے تذکرہ شمع انجمن مطبوعہ ۱۲۹۳ھ میں کیا ہے۔

نونهال طرب ببار آمد | گل فشان گشت خاطر خرم
دل خوشی نشئه رسا بخشید | به گل و سبزه و بهار قسم
باغ از بس شگفتگی پر کرد | ساغر گل ز باده شبنم
ابر دامن کشان خرامان است | برق رقصان و رعد گرم نغم
نوبهار از برای رسم نثار | هر طرف از شگوفه ریخت درم
که امیر سعید آمد اسرا | کرد تسخیر قلعه اعظم
این ظفر از سواب عظمی است | بر زبان واجب است ذکر نعم
پسر اکبر آنکه در افواه | یافت نیکو سیر بنام علم
بود در حصن آگره محبوس | همچو منهوم ممتنع ز طعم
داشت عیشی و کنج عافیتی | خاک آسوده تر ز صید حرم
ناگهان نفس شوم راهش زد | خفیه آمیخت در طعامش سم
دید اسباب بغی آماده | استمالات رقم پرو زد نم
زر بسیار و زمره اوباش | لشکر آرا و قلعه محکم
ابروی فتنه زه نمود کمان | زلف آشوب گشت خم در خم
او بدر داشت ارث بغی از آن | فتنه انگیخت در کمال عظم
کرد پرویزنی ز چنبر سر | بیخت بر فرق خود غبار الم
چون برید این خبر به دهلی برد | شعله زد خشم دادگر عالم
خسرو دین پناه شاه جهان | آب و رنگ بهار فضل و کرم
آن ابوالمجد والعلا ذوالجود | مسند آرای چار بالش جم
بنده اش کیقباد و کیکاوس | نوکرش گیو و بیژن و رستم
بخشی الملک را اجازت داد | تا کند لشکر ظفر ترتیب

آن امیر جماعۂ امرا ۔۔۔ چون حسین علی بہر بر شیم
قرۃ العین حیدر کرار ۔۔۔ نخبۂ نسخۂ بنی آدم
خلف الصدق مؤتمن الاشبال[۳۸] ۔۔۔ پیش او شیر بیشہ کم ز غنم
جود او شہرۂ دیار عرب ۔۔۔ تیغ او ضابط بلاد عجم
ناز دارد نسبتش شمو نسب ۔۔۔ بالد از ہمتش علوِ ہمم
می کند با سماعۂ دل ریش ۔۔۔ لطف او آنچہ می کند مرہم
غوطہ در جود او زند دریا ۔۔۔ لطمہ از دست او خورد ضیغم
ہست مقیاس جود او بہ سحاب ۔۔۔ مثل مقیاس فربہی بہ ورم
در فن صرف ہمتش نبود ۔۔۔ ذکرے از لا و از لن و از لم
در صف جنگ با سر اعدا ۔۔۔ چون الف گشتہ تیغ او الرم
دشنہ و نیزہ اش بجان عدو ۔۔۔ می کند کار عقرب و ارقم
تیغ او شد بہ فرق اعدا غرق ۔۔۔ ہمچو حرفے کہ می شود مدغم
در دل خصم او در آید رمح ۔۔۔ چون در آید بہ اہل خود محرم
پالہنگش سر عساند او ۔۔۔ مثل دلوے است با رسن منضم
ظفر از فوج او شود پیدا ۔۔۔ فتح با تیغ او بود توام
کرد نہضت بدولت از دہلی ۔۔۔ فضل حق ہم عنان ظفر ہمدم
لشکرے در حساب بیش از حصر ۔۔۔ دیو از نعرۂ یلان در رم
ہمہ زور آوران فیل شکوہ ۔۔۔ کہ بہ شیر ژیان زدندے بم

[۳۸] مؤتمن الاشبال یعنی پسر رید شہید کا لقب ہے جو امیر الامرا حسین علیخان ممدوح، اور میر عبد الجلیل (مادح) دونوں کے جد اعلیٰ تھے۔ مؤتمن امین کرنے والا۔ اشبال جمع شبل بچہ شیر یعنی شیر کے بچوں کو یتیم کرنے والا۔ آپ شیر کا شکار اکثر کیا کرتے تھے اسلئے اس لقب سے مشہور تھے۔

گرد اسپان فوج نصرت موج / دامن افشان برین بلند خیم
آمد و قلعه را محاصره کرد / همچو انگشت در حلقهٔ خاتم
شرح اسباب قلعه گیری سخت / شرمهٔ عجز در گلوی قلم
چون نهنگان به دور گرد آبے / توپ ها گرد قلعه ها جمع بهم
خصم را سوخت توپ شیر دهان / کس ندیده است شیر آتش دم
اژدهائے ست توپ شبازی حال / کرد سرهند وان نمود لقم
چه نویسد ز توپ قلعه کشا / آسمان از تلاشش هست علم
تا برآید به قلعه نصرت / سنبه گردید فوج را سلّم
هر طرف شد مرتب ارساباط[49] / زخمه بهر دشمنان دژم
زان طرف هم مخالف سرکش / گوشمشے داشت در ثبات قدم
دست و پا زد درون قلعه بسے / چون جنینے که وا جهد به شکم
کرد اسقاط این جنین آخر / صدمهٔ توپ هائے مستحکم
کار بر اهل حصن شد دشوار / مرگ مقطوع، زندگی مبهم
قلعه شد بر جماعهٔ اعدا / از مصیبت چو حلقهٔ ماتم
شد برون آمدن چنان دشوار / که سخن از زبان اهل بکم
از درون هم ره رسد شد بند / چون نفوذ دم انگشتش صمم
از سر عجز خواستند امان / با لب خشک و دیدهٔ پرنم
از ترحم به جان امان بخشید / وقت قدرت خوش ست ترک نقم
فتح قلعه بزور تیغ نمود / این چنین می کنند اهل همم
شد سیه طالعے ز قلعه برون / همچو از لفظ دائره آدم[50]

---

[49] ساباط وہ سقف جو دو دیواروں کے اوپر ہو اور جس میں ہو کر راہ چلتی ہو۔ اسی کا پورا مرادف کلمہ انگریزی میں "کاریڈور" ہے۔
[50] اس شعر میں "ادم" سے مشہور مصرعے کی تلمیح ہے "کشد تنگ چنان نقش آن دہن پرکار / کہ دور

این مثنی کشو نیز لسرت او — ورنہ این عقدہ بود جذر اصم[541]
شاد گشتند دوستان یکسر — عام شد عیش در صنوف امم
شرح سال مناقبان گویم — کہ بہ آن جو حذیفہ ام اعلم[542]
مرحی انفعال روے سیاہ — خوش خضابے است از حنا و کتم[543]
محمد الله واهب الآلاء — حمد مستظہر بما النعم
گن گتھن کی سکت کہاں پاؤ — رمنان سے ئے جو اینک جسم

دائرہ مرکز ت گرد قرار۔ دائرہ کا دور وال اور ہا میں اور اُس کا مرکز یا مرادف ۔ ام ۔ حے دال اور میم ۔ اسم۔ کے اندر قرار پا جائیں تو ادہم ہو جائے گا ادہم لغت میں سیاہ کو کہتے ہیں قلعہ سے سیاہ طالع کا کلنا گویا ادہم کا دائرہ سے نکلنا ہے تنگ ہونے کی رعایت سے قلعہ اور دائرہ میں تشبیہ لطیف پیدا ہو گئی ہے

۵۴۱ لغت میں جذر ۔ اصل کو کہتے ہیں اہل حساب کی اصطلاح میں ۔ عدد ، ہوتا ہے جس کو اپنے دل میں مان کر ضرب دیا جائے ایسے عدد کو جذر کہتے ہیں اور اسکے حاصل ضرب کو مجذور ۔ اصم لغوی معنی بہرا یا بالکل بہرا سخت ہیں ... عدد کا جذر عدد صحیح ہو وہ حساب کی اصطلاح میں اصم کہلاتا ہے ۔ مثلاً ۹ اسکے مقابل کو ... کہتے ہیں مثلاً ۹ عدد مطلق کا جذر بسہولت حاصل ہو جاتا ہے ۔ ... کا جذر میں عدد اصم کا جذر ہمایت دشوار ہے ... صحیح نہیں ہو سکتا مگر قریب قریب سا پایا جاتا ہے ۔ اسی لیے حکما نے اپنی مناجات میں کہا ہے
سبحان من لا یعرف ... الا هو

علم معقول میں جذر الاصم ، ایک مشہور مغالطہ ہے جس کا واضع ابن کمونہ بغدادی تھا ۔ علامہ تفتازانی شرح مقاصد میں فرماتے ہیں وهذه مغلطة تحيرت فيها عقول العقلاء وعجزت عن حلها الاذكياء وتسمى ... الاصم علامہ ممدوح نے شرح مقاصد میں بعد تحریر جوابات کے لکھا ہے لکن الصواب ... الاستغال بالعجز عن الاشكال ۔
میر باقر استرآبادی نے بھی اس بحث کو افق المبین میں لکھا ہے اس کا اختصار یہ ہے گو دلت ... الصواب واصابة الحق من اعترف منهم بالعجز بظاہر حضرت میر باقر کی ... علامہ تفتازانی معلوم ہوتے ہیں ۔
پس ... مطلب یہ ہے کہ اشکال و عدم انحلال میں یہ عقدہ (جذر اصم) کے مثل ہو رہا ہے خواہ علم حساب کا ہو خواہ علم معقول کا خلاصہ یہ کہ ... اور سنگین ہونے کے اعتبار سے لفظ اصم (جسکے معنی سنگ سخت و مصمت کے ہیں)

رمضان الجیدی بولدی بخشی فتح | کلدی بوی آی نیناک ایکی پرم
از پی ہم دو عید گشت پدید | معنی فطر جلوہ کرد اعم[۵۴۴]
ہر طرف مجلس طرب چیدند | آن یک از شعر دیگرے زر حکم
وان دگر از ترانۂ رنگین | چنگ و طنبور کرد با ہم ضم
نغمہ گویان فارسی ز نشاط | کوک کردند زیر را با بم
نغمہ سنجان ہند سر کردند | سپت سُر[۵۴۵] در مراتب سرگم
نغمہ تا چاک دل رفو سازد | زہرہ از چنگ دارد ابریشم
زین ترنم جہان طراوت یافت | زانکہ در جوہرش بود نزدم
شعرا ہم قصیدہا گفتند | انوری گشت پیش شان ابکم
ہر یکے سفت دُرِّ تاریخے | کہ از آب شد گہر در یم
من ہم از باغ معنی رنگین | گل چیندے زدم بفرق قلم
ورق با لباس سینۂ حور | سطر ہا سلک گوہر شبنم

نہایت صاف واقع ہوا ہے (مرزا داد)

۵۴۲ حضرت حذیفہ بن الیمان مشہور صحابی اور محدث اور رسول اللہ صلعم کے صاحب راز تھے حضرت صلی اللہ صلعم نے اُن کو منافقوں کے حال سے پوشیدہ آگاہ کر دیا تھا حضرت عثمان کی شہادت کے چالیس دن بعد ۲۰ صفر سنہ ۳۶ھ (۲۲ جولائی ۶۵۶ع) کو انہوں نے وفات پائی اس شعر میں ممدوح کے ساتھ اپنی محرمیت اور کمال تقرب کا اشارہ ہے

۵۴۳ کتم ایک قسم کی گھاس جس کا خضاب بنایا جاتا ہے یعنی نیل۔

۵۴۴ قلعہ ماہ مبارک رمضان میں فتح ہوا تھا اس لئے دو عیدیں بہم پیش آئیں پہلی عید فتح جس کو عید مجازی کہنا چاہیئے۔ دوسری عید رمضان، جو عید حقیقی ہے۔ اسی طرح لفظ فطر بھی دو معنی میں جلوہ گر نظر آتا ہے یعنی روزہ کا کھولنا اور معنی مجازی میں بھی یعنی فتح۔ یہ بھی دروازہ کا کھولنا ہے

۵۴۵ ہندوستان کے اہل موسیقی نے آواز کے سات مرتبے قرار دیئے ہیں جو سپت سُر کہلاتے ہیں سپت یعنی سات اور سُر یعنی آواز ہر مرتبہ کیلئے ایک نام مقرر کر رکھا ہے اور ہر نام کے شروع سے ایک حرف لیکر اوس سے سرگم بنایا ہے اس شعر میں سرگم سے مراد الحان مراتب سبعہ سے ہے۔

شعر گر فضل من نہ پوشید ے | می شدم در فن سخن قدم
گر بہ پرسی ز جامعیت من | میر خسرو دہد جواب نعم
کرد عبد الجلیل در تاریخ | "قلعۂ آگرہ گرفت" رقم
بردعا بہتر است ختم سخن | کہ بر آمین کنند بابک معظم[1]
چار چیزش نشاط افزا باد | تا بود سبزہ در چمن خرم
دست زر پاش و تیغ اعداکش | عمر ممدود و دولت ادوم

امواج الخیال

یہ مثنوی آپ نے اپنے وطن بلگرام کی تعریف مین عنفوان جوانی مین لکھی تھی یہی وجہ ہے کہ آپ میر صاحب کے کلام موخر کے مقابلہ مین بڑا زور ہے۔ اس مین ایک طولانی مات موسیقی ہندی کے نام سے ہے جسمین تمام قواعد واصول و فروع اس فن لطیف کے بیان کر دیے ہین یہ مثنوی طبع نہین ہوئی اور کمیاب ہے ؎

آب و گل من کہ فیض عام است | از خطۂ پاک بلگرام است
سبحان اللہ چہ بلگرامے | کوثر کے و آفتاب جامے
خاکش گل نو بہار عشق است | آبش مئے بے خمار عشق است
ازعشق سرشتہ ایزد پاک | از روز ازل خمیر این خاک
ہر لالہ کزین دیار روید | تخم دل داغدار روید
ہر گل کہ دمیدہ است زین خاک | خونین جگرے است پیرہن چاک
نرگس نہ بود بصحن گلزار | منصور بر آمدہ است بر دار
گل با سنبل بہم در ان خاک | آویختہ بسلسلہ فتراک

[1] یعنی علم بالاسم جس پر نشان کر دیا گیا ہو

خورشید از آن بهار نیرنگ | پژمرده گلی است باخته رنگ
سنبل به چمن بود بصد ناز | زنگی بچه‌ای کمند انداز
از فیض هوای آن گلستان | سرسبز شود نفس چو ریحان
ز آتشکده سبزه می‌زند جوش | همچون خط یار از بناگوش
تا شد چمنش به دیده محسوس | شد پردهٔ چشم بال طاووس
تا بست نقش که عیش بار است | چون گرمی عشق سازگار است
گرمی آنجاست مایهٔ زیست | گویی که حرارت غریزیست
سرما چو در آن مقام آید | عنقای هوا بدام آید
هر دود که از جگر کند گل | افسرده شود چو شاخ سنبل
چون موسم برشکال آید | حسنش بحد کمال آید
جولان سحاب شوخ و طناز | چون خیل پری بود به پرواز
درویش هوا بسی نفس سوخت | تا خرقه رقعه رقعه دوخت
در نشئهٔ ذکر جهر شد مست | تسبیح هزار دانه در دست
شاهنشه تکیه تاز برسات | ساغرکش نشئهٔ مباهات
نقاره نواز حشمت خویش | مشکین علم سحاب در پیش
از برق نموده تیغ خون ریز | وز ابر سیه سپر دلاویز
ترکش ز تقاطر بهارین | وز قوس قزح کمان رنگین
تا رودی زمین به دست آرد | بر فوج خزان شکست آرد
بارید به ریزه ریزه باران | گرده ورق نشاط افشان
نقشی است از این بهار مرغوب | طل ممدود مار مکوب
هر سو صنمی کرشمه پرداز | از نوک نگه جگر رفوساز

تا پائے گمان کمند کاکل — سرمست نگاہ پُر تغافل
تا در تتق حیا نشستہ — حق از مژہ بہ نگاہ بستہ
صفہائے مژہ بہ ترکتازی — مشغول نبرد نیزہ بازی
قدّے و نہال جلوہ نو خیز — حُسنے و بہار غمزہ گل ریز
از چین جبین نا تخمیر — دریائے نگاہ بستہ زنجیر
از واشدن گلِ تبسّم — در خون شفق طپیدہ انجم
از سینہ رُسنان کہ خوش بہارست — مینا فی صبح و اغمد ارست

فُقرائے دار السّلام بلگرام کی مدح مین لکھتے ہین سہ

از فرقۂ طالبان مولے — رنگینی بزم وصف ادلے
وحدت نگہان کثرت آثار — از بادۂ نفی عبر سرشار
اطوار وجود دیدہ یکرنگ — حیرت بنگاہ کردہ ہم سنگ
میناشکنان بزم ہستی — مدہوش شراب حق پرستی
دِل کردہ ز بہر بار خود فرش — اَلرَّحْمٰنُ عَلَى الْعَرْشِ اسْتَوٰى
طے ساختہ وادیٔ شریعت — جا کردہ بہ منزل حقیقت
وا کردہ نظر حُسن جا دید — از دیدۂ سرمہ سائے توحید
سرگرم طواف کعبۂ دل — قُربانی نفس کردہ بسمل
تا یافتہ گنج کُنت کنزا — دادہ دل و دین زکوٰۃ از کے

فُضلائے تہر کی توصیف مین فرماتے ہین سہ

دقّت منشان نکتہ پرداز — در سر سر کوچہ اش سخن ساز
بشگافتہ ہر یکے بہ تحقیق — از دقّت نغز مغز تدقیق

۵۴۷ اَلرَّحْمٰنُ عَلَى الْعَرْشِ اسْتَوٰى ٥ رحمن عرش پر براج رہا ہے (حرہ ۱۶ سورہ طٰہٰ ع ۱ - ۱) استوا اللہ علی العرش کا مسئلہ

برآرد بے خود نمودہ واجب | تنقیح اُصول ابن حاجب
برچشم شمردہ فرض چون دَین | تلویح رموز حکمۃ العین
ابرد بے بیان شان رفیع است | مفتاح معانی بدیع است
ہر بحث کہ دل کند بصد غور | در حیّز حل کشند فی الفور
از منطق شان خطا نفور است | تصدیق بہ حکم شان ضرورست
ہر فرد یگانۂ اماثل | شیرازۂ نسخۂ فضائل
دانائے حقیقت کیانی | اشراقیٔ حکمت یمانی

مثنوی کدخدائی ارشاد خان

ارشاد خان نوّاب امین الدولہ سنبھلی وقایع خوان حضور فردوس آرامگاہ محمد شاہ کا بیٹا تھا۔ امین الدولہ کا ذکر پہلے ہو چکا ہو میر صاحب کو جو اختصاص نوّاب سے بلحاظ تعلقات وخدمت ہونا چاہیے تھا ظاہر ہے حق یہ ہو کہ میر صاحب نے حق محبت اور حق شاعری دونوں اسمین ادا کر دیے ہین۔ مثنوی کمیاب ہی اسکے بعض اجزا میر غلام علی آزاد کے پاس تھے جو خزانۂ عامرہ سے نقل کیے جاتے ہین۔

پان کی صفت مین بر سبیل ایہام ؎

بس سبزی ست برگ پان نکوفال | زبان من بود در وصف آن لال

حمام کی تعریف مین ؎

عطا بخشی این حمام کن گوش | کند مرد برہنہ را گہر پوش
بہ بین در بیت رنگینش بہ انصاف | کہ دارد معنیٔ بس شستہ وصاف

واعتقاد مسلمانون کے مختلف فرقوں میں ہمیشہ سے مختلف فیہ چلا آتا ہی بعض اسکی تاویل کرتے اور استیلا یا قہر سے مُراد لیتے ہیں بعض اسکو بلفظہا مانتے اور تسلیم کرتے ہین پیروان مذاہب ائمہ کا عمل یہی ہے حضرت امام مالکؒ کا قول بلحاظ اس مارہ میں یاد رکھنے کے قابل ہی" الاستواء معقول والکیف مجہول والایمان بہ واجب والسوال عنہ بدعۃ"

دل سنگین پر سوراخ اعدا | بجائے سنگ پا مستعمل انجا
بہم فوارہ وحوض اندستادان | برقص دانہ مروارید رقصان

[دانہ مروارید ایک نوع کا ناچ ہی جو ولایت کی لولیان ناچتی ہین] یہ اشعار بھی ملاحظہ ہون ؎

بدولت پیش آورند فیلے | چہ فیلے در تجمل بے بدیلے
لباس زر بر آن از بس رسا بود | سراپا در نظر کوہ طلا بود
عماری را بہ پشت او ستکو ہے | طلائی گنبدے بالائے کوہے
سوار فیل آن والا مکان شد | بہر جانب دو دستش زر فشان شد
کف نواب زر میریخت پائین | دعا میرفت بالا با صدا آمین
بگرد فیل جمعیت بہ انبوہ | چو شیران بلیہ در دامن کوہ
ز فیلان علم بیش سواری | خرامان پے بہ پے ابر بہاری
بہ پشت فیل مرد نیزہ بردار | سماک رامح از گردون نمودار
صف پیلان پس لشکر بہ انبوہ | کہ پشت فوج را نہا بود بر کوہ

آتشباری کی توصیف مین ؎

ہوائی بسکہ زد از ہر طرف جوش | ہوا شد در عروسی بادلہ پوش
ولہ تا چشم شب را روشنائی | ہوائی شد عجب میل طلائی
بیان چیبر و چرخی کنم چند | درین گرداب زرین شد نگہ بند
ز جنگ آتشین فیلان بہ تحریر | رقم بر یکدگر پیچد چو زنجیر
چنان گردید یک دیگر ستیزہ | کہ اجزائے بدن شد ریزہ ریزہ
بہ یکسو طرفہ دیوان ترش رو | مہیا بہر ہیجا چین بہ ابرو
نگاہ خشم از چشم آفت زہر | نہان در دیدہ شان گردش دہر
درین دیوان سر کش چون نظر کرد | رخ دیو سفید از سہم شد زرد

چنان دجّال رین دیوان رسیده | کہ در پس کوچہ محنت خزیده
بہم افروخت مرکب ز آتش کین | تعجب بین بہم رجم شیاطین

دُلہن کی صفت مین ہے

تُتق از حجلہ زیبا کشادند | عروس شرمگین را جلوہ دادند
چو صبح پاک دامن پاک تخمیر | حیا چون سُرمہ در چشمش وطن گیر
خموشی گوہر دُرج دہن بود | چو غنچہ مجتمع ہر عضو تن بود
چو داماد آن عروس شرمگین دید | بہندُستان نگارستان چین دید
دَرِ گنجینۂ اعزاز بکشاد | ز والا گوہری دل رونما داد
چو وقت آمد کہ آسایش نماید | درے از خرّمی برخود کشاید
بخلوت خانہ باہم درون شد | مپرس از حالت آنجا کہ چون شد
بعید است از بلاغت در نکوئی | کہ حرف پردہ را بے پردہ گوئی
خدا گفتہ است در قرآن لطیف | بجائے جا معوہن باشروہن
ہمین بس شد سخن از حسن تمہید | میان ہر دو صحبت کوک گردید

(کوک بضم کاف کپڑے کے دو ٹکڑون کو باہم بخیہ سے سرسری پیوند کر دینا تاکہ سلنے مین کم و زیادہ نہ ہونے پائے اور سازون کو ہم آہنگ اور آوازون کو موافق بنا دینا۔ صحبت کوک گردید، یعنی موافق ہوئی چونکہ بخیہ بھی سوئی کے ڈالے سے ہوتا ہے۔ اسلئے لفظ کوک یہان نہایت مناسب و برمحل واقع ہوا ہے)

مثنوی طوی محمد فرخ سیر بادشاہ

میر عبدالجلیل کی تمام مثنویات بلکہ تصنیفات مین یہ مثنوی سب سے بڑی اور ایک پوری کتاب ہے۔ منشی نولکشور کے مطبع لکھنؤ مین رجب ۱۲۹۹ھ یعنی جون ۱۸۸۲ء مین اکہتر صفحات پر یہ مثنوی

میر عبد الجلیل بلگرامی" کے نام سے چھپی ہے اور بہ آسانی دستیاب ہو سکتی ہے۔ اگرچہ اسکی کتابت و تصحیح کما ینبغی نہیں ہوئی تاہم اس میں اتنے اغلاط نظر نہیں آتے جتنے اس وقت کی اور مطبوعہ کتابوں میں پائے جاتے ہیں۔ حاشیہ پر حل لغات و مشکلات بخوبی ملکہ بافراط کر دیا گیا ہے جو کہیں کہیں غیر متعلق و بے محل معلوم ہوتا ہے خط معمولی ملکہ جیسا ہے۔ الٰہ آبادی منشی دبی پرشاد معائن مدارس بدایوں اس کی طبع و اشاعت کے محرک تھے

فرخ سیر بادشاہ کی شادی راجہ اجیت سنگھ راٹھور (پسر مہاراجہ جسونت سنگھ) مرزبان جودھپور مارواڑ کی بیٹی کے ساتھ ۲۲ ذیحجہ سنہ ۱۱۲۷ھ (۹ دسمبر سنہ ۱۷۱۵ء) روز پنجشنبہ کو ہوئی تھی۔ یہی آخری راجپوتنی تھی جو مغلی حرم سرا میں آئی۔ یہ قرابت جیسی عظیم الشان تھی ویسی ہی تزک و احتشام سے تقریب بھی انجام دی گئی۔

صاحب سیر المتاخرین لکھتا ہے کہ "وزیر حسین علیخان نے اسباب شادی دختر کا حسب رسوم ہنود سر انجام کیا۔ اس شان و شوکت سے شادی ہوئی کہ ہند اور دکن میں کسی راجہ اور بادشاہ کے عہد میں ہوئی نہ تھی"

---

۱۵ فرخ سیر کے ازواج و اعقاب کے متعلق تفصیل کے ساتھ لکھنا تو ایک تاریخ نویس کا کام ہے لیکن سلسلۂ تحریر میں اسقدر اشارتاً بیان ضروری سمجھتا ہوں کہ فرخ سیر کی پہلی بیگم "فخر النساء" صبیہ سعادت خان تھیں جس کے بطن سے تین بچے ہوئے تھے دو (۱) محمد فرخندہ سیر جہانگیر شاہ (۲) ہمایوں مراد شاہ صغر سنی میں والدین کو داغ مفارقت دے گئے (۳) بادشاہ بیگم جس کا عقد محمد شاہ سے ۹ صفر سنہ ۱۱۳۲ھ سہ شنبہ کی رات میں ہوا اور ملکۃ الزمانی کے لقب سے پکاری جاتی تھی

فرخ سیر کے محل میں ایک پہاڑی راجہ کی لڑکی بھی تھی اُس سے نکاح ہوا تھا وہ سنہ ۱۱۳۱ھ میں محل سرای شاہی میں داخل ہوئی تھی۔ اسکی اولاد کوئی نہیں تھی

ایک اور بات بھی میری نظر سے گذری ہے جس کو سپرد قلم کرتا ہوں۔ "شکار پور ضلع بلندشہر میں قصبہ کے شمال ایک نہایت قابل لحاظ عمارت "بارہ کھمبا" (دوازدہ ستون) کے نام سے مشہور ہے ستون سنگ سرخ کے ہیں اور بہت ضخیم اور بھاری ہیں حتی کہ عامۃ الناس میں یہ خبر شائع و ذائع ہے کہ اسکی تعمیر غیر انسانی ذرائع سے ہوئی تھی۔ انگریز محققین لکھتے ہیں کہ "فی الواقع یہ ایک نامکمل مقبرہ ہے جس کو سنہ ۱۷۱۹ء (سنہ ۱۱۳۲ھ) کے قریب شہنشاہ فرخ سیر کے داماد سید فضل اللہ نے تعمیر کرانا شروع کیا تھا"

سرکاری گزیٹیر کے لکھنے والے اسکی صحت و تحقیق کے ذمہ دار ہیں مجھے اسکے باور کرنے میں تامل ہے فرخ سیر نے اپریل سنہ ۱۷۱۹ء (سنہ ۱۱۳۱ھ) میں تینتیس ۳۳ سال کی عمر میں جان بحق تسلیم کی سنہ ۱۱۳۱ھ میں اسکی عمر تینتیس ۳۳ سال کی رہی ہوگی فضل اللہ کی شادی کب ہوئی؟ شاہزادی کا نام کیا تھا۔؟ کس کے بطن سے تھی تینتیس برس

شب سہ شنبہ ۲۲ ذی الحجہ ۱۱۲۶ھ کو بادشاہ حسن علی خان کے محل پر نواب شایستہ خان کی حویلی پر بارہ دری میں آیا مع امرا و ارکان سلطنت کے آیا عقد نکاح پڑھایا"

فرخ بار دوسرا مصنف منشی مرلی داس کہتا ہے کہ امیر الامرا سید حسین علی خان بعد طے معاملات وزیر السلطنت مصالحت طے کر کے دکن کی جانب روانہ ہو گیا اور حسب قرار داد تھا [illegible] شادی [illegible] ۲ جمادی الاول ۱۱۲۶ھ (۱۶ مئی ۱۷۱۵ء) کو دہلی سے خود شیوراس لڑکی کے لانے کیلیے بھیجا گیا وہ ۵ [illegible] ۱۱۲۷ھ (۵ ستمبر ۱۷۱۵ء) کو دار السلطنت واپس ہو گیا اور ۲۹ رمضان کو شادی ہو گئی"

مجھے اس تاریخ کے صحیح ماننے میں تامل ہے۔ ہم جب اور تاریخ الیسی تم بالستان تقریبات ساتھ نہیں ہوتا ہے یہ ممکن ہے کہ نکاح ذرا ہو ا ہو لو۔ اس کے ساتھ ہی اس تاریخ پر مولانا [illegible] شادی اور اختتام شادی سہ ذی الحجہ میں انجام دے گئی ہوں رحسائی ایران ترجمہ سیر المتاخرین انگلستان لیکن مثنوی سال و ماہ و یوم یا کسی واقعہ کا تعین کرنے سے قاصر ہے وہ حافظ لعات اور [illegible] گورکھ دھندا ہے جس سے کوئی بات نکالنا دشوار ہے سخن شناس [illegible] سید لطف صاحب [illegible] میں ساتق وہین طرز کی رنگین بیانی کے سوا مثنوی نکاح یا کسی اور رسم شرعی یا رواجی کا پتہ نہیں دیتی۔ میر عبد الجلیل نے اس لڑکی کو اندرانی کہکر یاد کیا ہے سیر المتاخرین میں بھی رانی لکھا ہے متوخین اسکا نام

رس کی عمر خسرے کیلیے کہانتک مناسب تھی۔ وصل اندر کنور کا مقدمہ ہوا رہا تھا یہ سب باتیں محتاج جواب اور قابل تحقیق ہیں،

ا؎ سیر المتاخرین بارہویں صدی ہجری کی ہندوستان کے عہد اسلامی کی تاریخ، میر غلام حسین خان ولد میر ہدایت حسین خان طباطبائی حسنی کی تالیف ہے ۱۱۱۸ھ (۱۷۰۶ء) سے لیکر ۱۱۹۵ھ (۱۷۸۱ء) تک کے حالات تحقیق و صحت کے ساتھ اس میں قلمبند کئے ہیں

اسکا ترجمہ اردو میں مرأۃ السلاطین کے نام سے طبع ہو چکا ہے۔ انگریزی ترجمہ ایک ہندی نژاد فرانسیسی المعروف M. Raymond نے ۱۲۰۲ھ (۱۷۸۶ء) میں کیا تھا جس نے شرف بہ اسلام ہو کر حاجی مصطفی نام اختیار کیا اور اسی نام سے شہرت پائی۔ دوسرا ترجمہ ۱۸۳۲ء میں لندن میں کرنیل جان برگس Colonel John Biggs نے شائع کیا۔

میر غلام حسین خان میر غلام علی آزاد کا معاصر تھا۔ واقعات کے لکھنے میں ایجاز و اختصار سے کام لیتا ہے اور اپنی تحقیق و تلاش کے سامنے دوسرے کو نہیں مانتا۔

۲؎ صاحب مصباح التواریخ [illegible] سال ۱۰۴۲ھ [illegible] لکھتا ہے اگر اس کو کتابت کی غلطی [illegible] سال ۱۱۲۸ [illegible] خلاف قرینہ ہے کہ حرم کے [illegible] یہ جشن اس دھوم سے منایا گیا تو میر غلام علی بھی [illegible] کا زمانہ ۱۱۲۷ھ لکھتے ہیں۔ اسکی تائید میر حسن ایجاد تخلص [illegible] مولانا [illegible] تاریخ سے ہوتی ہے۔

بانی اندر کنور بتاتے ہین۔ بدنصیب بانی کی مدّت عیش و اطمینان بہایت تنگ تھی خود فرخ سیر کو فراغ و عافیت نصیب نہ رہی شادی کے ساڑھے تین سال بعد کچھ دن سخت اذیت کیساتھ اسیری مین کاٹکر اُس نے جان دی فرخ سیر کی اس رانی سے کوئی اولاد نہ تھی۔ راٹھور راجہ جسکی آمد و رفت بلکہ ایک حد تک بود و باش دہلی مین رہتی تھی اور جو آخر کار بعض مجبوریوں یا مصالح سے داماد کے خلاف سازشوں اور مشورونمین سادات بارھہ کے شریک ہو گیا تھا لڑکی کو واپس لے گیا اور مراسم ضروری انجام دیکر اُسکو اپنے دہرم اور خاندان مین ملا لیا۔ جودھپور چلے جانیکے بعد پتہ نہین ہی کہ رانی کا انجام کیا ہوا دوسری شادی ہوئی تھی یا نہین؟ اُسنے کہانتک اور کہان اور کسعمر مین وفات پائی؟ یہ سب امور معرض خفا مین ہین۔ صاحب تواریخ مارواڑ نے بھی اس بارہ مین کچھ نہین لکھا صاحب سیر نے بھی اسی قدر لکھا کہ فرخ سیر کی وفات کے بعد اُسکے تمام اہالی و موالی کی جاگیرین ضبط کر لی گئین صرف رانی کی جاگیر اجیت سنگھ کی دلجوئی کے خیال سے بحال رہی۔

رباعی مہاراجہ جسونت سنگھ ۱۲۰۱ھ بمثل گوئے دولت بیاید گلے

۵۱ رانی سنسکرت کا لفظ ہے اسکے معنی ملکہ کے ہین یعنی جو کسی راجہ یا بادشاہ کی زوجہ ہو۔ اس کا اطلاق شاہزادی پر بھی ہوتا ہے۔ یہ امر قابل تحریر ہے کہ راجپوت شاہزادے جو مسلمان ہو جاتے تھے اپنے پُرانے ہندوانہ رسم و رواج پر قائم رہتے تھے۔ حتی کہ اپنے ہی خاندان والون کے ساتھ کھاتے پیتے تھے۔ اپنے ہی خاندان مین شادی بیاہ کرتے اور اپنی بیویون کو خطاب بھی ہندوئن کے طریقہ پر دیتے تھے۔ بہرحال رانی خالص ہندوانہ خطاب ہے

۵۲ موسیو رامان ترجمہ سیر المتاخرین کے ذیل مین لکھتا ہے کہ راجہ اجیت سنگھ لے جو عوام الناس کے طعن ملامت و تشنیع سے بہت گھبراتا تھا مارا کوشش کی کہ اپنی خدمت صوبہ داری گجرات پر چلا جاوے مگر اجازت نہین ملی اور چار و ناچار دستمبر مین رہنا پڑا۔ اس جاہ طلب غیرت مند راجپوت نے اپنے داماد کے خلاف معاملات مین جو حصہ لیا تھا۔ وہ سب کو بہایت متنفر تھے اور آوازے کستے تھے۔

راے مان قسطنطنیہ کی پیدائش تھا۔ دس سال تک مکہ معظمہ مین رہا تھا۔ ہندوستان میں تربیت پائی تھی۔ سیر المتاخرین کے سوا تاریخ کشمیر وغیرہ متعدد کتابون کا ترجمہ کیا تھا۔ اس کو اسکی حضائل کا اقتضا کہیئے یا فطرت انسانی کا جذبہ کہ اُسنے راجہ کے ان اعمال کو بہایت کراہت و قباحت سے دیکھا اور تلخی سے یاد کیا ہے

اصل مثنوی میں بارہ سو چار شعر ہیں اور خاتمہ میں بیانِ اتفاقات سے مثنوی فرخ سیر کے روبرو پیش نہ ہوسکی تھی اس لئے اس خاتمہ میں ناظم نے اس واقعہ اور اپنے مافی الضمیر کو ظاہر کردیا ہے اور جو غیر واقع و ناواجب شاعرانہ ستائیش لوگون کی مثنوی میں لکھی گئی تھی اُس سے گریز و استغفار کیا ہے اور بارگاہ الٰہی میں آمرزش و مغفرت کی دعا کی ہے۔ فرخ سیر کی رحلت پر میر عبدالجلیل نے بددل ہوکر اس مثنوی کو الگ ڈال دیا تھا۔ وہ کہتے ہیں کہ ؎

چہ گویم دل ازین بیداد چون شد | برنگ غنچۂ ناشگفتہ خون شد
بہ دل دارم قرار عہد پیدور | کہ این اوراق را سوزم سراسر

جلانے کی نوبت نہیں آئی تھی کہ میر صاحب نے کچھ سوچ سمجھ کر رہنے دیا اور ؎

بساط عزم خود را در نوردید | بقائے خود در القائے سخن دید

وہ اس کو صاف نہیں کرنا چاہتے تھے حتی کہ وفات پائی۔ انکے انتقال کے بعد میر غلام علی آزاد نے اس مسودہ کو صاف اور بیاض کیا اور حتی الوسع مشکل ابیات کو حل کرکے حواشی لکھے

یہ مثنوی بڑی ہے اور اس سے انتخاب کرنا مشکل۔ اس میں بہت سے لطائف و ظرائف مندرج ہیں خصوصاً اس مقام پر جہاں ہندی راگون کے نام اور اُن کی کیفیت فارسی کے قالب میں ڈھالی گئی ہے۔ شاعر کے تصرف اور قدرت کلام و کمال کو دیکھکر عقل سرگشتہ و حیران ہوجاتی ہے نہ صرف نغمہ اور سنگیت بلکہ اکثر علوم متعارفہ و فنون متداولہ اس شناور بحرِ سخن کے سامنے سیلِ دریا کی طرح بہتے نظر آتے ہیں۔ مگر بدنصیب و بدمذاق نگارندۂ اوراق جو ان عجائب و غرائب سے خود افادہ نہیں کرسکتا ان کو نقل کرکے قارئین تذکرہ کو بھی بے لطف و بدحظ کرنا نہیں چاہتا۔ جہانتک کہ آمد کا تعلق ہے اکثر اشعار سلیس اور پُرکیف ہیں تمکنت و احتشام شاہانہ کے ساتھ ساتھ اپنی شوکت و شان کو بھی ہاتھ سے جانے نہیں دیتے لیکن اسکے بعد صرف آورد اور عالمانہ و مغلق ترکیبات و محاورات و اصطلاحات کی نمائش ہے۔ ایسی تخیل بندیون اور ادا شناسیون سے لطف اُٹھانے والے اس صدی میں نایاب ہیں۔ ؎

مجکو جو اشعار پسند آئے ہین اُن مین سے بعض کو پیش کرتا ہون۔

تمہید مین فرماتے ہین ؎

نوید طوئے شاہ ہفت کشور ‏ ‏ جہان را نوبہار سے ریخت در بر
شہنشاہ سریر سرفرازی ‏ ‏ خدیو عصر فرّخ شاہ غازی
معین الدین محمد شاہ جمجاہ ‏ ‏ شہ گیتی ستان فرّخ سیر شاہ
طراز نوبہار بادشاہی ‏ ‏ وجودش مظہر ظلّ الٰہی
شہنشاہ کرم گستر گہر بخش ‏ ‏ بعاجز پرور ہیا بحر و بر بخش
جبلّی خصلت این شاہ غازی ‏ ‏ عدالت پروری عاجز نوازی
رئیس رجہای عمدہ ہند ‏ ‏ کہ مُلکش می کشد تا کشور سِند
رشید دودمانِ نسل راٹھور ‏ ‏ کہ ممتاز است از اقران درین دور
مہاراجا اَجیت الفاظ نامش ‏ ‏ بلفظ سنگہ می گردد تمامش
بگیتی مرزبان مارواڑ است ‏ ‏ کہ نوکِ نیزۂ او ماروار ست
یکے تانہی درآغاز جلوس شاہ والا ‏ ‏ تمرّد گونہ سر زد ز راجا
پئے تادیب او فوجی روان شد ‏ ‏ سپہر اسپان زمین انجم نشان شد
چو راجا لشکر نصرت اثر دید ‏ ‏ بساط ملک خود را بے سپر دید
بارسال جگر پر کالۂ خویش ‏ ‏ توسّل جُست با شاہ ظفر کیش
پری پیکر بتے عصمت نقابے ‏ ‏ سپہر مِعْفَر را آفتابے
زعصمت در حیا پیچیدہ خود را ‏ ‏ چو بُود ر برگِ گُل ذرّ دیدہ خود را
بدر گاہ جہانبانی روان کرد ‏ ‏ بصد عجز و ادب عرض امان کرد
شہنشہ خواند مضمون مبارک ‏ ‏ اجر للمشرک ان ہو استجارک
تقبّل کرد و راجہ را امان داد ‏ ‏ تو گوئی مُردہ را باز جان داد

ازان پس از پئے تشریف را جا | بہ مہمان خانہ داد آن شمع را جا
بہ ایمان آن صنم را آشنا کرد | گرہ از رشتۂ زنار وا کرد
قرین شد از شہ نصرت موطن | بہ حسن ظاہر او نور باطن
پس آنگہ شد پئے شان عروسی | بہ حکم شاہ سامان عروسی

اُس کے بعد آرائش ساچق۔ وصف حنابندی۔ نور بانی چراغان۔ پوشاک وجواہر بخت روان، نقارخانہ۔ آتش بازی اور بہت سے مختلف عنوانون کے تحت مین میر نے داد سخن دی ہے۔ مگران تکلفات کا بیان کرنا تکلف سے خالی نہین۔

ناچ شروع ہوکر ختم ہوگیا، بزم افروزی رقص کنچنیان، کی تصویر کھینچنے اور اُن کے کمال کی داد دینے، اُن کی دلربائیون کا اندازہ دکھانے کیلئے زاہد خشک شاعر کا قلم عالم تصور اور عالم تخیل کی ایک محفل عیش وطرب مین گام زن رہا۔ اُسنے بہت کچھ لکھا اور خوب لکھا ہے۔ گلگون قبا رنگین ادا، شاہدان دہلی وجودہ پور کے تقوی شکن انداز اور حیاسوز کرشمہ وناز دکھائے ہین مگر خواب تھا جو کچھ کہ دیکھا جو سُنا افسانہ تھا۔ پوری داد سخن نہ دینے کا الزام مین اپنے سر لیتا ہون میر کی روح پاک اور یاد نیک سے مجھے شرم آتی ہے لیکن اظہار حقیقت سے مجبور ہون کہ مین اُنکی توصیفی کی تحریر دتصویرکشی مین اصلی رنگ وروغن کی جھلک نہین پاتا۔ بحالیکہ ظہوری ترشیزی کے وصف رقاصان کے ان پانچ سادہ شعرون مین مستی اور نشاط کا ایک پورا عالم محسوس کر رہا ہون

بیا مطرب با پردہ ساز کن | طرب می رود نایک آواز کن
غم وغصہ چون تارک بدسگال | زرقص سہی قامتان پائمال
زہر سو دلے مبتلا می کنند | بخاطر فریبی چہا می کنند
کمرہا چو در پیچ وتاب آورند | چہ دلہا کہ در اضطراب آورند
بافشاندن دست مانند گوش | بہ برچیدن پائے دزدند ہوش

ظہوری مختصر سی بزم طرب مین اپنی جادو نوائی سے سُننے والون کو مسحور کر جاتا اور اُنکے حرمن صبر

وقرار پر بجلیان گرا دیتا ہے۔ میر اپنے اظہار کمال خیال بندی اور صورت کشی یا قلم کے ترکتاز کے لئے پانی پت کا میدان بھی تنگ پاتے؛ رعد کی طرح گرجتے اور صواعق برق کی طرح چمکتے ہین۔ بالآخر قوس قزح بنکر رہجاتے مین۔

ظہوری کی بحر بھی جدا ہے مین دونون کا مقابلہ اور اُن کے انداز کلام کا موازنہ نہین کرنا چاہتا تھا شعر یاد آگئے تو لکھدئے ہین میر کے اسی رنگ کے چند مزہ دار شعر جن مین انھین خیالات کو موزون کیا ہے اب نقل کرتا ہون ؎

بہر عضوی طرب مستانہ رقصد — چو جوش مے کہ در میخانہ رقصد
ز جستن جستن شان می جہد دل — غم از پا کوب شان در رقص بسمل
بیا بر چیدن سر ناز تہ در — گزارد بے قراری پا بر اخگر
کمر در پیچ و تاب رقص بے تاب — چو موے کوفتہ در جوش گرداب
خرام عشوہ ہای شوخ و طناز — چو موج مے بصید دل سبکتاز
چو ہر شوخ جبین آئینہ رقصد — نگہ در چشم و دل در سینہ رقصد
ادای گردش چشم فسون ساز — بچرخ آوردہ دلہاے نظر باز

شرکاے صحبت گشت و گشت بزم عشرت سے سیر ہو گئے ہونگے اسلئے اب میر کی سنجیدہ ظرافت یا "ہنگامہ سازی ہزالان" سے اُن کی ضیافت طبع مناسب ہے ؎

ز ہزالان گروہے گرم بازی — برقص طرفہ در دستان طرازی
عمامہ کردہ کج بر نوک ابرو — زدہ پس خم چو ماہ نو بزانو
ز رقص شان کہ دارد از طرب بہر — بہر سو ولولہ افتادہ در شہر
بجد از بسکہ در ہزل اند ہر یک — نماید صورت شان ہزل مبتیک
برنگ کبک گہ قہقہ بخندند — ز قلقلہاے مینا شیشہ بندند
ز بزم افروزئی شان گشت بیتاب — بہار فرفرہ[۵۵۳] بستان قلاب

۵۵۳ فرفرہ - چمڑے کی پھرکی۔

مقلد مشنگان محفل طرب‌ے — بانواع ظرافت قافیہ گوے

بہم کردند کوک از نغمہ ساز — یکے تازد یکے قاز و یکے باز

عمامہ بر سر این شملہ بر بر سر — بیا بنگر مقدم شد موخر

بادشاہ کے مشکوے عروسی مین پہونچنے اور وہان کی روداد سے یون پردہ اٹھایا جاتا ہے

شہنشہ در حرم تشریف فرمود — حرم از مقدمش شد عشرت آمود

پرستاران بگرد شاہ جمجاہ — زدہ حلقہ چو دور ہالہ بر ماہ

ز عصمت ہر یکے را غازہ بر رو — ز عفت مشک آگین چین گیسو

سخن چون در گلستان حرم شد — ادب انجا عنان گیر قلم شد

کہ تفصیل سخن انجا محال است — قلم نامحرم روداد حال است

خموشی از ادب بہتر ز گفتن — کہ این جا غنچگی بہ از شگفتن

کہ نشنید و ندید آئین مجلس راز — بجز گوش گل و جز چشم نرگس

رسوم مصحف و آئینہ بینی — بود معمول در حجلہ نشینی

رخ شہ مصحف آیات نور است — دلش آئینۂ روے سرور است

دگر ہم ہر چہ رسم کدخدائیست — کہ آن شایان شان بادشاہیست

بجا آورد شاہ ہفت کشور — بہار تہنیت شد جلوہ گستر

عروس، دولت خانہ شاہی مین اس شان سے لائی جاتی ہے

شہنشہ شد روان با شوکت و شان — گہر بارید ہمچون ابر نیسان

عقب تخت شہ چنڈول رانی — نگارین محمل بلقیس ثانی

۵۵ چنڈول ہندی لفظ ہے حرف اول کے زبر و زیر دونون طرح سے مستعمل ہے آجکل زیادہ تر چنڈول کہلاتا ہے جو پالکی
عربی فارسی مین مختصر یا بہ رنج رائج ہے جیسے ایک بڑی ڈولی ہوتی ہے جس کے دونون طرف چوبین یا بانس لگائے جاتے ہین

نہان در برج عالی سپہر / ببرج اعلا رخشندہ مہر
چو شد دولت سرائے شاہ پیدا / کہ دولت بر جمال اوست شیدا
فرود آمد بشان و شوکت و جاہ / برنگ آیۂ رحمت شہنشاہ

ولیمہ کا انتظام و اہتمام مطبخ ہمایون سے کیا جاتا ہے ؎

چو در زیر سپہر آبنوسی / ولیمہ سنت آمد در عروسی
بحکم شاہ شیلانی کشیدند / چو شیلانے فراوانے کشیدند
چو لذت داد دل را شولہ و آش / بقاول با مرحبا طباخ با شاباش

میر صاحب مثنوی کو اس دعا پر ختم کرتے ہیں ؎

بیا عبد الجلیل بلگرامی / سخن را بر دعا بہتر تمامی
دعائے شاہ دین پرور ادا کن / اجابت می شود ممنون دعا کن
ہمیشہ تا بود در ہفت کشور / عروس آمادۂ آغوش شوہر
عروس سلطنت با رونق و جاہ / بود دائم در آغوشش شہنشاہ
کند از عیش و عشرت شادمانی / چو بلقیس و سلیمان کامرانی
بہ شاہنشاہ و بجاہ گہر ریز / مبارکباد این طوئے دلاویز
شہنشہ با عدالت کامران باد / جہان تا ہست دائم در جہان باد
بود تاریخ طوئے شادمانی / نشاط اندوز وصل شادمانی

زمانے کی ستم ظریفی دیکھیے کہ دعا نامقبول ہوتی ہے۔ صاحب ممدوح اور ممدوح دونوں ناکام اور مطعون ہو جاتے ہیں میر کی مبارکباد اور مثنوی جب مسامع شہنشاہی تک نہیں پہنچنے پائی تو کار ان کا

اور کندھوں پر لے کر کہار چلتے ہیں کسی وقت امرا اور اعلیٰ طبقہ کے لیے سواری کی رسم تھی اور شہنشاہ اور [illegible] خیر سمجھی جاتی تھی

میر حسن دہلوی مثنوی سحر البیان میں فرماتے ہیں ؎

چلے لے کے سب پالکی اوس دم کہار / گیا [illegible]

عالم بالا کی بارگاہ تک اُن کی دُعا کے پہونچنے اور اُنکے التفات و توجہ کی توقع کون کرسکتا تھا؟ اس مین شبہ نہین کہ "تحریر" کے زیر عنوان اور "خاتمہ" مین میر نے بے مثل لکھا ہے اپنے واقعات و مکنونات خاطر کو نہایت سادگی اور سچائی اور دردولی کے ساتھ ادا کردیا ہو۔ نثر مین اپنی نسبت جو کچھ وہ لکھتے ہین اُس کے وہ ضرور مستحق اور شایان ہین۔

پروفیسر سید مسعود حسن صاحب کی مملوکات جمیلہ میں اس مثنوی کا بھی ایک نفیس قلمی نسخہ موجود ہے، سروز چہارشنبہ ۱۲۷۱ھ مین بتاریخ ۱۶۔ رمضان المبارک (۲۴ مئی ۱۸۵۵ء) مولوی طالب حق نے اس کو بمقام لکھنؤ، لالہ رام نراین کے دروازہ پر ختم کیا تھا یہ بزرگ بیوندی (ضلع کانپور) کے باشندے اور ہبداری پیشہ اصحاب علم و ارباب ادب خاندان سے تھے۔ خود مولوی صاحب اور ان کے والد مولوی محمد خان ستار نے متعدد تالیفات یادگار چھوڑی تھین اور بہت سی مفید کتابین نقل و کتابت فرمائی تھیں۔

غزل سنجی و غزل سرائی

آغاز شباب اور غالباً قیام آگرہ کے زمانہ مین غزل گوئی بھی کی تھی۔ ایسے اشعار کا کہنا خواہ اقتضائے عمر و ولولۂ ذوق سے رہا ہو خواہ استجماع فنون کی نظر سے، بہرکیف اس رنگ مین بھی میر صاحب نے اُس دور کے مذاق طبائع کے اعتبار سے بعض نہایت لطیف اشعار کہہ ڈالے ہین۔ اُن کا ترجیع بند مشہور ہے۔ مطلع یہ ہے ؎

منم آن بانکۂ دلبر و اصل   کز من افتاد در جہان گُھل بل

ترجیع بند کے آخر مین تخلص "اثل"[۵۵] لکھا ہے ممکن ہے کہ تحسین و تزئین شعر کی ضرورت یا قوافی کی یکسانی و ندرت کی وجہ سے اختیار کیا گیا ہو۔ یہ شعر بھی اُسی ترجیع بند کا ہے ؎

---

۵۵ میر جعفر زٹلی کے چھوٹے بھائی میر صدر کا تخلص بھی "اثل" تھا عہد اورنگ زیب مین تھے۔ اثل کی نظم و نثر کا نمونہ سوانح میر جعفر زٹلی (موسوم بہ زر جعفری مطبوعہ وکٹوریہ پریس لاہور ۱۹۰۶ء) مین ملے گا۔

شعر بارہ[۵۵۶] زاربان دیدی کشتہ ما گرام را عشق است

بروایت آزاد یاران حرف تیشہ نے اس شعر کو بدل کر کچھ کا کچھ بنا دیا تھا

یہ اشعار بھی آپ ہی کے نتائجِ طبع سے ہیں ؎

عدو گر ہمہ تن ز فولاد جگر د | ز سر تا قدم ہیچو زنجیر اگر د
بکف گیتی برق بے دھڑکہ پکڑ د | بجز حکم اللہ شیے نہ اکڑ د

بعض تذکرہ نویسوں نے ہزل و ظرافت کو میر صاحب کے علوِ شان و زاہد مزاجی سے بعید سمجھ کر اس ترجیح بند اور اسی جنس کے دیگر اشعار کو اور شاعروں سے منسوب کیا ہے۔ چنانچہ نواب محمد مصطفیٰ خان شیفتہ بھی اسی غلط فہمی کا شکار ہوئے اور اپنے مشہور تذکرۂ اشعار موسوم بہ "گلشنِ بیخار[۵۵۷]" میں لکھتے ہیں

"اثل تخلص سید عبد الجلیل نام ، از سادات گرامی قدر شاہجہان آباد دہلی بودہ است ۔ شاگرد معنوی جعفر زٹلی ، و استاد الظاہر نبودہ ۔ از وست ؎

زلف ہے چہرہ پہ یا جنجال ہے | جنبشِ ابرو ہے یا بھونچال ہے"

نیز منشی گوکل پرشاد متخلص بہ رسا ، اپنے انتخابِ اشعارِ سراپا ، موسوم بہ "ارمغان گوکل پرشاد[۵۵۸]" کی فہرست شعرا میں ایک صاحب کا تذکرہ کرتے ہیں ۔

"اثل ، میر عبد الجلیل دہلوی تخلص سے ظاہر ہے کہ کس مذاق کے انسان تھے ۔ اس پر تماشا یہ کہ حضرت جعفر زٹل کے شاگرد تھے ۔ ان کے کلام میں بھی ایک شعر تین چار تذکروں میں درج پایا جاتا ہے وہ شعر بہ ذیل "شانہ کشی عروسِ مضامین زلف" صفحہ ۱۱ پہ نقل کیا ہے ؎

زلف ہے چہرے پہ یا جنجال ہے | جنبشِ ابرو ہے یا بھونچال ہے

[۵۵۶] بارہ میار ملگرام کا ایک محلہ ہے ۔

[۵۵۷] مطبوعہ مطبع منشی نول کشور صفحہ ۱۲

[۵۵۸] ارمغان گوکل پرشاد سنہ ۱۲۹۵ھ مطبوعہ مطبع مطلعِ نور منشی بہاری لال واقع کانپور سنہ ۱۸۸۲ء (سنہ ۱۲۹۹ھ) صفحہ ۷

میر عبدالجلیل بلگرامی کے اس قسم کے کلام کی نسبت میر غلام علی سرو آزاد ہمیں یقین دلاتے ہیں کہ "بلا ریب زادۂ فکر ایشان است"

شیفتہ اور اُن کے بعض متقدمین، معاصرین یا متبعین نے میر عبدالجلیل کو دہلوی لکھا ہے اور اسا وغیرہ دیگر تذکرہ نویسان متاخر نے اُنہیں سے نقل کیا ہے۔ لیکن واقعہ یہ ہے کہ میر عبدالجلیل بلگرامی کے سوا اور کوئی صاحب شعرائے ظریف مزاج سے دہلی میں اس نام کے نہیں گذرے ہیں۔ ان کا قیام بسلسلۂ ملازمت و رسائی دربار شاہی و رسوخ و قدر افزائی امرائے عالی جاہ ایک مدت تک دار السلطنت میں رہا تھا اس لئے ممکن ہے کہ وہ بھی دہلوی کہلائے یا مان لئے گئے ہوں لیکن اس میں بھی شک نہیں کہ پرانے تذکرہ نگار اپنی تحریرات میں اتنی احتیاط انہیں برتتے تھے جتنی کسی ذمہ دار لکھنے والے کو لازم تھی۔ وہ لفاظی و انشا پردازی، مبالغہ و ثنا خوانی میں اس درجہ محو و مستغرق ہو جاتے تھے کہ صحت روایت اور تحقیق و تنقید سے دور پڑ جاتے تھے۔

میرے خیال میں میر صاحب کے معتقدین رندلہ ربایان کو اس بارہ میں کسی گریز یا معذرت کی ضرورت نہیں ہے۔ بعض مشاہیر شعرا اور اہل علم میں بھی ہاجی و ہرزہ سرا گزرے ہیں۔ اس میں ہندوستان[۵۹]

---

۵۹ میر عبدالجلیل کے حقیقی خالہ زاد بھائی سید قریش بلگرامی، عجیب تخلص کرتے تھے منقبت اہل بیت میں ان کا کلام مشہور ہے۔ اس سے کبھی فرصت پاتے یا کوئی صحبت ساز گار مل جاتی، تو دل بہلانے کیلئے کچھ ہزل بھی کہہ ڈالتے تھے فارسی و ہندی آمیز اشعار زیادہ لکھتے اُن کا ایک شعر یادگار رہیگا ۔ اندھے کے آگے گر زلف بچھید ؛ سٹیلہ ہفت آسمان ٹپ جائے
اتفاق وقت یہ کہ یہی مضمون صادق بھی آیا قضائے الٰہی نے کار فرمائی کی۔ احمد آباد گجرات میں سنہ ۱۱۴۰ھ (۱۷۲۷ء) میں گھوڑے پر ایسے سوار ہوئے کہ گر ہی پڑے تھے۔ پلٹ کر آنا درکنار ستیہ بھی ہو چلا و حادثہ قضی الرحمن لابد واقع
ایک اور صاحب، صاحب قران تخلص، میر امام علی نام سادات صوبہ بلگرام سے نہایت فحش اور ہزل کہنے والے تھے ۱۲۲۸ھ (۱۸۱۳ء) میں وفات پائی۔ ان کو ماؤنڈر صاحب نے اپنی تاریخ میں ہجو گو اور مسخرہ کے نام سے یاد کیا ہے۔

Maunder's Biographical Treasury.

یا[۹۳] ایران کی تخصیص و قید نہیں۔ اگر میر نے اپنی قوت سخن سنجی اور بذلہ گوئی کو خواہ عنفوان جوانی کی جانی[۹۴] کہ یادت بخیر!!) خواہ کہولت و پیرانہ سالی میں نمایاں کیا ہو تو بھی اس سے اُن کی شان کمال پر حرف نہیں آسکتا، وہ بالغ قلم جو ادا خرعمرا ور کہن سالگی میں ہنگامہ سازی ہر الان کے عنفوان سے اُن کے کارنامے بیان کرنے اور اُن کی گرم بازاری دکھانے کی قدرت رکھتا ہو، جو اُنکے ادائے کمال اور جوہر فن کی نسبت یہ کہہ رہا ہو کہ ؎

بمفتاح طرب فصل مطول	بہ نظم آرند دستِ ہر صنع مہمل
مشار الشہر تشریح الملاہی	مدار الدہر ترویج المباہی

اُسکے لئے چند سادہ و عامیانہ اشعار کا موزون کر دینا کیا دشوار ہوگا۔ عرب کے مشہور شاعر و فلسفی **جاحظ** کا قول ہے کہ "مضمون بازاریون تک کو سوجھتے ہین جو کچھ فرق اور امتیاز ہے لطف ادا و بندش کا ہے"

میر صاحب کی تمام تصانیف اور تحریرات مین ایک فقرہ یا شعر بھی ہجویہ نہین ملے گا۔ وہ اس سے نہایت احتیاط و اجتناب کرتے تھے۔ کسی کی بدگوئی یا کلمات رکیک و اہانت سے زبان قلم کو آشنا نہ کرتے۔

نوٹ[۹۵] ملا نور الدین محمد ترخان نوری۔ قاسم کاہی۔ عبید زاکانی۔ خاقانی شروانی۔ ابوالعلی گنجوی رشید وطواط۔ شفائی اصفہانی جس پایہ کے نامور حکیم و عالم، ناثر و ناظم گذرے ہیں۔ ان کے دیوانوں کا جائزہ لیا جائے تو حد سے زیادہ ہزل کا پلہ بھاری ملے گا۔

ہندی شاعری

پورب خصوصاً اودھ کی رسیلی سرزمین کو اہلِ روایت طلسم زارِ الفت بتاتے ہیں۔ اس کے سینہ پر عشق و محبت کے بڑے بڑے کارنامے منقوش پاتے ہیں اسی موسیقی نواز و جنوں آفریں مٹی سے میر عبدالجلیل کا خمیر تھا۔ حسن اتفاق سے جس دور اور جس طبقہ میں انھوں نے آنکھیں کھولی تھیں اسکے سرخ درواں (۱) سید نظام الدین المتخلص بہ مدھنایک[۶۱] (۲) دیوان سید رحمت اللہ[۶۲] بزرگان بلگرام (۳) ملجھدر برہمن[۶۳] عمدہ بلگرام (۴) چنتامن[۶۴] (۵) ہمتِ رام[۶۵] (۶) بھوکن[۶۶] باشندگان کوڑا جہان آباد تھے جنکی ہندی شاعری اور بھاشا میں کمال کا شہرہ اطراف و نواحی میں پھیلا ہوا تھا اور جنکی صحبت سے میر نے فیض اٹھایا تھا (۷) ملا محمود[۶۷] جونپوری اور (۸) شیخ شاہ محمد[۶۸] فرملی بلگرامی کی ہندی میں نکتہ سنجی اور جنوں نوازی کی یاد تازہ و باقی تھی۔

---

[۶۱] سنہ ۱۰۹۹ھ (سنہ ۱۶۸۷ء) میں وفات پائی۔ مادھ چندر کا اور مدھنایک سنگار دو کتابوں کے مصنف تھے سنسکرت و بھاشا بنارس میں پڑھی تھی۔ ہندی موسیقی کے علم ناد و تال اور سنگیت میں یکتا تھے مہارت عظیم حاصل تھی۔ اس فن کے محققین بھی ان کے شاگرد ہوئے پر تھرا اور ان کے کمال کے معترف ہیں۔ سندر نام ایک عورت پر عاشق ہوئے اور اسی کے ہو رہے۔ نواب کمال الدین خاں رئیس شاہ آباد ان کا معتقد اور قدر شناس و خدمتگزار تھا۔ راگ سبھا میں ان کی کرامت زبان زد عوام و تمجید خواص تھی

[۶۲] جاجمئو و سیواڑہ کے حاکم تھے خیر اندیش خاں عالمگیری اور عبدالصمد خاں اور دیگر امرا کے یہاں انکی بڑی عزت تھی جاگیر وافر رکھتے تھے اہل فن و کمال کو بہت دیتے تھے۔ چنتامن صاحب کبت بچار سے انکا مناظرہ اور بالآخر اس کا دیوان کے کمالات کا اعتراف کرنا صفحاتِ تاریخ پر یادگار رہیگا۔ پورن رس انکا دیوان موجود ہے ۱۱۱۵ھ (سنہ ۱۷۰۳ء) میں رحلت فرمائی۔

[۶۳] بلگرام کے رئیس اور صاحب کمال تھے۔ نورس سنگار ایک کتاب شیخ الاسلام شیخ اوڈھن بلگرامی کے نام پر لکھی اور اس کا نام صوفی ست رکھا۔

[۶۴] چنتامن یا چنتامنی، ایک قنوجی برہمن رتناکر ترپاٹھی کا بیٹا، سنسکرت کا بڑا عالم اور ہندی

اسی خاک بلگرام سے شیخ عنایت اللہ کا پتلا بنا تھا جو اعجوبہ زمانہ اور نادرہ یگانہ تھے جملہ فنون السنہ عربی و فارسی و ہندی میں انکو قدرت عظیم حاصل تھی۔ ایک شیخ ابو الوقت کے مرید و خلیفہ تھے تصفیہ قلب و تزکیہ باطن و تہذیب اخلاق انتہا تک پہونچا دی تھی۔ سنسکرت، ورہا شا اور موسیقی ہندی میں کمال رکھتے تھے باایں ہمہ زندگی کا کچھ عجیب غریب طرز تھا نہایت تڑکے صبح کو اٹھتے اور کچھ دیر تک نغمات ہندی سے شغل کرتے اسکے بعد تہیہ نماز تہجد فرماتے تھے۔ لباس فاخرہ پہنکر اور اسلحہ بدن پر سجا کر متوجہ نماز ہو جاتے اور ارکان نماز بخضوع و خشوع تمام ادا کرتے

مبارک علی جن کے دو سے چھوٹی چھوٹی بحروں کے اب تک مشہور و زبان زد ہیں اسی بلگرام کے باشندے تھے سنہ ۱۰۵۲ھ میں اسی جگہ پیدا ہوئے تھے

سید عبد الجلیل کی فطری موزوں طبع جو عربی و فارسی میں اوج سخن الکی عجارہی تھی ہندی میں بھی چمکتی

کا بڑا گوی (شاعر) تھا۔ شاہ شجاع بن شاہجہاں بادشاہ کی سرکار میں عزت و وقار سے بسر کرتا تھا خود جہاں پناہ تک بھی رسائی تھی۔ اسکی متعدد تصانیف ہیں۔ ایک کبت بچار ہے فن عروض میں چھند بچار جو بہ لکھی ہے۔
سال ولادت ۱۶۱۳ء (۱۶۷۰ بکرمی سمبت) اور وفات ۱۷۱۵ء ہے
یہ ان چاروں بھائیوں میں سب سے بڑا تھا (جو حقیقی نہ تھے)

۹۵ مت رام اور بھوشن کی نسبت ماہرین فن لکھتے ہیں کہ اپنے بڑے بھائی چنتامنی اور چھوٹے بھائی نیل کنٹھ (جٹا شنکر) سے بھی زیادہ باکمال اور قادر الکلام تھے۔ مت رام ۱۶۹۴ء میں فوت ہوا

متی رام ابتداءً راجہ راؤ بھاؤ سنگھ (والی بوندی) کا درباری شاعر اور حاشیہ نشین بساطِ امارت تھا۔ اس نے علم بدائع و معانی میں ایک کتاب "للت للام" لکھکر راجہ کو پیش کی تھی اس میں امثال الوسع مثالیہ اشعار اپنے ہی طبعزاد درج کئے تھے اور زیادہ تر ایسے ہی اشعار تھے جن سے راجہ کی مدح و ستائش نکلتی تھی اس کے تتبع و تقلید میں دیو دت نے ۱۸۰۰ء میں للت للام تحریر کی

بوندی سے تعلق قطع ہوا تو متی رام نے راجہ شمبھو ناتھ سلطانی سے توسل پیدا کیا اس کی فرمایش سے کتاب "چھند سار سنگرہ" تصنیف کی جو فن عروض میں بڑی عزت و استناد کی نظر سے دیکھی جاتی ہے "رس راج" خالص عاشقانہ شاعری ہے اور اسکی بہترین تصنیف سمجھی جاتی ہے۔ متی رام کی ست سئی کو بھی کافی شہرت ملی ہے

۹۶ بھوشن کو شاعر رزم و بزم دونوں کے بیان کرنے میں یکساں قدرت حاصل تھی ہندوستان کے مختلف راجگان و روساکے یہاں رہا تھا اسکی قدردانی خصوصیت کے ساتھ شیواجی مرہٹہ اور چھتر سال راجہ (بوندیل کھنڈ) نے کی اس نے

اور اپنا علم بلند کرنے لگی۔ دکھانے لگی کہ آہنگِ حجازی اور ترانۂ عراقی سے انکا نغمۂ ہندی دیگر نہیں رہ سکتا معنی آفرینی و نازک خیالی میں سحر طرازان حجاز اور افسوں خوانان پارس سے جادو نوایان ہند کسی طرح کم نہیں ہوتے ان کا فن نایکا بھید انہیں کی ایجاد اور تنہا انہیں کا حصہ اور انکی زندہ کرامت ہے میر عبد الجلیل سے جب فرمایش کی جاتی تھی یا خود انکا دل چاہتا تھا تو بھاشا میں بھی کہہ دیتے تھے چنانچہ خود فرماتے ہیں ؎

شعر گر فضلِ من نہ پوشیدے ۔۔۔ می شدم در فنِ سخن اقدم
گر بہ پرسی ز جامعیتِ من ۔۔۔ میرِ خسرو دہد جواب نعم

بھی انکو اپنے فیض کلام سے غیر فانی بنا دیا اور بے مثل قصائد و محامد لکھے ہیں۔ شیواجی کے کارنامے شیوراج بھوشن میں نظم کئے ہیں۔ شیوا باونی، چھتر سال دشک بھی بڑے پایہ کی نظمیں ہیں بھوشن کی زبان بھاشا ہے مگر عربی فارسی کے الفاظ بھی موقع و محل سے آجاتے ہیں
مصنف ہندی نورتن کا بیان ہے کہ بھوشن کی پیدایش ۱۶۳۵ء میں ہوئی تھی۔ انتقال ۱۷۱۵ء (۶ دسمبر ۱۷۲۷) میں ہوا۔ بعض تذکرہ نویس سال ولادت ۱۶۱۳ء (۱۰ دسمبر ۱۶۷۰) لکھتے ہیں۔

۶۷ میر غلام علی بلگرامی، سرو آزاد (تذکرہ دیوان سید رحمت اللہ) میں ان بھائیوں کا مسکن کوڑا جہان آباد لکھتے ہیں جو ضلع فتحپور میں ایک مشہور اور قدیم قصبہ ہے۔ لیکن صحیح یہ ہے کہ یہ باکمال ٹکماں پور یا ٹکوان پور کے رہنے والے تھے جو ضلع کانپور میں گھاٹم پور کے جنوب جمنا کنارے واقع ہے اور جو اس وقت تری وکرم پور کہلاتا تھا۔ ان دونوں مقامات کا فاصلہ چنداں زیادہ نہیں۔ ممکن ہے کہ اس وقت ٹکوان پور متعلق کوڑا جہان آباد کے رہا ہو یا باعتبار قرب و شہرت ایسا لکھا گیا ہو کیونکہ عہد اورنگ زیب میں گھاٹم پور متعلق حویلی و سرکار کوڑہ کے تھا۔

۶۸ ملا محمود۔ فاروقی شیخ تھے۔ علمائے اشراقیین اور حکمائے مشائین کی بہترین یادگار اور یگانۂ روزگار تھے۔ سترہ برس کی عمر میں فارغ التحصیل ہو کر تصنیفات شروع کر دیں۔ حکمت میں شمس بازغہ اور فن بلاغت میں فرائد تحریر کی تھی۔ مدۃ العمر کبھی کوئی ایسی بات نہیں کہی جس سے رجوع یا انکار کرنا پڑا ہو۔ جب کوئی سائل مسئلہ پوچھتا اگر دل حاضر ہوتا تو جواب دیدیتے تھے ورنہ کہہ دیتے کہ اس وقت خاطر متوجہ جواب نہیں شاہجہاں نے صدر ہندی کی جانب راغب کیا تھا لیکن وزرا نے مہم بلخ کے در پیش ہونے کی وجہ سے اس تجویز کو ستر (؟) کر ادیا

اُس دَور کے بعض امرا کو بھی ہندی بھاکھا کی شاعری کے ساتھ التزام خاص تھا میرزا فقیر اللہ مخاطب بہ سیف خاں بدخشی، صوبہ دار الہ آباد تھا۔ عہد عالمگیری میں صوبہ دار کشمیر بھی رہا تھا سہرند سے ایک منزل پر سیف آباد اُسی کا آباد کیا ہوا ہے۔ سیف خاں جوہر قابل رکھتا تھا اور قابل دوست تھا فنِ موسیقی و رقص ہندی میں راگ درپنؔ فارسی زبان میں اُسکی تالیف ہے۔

امیر الامرا حسین علی خاں کے دربار میں میر عبد الجلیل جایا کرتے تھے۔ ایک مرتبہ عالم شاعر کے کبتوں کا تذکرہ ہونے لگا تو نواب صاحب سنکر نہایت محظوظ ہوئے اور میر سے فرمایا کہ عالم کے کبت ہمارے لئے فراہم کرا دیجئے۔ ان کے زمانہ کے شرفا میں شعر و شاعری کا عموماً چرچا رہتا تھا خواہ کسی زبان کی ہو۔

کچھ روز بعد ظاہر ہوا کہ جس زمین پر ملا محمود نے رصد لگانا تجویز کیا تھا اسی جگہ کو حکمائے متقدمین میں سے کسی نے رصد کے لئے پسند و اختیار کیا تھا۔ امیر الامرا شائستہ خاں اور شاہ شجاع انکے شاگرد تھے۔ فنّ نایکا بھید میں بھی انکا ایک مختصر رسالہ فارسی زبان میں ہے اور نہایت مستند ہے اس فن میں اہل ہند نے باعتبار ادا، و انداز، و درجات عمر، و مراتب الفت و بے الفتی وغیر ذالک معشوقہ کو کئی قسم میں تقسیم اور ہر ایک کے لئے ایک نام معین کیا ہے اور اُسی مناسبت سے ہر قسم کے اشعار آبدار نظم کئے ہیں ملا کا رسالہ فارسی میں ہے انکو مثال کے لئے فارسی اشعار (جو کہ عموماً امارد کے حلیہ و شان میں ہوتے ہیں) عورتوں کے متعلق نہیں ملے اس لئے رسالہ مثالیہ اشعار سے خالی و معرّیٰ رہ گیا ملا نے سنہ ۱۰۶۲ھ (۱۶۵۲ء) میں انتقال کیا۔

۵۶۹ شیخ شاہ محمد اکبر بادشاہ کے عہد میں صاحب ثروت و اقتدار تھے حصار دریری چندوار کی حکومت سپرد تھی دریری ایک محال یا پرگنہ صوبہ و سرکار ملتان میں تھا۔ محال چندوار سرکار چانپانیر صوبہ گجرات میں تھا، شکار کو گئے تھے کہ کسی گاؤں میں ایک صاحب جمال لڑکی کے تیر نگاہ کے شکار ہو گئے۔ وہ بھی بڑی شوخ اور حاضر جواب تھی۔ اسکی ذہانت اور فی البدیہہ جوابات پر شیخ صاحب مفتون ہو گئے اور اپنے گھوڑے پر سوار کر کے لے کر چلے گئے گھر لاکر تربیت کی۔ نظم ہندی میں وہ شیخ سے بھی فائق اور رسا تھی اور لطافت ظرافت اور بدیہہ گوئی میں یکتا تھی دونوں کی نکتہ سنجی اور پر لطف گفتگو (دیدبینا میں) دیکھکر ان کے قدرت کلام سے حیرت ہو جاتی ہے

۵۷۰ کبت یا سیکہہ نظم کی ایک خاص صنف ہے جسمیں دو مصرعے ہوتے ہیں زبان برج بھاکھا ہوتی ہے جو متھرا اور بندرابن اور گوالیار اور قرب و جوار میں بولی جاتی ہے۔

۵۷۱ عالم، اصل میں برہمن تھا جو کسی مسلمان رنگریزن پر جو خود بھی شاعرہ تھی عاشق ہو کر مسلمان ہو گیا تھا

ہر لکھے پڑھے خاندان میں کچھ نہ کچھ اس کا ذخیرہ ملجاتا تھا۔ میر عبدالجلیل اور ان کے قرابتداروں کے گھر بھی اس سے خالی نہ تھے نواب صاحب کے بیٹے میر کو یہ سوغات اپنے وطن سے منگاتے تھے۔ ایک موقع پر میر سید محمد کو لکھتے ہیں کہ "ہر قدر کبت عالم و سکھ کہر و پکھے اندھیسں ہرنس مصر و دواکر پسران گھیسٹے و دیگر مردم اہم رسد بخط ہندی نویسانند یک جزو، دو جزو ہر چہ میسر آید زود بفرستند دور خط ہندی تحریف کم است و ہندی را کہ بفارسی نویسند در خواندن تحریف بسیار واقع می شود اما ہندی خوشخط باشد بخط رکیک نبود دریں باب تاکید دانند"

یہ مصر و داکر ہرنس برہمن کے بیٹے اور بلگرام کے معزز اور خوشحال لوگوں میں تھے سنسکرت و بھاشا میں ان کی قابلیت و جامعیت مسلم اور مشہور تھی۔ میر عبدالجلیل نے ان کو بار بار لکھکر دہلی بلایا اور سید حسین علی خاں امیرالامرا کے یہاں ملازم کرا دیا تھا۔ یہ نواب کے ندیم و مصاحب خاص تھے۔ میر کے مرثیہ میں ایک دوہہ انھوں نے لکھا اور بیان واقعہ عالم پر آشکار کر دیا تھا۔

نہ ہوا ہے نہ ہوئے گا ایسو گیان سوشیل جیسو احمد نند جگ ہوئے گیو میر جلیل

یہ بھی عجیب اتفاق تھا کہ جب اس دوہہ کے اعداد کا شمار کیا گیا تو بلا تخرجہ و تعمیہ تاریخ نکل آئی، خیال رہے کہ ۲۳۔ ربیع الآخر ۱۱۳۸ھ کو میر عبدالجلیل نے وفات پائی تھی۔

اور اُس سے عقد کر لیا تھا ایک لڑکا جہان نامی اس دور مسرت و عیش کا یادگار تھا عالم نے اپنی محبوبہ منکوحہ کی وفات میں دردناک مرثیہ لکھا ہے۔ اس کی نسبت ہندی شعرا لکھتے ہیں کہ یہ دونوں ٹکسالی چھند ہے شاہزادہ معظم شاہ کا ملازم خدمت تھا اس کا کلام نہایت دلکش ہے

مسٹر بیل اورینٹل بیاگرفی کل ڈکشنری میں لکھتے ہیں کہ ہندوستان کے فن موسیقی میں شیخ عالم نے مادھو انل یا مادھو نایک نام ایک کتاب لکھی تھی۔ یہ نام اُس ماہر فن موسیقی سے منسوب ہے جس نے اس کو سب سے پہلے ہندی میں لکھا تھا۔

۱۵ سنہ ۱۱۱۵ھ (۱۷۰۳ء) میں انتقال کیا۔

۲ سرو آزاد میں سکھ نکھ ہر جگہ لکھا ہے جو قوام فطرت انسانی اور ترکیب جسمانی کے لحاظ سے بالکل درست معلوم ہوتا ہے ممکن ہے کہ اُس وقت سنہ خامیں اسی طرح مستعمل ہو مگر آج کل عموماً ترتیب الفاظ بالعکس نکھ سکھ بتائی جاتی ہے۔ جس سے ہندوستان کے عامۃ الناس نکھ سے سکھ تک اور خواص نکھ سے سکھ تک یعنی ناخن پا سے لیکر موئے سر تک مراد لیتے ہیں نکھ لغۃً و عرفاً ناخن اور سکھ سر کی چوٹی کے بال کہلاتے ہیں۔

حال میں رسالۂ زمانہ (کانپور) کے کسی مضمون نویس نے جہاں پدماوت کے تمام تراجم و اشاعت کا ذکر کیا تھا، وہاں یہ بھی لکھا تھا کہ "حسین الدین غزنوی نے فارسی میں ۱۶۶۱ء (۱۰۷۲ھ) میں اورنگ زیب عالمگیر کے نام پر "حسن و عشق" لکھکر اپنا زور قلم دکھایا تھا۔ بعد ازاں ضیاء الدین عبرت دہلوی اور اُن کے استاد عشرت نے فارسی سے اُردو میں نقل کیا۔ پھر میر عبدالجلیل نے بھی یہ طبع آزمائی کی اور آخیر میں کسی شخص ابراہیم نامی نے پشتو میں نقل کیا۔" میر عبدالجلیل کی طبع آزمائی کی نوعیت اس مقالہ نگار نے نہیں لکھی ہے۔ میر فارسی اور ہندی دونوں میں قدرت تام رکھتے تھے۔ نظم و نثر دونوں اُن کے قلم کے سامنے سر جھکائے ہوئی تھیں لیکن اس سوال سے قطع نظر کرکے یہ بات بھی یاد رکھنے کے قابل ہے کہ میر عبدالجلیل کے تمام علمی کارناموں کا بیان میر غلام علی آزاد وغیرہ اُن کے خاص اعزہ نے جہاں کیا ہے وہاں اُنکی پدماوت کا ذکر کیوں نہیں کیا۔ تذکرہ جیسا میر کی رحلت کے بعد قریب تر زمانہ میں لکھا گیا تھا اُسکی تالیف کا مقصد اصلی محض میر کے نام کا احیاء اور اُنکی علمی و ادبی خدمات کا ابقاء تھا۔ قرین قیاس نہیں ہے کہ آزاد کو ترجمہ پدماوت کا علم ہو صاحب البیت ادری بما فیہ۔ اور اگر تھا تو تذکرہ سے کیوں متروک ہوگیا۔ علاوہ کسی اور معاصر یا قریب العہد مورخ نے بھی ذکر نہیں کیا ہے دو سو برس کے بعد اگر کوئی اہل قلم اس واقعہ کو لکھتا ہے تو اُس کو اپنے ذرائع علم اور اُن کے اسناد کا حوالہ دینا چاہیے۔

میر کی منظومات میں سے "نکھ سکھ" بھی دوہے کے وزن میں ہے اس گلدستہ کے چند پھول پیش کئے جاتے ہیں۔

अलह नाम पोथी पर लिख पहिं भाय । الہ نام پوتھی پر لکھ اپنہہ بھائی

ज्यों जड़ाव को टीको भाल सुहाय ॥ جیوں جڑائی کو ٹیکو بھال سہائی

مجاز اً حلیہ یا وہ کلام جس میں محبوب کے جملہ اعضا و جوارح کی ناخن پا سے لیکر چوٹی تک مختلف تشبیہات و تلمیحات کے ساتھ تعریف کی جائے۔

اسی کو فارسی زبان میں سراپا کہتے ہیں یعنی تمام و کمال کیونکہ اس میں تمام اندامہائے معشوق کا اول سے آخر تک وصف بیان کیا جاتا ہے۔

اللہ کا نام کتاب پر اس غرض سے لکھا جاتا ہے کہ خوبصورت عورت کی جبین پر چشم بد
زیب دیتا ہے

[illegible] । کیس پاس کی پھانسی پھانسہ لوگ
[illegible] ॥ ایک شیام تم اوپر الک سنجوگ

زلف کے دام میں لوگ پھنستے ہیں - ایک تم ہو کہ اوپر سے زلفیں کالی ہیں

फुलवारी घूँघट कै पाँति जात । پھلواری کو نکہت کی پانتیں جات
सुमन बास बिन जाहीं नाहीं सुहात ॥ سمن باس بن جاہیں نہیں سہات

نقاب ڈال کر باغ میں اس لئے جاتے ہیں کہ بغیر سایہ کے خوشبو کا لطف نہیں ہوتا

[illegible] निर्मल [illegible] दर्पन हार । دا کپول نرمل درپن ہار
[illegible] ॥ پرت انت جھوٹے کے سو چار

اس کے عارض شفاف سے آئینہ ہار مان گیا جھوٹے کے سو پیار بناوٹ والی بات ہے

बालक दृगनि [illegible] जोत । قاتل دیکھ تر ین باڑھت جوت
दंत [illegible] जैसे [illegible] कोत ॥ دنت چیکنوں دیکھ ہلست لوت

اس کے خال کے دیکھنے سے ہر دل کی رونق افزوں ہوتی ہے ہندوؤں میں رواج ہے
کہ بزرگوں کی روح کو آرام دینے کی غرض سے تل اور پانی دیتے ہیں اور دانتوں کی چمک سے
گویا بجلی کی چمک کھل جاتی ہیں

नखन झलक मेंहदी सँगनी छब दीन । ناخن جھلک مہندی سنگ یوں چھب دین
चुनीलाल हर जैसे लाख नवीन ॥ جیوں لال تر جھلکیں ڈاک نوین

ناخنوں پر مہندی کا رنگ یوں کھل رہا ہے گویا سرخ یاقوت کے نیچے ڈاک رکھی ہے

बाल नाभि के तल को कहो न जात । بہا د نابھ کی ترکو کو بجات
कँवल कली लौं मुँदी भली यह बात ॥ کنول کلی لو موندی کھلی یہ بات

ناف کے مقام کا خیال بیان میں نہیں آ سکتا۔ گویا کنول (نیلوفر) کی کلی بند ہو گئی ہے

बेनी पीठ बीच मिल चली जो कीन । بینی پیٹھ دو دل مل چلو جو کین

तांबी बकली बातन मन हरि लीन ॥ لانبی چکنی باتن من ہر لین

معشوق کی چوٹی اور اسکی پیٹھ نے متفق ہو کر لمبی چوڑی باتوں سے دل لے لیا (یعنی چوڑی اور چوٹی لمبی)

जुगुल जंघ सों मो मन अटको जाय । جگل جنگھ سو مو من اٹکو جائے

अंत भीषिपत गाहे कहीं न काय ॥ انت باندھیت سنگے کہیں نہ لئے

دونوں ساقوں میں میرا دل اٹک گیا (مصرع ثانی کو بعض سخن فہم حل بتاتے ہیں مگر انکا صحیح پتا نہیں چلتا اور نہ کوئی معنی سمجھ میں آتے ہیں)

कँवल सांझ मूंदत नहि कोय सिकोर । کنول سانجھ مونڈت نہیں کوئی سکور

वाचरनन को वन्दत अंजलि जोर ॥ وا چرنن کو بندت انجلی جور

کنول شام کو اپنا جسم سکوڑ کر بند نہیں ہوتا ہے بلکہ وہ دونوں ہاتھ جوڑ کر اسکے قدموں کی پرستش کرتا ہے

फुलवारी जग में सबै सींचत लै लै बास । پھلواری جگ میں سبے سینچت لے لے باس

सूखे रूख पलास को रितु बसंत की आस ॥ سوکھے روکھ پلاس کو رت بسنت کی آس

رنگ خوشبو لیکر باغ کی آبپاشی کرتے ہیں۔ خشک ڈھاک کو صرف موسم بہار کی امید رہتی ہے

रजनी सजनी पीय सँग पावन रूप बिहात । رجنی سجنی پیہ سنگ پاون روپ بہات

अब प्रीतम बिछुरे भई पाँव पखे की भाँत ॥ اب پریتم بچھرے بھئی پاون پکھے کی بھانت

یار کے ساتھ رات جلد گذر جاتی ہے ہجر میں وہی رات کاٹے نہیں کٹتی

तो नासा की डाह की कीर लगी जिय कोंच । تو ناسا کی ڈاہ کی کیر لگی جیہ کونچ

माहुर खूँटो नित करै कहे देत है चोंच ॥ ماہر گھونٹت کرے کہے دیت ہے چونچ

تیری ناک کے حسد سے طوطا زخمی ہو گیا ہے اسکی چونچ صاف ظاہر کر رہی ہے کہ وہ ہمیشہ زہر گھونٹا کرتا ہے

پیارے تیرے چرن کی کہوں کہاں لو بھید ۔
چھن بچھڑت جاکے پرے چھاواں چھاتی چھید ۔۔

प्यारी तेरे चरन के कहू कहाँ लौं भेद ।
छिन बिछुरत जाके परे झावाँ छाती छेद ॥

تمہارے پاؤں کا کیا بیان کروں جس کی ایک لمحہ کی جدائی سے جھانواں کے سینہ میں چھید ہوجاتے ہیں (جھانواں جس سے پاؤں صاف کیا جاتا ہے)

یہ اشعار سروآزاد سے لئے گئے ہیں۔ ان کے فارسی جامہ کو ہٹاکر بھاشا کے اصلی قالب میں دکھانے کیلئے مجھے دشواری اٹھانا پڑی ہے جن ماہرین نے مدد فرمائی انکا ممنون گزار ہوں میر غلام علی نے کچھ اور شعر بھی نقل کئے ہیں جو نستعلیق خط میں ہونیکی وجہ سے صحیح نہیں پڑھے جاتے اور وزن و معنی سے بیگانہ نظر آتے ہیں

لکھپوت واکریواں اتھ ابھرام　　ہوئی اتیت کرڈاری سیری سیام
سنگھ ناتھ جو موری دہوں کیا کھوئی　　کری لاک جہاں تجھر یوہت تہاں ہوئی

کم نصیب محرر سطور سے جو ایسے لطیف فن سے بھی بے بہرہ ہے قدیم بھاشا کے متعدد و قدر شناس حضرات نے میر جلیل کی ہندی شاعری کی تحسین و ستایش کی ہے اہل ذوق کی زبان پر انکا کلام ابتک باقی ہے اسکی قبولیت عام کی شہادت یہ کیا کم ہے کہ صوبہ متوسط میں جسکو ہندی بھاشا کے ادب و شعر کا گہوارہ کہنا چاہئے کسی وقت اسکے بعض اجزاء مدارس سرکاری کی نصاب میں داخل تھے (پاٹھ پستک چوتھی مؤلفہ مسٹر ہری گوپال پادھیا بی۔اے۔ جو ۱۸۸۴ء سے ۱۸۹۰ء تک جاری رہی) شیو سنگھ سروج وغیرہ بعض مطبوعہ کتابوں میں بھی اسکے منتخبات موجود ہیں اس دور کے لحاظ سے انکا معیار بہت بلند سمجھا جاتا اور انمیں حق شناسی و خدا پرستی کا حقیقی جلوہ دکھایا گیا ہے

میر جلیل کی کوتیا ۔ بروے چھند

صورت آئے گئی تمھری اس بے جان
سوامی مور بڑ سمرت جیئے ہرکھان
سبھہ النگ تیں من ہٹ تمھری اور
ارج کرئی سن لیجئے تن کر کور ۱
تنک دیا کے چتیئے مور بچاؤ
جل اوپر چینٹی کو تنکئی ناؤ
بلگرام کر باسی میر جلیل
تمھری شرن گہ گاڑھے سے ندھ شیل ۲

मीर जलील की कविता—बरवै छन्द

सुरति आय गई तुम्हरी अस जिय जान ।
स्वामि मोर बड़ समरथ जिय हरखान ॥
सबहिं अलँगतें मन हठि तुमरी ओर ।
अरज करहिं सुन लीजहि तनि करि कोर ॥ १
तनिक दया के चितये मोर बचाव ।
जल ऊपर चींटी को तिनुका नाव ॥
बिलगराम कर बासी मीर जलील ।
तुम्हरी शरण गहि गाढ़े से निभिशील ॥ २

ظرافت و حاضر جوابی

میر عبدالجلیل سے کسی بے تکلف ہندو دوست نے کہا "آپ صاحبوں کا قول ہے کہ لَا رَطْبٍ وَّلَا يَابِسٍ اِلَّا فِيْ كِتٰبٍ مُّبِيْنٍ ۝ (تر و خشک کتاب واضح میں لکھے ہوئے ہیں۔ جزء ۷ سورۃ الانعام ع ۷۔ ۱۳) بھلا یہ تو فرمائیے کہ اس میں کانّ کا بھی کچھ ذکر ہے؟" [کانّ بفتح آخر۔ ہنود کے ایک بڑے اوتار اور معظم مقتدا کا نام ہے] میر صاحب نے فرمایا کہ "ہاں ہے۔ اللہ سبحانہ و تعالیٰ نے فرمایا ہے۔ وَكَانَ مِنَ الْكٰفِرِيْنَ ۝ [اور نافرمان بن بیٹھا۔ جزء اول سورۂ بقرہ ع ۴۔ ۷]

سبحۃ المرجان میں میر غلام علی آزاد نے اس واقعہ کو صنعت ابو قلمون کے ذیل میں تحریر کیا ہے بندۂ راقم کو اندیشہ ہے کہ اس زمانہ (بیسویں صدی مسیحی) کی رفتار اور انسانی طبائع کی افتاد دیکھ کر یہ سوال و جواب ناشائستہ اور قابل اعتراض نہ سمجھا جائے۔ اس لیے یہ نظر انداز نہ کیجیے گا کہ آج سے ڈھائی سو برس پہلے اہل ہند کا بیاخلاق باہمی ارتباط و اختلاط اس ڈھنگ کا نہ تھا۔ اُس وقت کے ہندو اور مسلمان کسی متعصبانہ رنگ میں رنگے ہوئے نہ تھے۔ نہ ایک دوسرے پر مذہبی طعن یا چوٹیں کرتے تھے۔ یہ اُن کے غایت خلوص اور بے تکلفی کا تقاضا تھا کہ جو کچھ زبان پر آجاتا تھا اُسکو سادگی سے کہہ ڈالتے تھے۔ دونوں میں سے کوئی برا نہیں مانتا تھا اور نہ بدنیتی و بدمذاقی پر محمول کرتا تھا۔

مجھے اپنے بارے میں کسی معذرت کی ضرورت نہیں۔ میری حیثیت محض جامع احوال و اقوال کی ہے مستند کتابوں میں میر عبدالجلیل بلگرامی کی زندگی کے کسی پہلو کے متعلق کوئی بھی واقعہ اچھا یا برا جو کچھ نظر پڑجاتا ہے اُسکو نقل کر دیتا ہوں میں اپنی خدمت کی بجاآوری پر مامور اور اسلئے مجبور ہوں۔ قارئین معظم مجاز ہیں کہ میر عبدالجلیل اور اُن کے ہندو دوست کی نسبت جو رائے چاہیں قائم فرمائیں۔

معاصرین، اُنکی رائیں اور دلچسپیاں

بلگرام کی علمی مجلسوں کی روداد بیان کرنے کی اس مختصر تذکرہ میں گنجائش نہیں۔ وہاں علم بھی تھا فضل بھی، فقر بھی، اہل علم بھی تھے، صاحبان کمال بھی۔ میر عبدالجلیل کی بے تکلفانہ نشست و برخاست اور ہر وقت کا ساتھ انھیں ارباب طریقت و شریعت سے تھا۔ وہاں کی بزم سخن میں شمع کمال پر ہر طرف سے پروانے تصدق و نثار ہوتے رہتے تھے۔ جہت و سمت کی کوئی قید نہیں۔ فَضَّلْنَا بَعْضَهُمْ عَلٰی بَعْضٍ (ہم نے اُن میں سے بعض کو بعض پر بزرگی دی۔ جزء ۳ سورۃ البقرۃ ع ۱-۳۴) میرا ایمان ہے لیکن میر سید مبارک محدث، میر طفیل محمد، سید اویس، میر عظمت اللہ، سجادہ نشین شاہ طیب، اُن کے صاحبزادے شاہ حسین (خلیفہ مخدوم محمد رکن الدین خیرآبادی)، سید عبدالنبی (خلیفہ میر سید محمد کالپوی) مولوی سید شریف، میر سید لطف اللہ المعروف بہ شاہ لدھا، میر عظمت اللہ بیخبر، سید نوراللہ، سید محمدی (معتقد علیہ شاہ عالم بادشاہ) اولیائے کامل میں سے کس کو ایک دوسرے پر ترجیح دی جائے۔ اس لئے ان عزیزان یگانہ کو چھوڑ کر ع بود ہم پیشہ با ہم پیشہ دشمن کے قول پر اعتماد کر کے دوسرے رخ یعنی اغیار و بیگانوں کی طرف توجہ کروں گا ع

وَالْفَضْلُ مَا شَهِدَتْ بِهِ الْأَعْدَاءُ

(۱) سراج الدین علی خاں آرزو اکبرآبادی[۵۵] جب ۱۱۳۲ھ (۱۷۲۰ء) میں گوالیار سے دہلی آئے تو اُنکے اخراجات کے لئے سرکار بادشاہی اور دیگر امرا کے یہاں سے درماہے مقرر ہو گئے۔ اُس وقت

---

۵۵ بڑے نامور شاعر اور صاحب کمال اس صدی میں گزرے ہیں۔ ایک تذکرہ شعرائے فارسی و ہندستانی دوکی کا "مجمع النفائس" تمام نہایت مکمل و مستند اور عمدہ انتخابات کلام کے ساتھ ۱۱۶۴ھ (۱۷۵۱ء) میں لکھا تھا اس میں آزاد کو نہایت خلوص و خوبی سے دو جگہ یاد کیا ہے۔ خان آرزو اکبرآباد میں ۱۱۰۱ھ (۱۶۸۹ء) میں متولد ہوئے تھے ۲۳ ربیع الثانی ۱۱۶۹ھ (۲۶ جنوری ۱۷۵۶ء) کو لکھنؤ میں وفات پائی۔ خان آرزو کی ملاقات شیخ

سے لیکر میر عبدالجلیل کی وفات ۱۱۳۸ھ (۱۷۲۵ء) تک دونوں کی بڑی پرلطف صحبت رہی دونوں ایک دوسرے کے کمال و کلام کی داد دیتے تھے۔ جب آرزو اودھ چلے گئے۔ وہاں میر عبدالجلیل کے نواسے میر محمد یوسف بلگرامی سے تین بار ملاقات ہوئی۔ میر صاحب کے علاوہ شناسائی سے دو دہلی میں بھی دو بار آرزو سے مل چکے تھے آرزو فیض آباد میں ان سے بڑی محبت و تکریم سے پیش آئے اور اپنے یہاں مہمان رکھا۔ میر غلام علی آزاد لکھتے ہیں کہ سرو آزاد لکھتے وقت آرزو سے میں نے ان کا تذکرہ منگایا تو انھوں نے کمال اخلاق سے وَإِذَا حُيِّيتُم بِتَحِيَّةٍ فَحَيُّوا بِأَحْسَنَ مِنْهَا پر عمل فرماکر اپنے احوال و اشعار لکھ بھیجے اور یہ بھی اضافہ کیا کہ "فقیر بخدمت میر عبدالجلیل مرحوم بلگرامی مکرر مستفید شدہ و صحبت شعر اتفاق افتاد۔ حالا با ولد ارجمند او آشنا شدہ گل دوستی شگفت"

(۲) خواجہ عبدالباسط دہلوی سے کتاب "ربیع الابرار" منگانے اور خواجہ صاحب کی مروت کا ذکر "حسن طلب" کے عنوان سے ہو چکا ہے۔

(۳) سید علی معصوم مدنی مصنف "انوار الربیع فی انواع البدیع" سے اورنگ آباد دکن میں ملاقات کا اتفاق ہوا تھا۔ ان کا قول تھا واللہ ما رأیت ھذا السید بالھند نظیرا اذا لقاہ

علی حزیں سے دہلی میں ۱۱۴۶ھ (۱۷۳۳ء) میں ہوئی تھی جب تازہ وارد تھے۔ حزیں کی غلطیاں پکڑیں اور تنبیہ الغافلین لکھ ڈالی۔ اس کے سوا موہبت عظمیٰ، عطیہ کبریٰ، سراج اللغات، چراغ ہدایت، غرائب اللغات وغیرہ بہت سی مستند و تحقیقی کتابیں لکھی ہیں۔

۴۷؎ خود قاموس سورۃ النساء ع ۱۱ "اور جب دعا دیے جاؤ تم ساتھ کسی دعا کے تو دعا دو اس سے بہتر کے ساتھ" اس آیت کے ذیل میں واقعہ عام کے لئے ایک بات قابل تحریر ہے۔ امام بخاری ادب المفرد میں لکھتے ہیں کہ حضرت عبداللہ بن عباس کا ارشاد ہے کہ ہر شخص کے سلام کا جواب اسی طرح دینا چاہیے جس طرح وہ سلام کرتا ہے خواہ وہ شخص یہودی ہو یا عیسائی یا آتش پرست۔ اللہ جل شانہ فرماتا ہے کہ وَإِذَا حُيِّيتُم بِتَحِيَّةٍ فَحَيُّوا بِأَحْسَنَ مِنْهَا أَوْ رُدُّوهَا یعنی جب کوئی شخص تم کو سلام کرے تو اس سے زیادہ اچھے طور پر جواب دو ورنہ برابر کے طور پر تو ضرور دو یا انھیں۔ حضرت عبداللہ کا دوسرا قول اسی ذریعہ سے منقول ہے لو قال لی فرعون بارک اللہ فیک قلت وفیک اگر مجھ کو فرعون بھی کہے کہ اللہ تجھ کو برکت دے تو میں بھی وہی کہوں گا کہ اور تجھ کو بھی (اللہ برکت دے)

فی خمائل الادب غصنا نضیرا۔ ایک دوسرے موقع پر فرمایا تھا کہ من در تمام عمر خود جامع غرائب علوم مثل میر عبدالجلیل نہ دیدم"۔

(۴) مرزا محمد علی خاں متین کشمیری نے بھی اپنے تذکرہ حیات الشعرا[۵۷۵] میں میر عبدالجلیل کا ذکر کیا ہے۔ اسوقت ان کا تخلص میر جلیل تھا۔

متین نے ایک روایت میر عبدالجلیل کی طرف منسوب کرکے لکھی ہے جسکی میر غلام علی آزاد خزانہ عامرہ میں تنقیط کرتے اور لکھتے ہیں کہ میر محمد زماں راسخ (پدر میر معصوم وجدان تخلص مخاطب بہ عالی نسب خاں) نے یہ شعر کہا تھا ؎

دلبرے یافتم و گوشۂ خلوت رفتم ۔۔۔ بختم شمع بہ اندازۂ کاشانۂ خویش

اسپر بعض طباع شعرا نے ایراد کیا میر راسخ آزردہ ہو کر محمد اعظم شاہ کے لشکر سے چلے آئے اور بالآخر یہی شعر انکی نوکری اور ہفت صدی منصب چھوڑنے کا باعث ہوا۔ آزاد نے یہ واقعہ شاہ عبدالحکیم حاکم لاہوری سے سنا تھا اور شاہ صاحب نے آقا رضائی المتخلص بہ مشہور لاہوری کی زبان سے

(۵) میر محمد مراد متخلص بہ لائق جونپوری عنفوان جوانی میں مرزا صائب[۵۷۶] کی ملاقات کے شوق میں

۵۷۵ اس تذکرہ میں جلد مرل بہادر شاہ کے عہد سے لیکر فردوس آرامگاہ محمد شاہ کے زمانہ تک کے شعرا کے حالات ہیں

۵۷۶ مرزا محمد علی صائب تبریزی کے باپ عباس آباد اصفہان کے راس لڑو سلتھے۔ مرزا نے اصفہان میں نشوونما پائی تھی حرمین محترمین و دیگر مقامات متبرکہ کی زیارت کرکے وطن واپس چلے آئے تھے۔ بڑے درویش اور عالی منش انسان کامل تھے باوجود سُنّی مذہب ہونے کے اہل ایران میں مقبول و عزیز رہے۔ کمال احترام و وقار سے بسر کی۔

جہانگیر کے آخر عہد مگر اپنے شباب میں تاجرانہ ہندوستان آئے۔ ظفر خاں ناظم کابل سے بڑے مراسم ہو گئے۔ جو جو د امیر کبیر تھا۔ شاہجہاں کے زمانہ میں وہ ہندوستان آیا تو مرزا کو ساتھ لایا مرزا کے پدر گرامی قدر بھی ان کو وطن واپس لے چلنے کے لئے ہندوستان آئے۔ برہان پور میں پیر کنعان یعقوب کی آنکھوں نے دور افتادہ یوسف کے دیدار سے روشنی پائی تاہم کچھ تو ظفر خاں کے خلوص و ارتباط اور کچھ شوق گلگشت کشمیر نے مجبور کیا۔ کشمیر سے مرزا کو اصفہان جانے کی اجازت ملی۔ بادشاہ ایران شاہ عباس صفوی نے قدردانی کی ملک الشعرا بنایا۔ ہندوستان کی یاد وطن میں بھی باقی رہی جن امرا سے یہاں رسم و راہ ہو گئی تھی ان سے سلسلۂ رسل و رسائل قائم رکھا اور جو کچھ مقدر تھا

ہندوستان سے اصفہان کو پاپیادہ گئے۔ ایک زمانہ تک اُنکی خدمت میں رہے اور خوب مستفید ہو کر آئے تھے۔ اس خیال سے کہ لائق نے محض اُن سے ملنے کے لئے اسقدر تکلیف و تعب سفر برداشت کیا تھا مرزا صاحب بھی بڑی مدارات و دلجوئی سے پیش آئے۔ اپنی محلسرا میں جگہ دی تھی۔ ان کے اشعار کو بھی بہت پسند کرتے اور تحسین فرماتے میر مراد اورنگ زیب عالمگیر کی پیشگاہ سے مدت تک دار السلطنت لاہور کی سوانح نگاری پر سرفراز رہے تھے۔ میر عبد الجلیل سے بیحد ربط و رسم رکھتے تھے۔ انہیں کے اشارہ سے اپنا خمسہ نظم کیا تھا۔ مخزن اسرار کے مقابلہ میں جو مثنوی لکھی ہے اُسکے خاتمہ میں میر صاحب کا اور اُنکی تکلیف دہی کا ذکر کرتے اور ان الفاظ و اشعار میں اُنکی ستایش فرماتے ہیں ؎

راقم این نامۂ معنی سواد — محوِ سخن بندہ محمد مراد
بود شبے انجمن آرائے فکر — داشت سرے گرم ز سودائے فکر
یافتہ از قید تعلق خلاص — خامہ بکف منتظر فیض خاص
چہرہ طراز گل افسانۂ — دام نہِ معنیٔ بیگانۂ
پنجۂ اندیشۂ اعجاز فن — شانہ کش زلف بتان سخن
قطرۂ از ابر سخن ریختے — موج گہر از دلم انگیختے
خستہ دلم در ہوس مرہمے — جانِ گرو آرزوئے ہمدمے
از درم القصہ درآمد دلے — اہل سخن را بہ سخن رہنمول
نشئۂ سرجوش خمستان ہوش — از پے تحقیق سخن چشم و گوش

نقد و جنس نذر و نیاز ہو گئی رہی
غزلیں بالکل نئے طرز کی لکھتے تھے۔ کلام میں اخلاقی رنگ غالب تھا۔ تشبیہات کے بادشاہ تھے۔ مرزا شاعری کے ایک جداگانہ طریقہ کے موجد مانے اور بتائے جاتے ہیں۔ اساتذۂ فن سخن میں اُنکا شمار (نمبر) چوتھا ہے۔
ان کا دیوان اسی ہزار شعر کا ہے اور ہر صنف کلام پر مشتمل ہے۔
سنہ ۱۰۸۰ھ (۱۶۶۹ء) میں وفات پائی اصفہان مدفن ہے۔

صورت ار دگشته بمعنی دلیل | سید علامه عبد الجلیل
کرده بموزونی طبع سلیم | طالب خویشم چو کلام کلیم
می دهد از لفظ بمعنی پیام | زد ترانه نکهت گل با مشام
می برد از طرز بمطلب سراغ | گرم تر از نشئهٔ می با دماغ
دید که فکر سخنم پیشه است | دل بگرو صورت اندیشه است
گفت سخن ساده و پرکار به | ناب کن سبحه و زنار به
بیش بود از همه سخنور گوا | معنی بیگانه و لفظ آشنا
گفتن او فکر مرا تازه کرد | روی سخن را به نفس غازه کرد
شد ز پری خانهٔ دل جلوه گر | خیل معانی ز پی یک دگر
جرعه کش بزم ادیبی شدم | پنجه ور نغمه نویسی شدم
خامه به تحریر گرو ساختم | نقش دلاویز بپرداختم
از مدد باطنی گنجوی | طرز سخن یافت ز فکرم نوی

لائق ایک موقع پر میر عبدالجلیل سے فرماتے تھے کہ ایک روز مرزا صائب کی خدمت میں حاضر تھا فرمانے لگے کہ "اب میری عمر ستر سال کی ہولی تو قدرے چاشنی سخن پیدا ہوئی ہے لیکن بے سود۔ کوچ کا وقت آچکا۔ مرزا کے علاوہ حوصلہ اور مراتب کمال کے بارہ میں لائق بہت سی باتیں نقل کیا کرتے تھے۔ کہتے تھے کہ میں نے مرزا صائب کو شعر کہتے وقت کبھی تامل و غور کرتے ہوئے نہیں دیکھا البتہ ایک روز مرزا اپنے چمن کی روشوں پر متفکرانہ ٹہل رہے تھے میں نے التماس کیا کہ آج تو چہرۂ انور سے کچھ تفکر ظاہر ہو رہا ہے۔ مرزا نے تبسم فرمایا اور کہا کہ اسوقت فردوسی کا یہ شعر یاد آگیا تھا ؎

بفرمود تا رخش را زین کنند | دم اندر دم نائے زرین کنند

شفائی نے اس کے جواب میں کہا ہے ؎

بفرمود تا زین به ابرش نهند | چه زین، همه بالاے آتش نهند

دل چاہتا ہے کہ میں بھی اس پر طبع آزمائی کروں۔ میں نے عرض کیا کہ حضرت اسکی فکر میرے ذمہ چھوڑ دیں۔ مرزا نے براہ مہربانی منظور کیا۔ میں نے تمام شب غور کیا ایک شعر موزوں ہوگیا۔ صبح کو حاضر ہوکر عرض کیا۔ مرزا صاحب نے بہت تحسین و آفریں فرمائی ؎

بفرمود تا زیں سرا دمیم ہمہ ۔ بہ پشت قبا مسند جم ہمہ

(۶) ناظم خاں فارغانی تمی نے میر کی مدح میں کہا ہے ؎

چہ توئے کجاست شاہے بہ قلمرو معانی ۔ بہ تو ہیچ کس نماند تو بہ ہیچ کس نمانی

(۷) شیخ ناصر علی سرہندی سے میر صاحب کی ملاقات اورنگ آباد دکن میں ہوئی تھی۔ میر صاحب خود آزادت کہتے تھے کہ "خوب پر لطف صحبت رہی۔ وہ لوگوں کو ناغت کردی گئی تھی۔ دل وقت کی آدھی رات تک برابر جلسہ قائم رہا۔ ناصر علی نے اس زمانہ میں ایک قصیدہ لامیہ تازہ تازہ کہا تھا تشبیب موسم گرما کی توصیف میں تھی اور گریز نعت سرور انبیا علیہ التحیۃ والثنا پر۔ مطلع یہ تھا ؎

گداخت لسکہ ہوائے تموز، مغز خیال ۔ مغز رز سنگ برآید بصورت تمثال

سارا قصیدہ مجھکو سنایا اور پوچھا 'کوئی شعر پسند آیا؟' میں نے کہا کہ 'تمام قصیدہ خوب ہے'۔ پھر کہلا کر بہ جد کہا کہ 'اگر کوئی شعر پسند آگیا ہو تو نشان دیجئے'۔ میں نے کہا کہ 'ایک شعر' اس کلمہ کو سنکر شیخ کے چہرے پر تغیر ظاہر ہونے لگا میں نے دیکھ لیا۔ کہا کہ 'سب جواہر ریزے ہیں اور قیمت و جوہریت کی رتبہ میں سب مساوی لیکن کبھی ایسا بھی ہو جاتا ہے کہ کسی ایک کی آبداری دوسروں سے ممتاز ہو جاتی ہے'۔ یہ بات سنکر انکا رنگ اصلی حال پر آگیا اور پوچھا کہ آخر کون سا شعر اچھا معلوم ہوا ہے۔ میں نے کہا کہ ؎

زبسکہ نعم بہ زمیں نارسیدہ می سوزد ۔ چو شمع بر سر شاخ است ریشہائے نہال

ناصر علی نے تحسین کی اور تسلیم کیا کہ 'فی الواقع میں بھی اسی شعر کو اور سب شعروں سے ممتاز سمجھتا ہوں'۔ میر عبدالجلیل یہ بھی فرماتے تھے کہ میں نے ناصر علی کے دو شعروں میں دخل دیا تھا ایک شعر آزاد کو یاد نہیں رہا۔ دوسرا یہ شعر ہے جو عالمگیر کی مدح میں مثنوی میں کہا تھا ؎

محی الدین محمد زیب اورنگ ۔ بضلے شش جہت بر شوخیش تنگ

میر عبد الجلیل کا اعتراض تھا کہ بادشاہ کا لقب محی الدین ہے۔ بلا ضرورت یا تشدید نہیں ہے۔ ناصر علی نے اعتراف کیا۔

اسی مثنوی میں ایک جگہ گھوڑے کی تعریف میں لکھا تھا ؎

بعکر لامکان سیرستش ہم آہنگ　　فضائے نُہ فلک بر شوخیش تنگ

میر صاحب نے فرمایا کہ بادشاہ کی اور اُسکے گھوڑے کی تعریف ایک پیرا میں واقع ہوئی ہے اور بادشاہ کی نسبت شوخی ملائمت نہیں رکھتی ناصر علی نے اس شعر کو نکال ڈالا۔ اکثر نسخوں میں یہ شعر پایا نہیں جاتا ہے۔ ایک قدیم نسخہ میں البتہ بعینہ باقی رہ گیا ہے بعض نسخوں میں مصرع یوں بدل دیا ہے ؎

شہنشاہ جہان ہوش و فرہنگ　　محیِ الدّین محمد زیب اورنگ

خیال رہے کہ ناصر علی بڑی شہرت و شان اور قدرت و کمال کا شاعر گذرا ہے جو اپنے خیال میں صائب کو بھی کچھ نہ سمجھتا اور اکثر اشعار میں اُسکے ساتھ معارضہ کا داعیہ رکھتا تھا اُسکے ہمعصر بھی اُسکے کمال کو مانتے اور قدر کرتے تھے محمد افضل سرخوش اُس کی نسبت کلمات الشعرا میں لکھتا ہے ؎

در ملکِ سخن بود جہانگیر علی　　در مشربِ دل ولی علی پیر علی

با شعر علی نمی رسد شعرِ کسے　　زانساں کہ خطِ کس بہ خطِ میر علی

(۸) مرزا خاضع[شذ] جو مرزا صائب کی صحبت سے مستفیض ہو چکے تھے میر عبد الجلیل سے بڑی قدر و عزت سے ملتے تھے دونوں کی صحبتیں شاعرانہ نکات اور روایات کی بہترین یادگار تھیں۔ خاضع کہتے ہیں کہ یہ دو مصرعے مدت سے میرے گوشۂ ذہن میں رہے تھے (۱) از شیشۂ بے مے مے بے شیشہ طلب کن

شذ اہل لغت کی تحقیق یہ ہے کہ میر ابتدائے ہر دو کے ساتھ پیشتر شاہزادوں کے القاب کے لئے مخصوص تھا۔ کچھ زمانہ سے عام طور پر سردار زادگاں کے لئے بھی استعمال ہوتا ہے۔ ایران میں اس کا اطلاق سادات پر ہوتا ہے عالبًا اصل میں امیرزا یعنی امیر زادہ تھا۔ کثرت استعمال سے الف اول حذف ہوگیا۔ حرف تحتانی کے ساتھ مرزا بھی بولا جاتا ہے حاجی مصطفےٰ معروف بہ راے مان (سنہ ۱۸۶۶ء میں) لکھتا ہے۔ مرزا کے معنی شریف زادہ کے ہیں مگر ہندوستان اور ایران دونوں ملکوں میں اس سے مراد ایسے شریف آدمی سے لیجاتی ہے جو لکھ پڑھ سکتا ہو یہ ایک ایسا وصف ہے جو مسلمانوں میں کم مگر ہندوؤں میں زیادہ پایا جاتا تھا نام سے پہلے اگر یہ لفظ لگایا جائے تو چنداں اہمیت نہیں رکھتا۔ اگر نام کے بعد آئے تو ہمیشہ اُس سے مقصود شاہی خاندان کا کوئی ممبر یا شاہزادہ ہوگا۔

(۸) دیدن، رفتن، استادن، نشستن، خفتن وغیرہ۔ ایک روز میں نے مرزا صاحب کے روبرو عرض کیا۔ مرزا نے پہلے مصرعہ کے لئے فی البدیہہ فرمایا ع حق راز دل خالی از اندیشہ طلب کن۔ دوسرے کے ساتھ یہ مصرعہ لگایا۔ بقدر ہر سکوں راحت بود بنگر مراتب ہا[۷۸]۔ جامع نے یہ واقعہ میر عبد الجلیل سے نقل کیا تھا اور میر صاحب سے سنکر میر عظمت اللہ نے اپنے "سفینۂ بے خبر" میں درج کیا ہے۔

(۹) میر محمد ہاشم تخلص بہ جرأت مخاطب بہ موسوی خاں پہلے دہارواڑ[۷۹] کے قلعہ دار تھے۔ پھر امیر الامرا سید حسین علی خاں کے ہمرکاب ہندوستان چلے آئے تھے اور یہاں کے اکثر صاحبان کمال مثل مرزا بیدل[۸۰]

---

۷۸ بقدر ہر سکوں راحت بود بنگر تفاوت را مشہور در ہر دو علم ہے مگر میر غلام علی نے سرو آزاد میں مراتب ہا" نقل کیا ہے۔

۷۹ دہارواڑ، صوبہ بمبئی میں ایک قصبہ کا نام ہے ضلع اور تعلقہ دہارواڑ اسی شہر کے نام سے موسوم ہے تفصیل و تاریخ حیدرآباد دلچسپ ہیں

۸۰ مرزا عبد القادر برلاس بیدل تخلص عظیم آباد پٹنہ کے رہنے والے تھے۔ ہندوستان کے فارسی گو شعرا میں ممتاز اور عدیم النظیر مانے گئے ہیں۔ بہت سے اہل سخن نے انکے اتباع و تقلید کی کوشش کی مگر ناکام رہے۔ زیادہ عمر دہلی میں بسر ہوئی۔ آغاز شباب میں شاہزادہ محمد اعظم خلف عالمگیر کی نوکری کی منصب عالی پایا۔ کسی مداح الکمال نے مرزا کی سخن سنجی کی تعریف شاہزادے سے کی۔ فرمایا "ہماری شان میں قصیدہ لکھیں ہم بقدر استعداد قدر دانی کرینگے" مرزا نے سنا تو قطعاً انکار کیا۔ اسی وقت نوکری چھوڑ کر شاہجہان آباد چلے آئے بقیہ عمر یہیں ختم کر دی۔ با ایں ہمہ استغنا کے بے نیازی شان کمال یہ تھی کہ اواخر عہد عالمگیر سے لیکر اوائل جلوس محمد شاہ تک تمام ارکان سلطنت ان کی حد گزاری آستان بوسی کو اپنا افتخار سمجھتے اور مراتب نیازمندی بجا لاتے تھے قلیچ خاں آصف جاہ کو انکی شاگردی پر ناز تھا۔ دکن گئے تو بڑی محبت و اعزاز سے لکھکر مرزا کو بلایا۔ جواب ملا ؎

دنیا اگر دہند نہ خیزم ز جائے خویش ... من بستہ ام حنائے قناعت بہ پائے خویش

نواب شکر اللہ خاں مع تمام خاندان کے انکا بڑا معتقد اور قدر شناس تھا امیر الامرا حسین علی خاں سے ربط و رسم خاص تھا لیکن فرخ سیر کے قتل پر جو رنج و ملال پیدا ہوئی اسکا اظہار مرزا نے اپنی تاریخ سادات ذی شکوہ کی گمراہی کرد میں کر دیا۔ مرزا بڑے بلند پایہ سخن سنج تھے۔ تمامی اصناف سخن غزل، مثنوی، رباعی، قصیدہ ہر صنف میں انکا کلام موجود ہے۔ نثر بھی ایک طرز خاص سے نہایت لطیف لکھتے تھے۔ مزاج اور کلام دونوں پر فقر و تصوف کا رنگ غالب تھا

وغیرہ کی صحبت سے مستفیض ہوئے تھے۔ میر عبدالجلیل کی نسبت فرماتے تھے

"ہمیشہ دردکش ار زبان امیرالامرا اوصاف کمال میر عبدالجلیل سامعہ افروز بود چوں ملاقات
واقع شد حجب نسخہ جامعے یافتم"

(۱۰) مولوی الہ داد عرف ملا جیون[1] شیخ احمد امیٹھوی نے جب اُن تاریخوں کو دیکھا جو میر نے امیرالامراء کے فرزند کی ولادت کی کہی تھیں تو بہت پسند کیا اُسوقت بہت سے آدمی اُن کے پاس بیٹھے ہوئے تھے سب کے سامنے فرمایا "مارا بوجود شما فخر است کہ در زمانہ ما ہم چو شما مستعدے موجود است" میر عبدالجلیل اپنے بیٹے کو اسی صحبت اور اسی قدرشناسی کی نسبت لکھتے ہیں کہ "ایں قدر مہربانی کردند کہ خجالت کشیدیم"

(۱۱) مرزا یار علی بیگ کی قدرشناسی اور عزت افزائی کا تذکرہ پیشتر ہو چکا ہے۔ اعادہ کی ضرورت نہیں۔

(۱۲) شعروسخن کی ایک پرلطف مجلس میں کسی شخص نے مرزا بیدل کا یہ مصرع پڑھا

روزِ سوارِ شب کند اسپ چراغ پا

اور بالاعلان کہا کہ اس پر بہتر مصرع کون لگا سکتا ہے میر عبدالجلیل نے فی البدیہہ السا کیا ؎

عرہ مشو کہ ابلق ایام رام تست | روزِ سوارِ شب کند اسپ چراغ پا

اُس شخص نے بے اختیار تحسین و آفریں کی اور کہا کہ حقیقتاً آپ کا مصرعہ مرزا کے بہتر مصرع سے بہت بڑھ گیا ہے مرزا نے یوں کہا تھا ؎

باطبع سرکش ایں ہمہ رنج و فا مبسہ | روزِ سوارِ شب کند اسپ چراغ پا

ایک لاکھ شعر کا کلیات اور بہت سی تصانیف، محیط اعظم، چار عنصر، اشارات بیدل، رقعات بیدل، نکات بیدل یادگار چھوڑی ہیں بحر کامل بحر متدارک بحر طویل، بحر خفیف میں زیادہ مرغوب تھیں۔ ۳۔ صفر ۱۱۳۳ھ (۲۴۔ نومبر ۱۷۲۰ء) کو دہلی میں وفات پائی اپنے ہی گھر کے صحن میں دفن ہوئے۔

[1] حاجی ملا جیون صدیقی شیخ امیٹھی (ملک اودھ) کے رہنے والے تھے وہیں پیدا ہوئے اور درس و تعلیم پائی بساعدت طالع نے ملشاہ عالمگیر تک پہونچایا۔ بادشاہ نے انکی خدمت میں شاگردی کی نہایت سادہ وضع اور تکلفات رسمی سے بیگانہ تھے بادشاہ کو انکے ساتھ حسن ظن تھا اعزاز و احترام بعزا وال کرتا تھا باپ کی اسی سنت پر شاہ عالم بہادرشاہ نے بھی عمل رکھا اور لوازم تکریم فوق الحد بجالاتا رہا۔ ملا کا حافظہ نہایت قوی و بلند تھا۔ کتب درسیہ کی عبارات صفحہ صفحہ اور ورق ورق زبانی پڑھتے چلے جاتے تھے ایک ہی بار سنکر طولانی قصیدہ یاد ہو جاتا اور یاد رہتا تھا سنہ ۱۱۳۰ھ (۱۷۱۸ء) میں دہلی میں وفات پائی نعش امیٹھی

(۱۳) جو وہاں کے استاذ نامور شیخ غلام نقشبند ہمیشہ میر عبدالجلیل کی تعریف و توصیف کیا کرتے تھے۔ شیخ نے ایک بار ایک دائرہ تاریخی اپنا طبع زاد میر کے پاس بھیجا لیکن اسکی وضع و فہم کا طریقہ قلمبند نہیں فرمایا تھا۔ میر نے اپنی قوت فکر سے دائرہ کی ماہیت و نکتہ دریافت کرلی اور ایک دوسرا دائرہ اس سے بھی زیادہ لطیف و نادر اسی طرح سے تیار کر کے شیخ کی خدمت میں بھیجا۔ شیخ نے اسکے جواب میں یہ خط اپنے قلم خاص سے لکھا تھا

"میرزا المدارج السامی مجمع فیوضات ربانی سلامت۔ گرامی نامہ ملت شمامہ مشتمل بر رسیدن بلگرام۔ تفویض خدمت بخشی گری۔ و وقائع نگاری گجرات رسید۔ مسرت فراوان بخشید۔ الحمد للہ کہ برونق و خواہش دوستاں با جمعیت ایں طرف تشریف آوردند فقیر را مخلص صمیم دانستہ از یاد و دعا غافل نہ دانند۔ حق سبحانہ ہمیشہ در ترقی جمعیت نشاتین دارد۔ دیگر رسالۂ ایجاز طراز دائرہ رسید۔ زبان از مدحت آں قاصر است حقا کہ ذات سامی آیات دریں رسالہ بے عدیل است۔ اللہ تعالیٰ ایں افادہ مستدام دارد۔ زہے فطرت عالی و ذہن ثاقب۔ کہ سر مخفی معلوم نمودہ دائرہ از خود وضع نمودند۔ غرض کہ کمال سامی از تحریر بیرون است۔ دیگر از اشتیاق گرامی صحبت چہ برگزارد۔ اللہ تعالیٰ بوجہ احسن میسر آرد۔ والسلام"

(۱۴) حافظ ضیاء اللہ عالم کامل اور حافظ و قاری کلام مجید تھے۔ نظم و نثر عربی و فارسی پر قدرت تامہ رکھتے تھے۔ ان کے دو خط اوپر نقل ہو چکے ہیں۔ حضرت میر سید محمد قدس سرہ صاحب سجادہ کالپی کے شاگردان و مستفیدان سے تھے۔ ان کے کمال عقیدت اور رسوخ ارادت کے ثبوت میں ان کا یہ والہانہ شعر پیش کیا جاتا ہے۔

کالپی مکہ بلگرام یمن
اے تو احمد منم اویس قرن

شعبان سنہ ۱۱۰۲ھ (اپریل ۱۶۹۱ء) میں دعاتیانی و انکے انشاءات دو دفتر میں ترتیب دیئے گئے اور ان کے سعید فرزندوں کی استدعا سے میر عبدالجلیل نے ان پر دیباچہ لکھا

(معلومات ملفوظ) الکردس کی گئی 'جو صبوری' بھی کہلاتے تھے۔ تفسیر احمدی' قرآن پاک کی تفسیر جو لکھی ہے شیخ احمد نام تھا۔

(۱۵) اہل فقر و فضل میں سے سید قاسم اسرار بلگرامی سے میر عبدالجلیل کو بہت عقیدت تھی۔ اُن کے دیوان کو بہت عزیز رکھتے تھے اور فرمایا کرتے تھے کہ "سید قاسم اسرار، صاحب سخن بود. گویا پرتو سید قاسم[۵۲] انوار بر ساحت احوالش تافتہ، قاسم اسرار گردیدہ" اسی طرح ان کی نسبت ان کے پیرومرشد سید تاج الدین حجرہ نشین فرماتے تھے کہ "قاسم اسرار مرآۃ این ملک است" مرشد کی رحلت کے بعد اُن کے ایما کے موافق سید قاسم شمس آباد[۵۳] (ضلع فرخ آباد) چلے آئے جس جائے بلند کا پتہ دیا تھا وہاں اقامت گزیں ہوئے۔ دو تین مہینے بھی نہ گزرے ہونگے کہ کسی دولت مند کا اُدھر سے گزر ہوا اُس نے عالی ہمتی سے مسجد و خانقاہ و چاہ و روضہ و باغ وہاں بنوا دیا اور رقم خرچ مقرر کر دی

(۱۶) سید محمد اشرف، معروف بہ سید شاہ درگاہی، مشہور عالم و صوفی تھے۔ ان کا طریقہ بالکل سلف

---

۵۲ قاسم انوار، سید معین الدین علی کا لقب تھا شیخ صدر الدین موسیٰ اردبیلی کے سلسلہ میں تھے۔ تبریز میں پیدا ہوئے۔ آذربیجان اپنے وطن اصلی سے گیلان، وہاں سے ہرات چلے آئے علوم ظاہری و مدارج معنوی کی تکمیل یہیں فرمائی۔ رؤساء و اشراف کی ایک بڑی جماعت مرید و معتقد تھی۔ لوگوں کی سعایت و بدگوئی سے ۸۲۹ھ (۱۴۲۵ء) میں شاہرخ مرزا نے ان کے اخراج کا حکم دیا۔ تعمیل بعد کنار یہ بھی کسی کی مجال نہ تھی کہ یہ حکم آپ تک پہونچا دے۔ شاہزادہ بایسنغر بحیلۂ زیارت حاضر ہوا اثنائے گفتگو میں آپ کا یہ مطلع پڑھا ؎

اے عاشقاں اے عاشقاں! ہنگام آفت گر جہاں　　　مرغ دلم طیراں کند بالاے ہفتم آسماں

پھر اُسی سلسلۂ کلام میں محل مناسب سے آپ کو آپ کا ارشاد یاد دلایا ؎

قاسم سخن کوتاہ کن، برخیز و عزم راہ کن　　　شکر بر طوطی فگن، مُردار پیش کرگساں

سید صاحب دعا و تحسین فرماتے ہوئے اُٹھ کھڑے ہوئے، پہلے سمرقند گئے پھر شہر جام، جو متصل ہرات ہے، چلے آئے۔ بقیہ عمر یہیں طے کی۔ اسی شہر کے محلہ خرجرد میں ۸۳۵ھ (۱۴۳۱ء) میں رحلت فرمائی۔ بعض مورخین مثل صاحب تاریخ حبیب السیر آپ کا ۸۳۷ھ (۱۴۳۳ء) میں خراسان میں وفات پانا لکھتے ہیں۔ مثنوی انیس العاشقین آپ کی تصنیف ہے

۵۳ شمس آباد (اب ضلع فرخ آباد میں) ایک قدیم و مشہور قصبہ، دریائے گنگ کی پرانی اور بلند پہاڑیوں پر واقع ہے۔ طول البلد ۲۷ درجہ ۳۲ دقیقہ شمالاً اور عرض البلد ۷۹ درجہ ۲۸ دقیقہ شرقاً ہوگا فتح گڈھ (ضلع کے صدر مقام) سے اس کا فاصلہ اٹھارہ میل سمت شمال و مغرب ہے۔ ۳۲ محلے ہیں، مردم شماری ۱۹۱۱ء میں ۸۳۷۵ تھی لیکن بیس برس کے زمانہ (۱۹۲۱ء) میں ۶۹۹۵ رہ گئی۔ قصبہ روز بروز شکستہ حال و تباہ ہوتا جاتا ہے۔ پختہ مکانات اور شاندار عمارات اسکی گزشتہ عظمت و عروج کی دلیل ہیں۔ عیز آباد حصول میں کاشت

صالحین کا تھا مآثر الکرام میں ان کا مفصل تذکرہ ہے۔ سید میر عبدالجلیل کے یاران خاص میں سے تھے اور کہا کرتے تھے کہ میری تحصیل علم کا باعث میر عبدالجلیل ہوئے تھے میں پابند و متاہل ہو چکا تھا کہ کسب علم کی ترغیب دی میں نے عذر کیا کہ اب مرحلہ شباب میں قدم رکھ چکا ہوں اس کا حاصل کچھ نظر نہیں آتا ہے۔ اصرار کیا اور فرمایا کہ ضرور بالضرور نفع ہو گا مختصرات کو خود پڑھایا۔ باقی کتابیں اور علوم دیگر علماء و اساتذہ سے پڑھیں۔

(۱۷) سید محمد باقر بلگرامی ۹۵۵ نے ابتداءً علوم متداولہ مقامی علماء و مشاہیر فضلاء سے حاصل کئے تھے۔ خود بڑے جید فاضل اور طباع تھے۔ فن لغت عربی میں لانہایت خوض فرماتے آخر میں میر عبدالجلیل کی صحبت میں پہونچے اور خوب استفادہ کیا اور ہر فن میں دستگاہ کامل بہم پہونچائی۔ خط نہایت شیریں اور دل پسند ہو گیا تھا۔ بالکل میر کے خط کی روش اور شان تھی۔

ہونے لگی ہے۔ بلندی پر سے دیکھنے سے زراعت کے دلفریب قطعات اور لہلہاتے ہوئے کھیت اور سبزہ زار ہر طرف نظر آتے ہیں۔

پرانا شہر کھور ساڑھے تین میل کے فاصلہ پر گنگا کی پہاڑی پر آباد تھا۔ تیرھویں صدی عیسوی کے آغاز میں ایک راٹھور راجہ نے جسکا نام زیادہ تر رتن پال بتایا جاتا ہے اور کبھی کبھی جے سنگھ دیو، اور جو مشہور و معروف جے چند راٹھور کی نسل سے تھا اسکی بنیاد ڈالی تھی۔ اُس وقت سے لیکر اکبر بادشاہ کے عہد تک دریا اسی پہاڑی کے نیچے بہتا رہا ہے۔ سنہ ۶۲۵ھ (سنہ ۱۲۲۸ء) کے قریب شمس الدین التمش بہاروں کا بیڑہ لیکر یہاں آیا اور بحری حملہ کر کے راٹھوروں کو مغلوب کیا۔ موجودہ قصبہ سے دو میل پورب کو شمس آباد کی بنیاد ڈالی۔ سنہ ۶۴۶ھ (سنہ ۱۲۴۵ء) میں شہنشاہ محمد تغلق بھی یہاں ہو کر گزرا تھا۔ سنہ ۷۱۴ھ (سنہ ۱۳۱۴ء) میں راٹھوروں کی تنبیہ و تادیب کے لئے شہنشاہ سکندر خاں کو بھی آنا پڑا تھا۔ سلطنت شرقیہ جونپور کی تواریخ و واقعات میں بھی شمس آباد کا نام بارہا آیا ہے ملک بہلول لودی بادشاہ دہلی کے ہاتھ سے جب اُس سلطنت کا قلع و قمع ہوا تو سنہ ۸۸۴ھ (سنہ ۱۴۷۹ء) میں کھور کے خاندان کا بھی قطعی فیصلہ ہو گیا۔ سنہ ۹۰۱ و ۹۰۲ھ (سنہ ۱۴۹۴ و ۱۴۹۵ء) میں سکندر لودی نے بھی کچھ زمانہ یہاں بسر کیا تھا۔ موضع سکندرپور اُسی قیام کی یادگار ہے۔ سنہ ۹۰۶ھ (سنہ ۱۵۰۰ء) میں یہ قصبہ اور پرگنہ اُس نے عماد خاں و سلیمان خاں، افاغنہ فرملی کو دیا تھا۔ بابر نے اولاً یہ نظر التیام سنہ ۹۳۵ھ (سنہ ۱۵۲۸ء) میں اسکو راجہ چندر سین کو دینا چاہا تھا مگر بعد ازاں اُسی سال بکرماجیت سسودیہ کے حوالہ کر دیا، جس نے رنتھمبور سا حصین حصن دے کر اُس کے عوض میں شمس آباد لیا تھا اس سے کچھ زیر نشیب پٹھانوں نے

(۱۸) حاجی صفت اللہ خیرآبادی جو اجلہ مشائخ وصنا دید فضلاء سے تھے، ۱۲۳۲ھ (۱۸۲۰ء) میں وارد بلگرام ہوئے تو اپنے مرتبہ اور علو شان اور جماعت معتقدین و مسترشدین کی تعظیم و تکریم کا کچھ خیال نہ فرمایا بلکہ میر عبدالجلیل سے ملنے کے لئے خود اُنکے دیوان خانہ پر تشریف لائے اور بہت سے خواہشمندوں کو اپنے جمال باکمال اور مقال فیض اشتمال سے مشرف فرما گئے۔

(۱۹) ارباب دولت و حشمت میں سے حاجی سید حسین صفاہانی متخلص بہ خالص و مخاطب بہ امتیاز خاں، دیوان صوبۂ عظیم آباد پٹنہ خاصکر قابل ذکر و اعتنا ہے۔ جیساکہ ایک موقع پر تحریر ہو چکا ہے شاہ عالم کے عہد میں اُس نے اپنے وطن (ایران) کا عزم کیا۔ شہر بھکر میں پہونچا۔ میر عبدالجلیل سے ملاقات ہوئی۔ خود بڑا سخن سنج و سخن فہم امیر تھا۔ میر سے بڑی پر لطف صحبتیں رہیں۔ امتیاز خاں اپنے ساتھ کثیر مال و متاع اور لاکھوں روپیہ نقد اور جواہر بیش بہا و پارچہ لیکر جا رہا تھا۔

شاہی گورنر ابو المحمد بیرہ مانز سے شمس آباد چھین لیا تھا اور ۹۸۳ھ (۱۵۷۵ء) میں ایک اور صوبہ دار حسین خاں ٹکریہ کو رخصت کر چکے تھے

کھور اور اُسکے راجگان کے رفیع و وسیع ور کا نام و نشان صرف ایک بلند ٹیلہ سے قائم ہے جو کوٹ کہلاتا ہے اراضی نشیبی کی سطح سے اسکا ارتفاع تیس فٹ ہوگا۔ پُرانے شہر کے نام سے انتساب کر کے والی، قنوجیہ برہمنوں کی ایک جماعت باقی ہے جو اپنے کو کھور کا پانڈے کہتے اور اُس پر فخر کرتے ہیں۔

موجودہ قصبہ کی بنیاد ۹۹۷ھ (۱۵۸۹ء) میں مرزا طاہر نے ڈالی تھی۔ آئین اکبری میں اسکا تذکرہ بذیل سرکار قنوج ان الفاظ میں ہے "شمس آباد۔ قلعہ دارد بر کنار آب گنگ" اپنی پریشانی و سرگردانی کے ایام میں مشہور مورخ شیخ عبدالقادر بدایونی بھی کچھ روز یہاں بپاہ گیر اقامت گزین رہا ہے بدایوں کا عامل اُسوقت شمس آباد ہو کر تھا۔

آثار قدیمہ میں، قلعہ کے کھنڈرے ابھی کوٹ پر، سب سے پُرانی تعمیر جامع مسجد ہے۔ بالائے محراب، ایک پتھر پر اُبھرے ہوئے حروف میں یہ قطعۂ تاریخ کندہ ہے ؎

دین پرور محمد خانِ بلند رتبہ ، · کرد اسب گوئے دولت ما صولجان جہاں
وارد چو ذوق طاعت آں محسن زمانہ · مرتب داد مسجد از عون و لطف یزداں
تاریخ آں رضائی جست از خرد۔ بگفتا · شد خانۂ الٰہی تاریخ مسجد جاں
(۱۰۳۲ھ (۱۶۲۳ء))

اسی کے قریب سید سالم کا مزار ہے جو یہاں کے اکثر سادات قنائی کے مورث اعلی ہیں۔ میر عزیز اللہ کی درگاہ پورب کو ہے۔ بزرگ بہت مرتاض اور خدا رسیدہ بزرگ تھے۔ کھور کی شکست اور

میر صاحب کو اطلاع تھی کہ خدا یار خاں والی سندھ اس دولت و سامان کو بُرے حسد و حرص سے دیکھتا ہے۔ میر نے امتیاز خاں کو آگے بڑھنے سے روکا اور وہیں سے واپس جانیکا مشورہ دیا اور اصرار کیا لیکن وہ کب سُننے والا تھا۔ جولانگاہِ فاضل کی طرف سر بکف روانہ ہوا۔ سیوستان پہونچا تو میر محمد اشرف (میر عبد الجلیل کے داماد) وہاں نائب خدمت تھے اُنہوں نے کمال گرم جوشی سے استقبال کیا اور اپنی حویلی میں فروکش کرایا۔ خدا یار خاں نے کسی تقریب یا حیلہ سے محمد اشرف کو خدا آباد بلا بھیجا اور اپنے آدمیوں کو بھیجکر امتیاز خاں کا کام تمام کرادیا۔ میر نے "آہ آہ۔ امتیاز خاں" ۱۱۲۳ھ (۱۷۱۱ء) تاریخ نکالی۔ امتیاز خاں میر کے کمالات اور تبحر کا نہایت دلدادہ تھا اور بیحد توصیف کرتا اور معتقدانہ

شمس الدین کی فتح آپ ہی کی برکت و دعا سے منسوب کیجاتی ہے۔ جانب غرب تھوڑا کھاڑ بائے پر نواب جعفری بیگم رئیسہ مرحومہ کا تعمیر کردہ پختہ پل ہے، جسکے قریب ایک ولی اللہ حسین شاہ زندہ دوست کا مقبرہ ہے جو ایک صاحب کمال درویش تھے۔

شمس آباد کی شہرت و ناموری حقیقتاً پون صدی سے یہاں کے نواب صاحبان کے دامن دولت سے وابستہ ہے۔ اپنے باپ اعتماد الدولہ ضیاء الملک نواب سید فضل علی خاں سہراب جنگ وزیر اودھ کی وفات کے بعد نواب جعفری بیگم صاحبہ اور اُنکے شوہر نامدار سید محمد علی خاں عرف نواب دولہ صاحب نے ۱۸۳۵ء میں یہاں قیام اختیار فرمایا تھا۔ بیگم صاحبہ کے اجداد سادات بارھہ سے تھے۔ باپ کی طرف سے یہ عتیرۂ عالیہ موسوی سید (امام ہفتم سید نا موسیٰ کاظم علیہ السلام کی نسل محترم)، شاہ صفی اردبیلی کی اولاد سے ہے جو ایران کے ملوک صفوی کے دادا تھے "ایں خانہ تمام آفتاب است" کا مصداق یہی دودمان محتشم ہے، جسکے ممتاز ارکان باہمہ اِبالت و حکومت، امارت و دولت کریم الاخلاق، پیکر خلوص و وفا، زیور علم و کمال سے آراستہ، نہایت روشن خیال سراپا تہذیب و شائستہ اولو العزم ہیں قصبہ اور اُسکے اطراف میں عظیم الشان مساجد اور امام باڑے، محلات، کوٹھیاں تعمیر کرائی ہیں اور ہر طرح کی ترقی و رونق دی ہے ؎

للہ قوم اذا حلوا بمنزلۃ — حل الرضا و لبسیر الجود ان ساروا

۵۵۴ ولادت ۱۱۷۶ھ (۱۷۶۲ء)۔ وفات صفر ۱۲۶۵ھ (دسمبر ۱۸۴۸ء)

۵۵۵ ساٹھ برس کی عمر میں ۱۲۳۱ھ (۱۸۱۹ء) میں رحلت فرمائی

۵۵۶ ۱۲۵۷ھ (۱۸۴۲ء) میں انتقال کیا۔ سن مبارک اسی سال تھا۔

۵۵۷ خدا آباد۔ یہ ویران قصبہ تعلقہ دادو ضلع لاڑکانہ ملک سندھ صوبہ بمبئی میں سیہوان سے سولہ میل پر شمال و مشرق کے سمت ریل کی سڑک پر واقع ہے تھارنٹن صاحب نے اسکی نسبت ۱۸۴۳ء میں لکھا ہے

ملتا تھا۔ اپنے دیوان کا ایک انتخاب بھی پیش کیا تھا۔

(۲۰) مرزا احمد یار خاں برلاس متخلص بہ یکتا عالمگیر کے عہد میں صوبہ دار ٹھٹہ[۵۵] تھا اور بہت سے کمالات و فضائل کا جامع خط نہایت پاکیزہ و پختہ لکھتا۔ تصویر بکمال نفیس و تحفہ بناتا۔ ہر قسم کے شعر نہایت خوب کہتا محمد عاقل خاں یکتا لاہوری کے ساتھ اُسکا مقابلہ اور اہل فن کا احمد یار کے حق میں فیصلہ مشہور ہے۔ ۱۱۱۹ھ (۱۷۰۷ء) میں وارد بھکر ہوا تو میر عبدالجلیل کی صحبت میں معتقدانہ حاضر رہا۔ اپنے قلم کا خط نسخ میں لکھا ہوا کلام اللہ کا ایک نسخہ بھی بطریق یادگار حوالہ کیا تھا۔ ۲۳ جمادی الاولی ۱۱۴۷ھ مطابق ۱۲ ستمبر ۱۷۳۴ء کو قصبہ خوشاب اعمال لاہور میں وفات پائی۔

(۲۱) سید قریش بلگرامی متخلص بہ عجیب میر عبدالجلیل کے حقیقی خالہ زاد بھائی تھے۔ خوش خلق و

تیس سال سے کچھ زائد گر اکہ وسعت اور آبادی میں حیدر آباد سندھ کا مقابلہ کرتا تھا۔ نہایت سرسبز و بارونق تھا مگر آج اس قصبہ میں ایک گھر بھی ایسا باقی نہیں ہے جو آباد ہو۔ یہ سندھ کے تالپوری امیروں کا نہایت دلپسند مسکن تھا۔ اُن سرداروں میں سے اکثر اب اُن مقبروں میں راحت گزیں ہیں جنکی سادہ اور ستھری تعمیر بنوانے والوں کے حسن انتخاب اور سلامت ذوق کی یادگار ہے یہاں کے مخصوص اور دلچسپ مقامات میں سے فی الحال ایک پرانی مسجد باقی ہے جو ۱۱۲۲ھ (۱۷۱۰ء) میں تعمیر ہوئی تھی اور جسپر نہایت خوشنما چینی کا کام ہے۔ دوسرا یار محمد کلہوڑہ کا مقبرہ جو ایک میل کے فاصلہ پر ہوگا۔ اسکی تزئین بھی ویسی رنگین ٹھیکروں سے کی گئی ہے۔ مقبرہ تو ابھی اچھی حالت میں ہے لیکن مسجد کو بہت نقصان پہونچ چکا ہے اور ویران و شکستہ حال ہے۔ یہاں کی زبان سندھی ہے۔

شیخ حزیں اپنی روئداد سفر میں لکھتے ہیں کہ نواحی ٹھٹہ (ٹھٹہ) سے حیدرآباد تک ایک رود جاری (سہستا) ہوا ہے اور مسافت بھی چند روز کی ہے۔ یہ بھی کشتی پر آئے تھے۔ سارا راستہ نہایت لطف و تفریح سے طے ہوا تھا لیکن خدا آباد پہونچکر سات مہینے پڑے رہے۔ گرمی کی شدت اور ہوا کی خرابی سے مختلف امراض صعب میں گرفتار ہوگئے تھے

واضح رہے کہ ایسٹ انڈیا کمپنی کی جماعت ڈائرکٹران کے حکم سے کپتان تھارنٹن نے یہ گزیٹر مرتب کیا تھا جو لندن میں ۱۸۴۴ء میں دو جلدوں میں شائع کیا گیا A Gazetteer by Cap E Thornton R

[۵۵] ٹھٹہ (یا ٹہاٹو جسکو باشندگان زیادہ تر نگر ٹھٹا کہتے ہیں) ضلع کراچی ملک سندھ میں ایک قصبہ اور ایک تعلقہ کا صدر مقام رہ گیا ہے۔ دریائے سندھ یہاں سے سات میل پر ہوگا۔ عہد عالمگیر میں ٹھٹہ ایک زرخیز صوبہ تھا جسکے متعلق چار سرکاریں ستاون محال اور پانچ بندرگاہ تھے۔ اور ٹھٹہ بادینی شہر عظیم مانا گیا تھا۔ نمک و آہن کی معادن یہاں تھیں۔

یہ قصبہ مکلی Makli پہاڑیوں کے دامن میں واقع ہے کیونکہ دریا سندھ کا پانی اسکی ہر طرف رواں تھا اب بھی جب طغیانی فرو ہوکر پانی نکل جاتا ہے تو جا بجا تالاب اور گڈھے بھرے رہ جاتے ہیں۔ آب و ہوا تکلیف دہ اور سردی ناسازگار ہے۔ بخار شدید پھیلا رہتا ہے۔ ریل اسٹیشن سے تیرہ میل کا فاصلہ ہے۔ سڑکیں

ظریف تھے۔ سلیقۂ نظم خوب حاصل تھا میر صاحب کی مدح میں کہتے ہیں ؎

گل ہمان بو کہ نہ گلزار حمیر باشد
گل ہماں بو کہ ز میخانۂ کوثر باشد

گوہر آں نیست کہ از نطفۂ نیساں زاید
گوہر آن است کہ از معدن حیدر باشد

اے خوشا تازہ نہالے کہ بہ بستاں شرف
دست پرور دۂ زہرا اطہر باشد

آنکہ از جبہۂ او نور سیادت پیداست
عالم افروز تر از نیر اکبر باشد

ور ز سینے کہ بجد و گل خلق حسنش
برکت خاک بخاصیت عنبر باشد

چشم بد دور ز سیمائے حسینی نسبی
چمن آرائے جہاں این گل احمر باشد

مدح او را نتواں در قلم آورد عجیب
زانکہ از حوصلۂ خامہ فزوں تر باشد

پختہ کر دی گئی ہیں۔

ٹھٹہ کی تاریخ نہایت دلچسپ و قدیم ہے۔ حالات زیادہ تر تاریخ[1] حاجی محمد صدیق بارہ[2] ومعاصرہ احکام محبت نامہ[3] میں ملتے ہیں۔ اوٹرم صاحب لکھتے ہیں کہ اسکی سعادت سنہ ۱۴۴۵ء (سنہ ۸۴۹ھ) میں پڑی تھی۔ دیگر مورخین سنہ ۱۵۲۲ء (سنہ ۹۲۸ھ) بتاتے ہیں۔ اجماع روایات اسی قدر ہے کہ جام نظام الدین عرف جام ندا جو سماکے شاہی خاندان سے تھا اسکا بانی تھا۔ ٹھٹہ جب سماسلاطین کا دار السلطنۃ تھا تو یہاں کا فرمانروا جام کہلاتا تھا۔ پوسٹنس Postans راوی ہے کہ سنہ ۱۵۵۵ء (سنہ ۹۶۳ھ) میں پرتگالی اجوہ دار دوں نے ٹھٹہ پر حملہ کیا اور غارت کر ڈالا تھا۔ سنہ ۱۵۹۲ء (سنہ ۱۰۰۱ھ) میں جب اکبر نے سندھ کو اپنے قلمرو میں داخل کیا تو اُسوقت یہاں کا والی مرزا جانی بیگ تھا۔ آزاد دہلوی دربار اکبری میں لکھتے ہیں کہ تیموری خاندان کے مانی شاہی امرا کہلاتے تھے، بادشاہ نے ٹھٹہ بطور جاگیر اُسکو واگذار کر دیا۔ سنہ ۱۶۱۲ء (سنہ ۱۰۲۱ھ) میں بادشاہ بادشاہ ابرا کے حوالہ ہوا۔ پھر کلھوڑ خاندان میں آیا وہاں سے تال پور کے میر صاحبان کے یہاں ہوگیا۔

الیگزینڈر ہملٹن سنہ ۱۶۹۹ء (سنہ ۱۱۱۱ھ) میں یہاں سے گزرا تھا وہ اسکو ایک عظیم اور دولتمند شہر بتاتا ہے۔ لکھتا ہے کہ اُسکے پہونچنے سے کچھ پہلے ٹھٹہ میں اسی ہزار نفوس طاعون سے ہلاک ہو چکے تھے۔ ایک دوسرا یورپین سیاح پاٹنجر Pottinger لکھتا ہے کہ جب نادر شاہ اپنی فوج لیکر سنہ ۱۷۴۲ء (سنہ ۱۱۵۵ھ) میں یہاں داخل ہوا تھا تو چالیس ہزار پارچہ باف بیس ہزار صناع اور دستکار اور ساٹھ ہزار دیگر تاجر اور اہل حرفہ یہاں بستے تھے

ٹھٹہ کی آبادی اٹھارہویں صدی مسیحی میں بہت گھٹ گئی بیان ہے وڈ J Wood نے جب سنہ ۱۸۳۷ء میں دیکھا ہے تو اُسکے تخمینہ میں دس ہزار سے زائد تھی۔

بحالت موجودہ ٹھٹہ کی مردم شماری ساڑھے آٹھ ہزار کے قریب ہے۔

ایسٹ انڈیا کمپنی نے سنہ ۱۷۷۵ء (سنہ ۱۱۸۹ھ) میں یہاں ایک کوٹھی کھولی تھی جو سنہ ۱۷۸۵ء (سنہ ۱۱۹۹ھ) میں بند کر دی۔ ریشم اور روئی کے منسوجات اور بعض دیگر مصنوعات اور غلہ کی تجارت اب بھی کسیقدر باقی ہے۔

امرا و سلاطین

عہد اورنگ زیب عالمگیر سے لے کر عصر محمد شاہ بادشاہ تک تمام امرائے عظام میر عبدالجلیل کا بڑا اعزاز و احترام فرماتے اور صحبت والا کے تشنہ و متمنی رہتے۔ حسین علی امیر الامرا کو بالخصوص کمال الفت تھی۔ اپنی مجلس میں برملا کہا کرتے تھے کہ "میر عبدالجلیل در ہر عصر نظیر ندارند" اور لوازم احترام فوق الحد بجا لاتے تھے۔ میر صاحب نے بھی دل کھول کر انکی مدحت سرائی فرمائی ہے اور انکا نام دنیائے علم میں زندہ جاوید بنا دیا ہے۔ میر صاحب کے قصائد و مراثی جو امیر الامرا کی شان میں ہیں، دونوں کے مراسم و ارتباط اور مخلصانہ تعلقات کے شاہد ہیں۔

ایک موقع پر میر عبدالجلیل امیر خسرو سے اپنا تشابہ (مثنوی طوی فرخ سیر بادشاہ کے فخریہ میں)

عہد اسلامی کی یادگار ٹھٹھہ کے اندر ایک مسجد جامع ہے جو شاہجہاں کے حکم سے سنہ ۵۴ھ (سنہ ۱۶۴۴ء) میں تعمیر ہوئی تھی شاہجہاں جب اپنے باپ جہانگیر کے پاس سے بھاگ کر یہاں آیا تھا تو ٹھٹھہ والوں نے اسکی شایان شان عزت و توقیر کی تھی۔ وہ یہاں کی قدیم جامع مسجد میں نماز ادا کرنے جاتا تھا۔ اسی حسن سلوک کی یادگار میں تاج و تخت پانے کے بعد شاہجہاں نے یہ خوشنما اور نفیس مسجد تیار کرادی تھی۔ مسجد بہت مرمت طلب ہوگئی تھی مگر کچھ عرصہ ہوا کہ عوام کے چندے اور سرکاری امداد سے کافی درستی کرادی گئی ہے۔ شہر کے جنوب میں دیگر مسجد Dabgar Mosque بہت پرانی سنہ ۹۱۵ھ (سنہ ۱۵۹ء) کی تعمیر ہے اس پر نہایت عمدہ چینی کا کام کیا ہوا ہے۔ ٹھٹھہ کا قلعہ بعہد اورنگ زیب سنہ ۱۱۱۱ھ (سنہ ۱۶۹۹ء) میں زیر اہتمام نواب حفیظ اللہ خاں تعمیر ہونا شروع ہوا تھا۔ تکمیل کی نوبت نہیں پہونچی۔ اب تو لوگوں نے بنیادیں تک کھود لیں اور اینٹ اور مصالح دوسری عمارات میں لگا دیا ہے۔

مسلمانوں کے زمانہ میں ٹھٹھہ کا نام رحیم آباد تھا۔

کپتان ہملٹن (جسکا نام ابھی لے چکا ہوں) ایک نامور عالم سیاح اور تاجر تھا۔ وہ ہندوستان میں عہد اورنگ زیب میں آیا تھا۔ اس نے پچیس ۲۵ سال کے قریب اس ملک میں گزارے تھے۔ اپنا مکمل سفرنامہ تحریر کیا تھا۔ اس میں شہر ٹھٹھہ اور سورت کے حالات، مسلمانوں کی حکومت اور انکی مذہبی رواداری اور مختلف اقوام کے مراسم و دستورات کو بخوبی و بہ تفصیل لکھا ہے۔ وہ ایک موقع پر لکھتا ہے کہ سندھ کا شہر ٹٹہ (ٹھٹھہ) دریائے انڈس سے دو میل کے فاصلہ پر ہے نہروں اور موریوں کے ذریعہ سے دریا سے شہر و باغات میں آب رسانی کا انتظام کیا گیا ہے۔

شیخ علی حزیں بھی سنہ ۱۱۵۴ھ (سنہ ۱۷۴۱ء) میں ٹھٹھہ آئے تھے۔ دو ماہ قیام کیا تھا۔ اپنے سوانح حیات میں شہر کی بڑی تعریف کی ہے اور یہاں کے تاجروں کی کمال تحسین۔

ان الفاظ میں ظاہر کرتے ہیں ؎

چناں کردم سخن در نغمہ انشاد — کہ روح میر خسرو گشت زو شاد

... ...

اگرچہ میر خسرو بود او ستاد — ندارد چرخ چوں او دیگرے یاد
بفکر دور دو پرواز دارد — نبی نبود ولے اعجاز دارد
در انواع سخن کاندر جہان است — بقدرت خسرو صاحب قران است
ولے من ہم ازیں گلدستۂ نو — دریں عصرم بجائے میر خسرو
کمال از ہر نمط دل خواہ دارم — امید تربیت ارشاہ دارم

... ...

صلہ گر داد خسرو را خضر خاں — بہ نظم مثنوی گنج فراواں
شہ ما چشمۂ آب حیات است — کہ صد چوں خضر خاں راز و برات است

واقعہ بھی یہی ہے کہ امیر کے ساتھ میر کا نسبتاً بہ جامعیت علم و عمل کی راہ سے تھا اور ارباب دول کی مصاحبت سے بھی۔ آغاز سے انجام تک امیر نے بادشاہان دہلی کے ساتھ بسر کی اور بقول اُن کے سات بادشاہوں کی خدمت کی تھی۔ طرفہ یہ ہے کہ میر بھی سلاطین تیموریہ (دہلی) میں سے سات بادشاہو[۵۹]

[۵۹] موجودہ نصاب تعلیم کی بدولت، ہندوستان کے مسلمان بادشاہوں کے حالات، واقعات اور کارنامے کسی تفصیل کے محتاج نہیں بالخصوص خاندان تیمور کے آخر زمانہ کی تاریخ تو کافی ووافی شہرت رکھتی ہے اس لئے زمانہ کا تعین کرنے اور اُس کا سلسلہ قائم رکھنے کے لئے مختصراً تحریر کیا جاتا ہے۔

نمبر	نام	از بطن	ولادت	تخت نشینی	وفات مدفن	لقب بعد وفات
۱	ابوالمظفر محی الدین محمد اورنگ زیب عالمگیر بادشاہ بن شاہجہاں بادشاہ	ارجمند بانو بیگم ملقب بہ ممتاز محل	۱۱- ذیقعدہ سنہ ۱۰۲۸ھ شب یکشنبہ مطابق ۱- اکتوبر سنہ ۱۶۱۹ء قدیم	۹ رمضان سنہ ۱۰۶۸ھ کو عالمگیر سلطنت ہوا جلوس فو زجمیہ غرہ ذیقعدہ سال مذکور مطابق ۲ اگست سنہ ۱۶۵۸ء جدید	جمعہ ۲۸ ذیقعدہ سنہ ۱۱۱۸ھ مطابق ۲۰ فروری سنہ ۱۷۰۷ء قدیم و ۳ مارچ سنہ ۱۷۰۷ء جدید مقام احمد نگر مدفن روضہ شاہ زین الدین واقع خلد آباد اورنگ آباد	خلد مکان

کے لوازم خدمت بجالائے تھے یعنی (۱) عالمگیر اورنگ زیب (۲) شاہ عالم بہادر شاہ (۳) محمد معز الدین جہاندا

نمبر	نام	ام البطن	ولادت	تخت نشینی	وفات و مدفن	لقب بعد وفات
۲	قطب الدین محمد شاہ عالم بہادر شاہ (شاہزادہ محمد معظم) خلف دوم عالمگیر بادشاہ	نواب بائی (ہندو رانی)	۳۰ رجب سنہ ۱۰۵۳ھ مطابق ۴ اکتوبر سنہ ۱۶۴۳ء برہانپور دکن	دوشنبہ ۱۹ ربیع الاول سنہ ۱۱۱۹ھ مطابق ۷ جون سنہ ۱۷۰۷ء آگرہ شمار جلوس از ذیقعدہ سنہ ۱۱۱۸ھ	دوشنبہ ۲۰ محرم سنہ ۱۱۲۴ھ مطابق ۱۷ فروری سنہ ۱۷۱۲ء دہلی قطب صاحب	خلد منزل
۳	محمد معز الدین جہاندار شاہ فرزند بہادر شاہ (محمد معظم)	نظام بائی	۱۰ رمضان سنہ ۱۰۷۳ھ چہارشنبہ مطابق ۸ اپریل سنہ ۱۶۶۳ء دکن میں	آخر صفر یا ۱۴ ربیع الاول سنہ ۱۱۲۴ھ مطابق ۱ اپریل سنہ ۱۷۱۲ء سہ شنبہ لاہور شمار از ۱۰ محرم سنہ ۱۱۲۴ھ	۲۳ ذیحجہ سنہ ۱۱۲۴ھ کو یعنی آخر دسمبر سنہ ۱۷۱۲ء یا شروع جنوری سنہ ۱۷۱۳ء میں قتل ہوا	+
۴	معین الدین محمد فرخ سیر پسر عظیم الشان ابن شاہ عالم	صاحبہ نسواں	۱۸ رمضان سنہ ۱۰۹۸ھ مطابق ۱۸ جولائی سنہ ۱۶۸۷ء	۱۷ ذیقعدہ سنہ ۱۱۲۴ھ اکبرآباد جلوس جمعہ ۲۴ ذیحجہ سنہ ۱۱۲۴ھ مطابق ۹ جنوری سنہ ۱۷۱۳ء قلعہ دہلی	۱۸ جمادی الثانی سنہ ۱۱۳۱ھ مطابق ۱۷ اپریل سنہ ۱۷۱۹ء یا ۹ رجب سنہ ۱۱۳۱ھ مطابق ۱۶ مئی سنہ ۱۷۱۹ء کو قتل کیا گیا دہلی مقبرہ ہمایوں	شاہ شہید ۹ ربیع الثانی سنہ ۱۱۳۱ھ مطابق ۱۷/۱۸ فروری سنہ ۱۷۱۹ء کو گرفتار و محبوس ہوا اس کے عہد میں ایسٹ انڈیا کمپنی کو یہاں آزادی تجارت ملا تھا
۵	شمس الدین محمد ابوالبرکات بادشاہ رفیع الدرجات پسر شاہزادہ رفیع الشان بن شاہ عالم	نور النسا	۔ ۔	۹ ربیع الثانی سنہ ۱۱۳۱ھ مطابق ۱۰ فروری سنہ ۱۷۱۹ء دہلی	۱۹ رجب سنہ ۱۱۳۱ھ مطابق ۲۸ مئی سنہ ۱۷۱۹ء دہلی، قطب صاحب	راجہ جیت سنگھ [illegible] کے کہنے سے ہندوؤں کی استمالت کے لئے جزیہ اٹھا دیا تھا
۶	شمس الدین رفیع الدولہ محمد شاہ جہان ثانی برادر کلاں رفیع الدرجات	ایضاً	۔	۱۹/۲۰ رجب المرجب سنہ ۱۱۳۱ھ مطابق ۲۰ مئی سنہ ۱۷۱۹ء	۷ ذیقعدہ سنہ ۱۱۳۱ھ مطابق ۶ ستمبر سنہ ۱۷۱۹ء دہلی قطب صاحب	×

شاہ (۴) محمد فرخ سیر (۵) رفیع الدرجات (۶) شاہجہاں ثانی (۷) محمد شاہ۔ رفیع الدرجات اور شاہجہاں ثانی برائے چندے سریر آرائے فرمانروائی رہے تھے غارت گر اجل نے اُنکو زیادہ فرصت و مہلت نہیں دی تھی۔ تاہم میر نے شاہجہاں ثانی کی شان میں ایک زبردست قصیدہ مہمیہ لکھا تھا

جب میر عبدالجلیل محض طالب علم تھے اور اُن کو سید طفیل محمد کے ساتھ اکبر آباد جانیکا اتفاق ہوا تو نواب فضائل خاں کے یہاں بڑے بڑے علمی جلسے دیکھے جماعت فضلاء کی اکثر نشست ہوتی تفسیر و حدیث و کلام اللہ کا تذکرہ ہوتا۔ ہر قسم کی چھیڑ چھاڑ رہتی میر صاحب کو یہاں بھی بلند جگہ ملتی وہ اپنی استعداد و قابلیت، یادداشت و جودت و ذہانت کی بدولت اکثر فائق و برتر رہتے۔

نواب آصف جاہ

نواب نظام الملک آصف جاہ طاب ثراہ کی نسبت میر غلام علی بلگرامی سرو آزاد میں لکھتے ہیں کہ

"بروز تعالیٰ امراء سلف ہویداست کہ در طبقہ سلاطین تیموریہ و طبقات پیشیں امیرے بایں اقتدار چشم روزگار کم مشاہدہ کرد قریب سی سال بایالت ممالک دکن پرداخت و قلمروے کہ سریر فرمان چندیں سلاطین ذوی الاقتدار بود تنہا در تصرف داشت و فتوحاتے کہ کارنامۂ روزگار باشد بجلوہ آمد و مستحقین را بہ خیرات و مبرات فراواں نواخت۔ از دفتر صدارت تحقیق نمودہ شد کہ سہ لکھ روپیہ بدستخط او سوائے انعامات بادشاہی در صوبجات دکن بطریق یومیہ و روزینہ بہ ارباب استحقاق می رسید و سوائے ایں قریب یک لکھ روپیہ بمردم بیج رو و غیرہم رعایت می فرمود"

۷۔ ابوالفتح ناصر الدین محمد شاہ بادشاہ معروف بہ سلطان روشن اختر پسر جہان شاہ محمد اختر پسر بہادر شاہ	نواب قدسیہ بیگم	۲۳ ربیع الاول سنہ ۱۱۱۳ھ مطابق ۱۷ اگست ۱۷۰۲ء بنواحی غزنیں	۱۵ ذیقعدہ سنہ ۱۱۳۱ھ مطابق ۲۹ ستمبر ۱۷۱۹ء اکبر آباد	۲۷ ربیع الثانی سنہ ۱۱۶۱ھ مطابق ۱۶ اپریل سنہ ۱۷۴۸ء مقبرہ دہلی نظام الدین اولیاء	فردوس آرامگاہ

سادات و علماء و مشائخ دیارِ عرب و ماوراءالنہر و خراسان و عراق عجم و ہندوستان آوازۂ قدردانی استماع یافتہ رو بہ دکن آوردند۔ و در خورِ قسمت حظّے از احسانِ عام اندوختند"

نواب کے احوال ذاتی کے بیان سے پہلے اُن کے خاندانِ عالی اور آباءِ عظام اور بزرگان تمام کی نسبت گزارش کرنا ضروری ہے۔

صاحبقرانِ ثانی (شاہجہاں) کا وزیرِ اعظم سعداللہ خاں اُن کا نانا (جد مادری) تھا۔ دادا کا نام عابد خاں تھا۔ پردادا شیخ عالم' اکابرِ رؤسائے سمرقند اور شیخ شہاب الدین سہروردی کی اولاد سے تھے۔ عابد خاں عہدِ شاہجہاں میں ہندوستان چلے آئے۔ یہاں بہ نگیر بادشاہ کی روشناسی اور شاہزادہ اورنگ زیب کی خدمت و ملازمت سے شرف و افتخار حاصل کیا جب اورنگ زیب اور اُسکے بھائیوں سے محاربہ ہو رہا تھا یہ ملتزم رکاب تھے۔ اورنگ زیب' زیب دہِ اورنگ ہوا تو ان کو چار ہزاری منصب عطا کیا۔ جلوس کے چوتھے سال میں صدارتِ کل کی خدمت پر ممتاز ہوئے بعد ازاں پنج ہزاری منصب اور قلیچ خاں خطاب پایا اعزاز و افتخار بڑھا۔ صدارت سے ایکبار علٰحدہ ہو کر پھر عزت دوبارہ پائی رعایا و برایا کو فورِ عدل و احسان سے شادکام و خوشدل بنادیا اور مہادِ امن و امان بچھا دیا ؎

آرام یافت در کنفِ عدل وحش و طیر وآسودہ گشت در حرمِ امن انس و جاں

قلعۂ گلکنڈہ (حیدرآباد) کے محاصرہ میں ۲۴ ربیع الاول ۱۰۹۸ھ (۲۸ جنوری ۱۶۸۷ء) کو توپ کا گولہ لگا۔ زخم کھایا اور جانِ عزیز اپنے شہریار اور اُسکی شہریاری پر نثار کردی

الولد سرٌ لابیہ۔ عابد خاں کے فرزند میر شہاب الدین نے بڑے بڑے مرتبے پائے۔ سات ہزاری منصب سات ہزار سوار اور "غازی الدین خان بہادر فیروز جنگ" خطاب مرحمت ہوا بیجاپور کی فتح میں اس شیردل نے بڑی شجاعت اور مردانہ ہمت سے کام لیا تو "فرزندِ ارجمند" کا طرہ القاب سابق پر اضافہ ہوا شاہ عالم کے عہد میں صوبہ داری گجرات پر مامور ہوئے اور اسی زمانۂ حکمرانی گجرات ۱۱۲۲ھ (۱۷۱۰ء) میں عالمِ آب و گِل کو خیرباد کہا۔

نواب نظام الملک آصف جاہ نواب غازی الدین خان کے خلف الرشید تھے۔ اصلی نام میر قمر الدین

اور سال ولادت ۱۰۸۲ھ (۱۶۷۱ء) تھا آغاز شباب میں اس جوہر قابل پر خلد مکاں کی نظر پڑی تو چار ہزاری منصب اور چین قلیچ خاں خطاب سے سرفراز فرمایا۔ واکنکیرہ کے قلعہ کی تسخیر میں کمال استقامت و جوانمردی اور حسن نظمی دکھائی تو ہزاری اضافہ ہو کر پنج ہزاری منصب پر عروج پایا۔ خلد مکاں کی رحلت پر شاہزادوں کے باہم تنازع دیکھا تو کمال حزم و احتیاط سے کام لیا اور کسی فریق کی جانب داری و حمایت پسند نہ کی

شاہ عالم تخت نشین ہوا تو "خان دوراں بہادر" خطاب دیا اور صوبہ داری اودھ بمع فوجداری اودھ کے مرحمت فرمایا۔ اُس وقت تک لکھنؤ کا فوجدار حضور عالی سے مقرر ہو کر آتا تھا میر عبد الجلیل بلگرامی نے اسی خطاب "خان دوراں بہادر" میں خطاب کی تاریخ پائی

نواب نظام الملک نے جب تھوڑے ہی دنوں میں امرائے جدید کا بازار گرم اور امرائے قدیم کا کاسد دیکھا تو نوکری سے مستعفی ہو کر دار الخلافہ شاہجہاں آباد کو چلے آئے۔ درویشانہ لباس پہن لیا اور خانہ نشین ہو گئے ؎

از بال و پر غبار تمنا فشاندہ ایم — بر شاخ گل گراں نبود آشیان ما

شاہ عالم کی رحلت پر جب محمد معز الدین نے چند روز کے لئے تاج تیموری پہنا تو عروس سلطنت کے حیدہ بلند یا کمند مشکیں نے آصف جاہ کو گوشۂ عافیت سے باہر کھینچ لیا۔ اصل منصب و خطاب سابق پھر عنایت ہوا۔ ہندوستان کے فقراء بے قید نواب پر طعنہ زن ہونے لگے کہ خرقۂ درویشی اتار کر لباس دنیا اختیار کیا اس جماعت کا طریقہ اگرچہ دریوزہ گری ہے لیکن ان حضرات کی وضع و غیرت بھی قابل ستایش ہے کہ پھر اُس وقت سے کبھی نواب نظام الملک کے روبرو دست سوال نہیں بڑھایا۔

جب محمد فرخ سیر تخت نشین ہوا تو "نظام الملک بہادر فتح جنگ" خطاب دیا ہفت ہزاری منصب پر ترقی دیکر انتظام دکن پر مامور کیا فرخ سیر کے معزول ہونے پر اولاً حکومت مراد آباد بعد ازاں حکومت مالوہ سپرد کی گئی۔ ۱۱۳۲ھ (۱۷۲۰ء) میں آصف جاہ دکن چلے آئے۔

دکن کے انتظام و تسلط میں سید دلاور خاں و سید عالم علی خاں وغیرہ سے سخت مقابلہ و مقاتلہ ہوا

نواب نے فتح پائی اورنگ آباد میں داخل ہوگئے۔ امیر الامرا حسین علی خاں اپنے ایک عزیز اور ایک
بھتیجے کے واقعات سنکر متفکر ہوگئے۔ محمد شاہ کو ساتھ لیکر دکن جانے کا عزم کیا۔ لیکن تقدیر کا قلم سادات
بارھہ کی دولت کے زوال کے لئے چل چکا تھا۔ اعتماد الدولہ محمد امین خاں کی تحریک سے میر حیدر کاشغری
نے امیر الامرا کو خنجر سے ہلاک کردیا۔ قطب الملک فوج لیکر مقابلہ کو بڑھا لڑا اور گرفتار ہوگیا۔

محمد امین خاں برادر زادہ نواب عابد خاں کے انتقال پر نواب نظام الملک دکن سے دہلی چلے آئے
اور خلعت وزارت پہنا۔ نواب نے عالمگیر کی آنکھیں دیکھی تھیں۔ اسکی آن بان اور شان حکومت پر فریفتہ تھے
چاہا کہ اسکے آئین و قواعد کو جو ترک ہوگئے تھے تازہ کریں اور از سر نو رواج دیں۔ خود غرض امرا نے اس کو
اپنے مقاصد و اغراض کے منافی و مغائر سمجھا۔ بادشاہ کے مزاج کو نواب کی طرف سے گونہ منحرف کردیا۔
اسی زمانہ (۱۱۳۵ھ یعنی ۱۷۲۳ء) میں حیدر قلی خاں ناظم گجرات نے بغاوت کی تو نواب اسکی تادیب
کے لئے مامور ہوگئے۔ خود کام امیروں کو حضوری سے نواب کے ہٹانے کا موقع ملا نواب ادھر بڑھے تو حیدر
قلی دیوانہ بن گیا بات بحال تھی نہیں رہی۔ نواب دہلی واپس چلے آئے جلد وہی خدمت میں حکومت
دکن و وزارت کے علاوہ صوبہ داری مالوہ و گجرات بھی مرحمت ہوئی امرا کی سازش اور نفاق سے بہت
برداشتہ خاطر ہو رہے تھے ۱۱۳۶ھ (۱۷۲۴ء) میں جب نواب مبارز خاں جو سالہا سال سے ناظم حیدرآباد
تھے معزول ہوئے تو نواب نظام الملک انکی جگہ تمام ممالک دکن کے حاکم مقرر ہوئے۔ نواب علی سبیل الاستعجال
دکن کی سمت روانہ ہوئے مبارز خاں نے مزاحمت کی مارا گیا اور ممالک[۹۰] مجموعہ نواب کے قبض و تصرف

---

[۹۰] حیدرآباد کی ریاست یا سلطنت انگریزی میں The Nizam's Dominions
کہلاتی ہے۔ اس کا رقبہ بیاسی ہزار چھ سو اٹھانوے میل مربع ہے رقبہ کے لحاظ سے اس کا قلمرو آئرلینڈ کے رقبہ سے
ڈھائی گونہ (سے بھی) زائد اور انگلستان اور ویلس (دونوں) کے مجموعی رقبہ کے ڈیوڑھے سے زیادہ ہے
مسلمانوں میں سب سے پہلے علاء الدین خلجی نے ۶۹۳ھ (۱۲۹۴ء) میں دکن پر حملہ کیا اس وقت دیوگری
میں یادو ونسل کا راجہ حکمران تھا علاء الدین نے اسکو مفتوح و مغلوب کیا۔ پھر دولت آباد پر بھی قبضہ کیا۔ بعد ازاں سلطان
محمد بن تغلق نے ان فتوحات کو اور بھی وسعت دیدی حتی کہ شمال سے جنوب تک کل دکن اسلام کے زیر نگیں ہوگیا
اس مردم خیز خطہ میں مسلمانوں کی متعدد سلطنتیں کسی وقت قائم تھیں۔

میں آ گئے۔ اب محمد شاہ بادشاہ، نواب کی استمالت و دلداری اور بھی کرنے لگا۔ ہمیشہ فرامین بھیجکر اظہار عنایات و نوازش کرتا انعامات مخصوص مبذول ہوتے۔ اسی زمانے میں نواب نے آصفجاہ کے خطاب سے شہرت پائی۔ سنہ ۱۱۵۰ھ (سنہ ۱۷۳۷ء) میں بادشاہ نے بمبالغہ تمام نواب کو حضور میں

---

(۱) بہمنی جس کی بنیاد علاء الدین بہمن شاہ نے سنہ ۷۴۸ھ (سنہ ۱۳۴۷ء) میں ڈالی تھی سنہ ۹۳۴ھ (سنہ ۱۵۲۷ء) تک اس خاندان کے اٹھارہ بادشاہوں نے ایک سو چھیاسی سال (قمری یا ایک سو اسی سال شمسی سے زائد) فرمانروائی کی دارالسلطنت پہلے گلبرگہ تھا پھر بیدر رہا۔ احمد آباد اسی خاندان کا آباد کیا ہوا ہے

(۲) عماد شاہی۔ ایلچ پور واقع برار دارالملک تھا چار بادشاہوں نے ۸۹۰ھ (سنہ ۱۴۸۴ء) سے سنہ ۹۸۲ھ (سنہ ۱۵۷۴ء) تک سلطنت کی۔

(۳) عادل شاہی۔ دارالسلطنت بیجاپور۔ دس بادشاہ مدت دو سو دو سال سنہ ۸۹۵ھ (سنہ ۱۴۹۰ء) سے سنہ ۱۰۹۷ھ (سنہ ۱۶۸۶ء) تک اسکندر شاہ اورنگ زیب عالمگیر کے حکم سے سنہ ۱۰۹۷ھ میں قید کر لیا گیا تھا

(۴) نظام شاہی۔ احمد نگر۔ سنہ ۸۹۵ھ (سنہ ۱۴۹۰ء) سے سنہ ۱۰۴۷ھ (سنہ ۱۶۳۷ء) تک، مدت ایک سو سات سال دس بادشاہ اس تخت پر بیٹھے۔ دولت آباد بھی مستقر سلطنت رہا تھا۔ اخیر فرمانروا بہادر یا ابراہیم شہنشاہ اکبر کے عہد میں گرفتار ہوا۔

(۵) برید شاہی بیدر سنہ ۸۹۷ھ (سنہ ۱۴۹۲ء) سے سنہ ۱۰۱۸ھ (سنہ ۱۶۰۹ء) تک

(۶) قطب شاہی دارالسلطنت گلکنڈہ تھا۔ دور حکومت سنہ ۹۱۸ھ (سنہ ۱۵۱۲ء) سے سنہ ۱۰۹۸ھ (سنہ ۱۶۸۷ء) تک رہا ہے۔ اخیر بادشاہ ابوالحسن تانا شاہ نے سنہ ۱۰۹۸ھ میں بمقابلہ اورنگ زیب شکست پائی اور گرفتار ہوا بحالت اسر میں سنہ ۱۱۱۱ھ (سنہ ۱۶۹۹ء) میں فوت ہوا

دکن میں جب نواب آصف جاہ نے اپنی خود مختار سلطنت کی بنیاد ڈالی تو اولاً زیادہ وقت مرہٹوں کے استیصال میں صرف ہوا۔ پھر امرائے دربار نے حسد و رقابت کی وجہ سے سازش کر کے ایک نیا فتنہ برپا کیا مبارز خاں صوبہ دار خاندیس کو مقابلہ و مجادلہ کی خفیہ تحریک کی۔ وہ شامت زدہ میدان میں آ گیا۔ شکر کھیلڑہ (فتح کھیلڑہ) واقع ضلع بلڈانہ ملک برار میں سنہ ۱۱۳۷ھ (سنہ ۱۷۲۴ء) میں معرکہ عظیم ہوا۔ مبارز خاں نے داد مبارزت دی مگر ملک اور جان دونوں سے ہاتھ دھو بیٹھا اسی لڑائی سے نواب کی آزادی و خود مختاری قائم و مسلم ہو گئی۔ اب نواب کے دائرہ حکومت میں برار بھی شامل اور سلطنت میں داخل ہو گیا حیدر آباد دار الحکومت قرار پایا انگریز مورخین لکھتے ہیں کہ انتقال کے وقت یعنی سنہ ۱۱۶۱ھ (سنہ ۱۷۴۸ء) میں وہ ایک سلطنت کے خود مختار و آزاد بادشاہ کی حیثیت رکھتے تھے جس کی بادشاہی موجودہ ریاست بشمول صوبہ برار کے برابر وسعت و دوری میں تھی۔

سنہ ۱۲۰۵ھ (سنہ ۱۷۹۰ء) میں جب ٹیپو سلطان نے اپنی نصف جاگیر انگریزوں وغیرہ کے حوالہ کر دی تو نواب میں

طلب کیا۔ اپنے خلف الصدق نواب نظام الدولہ ناصر جنگ بہادر کو نیابت دکن پر مقرر کرکے خود بہ عجلت تمام دہلی کو روانہ ہوئے۔ بادشاہ کی ملازمت کا شرف حاصل کیا نواب کی تشریف آوری کی تاریخ فضل علیخاں نے نظم کی ہے

آصف شکر اللہ ذات دین پناہی آمد — رونق دہ ملک بادشاہی آمد
تاریخ رسیدنش بگوشم ہاتف — گفتا آیت رحمت الٰہی آمد

نواب نے کمال قدر دانی اور اپنی سخاوت جبلی سے ایک ہزار روپیہ نقد اور گھوڑا مع ساز نقرئی کے صلہ مرحمت فرمایا۔

دہلی میں دو ماہ قیام کرنے کے بعد بادشاہ نے نواب کو دکن کے مرہٹوں کی تنبیہ کے لئے رخصت کیا

ملی نظام کو ۱۲۰۰ کی حد ملا۔ ۱۲۱۳ ال سنہ ۱۲۱۳ (۱۷۹۹ء) میں سرنگاپٹم فتح ہوا اور ٹیپو سلطان نے شہادت پائی تو بروئے معاہدہ میسور نظام کو سلادہ منقوضہ میں بقدر حصہ ملا۔ چونکہ پیشوا اس عہد قرارداد سے منکر و دست بردار ہوگیا اسلئے نظام کا حصہ اور بھی بڑھ گیا

ایک باقاعدہ اور منتظم سلطنت میں جتنے محکمے اور صیغے ہوتے اور ہو سکتے ہیں حیدرآباد میں سب موجود ہیں علاقہ مال، پولیس، عدالت، فوج، منصب، خزانہ، ڈاک خانہ، ٹکسال، کرنسی، ریاست کی ریلوے، تعلیم، بندوبست، سروے (مساحت) صفائی (میونسپلٹی) تعمیرات وکارہائے رفاہ عامہ، صحت خلائق، رجسٹری وثائق وغیرہ اور اعلیٰحضرت شہریار دکن ادام اللہ سلطنتہ ہر صیغہ و محکمہ پر بنفس نفیس توجہ اور التفات فرماتے ہیں

آثار قدیمہ و تاریخی سے کل ریاست مالا مال ہے متفرق یادگاریں ہر طرف ادہر ادہر پھیلی ہوئی موجود ہیں۔ انمیں سے بہت زیادہ قابل لحاظ و مشہور غارہائے ایلورہ، اجنٹا، اورنگ آباد و عثمان آباد (دکن اسٹیٹ) ہیں جو بودھوں اور جینیوں اور برہمنوں کے طرز تعمیر کے عمدہ نمونے ہیں کثیر التعداد قلعوں میں سے گلکنڈہ، گلبرگہ، ورنگل، بیدر، مدگل، پرینڈا اور ملدرگ بہت مشہور ہیں۔ ہندوؤں کے مندر اور معابد مختلف حیثیت، حالت اور قدامت کے ریاست کے ہر ایک حصہ و سمت میں موجود اور کامل محفوظ ہیں مثلاً ہنم کنڈہ کا ہزار ستون والا مندر اور تلجا پور اور امبا جوگئی کے مندر۔ ایک قدیم لیکن ویران شہر کے قلعہ ورنگل کے اندر ہے۔ ان کے علاوہ بہت سے عمدہ اور نادر نمونے ہندوؤں کے مذہبی طرز تعمیر کے بھی ہیں

عہد اسلام کی قدیم اور بہترین عمارات یہ ہیں گلبرگہ کے پرانے قلعہ کی مسجد اور مکہ مسجد، جامع مسجد، چار مینار، چار کمان، دارالشفا (بیمارستان) موسیٰ ندی کا پرانا پل (یہ سب حیدرآباد میں ہیں) قطب شاہی خاندان کے بادشاہو

نواب جلد جلد منزلیں طے کرتے ہوئے بھوپال پہونچے۔ دوسری طرف سے مرہٹوں کی فوج آئی مقابلے پیہم
اور سخت ہوئے نادر شاہ کے آنے کی خبر گرم تھی اسلئے نواب نے مصالحت منظور کرلی اور دہلی واپس چلے گئے
نادر شاہ آیا اور جو کچھ کرنا تھا کر ڈالا لیکن باایں ہمہ تمام امرا کی بہ نسبت نواب کے ساتھ بڑی رعایت
روا رکھا کرتا تھا۔

پاس آداب بزرگاں ہے بہ ایں وضع جنوں
جب ملے ناصح جھکے ہم بندگی کے واسطے

اب امیر الامرا کا منصب بھی نواب کے دیگر مراتب کے ساتھ شامل کر دیا گیا۔
سنہ ۱۱۵۱ھ مطابق ۱۷۳۸ء سے لیکر سنہ ۱۱۶۱ھ مطابق ۱۷۴۸ء تک نواب بسر در انتظامات ملک دکن و استیصال
باغیان میں مصروف رہے۔ احمد خاں ابدالی کا کابل سے آنا سنکر نواب پہونچے وہاں معلوم ہوا کہ احمد شاہ

کے مقبرے جو گولکنڈہ کے پاس ہیں ابھی اور بہمنی شاہی سلاطین کے مقابر جو شہر بیدر کے متصل ہیں۔ اورنگ آباد میں
اورنگ زیب کی ملکہ رابعہ درانی کا مقبرہ ان کے سوا ہندوانہ اور اسلامی ساخت کی عمارات کے بہت سے نمونے
ہیں جو اب شکستہ حالت میں ہیں مثلاً محلات گولکنڈہ و بیدر و گلبرگہ و دولت آباد
زبانوں میں سے زیادہ تر اردو، مرہٹی، کناری، تلنگو اس ملک میں بولی جاتی ہیں
سب سے پہلے سنہ ۱۸۳۴ء میں انگریزی کی تعلیم حیدرآباد میں شروع ہوئی اور اب تو کثیر تعداد میں کالج اور مدرسے
اور انگریزی خانقاہیں ریاست کے مختلف حصوں میں قائم و جاری ہیں جامعہ عثمانیہ کل ہندوستان بلکہ ایشیا
ایشیائی میں اپنے طرز اور جامعیت کی ایک ہی یونیورسٹی ہے
زراعت فلاحت اور نصب و ترقی نے اعلیٰ حضرت داور دوراں کے عہد دولت مہد میں بہت ترقی اور
عروج پایا ہے۔ امدادی بنکیں کھلی ہوئی ہیں۔ اور حسن کی اعانت و فلاح اور عطائے تقاویات کا سلسلہ جاری ہے
حیدرآباد کے حکمرانوں اور انکے امرا و وزرا نے بڑے بڑے تالاب بنوائے جن کا تذکرہ ہے مثلاً حسین ساگر، ابراہیم
پٹن، میر عالم، افضل ساگر، جل پلی وغیرہ۔
دکن کے پانی پت بیل جفاکشی اور قوت برداشت و بردباری کے لئے مشہور ہیں عرب اور ایران سے اعلیٰ نسل کے گھوڑے
باہر سے آتے ہیں انکی نسل کی افزائش یہاں بھی ہوتی ہے۔ گھوڑوں اور مواشی کی تجارت صرف شہر و قصبات بلکہ دیہات
میں بھی روبہ ترقی ہے
معدنیات کے لحاظ سے یہ ریاست نہایت زرخیز ہے۔ کوئلے کے معادن ورنگل میں اور سونے کی کان لنگسگور
میں بہت وسیع ہیں۔ سنگاریتی میں بھی کوئلہ کی کان ہے۔ لوہے اور تانبے کی کانیں بھی اس ریاست میں پائی جاتی ہیں

نے فتح پائی۔احمد خاں ابدالی شکست کھاکر کابل واپس چلا گیا اسی حالت میں نواب یہاں ایک مرض میں مبتلا ہوئے۔ ۴ جمادی الآخرہ سنہ ۱۱۶۱ھ (۲۲ مئی سنہ ۱۷۴۸ء) کو وقت عصر راہگرائے ملک جاوداں ہوئے۔

آزاد لکھتے ہیں کہ نعش اٹھانے کے وقت خلق سے اس قدر شور وغریو برپا ہوا کہ زمین و زماں لرزہ میں آگئے بڑے بڑے اولیاء کرام و صلحاء عظام اور امراے باحتشام جنازۂ مبارک کو ایک میدان وسیع تک دوش بدوش لے گئے، وہاں نماز ادا کی۔ پھر شاہ برہان الدین غریب قدس سرہٗ کے روضۂ مطہرہ میں لائے اور پایان مرقد شیخ مائل بہ قبلۂ راحت کدۂ ابدی میں پیکر عالی کو پہونچا دیا۔ "متوجہ بہشت" (سنہ ۱۱۶۱ھ) تاریخ رحلت ہے۔

مسلمان اور ہندو تذکرہ نگاران کو چھوڑ دیجئے انگریز مورخین بھی نواب کو بڑی عظمت و احترام سے یاد کرتے اور اُن کی شجاعت و بسالت اور حسن تدبیر و دانائی و فرزانگی کی نہایت تحسین و ستائش کرتے ہیں۔ ہندوستان کا امپریئل گزیٹیر

(*a*) A Distinguished general of Aurangzeb

(*b*) Distinguished alike in war and political

sagacity

لکھکر ان چند منتخب و ممتاز الفاظ میں آپ کا نام نامی لیتا اور اپنا فرض مردم شناسی ادا کرتا ہے۔

نواب کی طبیعت نہایت موزوں واقع ہوئی تھی۔ آپ کے نتائج طبع سے ایک دیوان ضخیم یادگار ہے سنہ ۱۱۳۳ھ (سنہ ۱۷۲۱ء) میں جبکہ نواب بہ تقریب وزارت دکن سے شاہجہاں آباد تشریف لائے

پیداوار معدنی میں بالخصوص ہیرا، سونا اور کوئلہ داخل ہیں

تجارت اور مصنوعات میں شکر، گوٹہ، لیس، اور بدری کی اشیا ہیں نہایت بیش قیمت چیزیں ہر قسم کی اور اعلیٰ درجے کے قالین اور غالیچے یہاں تیار ہوتے ہیں۔

ڈاک کا محکمہ اور طریقہ اس ریاست میں اپنے قلمرو کے لئے خود اپنا قائم ہے اور ڈاک کے ٹکٹ بھی اپنے ہی جاری ہیں

اس سرکار ابد قرار کی فیاضیاں، عطیات، وظائف اور مدد معاش اوقاف۔ جاگیر و مستحقان پوری تفصیل اور مکمل بیان کی مستحق ہیں مگر ان معدود صفحات میں گنجائش کہاں۔

ریاست کا سکہ جو حالی سکہ کہلاتا ہے سنہ ۱۸۵۴ء سے جاری ہے وقتاً فوقتاً اُسکی شان اور وضع میں اصلاح و ترمیم ہوکر مجوسیہ روپیہ اور عثمانی سکہ معروف رائج ہوئے ہیں سکہ سمی کے چہرہ پر چار مینار کی شکل منقوش ہے

ہوئے تھے اور میر عبد الجلیل بھی مع اپنے دونوں نواسوں کے وہاں وارد تھے نواب نے اپنا ایک شعر مجمع شعرا میں پیش کیا اور غزل پوری کرنے کی خواہش کی ؎

کے سوے چمن می رود آن دست حنائی — مرو زکہ آئینہ گلزار دست است

اور اپنا یہ مصرع بھی پڑھا تاکہ کوئی صاحب پیش مصرع لگائیں تو لگادیں ع

گلِ آئینہ از آب رخ او تازگی دارد

اس مصرع کا قافیہ صعوبت و دشواری سے خالی نہ تھا نواب امین الدولہ وقائع خوان حضور معلّے نے میر عبد الجلیل سے تحریک کی اور اسکی انجام وہی کے لئے تکلیف دی میر نے اسی زمین میں پورا قصیدہ لکھ ڈالا مطلع یہ ہے ؎

تا حسن ترا مشعل انوار ید است — مہر ا ہمہ شب کاسہ گدا ور ید است

اور جس مصرع کو پیش کیا تھا اس پر پیش مصرع بھی لگا دیا اور کچھ شعر اور لاحق کرکے غزل تمام کردی تین شعر نقل کیے جاتے ہیں ؎

رُخِ او از بہارِ حسن زیبا ماندگی دارد — گل آئینہ از آب رخ او تازگی دارد

ز ہم پاشید اوراق دل صد لخت نادیدم — کتاب حسنت از چین جبیں شیرازگی دارد

بفکرِ صاف نواب نظام الملک می نازم — کہ فطرت از خیال او بلند آوازگی دارد

نواب امین الدولہ نے وہ قصیدہ اور غزل نواب نظام الملک آصف جاہ کے روبرو پیش کی۔ بغایت محظوظ ہوئے اور ملاقات کے لئے تکلیف دی اور اصرار فرمایا مجبورانہ میر صاحب نے ایک دوسرا قصیدہ مدحیہ تیار کیا اور ایک شب کو امین الدولہ کے ساتھ نواب کی مجلس میں پہونچے۔ نواب نے وادا اتاکم کو یمًا فاکرموہ پر عمل فرمایا اور اندازہ اور توقع سے زیادہ اعزاز و احترام کیا اور اپنے برابر بے فاصلہ جگہ دی جب قصیدہ کی کیفیت معلوم ہوئی اور کاغذ پر نگاہ پڑی تو شمع ترتیب منگا کر پڑھنے کے لیے اشارہ کیا۔ ہر ایک شعر کو کمال اطمینان و جمعیت خاطر کے ساتھ آہستہ آہستہ سنتے اور سمجھتے رہتے مضامین رنگیں اور ترکیبات دلکش کی تحسین و آفرین کی۔ قصیدہ سننے کے بعد پانچ ہزار روپیہ اور خلعت و اسپ

وجہ صلہ میں دینا چاہا میر صاحب نے اپنے ضابطۂ قدیم کے مطابق اسکو بھی قبول نہ کیا۔

یہ قصیدہ بھی بڑے زور کا ہے، وہ محاسن و تکلفات شاعری سے مملو۔ اس میں عربی و فارسی و ترکی و ہندی چاروں زبانوں میں کہن سال و کہنہ مشق سخنور کی قوت تخیل و توصیف جلوہ افروز ہے اس لیے نقل کیا جاتا ہے ؎

بہار آمد و وا کرد غنچہ بند نقاب　　گرہ ز خاطر بلبل کشود فیض صبا
ز بسکہ سبزہ و گل در چمن ہجوم آورد　　نسیم کرد بصد حیلہ جاے خود را وا
گرفت قہوہ بکف در پیالۂ یاقوت　　برائے شاہد نوروز لالۂ حمرا
بر بیں بہ لالہ و تحریک غنچہ در ہر برگ　　چو طوطئے کہ ز منقار وا کند پرہا
شکنج طرۂ سنبل کمند صید نظر　　نگاہ دیدۂ نرگس فسون ہوش ربا
دمید نغمہ ز منقار بلبل خوشگو　　چو گلبنے کہ از و بشگفد گل رعنا
فزود حسن چمن از سحاب گوہر بار　　چنانچہ شان وزارت ز عمدۃ الوزرا
نظام ملت و ملک افتخار اہل کرم　　قوام دین و دول آفتاب مجد و علا
بود بحسن وزارت بہ از نظام الملک　　کہ نقش ثانی بہتر کشد نگارہ آرا
مشابہ کف او بحر چوں تواند شد　　کہ نقص جزر بود مد بحر را بقفا
حباب نیست کہ بحر از تشبہ کف او　　کلاہ فخر بینداخت از خوشی بہ ہوا
رسن ز موج زدہ بر میان بکف کشتی　　کہ در سوال کند چوں قلندر دریا
ز بیم کثرت جودش محیط نالہ کند　　گواہ اوست بریں بیم رعشۂ اعضا
گرفت خنصر یمنی خرد ز دانش او　　چنانکہ خلق ز جودش اصابع یسری
رسیدہ است بجائے تقدس ذاتش　　کہ چوں ملک بود از جنس انس مستثنےٰ
چو او ندیدہ اسیرے مہذب الاخلاق　　بعینک مہ و مہر ایں سپہر پشت دوتا
مثال روح مصور بود بپاکی ذات　　نشان عقل مجسم بود بفہم و ذکا

چکد ز سنبل و گل شیشه شیشه عنبر و عطر | چو گرم جوشیِ خلقش شود چمن پیرا
صفای آئینهٔ رای او بود چندان | که می نماید از و آنچه رود هد فردا
کرم ز دست گهربار او بود ممنون | ظفر به تیغ چمن کار او بود شیدا
تعجب است نه شمشیر آتش افروزش | که جای تیغ کف است کف است بحر عطا
گره گره بود نیشترهٔ عدو شکنش | که بند گشته ورد جابجا دلِ اعدا
گه نبرد بود همچو ابر صاعقه بار | کمان چو قوس قزح تیر چون شهاب رسا
نزار لشکرِ او مسند وزارت یافت | هماں که یافت تن عاذرا زدم عیسیٰ
برسم جشن طرب چید بزم رنگینے | که از تصور آن خامه گشت شاخ حنا
ترانه سنج زمزمه ساخت چوگانے | ربوده گوی دلِ سامعان بحسنِ ادا
سپهر شد همه تن دیده تماشائی | پی نظارهٔ این محفلِ نشاط افزا
بو قوتیا و تو توک ن چو چیک تو شوق حیدری | تو تو گچی تولو. تو توک بولدی نیشکر مونذا
قو شوق نسیم دن آچیلدی کوپ گل ینذک | پیتورتقتیلغ بولسون بلند قلدی نوا
محیط مدحت او را کرانه پیدا نیست | نزورق قلمی چون توان نمود شنا
شعار من نبود شعر بس کنم زین حرف | که اہل فضل دعا خواہ است ز اہل فضل دعا
اَقُولُ وَفَّقَكَ اللّٰهُ دَاعِیًا بِالْخَیْرِ | لِانْتِظَامِ[۱۵۹] اُمُوْرِ الْاَنَامِ فِی الدُّنْیَا
اَدَامَ قَدْرَكَ فِی الْجَاهِ مَا سَمَا الْاَفْلَاكُ | وَشَدَّ اَزْرَكَ بِالْعِزِّ مَا رَسَتْ رَضْوٰی
فَاَنْتَ خَیْرُ ظَهِیْرٍ لِمَنْ رَمَاهُ الدَّهْرُ | وَاَنْتَ خَیْرُ نَصِیْرٍ لِنُصْرَةِ الضُّعَفَا
قَدِ اسْتَجَابَ دُعَائِیْ اِلٰهُنَا الْمُتَعَالُ | بِمُرْسَلٍ عَرَبِیٍّ وَآلِهِ النُّجَبَا
ز فضل گر گرزم تیغ و نیزه می گیرم | که بر جلادتِ من شاہد اند این دو گوا
ز ذوالفقار چو برہان قاطعے دارم | بروز معرکه فیصل نمایم این دعوی

۱۵۹ انتظام (افتعال) کا ہمزہ وصلی ہے۔ گویا اسے قطعی یہاں باقی رکھا گیا ہے۔ ضرورت شعری سے مجبوری ہے

قلم نوشت برائے وزارتش تاریخ — "وزیر کشورِ ہند آصف دوام البقا"
"ہزار و یکصد و سی و چہار نقش نشاط" ۱۱۳۴ھ — دو گوہر جوہر تاریخ از و شود پیدا ۱۱۳۴ھ
نظمت فی العربی الفصیح تاریخًا — حلی وزارتہ سالک التوشیع لنا ۱۱۳۴ھ
اسیس دے کے کبی ہندی مون یون سنبت ۱۷۹۰ — "دے جگت مون اچل باس یہ وزیر سدا"
خرد بجامۂ عبدالجلیل کرد ارشاد — کہ ختم کن بدعا ایں قصیدۂ غرا
ملائک از پئے آمین ایں دعا شدہ اند — برنگ نرگس و گل چشم و گوش فوق سما
ہمیشہ ہر دو زہم شاد و کامران باشند — دے از وزارت واز دے وزارت اعلیٰ

نواب آصف جاہ جیسے خود سخن سنج اور سخن فہم امیر تھے ویسے ہی قدر شناس اہل کمال بھی تھے۔ مرزا بیدل سے تلمذ تھا شاکر تخلص فرماتے۔ مرزا صاحب جب ان کے یہاں جاتے تھے تو نواب اُن کی بڑی تعظیم و تکریم فرماتے استقبال و مشایعت کرتے اور اپنی مسند پر بٹھاتے تھے مرزا کے نشآت میں کئی رقعے چین قلیچ خاں کے نام ہیں جو نواب کا ابتدائی خطاب تھا۔

سنہ ۹۲ سمت، ہندی میں سال کو کہتے ہیں۔ راجہ وکرمادیت کا سمت تقریبًا پونے ستاون (۵۶ ۳/۴) برس قبل حضرت مسیح سے شروع ہوتا ہے میرے حساب سے اُس وقت ہندی سمت ۱۷۸۰ رہا ہوگا

سادات بارہہ

خلد مکاں عالمگیر نے اپنی وصایا میں شاہزادہ عالیجاہ محمد معظم (بہادر شاہ) کو تحریر کیا تھا۔

"نہم آنکہ با سادات لازم کہ آں سعادت نشاں بموجب آیۂ کریمہ قُل لَّا أَسْأَلُكُمْ عَلَيْهِ أَجْرًا إِلَّا الْمَوَدَّةَ فِي الْقُرْبَىٰ محبت ایں جماعۃ کہ اجر نبوت است ہرگز مقصر نباید بود کہ ثمر دنیا و عاقبت است لیکن در سادات بارہہ کمال احتیاط باید نمود در محبت ظاہری و باطنی قصور نباید کرد و حسب ظاہر مرتبہ ایشاں را افزود کہ شریک غالب یا شریک ظالم۔ بلکہ اگر اندک استرخائے عنان شود ندامت فائدہ ندارد مصرع دریغ سود ندارد چو رفت کار از دست"

"نویں یہ کہ اُس سعادت مند فرزند کے لئے لازم ہے کہ سادات کے ساتھ محبت رکھنے میں ہرگز کوتاہی نہ کریں جو آیۂ قرآنی کے بموجب رسالت کا اجر قرار پائی ہے [(اے پیغمبر ان لوگوں سے) کہہ دیجئے کہ میں تم لوگوں سے اِس (تبلیغ رسالت) پر کوئی مزدوری تو مانگتا نہیں مگر رشتے ناطے کی محبت (تو قائم رکھو (جزیرہ ۲۵۔ سورۃ الشوریٰ ع ۳۔۴)] کیونکہ اس سے دنیا اور آخرت کے فائدے حاصل ہوتے ہیں۔ لیکن سادات بارہہ کے ساتھ نہایت احتیاط رکھنا چاہیئے، اور ظاہری و باطنی محبت میں کمی نہ کرنا چاہیئے البتہ اُن کا ظاہری مرتبہ نہ بڑھانا چاہیئے کیونکہ یہ لوگ شریک غالب بلکہ شریک ظالم ہوتے ہیں اور اگر ان کی باگ ذرا بھی ڈھیلی کر دی تو پھر پشیمانی سے کچھ فائدہ نہ ہوگا۔"

سادات صحیح النسب کے بارہ گاؤں دریائے گنگ و جمن کے مابین ضلع مظفر نگر میں مدتہائے دراز سے مشہور و معروف ہیں۔ اکبر کے عہد میں یہ قطعہ سرکار سہارنپور میں داخل تھا۔ یہاں کے سادات شجاعت و بہادری میں ہمیشہ ممتاز و نامور رہے ہیں۔ ان کے اسلاف کی نسبت کہا گیا ہے کہ سنہ ۷۵۱ھ (سنہ ۱۳۵۰ء) کے قریب یہاں آکر آباد ہوئے تھے۔ اُس وقت دہلی میں سادات کا خاندان فرمانروا تھا۔ اُس خاندان نے سرپرستی فرمائی تو ان غریب الدیار سیدوں نے اپنے جوہر دکھائے اور اعزاز و عروج

خوب بڑھا۔ سنہ ۸۱۷ھ (سنہ ۱۴۱۴ء) میں سلطان خضر خاں نے سہارنپور کی حکومت و نگرانی سید سلیم کے سپرد کی۔ دہی اُس وقت اس خاندان کے مقدم و پیشوا تھے۔ اُس کے بعد ان سادات کا اثر دربار اور اہل دربار پر برابر بڑھتا رہا۔

اس دلاور طبقہ نے بڑے بڑے کارہائے نمایاں کئے ہیں چنانچہ سید محمود بارہہ جو سکندر شاہ سوری کے ساتھ قلعہ مان کوٹ میں محصور تھا مجبور ہو کر اکبری فوج سے آ کر ملا اور اُس کی ملازمت اختیار کی چار ہزاری منصب تک پہونچا۔ سید ہاشم اس کے بیٹے نے بھی باپ کے برابر رتبہ پایا۔ اور سرکاری خدمت میں جان دی سید احمد، سید راجو، سید عبدالمطلب اور سید عبداللہ خاں (اول) کے کارنامے عہد اکبری کے ہمیشہ بہار چمن سمجھے جاتے ہیں۔ عبداللہ خاں کو بادشاہ نے داؤد خاں باغی بنگالہ کے استیصال کے لئے بھیجا تھا۔ سید محمود کو مع افواج شاہی کے پٹن میں مرزایان و شیر خاں فولادی نے گھیر لیا۔ عبدالمطلب خاں عین وقت پر مدد کو پہونچا اور بادشاہی شان و شوکت کو قائم و برقرار رکھا رانا میواڑ کے مقابلہ میں (اُسی اکبری عہد میں) سادات بارہہ نے بڑی مردانگی و بہادری سے کام لیا تھا اور بکمال ثابت قدمی سے لڑے تھے۔ سادات بارہہ کے بہت سے نام آئین اکبری میں بزرگان جاہ و دولت کے ذیل میں ملتے ہیں۔ سنہ ۱۰۱۵ھ (سنہ ۱۶۰۶ء) میں جہانگیر نے سید سیف خاں بارہہ کو شاہزادہ پرویز کا اتالیق مقرر کر کے لشکر جرار کے ساتھ خانخاناں کی مدد کے لئے دکن کی مہم پر بھیجا تھا۔ مرزا عزیز کوکلتاش کا یہ قول بالکل سچا تھا کہ "سادات بارہہ دولت اکبری پر فدا ہیں۔"

اکبر اور اُس کے عالی حوصلہ اخلاف کے زمانہ میں اس خاندان نے بڑے بڑے عہدے اور منصب اور وسیع جایدادیں اور جاگیریں پائی تھیں اگر ایک طرف منتظمین و مدبرین سلطنت کی حیثیت سے سارے شاہی قلمرو میں ان کی شہرت و نیکنامی کا سکہ چل رہا تھا تو دوسری طرف فوجی بہادر اور دلیر سپاہیوں کے طور پر دریائے سندھ سے نربدا تک ہندوستان ان کے گھوڑوں کا جولانگاہ بنا ہوا تھا انھیں کی قوت و بسالت کا نتیجہ تھا کہ بہادر شاہ اول نے سنہ ۱۱۱۹ھ (سنہ ۱۷۰۷ء) میں آگرہ فتح کیا اور تاج و تخت کا مالک ہوا۔

اسی تذکرہ کے صفحات سے واضح ہوگا کہ ۱۱۲۴ھ (۱۷۱۲ء) کے انقلابات اور فرخ سیر کی تخت نشینی میں بھی سادات بارہہ کا ہاتھ کام کر رہا تھا جس کے صلہ و خلد دے حدمت میں سید عبدالجلیل خاں (دوم) در یر مطلق اور سید حسین علی خاں سپہ سالار اعظم (کمانڈر ان چیف) بنا دیے گئے تھے۔ مگر اس کے بعد ہی زوال شروع ہوگیا اور سادات بارہہ کی قوت اور جمعیت ان کے مخالف و معاند وزیر قمرالدین خاں کی تدابیر اور دراندازیوں سے منتشر و پراگندہ ہوگئی حتی کہ ۱۱۵۰ھ (۱۷۳۷ء) میں اس خاندان کا تعلق دہلی اور سلطنت سے بالکل قطع ہوگیا

سادات بارہہ سے تعلقات

میر عبدالجلیل کے تعلقات و روابط سادات بارہہ سے نہایت صادق و راسخ تھے۔ ان دونوں بھائیوں کے ساتھ جس شان واخلاص و عقیدت کے ساتھ انھوں نے نباہی اور جو اختصاص واحترام انھوں نے مبذول رکھا صفحات تاریخ پر یادگار و مرتسم رہے گا۔ تفصیل اوراق آیندہ میں ملے گی۔ ایک وجہِ موافقت یہ بھی بتائی جاتی ہے کہ سادات بارہہ کا نسب اوپر جاکر سید ابوالفرح واسطی سے ملتا ہے جو سید محمد صغرے بلگرامی کے بھی مورث تھے۔ گویا سادات بلگرام اور سادات بارہہ ایک ہی درخت کی دو شاخیں ہیں۔ ضلع ہردوئی کا گزیٹیر بعنوان "باشندگان بدیں "سادات" رقم طراز ہے:-

"بلگرام اور شاہ آباد میں زیدی زیادہ ہیں۔ اس سے اس روایت کا ثبوت ملتا ہے کہ خاندان بلگرام کا تعلق سادات بارہہ مظفر نگر سے ہے زیدی سادات اضلاع مظفر نگر و میرٹھ و بجنور میں اور تعداد میں پائے جاتے ہیں۔ ضلع ہردوئی میں عموماً اور پرگنہ جات سیڈر و اد بلگرام میں ان کے پاس زمینداری بھی بہت ہے"

سادات کا خاندان سید محمد صغریٰ کی اولاد میں ہے جو بعد ازاں بلگرام میں آئے تھے جنکو

اس مقام کی فتح کے بعد ایک جاگیر وسیع ملی جو اب تک اُن کے اخلاف کے قبضہ میں ہے

بلگرام کے شجرہ سے پایا جاتا ہے کہ محمد صغری کی چھٹی پشت میں سید ابو الفرح واسطی تھے۔ انھیں کی نسل میں مظفر نگر کا مشہور خاندان بارہہ بھی ہے۔ اگر یہ صحیح ہو تو اُن کا لڑکا داؤد سادات بلگرام اور رتھاں پور کی شاخ نسل بارہہ دونوں کا مورث ہوگا"

آغاز

میر عبد الجلیل اور نواب دلیر دل خاں سے لشکر میں روشناسی ہوگئی تھی۔ اسی وسیلۂ شناسائی سے نواب بخشی الممالک امیر الامرا کی ملازمت میں میر پہونچے۔ دلّی کا قیام اُدھر بیماری سے مجبور اُدھر بیکاری سے پریشان۔ جب بیماری سے کچھ فرصت پاتے تو دلیر دل نواب کے ہمراہ جاکر امیر الامرا کے مجرائی ہو جاتے۔ ایک سلیس قصیدہ (یا خود انھیں کے الفاظ میں "ایک رنگین کاغذ") امیر الامرا کے لئے تیار کیا تھا جس کو دیکھکر فضلائے دہلی متعجب تھے۔ دلیر دل خاں نے اُسکی تقریب کی امیر الامرا نے فرمایا کہ صبح جب فضلائے وقت یکجا ہوں تو پیش کیا جائے روزوں کی وجہ سے وہ صحبت منعقد نہ ہو سکی اور نہ رمضان بھر وہ کاغذ نظر سے گذر سکا۔ اِدھر نواب دلیر دل خاں آخر رمضان میں صوبہ دار مقرر ہو کر چلے گئے۔ اور اُردوے معلّٰی (پایۂ تخت) میں میر عبد الجلیل کا جو کچھ سہارا پایا مرتی تھا رخصت ہو گیا۔ مگر نواب صاحب چلتے وقت امیر الامرا سے "بر وانگی مجرا" لے کر اِن کو دیتے گئے تھے۔ چنانچہ اُن کی روانگی کے بعد میر صاحب نے دو تین بار حاضری دی۔ عید کے دن رباعی تہنیت بھی پیش کی۔ اس مبارکباد کو مطالعہ فرما کر متبسم ہوئے اور کہنے لگے کہ "نہایت خوب کہی ہے" حسب دستور میر صاحب تسلیمات بجالائے۔ امیر الامرا نے بیٹھ جانے کے لئے ہاتھ سے اشارہ کیا۔ اُس زمانہ میں اُن کے جبروت کا یہ اقتضا تھا کہ اگر کسی کی طرف اتنا بھی متوجہ ہو جاتے تو گویا اُس کو نہال کر دیتے تھے۔ ع

اُن کا دیکھنا نظر التفات تھا

رباعی یہ تھی ؎

نواب فلک رتبہ امیر الامرا　　　　ہر حرف ز عید جزاو شد ایما

عین از عینش دہ باز میں است نشاں — دال آمدہ رمز دولت فیض آرا

جس زمانہ میں میر عبد الجلیل دہلی میں مقیم اور مبتلائے بخار تھے۔ امیر الامرا کے مشکوے معلّٰی میں لڑکا پیدا ہوا اس سے قبل جو اولاد ہوئی تھی اُنکی ولادت میں بڑی خوشی و شادمانی کیگئی تھی۔ ضیافت و انعامات میں زرِ خطیر خرچ کیا گیا تھا مگر کسی بچہ نے زندگی نہیں پائی اور والدین کو مفارقت کا داغ دے گئے۔ اس لئے اس بچہ کے پیدا ہونے پر واپسے نہ کسی کی نذر لی نہ کچھ خوشی کی میر عبد الجلیل نے عربی فارسی و ہندی میں علیحدہ علیحدہ رنگ سے تاریخ تولد باسلوب دعا لکھی اور دربار میں پیش کی نواب نہایت محظوظ ہوئے۔ مولوی جیون اور جُوجُو صاحب کہ وہاں بیٹھے ہوئے تھے دیکھکر بہت خوش ہوے۔ مولوی صاحب نے سب کے سامنے فرمایا کہ "ہمکو تمہاری ذات پر افتخار ہے کہ ہمارے زمانہ میں تم جیسے اہل استعداد موجود ہیں"

فی العربیۃ ؎

سال امیر الامرا[۹۴] نعمہ[۹۳]	وھی قد وم الولد المستنیر
ارخ فی ذالک عبد الجلیل	امتعہ اللہ بعمر کبیر ۱۱۲۶ھ

فارسی ؎

گلے[۹۵] شگفت بگلزار خاندانِ حسین	زمانہ شد بدوام بقائے اُو دعاگو
فرشتہ[۹۶] آمین گفتا چو گفتم ایں تاریخ	ہزار سال شود عمر ایں گل آمن[۹۶] ۱۱۲۶ھ

۹۳ امیر الامرا ایک نعمت پر پہونچا۔ یہ نعمت فرزند روشن کا آنا ہے۔ اس بارہ میں عبد الجلیل نے تاریخ کہی اللہ تعالٰی اُسکو عمر دراز نصیب فرمائے

۹۴ الامرا کی ہمزہ کا حذف کرنا عربی ترکیب میں محل اعتراض ہے۔ وزن جمع الف ممدودہ کے ساتھ تو ہے نہ کہ الف مقصورہ کے ساتھ۔ ضرورت شعری کی توجیہ بھی ضعف ہے۔

۹۵ موزونی مصرع میں مائل ہے۔ آمین اسم فعل ہے، بمعنی دُعا کو قبول کر یا ایسا ہی ہو۔

۹۶ آمن بمد الف و کسرۂ میم۔ اس کا اسم فاعل جو بحالت امالہ امین ہو جاتا ہے۔ آمین و ایمن بے حوف و بے خوف ہیسنت

ہندی سے

بترجمم سینت کھوں ہنس حسین مہیب
چرنجیو جگ جگ صدا بہ پیتسر کا دیب ۱۱۲۶ھ

سوانح نگاری بھکر و سیوستان اور بخشی گری وہ وقائع نگاری سرکار سیوسمان سے میر عبدالجلیل کی معزولی خدمت کی وجہ یہ تھی کہ پرگنہ جنوبی (سرکار بھکر) میں ایک بار بارش ہوئی جس کے قطرے درختوں کے پتوں پر منجمد ہو گئے جو رنگ و ذائقہ میں نبات (مصری) سے اصلاً تفاوت نہ رکھتے تھے میر صاحب نے یہ رباعی لکھی اور فرد سوانح میں لکھ دی سے

فرخ سیر آں شہنشہ بابرکات — چرخ از ادب او شدہ شیریں حرکات
در سندِ نہیں عہد عشرت مہد شش — باراں بارید ریزۂ قند و نبات

اتفاقاً اس رباعی کا تذکرہ دربار امیر الامرا میں آگیا کہ اس پر میر جملہ نے اعتبار نہ کیا اور عرض والا تک پہونچایا تھا۔ شعیب خاں نے امیر الامرا سے عرض کیا کہ فلاں نے خوب رباعی کہی ہے جو سننے کے قابل ہے نواب صاحب میر عبدالجلیل کی طرف متوجہ ہوئے۔ انھوں نے رباعی پڑھ دی اور ساری روداد عرض کی۔ رباعی بہت پسند کی اور وہ "فرد رباعی" (پرچہ) اسی طرح ہاتھ میں لئے ہوئے اٹھ کھڑے ہوئے۔ ظاہراً نواب قطب الملک (وزیر اعظم) اسی روز امیر الامرا کے یہاں آئے تھے۔ انھوں نے تخلیہ میں فرد مذکور قطب الملک کے حوالہ کی اور کہا کہ یہ مقدمہ عرض معلی کے قابل ہے انھوں نے بھی تصدیق کی اور فرد کو لئے ہوئے جب دربار پہونچے تو سب سے پہلے یہی فرد حضرت ظل سبحانی کے ہاتھ میں دیدی۔ حضرت بدولت نے مطالعہ فرما کر نہایت پسند کیا اور آفرین و تحسین کی قطب الملک نے گزارش کیا کہ یہی رباعی تو قائل کی تغیر کا باعث ہوئی ہے۔ حضرت نے تعجب و استبعاد کر کے خود فرمایا کہ ہم نے بدستور خدمات سابق پر بحال کیا۔ دوسرے دن جب میر صاحب امیر الامرا کے یہاں حاضر ہوئے تو فرمایا کہ "لیجئے صاحب آپ تو اپنی خدمات پر بحال ہو گئے۔ یہ بحالی کی پروانگی آگئی ہے۔"

میر صاحب کے دوست شیخ محمد رضا تتوی نے بھی جو بھکر کے بخشی و وقائع نگار بڑے بزرگ اور موزون طبع تھے اسی واقعہ کے متعلق دو تین رباعیاں فردِ وقائع میں درج کردی تھیں انھیں شیخ صاحب کو میر عبدالجلیل اپنے خطوط میں "شیخ محمد رضا جیو" کے نام سے یاد کرتے ہیں ؎

چو فرخ سیر بادشاہِ جہاں بیاراست گیتی چو باغِ جناں

بجشنِ ہمایوں جلوسش ملک نثارِ شکر کرد از آسماں

میر کی یہ رباعی شیخ مرتضیٰ حسین الہ یار بلگرامی نے بھی حدیقۃ الاقالیم میں نقل کی ہے سیوستان کے جغرافیہ میں لکھتے ہیں کہ اُس دیار میں قند و نبات کے ریزوں کی بارش تو ۹۰۰ سو جریب سے لیکر ایک ہزار جریب تک کے رقبہ میں ہوئی تھی۔ میر نے اس واقعہ کو درج روزنامچہ کیا اور بحکم فرخ سیر بادشاہ معزول ہوئے تو اپنی تصدیق کے لئے خدایار خاں ناظم صوبہ و دیگر رؤسائے معتبر اور قاضی شہر وغیرہ اربابِ شرع کی مُہر و دستخط سے محضر مرتب کرا کے شاہجہاں آباد لے گئے۔ تحریری شہادت کی تائید میں ایک بار شتر کے بقدر اصلی عطیہ قدرت بھی ہمراہ تھا اس کو دارائی کے خریطوں (تھیلیوں) میں بھروا کر حسین علی خاں کی معرفت حضور معلیٰ میں پیش کیا اور کامیاب ہوئے۔ شیخ کہتے ہیں کہ یہ آسمانی قند ایک دام میں بہت سا ملجاتا تھا۔ برسوں ٹھہرتا تھا۔ رنگ کی صفائی اور بَرّاقی میں یہ ریزے اُولوں (ژالہ) یا نمک سنگ کے مشابہ تھے انکا قوام اتنا سخت تھا کہ آہنی هاون دستہ سے بہ دُشواری ٹوٹتے تھے۔ خواص یہ تھا کہ چند روز تک آنکھ میں لگانے سے ناخنہ، جالا، ماندہ، آنکھ کی پھُلّی وغیرہ امراض جو مانع بصارت ہوتے ہیں دُور ہو جاتے تھے۔ اچھی خاصی آنکھوں میں کوئی لگاتا تو روشنی بڑھتی تھی۔ اس کو آنکھ میں رکھنے سے سُعال (کھانسی) جاتا رہتا تھا۔

سید حسن علی خاں

سید حسن علی خاں برادر کلاں، عالمگیر خلد مکاں کے عہد میں خطاب خانی[۵۹۷] سے سرفراز اور فوجداری ندربار[۵۹۸] و سلطان پور[۵۹۹] توابع بگلانہ[۶۰۰] پر ممتاز تھے۔ بعد ازاں حاکم اورنگ آباد مقرر ہوئے۔ جب شاہزادہ محمد معز الدین شاہ عالم کو خلد مکاں نے صوبہ دار ملتان مقرر کرکے بھیجا تو حسن علی خاں کو شاہزادے کے ہمرکاب جانے کا حکم دیا لیکن حسن علی خاں کی شاہزادہ سے موافقت مزاج نہیں ہوئی اور وہ آزردہ خاطر ہوکر لاہور واپس آئے۔ عالمگیر نے ایک رقعہ میں اس کا ذکر کیا اور عمدۃ الملک امیر الامرا امیر خاں کو لکھا ہے کہ

"حسن علی خاں با فرزند زادہ معز الدین برہم زدہ نیکی نمود بے اجازت ایشاں برخاستہ
آمد و شاہزادہ شکوہ نوشتہ منصب کم باید کرد و جاگیر ضبط نمود تا دیگراں را عبرت شود بیت
کند تحمل بسیار مرد رابے قدر   کماں چو تن بہ کشیدن دہد کشادہ شود
اعوذ باللہ من شرور انفسنا و من سیئات اعمالنا۔"

میر عبدالجلیل کا قیام اس وقت بکر و سیوستان میں تھا جب حسن علی خاں نے نواحی بھکر سے ہوکر لاہور جانے کا قصد کیا تو میر عبدالجلیل نے اُن کے ساتھ نہایت پسندیدہ اور اُن کے شایاں شان

---

۵۹۷ خان ترکی یا تاتاری خطاب ہے۔ اصل ملک (ترکستان یا تاتار) میں بادشاہ یا کسی فرقہ کے امیر کے لئے استعمال ہوتا تھا۔ ہندوستان میں بمعنی سردار و امیر و رئیس مستعمل ہے ایران میں بھی افراد سلاطین کے نام کے ساتھ لگایا جاتا تھا

۵۹۸ سرکار نندربار محال ندربار یا حویلی صوبہ مالوہ میں تھا۔

۵۹۹ سلطان پور۔ صوبہ بمبئی کے ضلع خاندیس مغربی میں ایک اُجڑا ہوا یا نیم ویران قصبہ ہے جو کسی وقت ندربار کا دار الملک تھا۔

۶۰۰ بگلانہ، صوبۂ مالوہ میں ایک سرکار تھی۔ آئین اکبری میں بذیل صوبۂ گجرات لکھا ہے "میان سرکار سورت و ندربار کوہستانے است آباد آں بگلانہ گویند (بفتح باد سکون کاف فارسی و لام و الف و فتح نون و ہائے مکتوب) بومی راٹھور" صوبہ گجرات کے یہ کوہ و قلعے بعض کتابوں میں بگلانا بھی لکھے گئے ہیں

خدمات و مراعات کہ جن سادات سے ارتباط کی ابتدا انہیں سے ہوئی شاہ عالم کے عہد میں حسن علی خاں چار ہزاری منصب پر فائز ہو کر صوبہ داری اجمیر[1] اور بعد ازاں صوبہ داری الٰہ آباد پر متعین ہوئے

[1] اجمیر کے شمال میں ریاست جودھ پور (مارواڑ)، جنوب میں اودے پور (میواڑ) و میرواڑہ، مشرق میں ریاست ہائے جے پور و کشن گڑھ اور غرب میں جودھ پور واقع ہیں۔

کہتے ہیں کہ اجمیر کا نام اُس کے بانی راجا اجا کے نام سے پڑا تھا۔ وہ چوہان راجپوت تھا اُس نے شہر و قلعۂ اجمیر کی بنیاد قریب ۱۱۵ء کے ڈالی تھی لیکن ڈاکٹر بھلر Buhler وغیرہ کا خیال ہے کہ اس راجہ اجا اور اجے کا زمانہ قریب ۱۱۰۰ء کے رہا ہوگا تو پھر یہی زمانہ اجمیر کی آبادی پڑنے کا بھی سمجھا جانا چاہیئے۔ اُسکے لڑکے انا یا ارنو نے ۱۱۵۰ء کے قریب آنا ساگر کا خوبصورت بند بندھوایا تھا جس پر بعد ازاں شاہجہاں نے ایک شاندار سلسلہ سنگ مرمر کے محلات اور برجوں کا تعمیر کرا دیا۔ ۵۸۸ھ (۱۱۹۲ء) میں پرتھوی راج دہلی و اجمیر کا فرمانروا تھا۔ اُس کے زمانہ میں شہاب الدین محمد غوری نے دہلی پر حملہ کیا۔ اور ناکام رہا۔ ۵۸۸ھ (۱۱۹۲ء) میں محمد غوری پھر افغانستان اور وسط ایشیا سے تازہ دم فوج لیکر آیا۔ پرتھی راج نے شکست پائی گرفتار اور قتل ہوا۔ دہلی سے فارغ ہو کر محمد غوری اجمیر آیا اور یہاں باشندگان کا قتل عام ہوا۔ پہلے پرتھی راج کا لڑکا پھر اُس کا چچا ہری راج حاکم ماتحت کے طور پر اجمیر میں رہے۔ اس کے بعد قطب الدین غوری نے جو اُس وقت محض نائب السلطنت تھا اجمیر کو سلطنت دہلی سے ملحق کر لیا۔ قطب الدین کی وفات کے بعد ۶۰۷ھ (۱۲۱۰ء) میں میر سولنکی قبائل کے اہل گجرات نے رات کے وقت تاراگڑھ پر حملہ کیا یہی قلعہ شہر اجمیر کا محافظ پناہ دہندہ ہے اُن لوگوں نے قلعہ کی مسلمان محافظ فوج کا ایک ایک شخص قتل کر ڈالا۔ سید حسین خنگ سوار شقہ دار (گورنر) کی درگاہ، حسین نے اس حملہ میں جان بحق تسلیم کی تھی تاراگڑھ میں اب بھی نہایت قابل لحاظ مقام ہے۔ انکی قبر مع اُسکے رفقاء اور اُنکے گھوڑوں کی قبروں کے اُسی ایک احاطہ میں ہے جو گنج شہیداں کہلاتا ہے۔ اُسکے بعد شمس الدین التمش نے یہاں حکومت اسلامی قائم کی جو تیمور اعظم کے حملہ تک رہی۔ رانا کومبھ والی میواڑ نے اُس زمانہ کی بدعملی اور ملکی بے انتظامی سے فائدہ اُٹھا کر اجمیر پر قبضہ کر لیا مگر تھوڑے ہی عرصہ میں مار ڈالا گیا۔ اسکے بعد ۸۶۵ھ ([illegible]) سے ۹۳۸ھ (۱۵۳۱ء) تک اجمیر مسلمان فرمانروایان مالوہ کے تحت میں رہا حتی کہ سلطنت مالوہ کا الحاق گجرات سے ہو گیا۔ مال دیو راٹھور نے مارواڑ کی گدی پانے کے بعد ہی اجمیر پر قبضہ کر لیا بالآخر اکبر کے اوائل عہد میں اجمیر پھر سلطنت دہلی میں شامل ہو گیا

اکبر کے زمانہ میں اجمیر اُسی نام کے ایک صوبہ میں داخل تھا جس کا اطلاق تقریباً پورے راجپوتانہ پر ہوتا تھا۔ قلعہ اور اطراف اجمیر کی اہمیت ریاست ہائے راجپوتانہ کے قلب میں واقع ہونے کی حیثیت سے سلاطین اسلام نے فوراً دریافت اور محسوس کر لی تھی۔ یہ بڑے بڑے شوارع کا مرکز اور جائے اتصال تھا شمالی ہند کو

محمد معزالدین اور فرخ سیر کی معرکہ آرائی میں جو کھجوہ (ضلع فتح پور) میں ہوئی ۔ فرخ سیر نے فتح پائی ۔ اس میں حسن علی خاں اور اُن کے بھائی نے بکمال شجاعت و مردانگی کا اظہار کیا ۔ فتح کا سہرہ انھیں کے سر رہا اس حُسن خدمت اور فوز عظیم کے صلہ میں بادشاہ نے حسن علی خاں کو منصب ہفت ہزاری اور

گجرات تک ایک طرف ، اور مالوہ تک دوسری طرف ، سلسلے پھیلے ہوئے تھے ۔ اجمیر خود تجارت کا مرکز و مرجع تھا ، اس کے مستحکم قلعہ سے اُسکی بخوبی اور کامل حفاظت ہوتی تھی ۔ اطراف و نواحی کے خشک و بے آب مقامات کے مقابلہ میں وہاں پانی بافراط تھا اسلئے بادشاہان مغلیہ کے وقت میں اجمیر مسکن شاہان بھی رہا تھا ۔ اکبر نے منت مانی تھی کہ اگر اُس کے بیٹا ہوگا اور زندہ رہے گا تو وہ زیارت کے لئے آگرہ سے اجمیر جائیگا اور حضرت خواجہ معین الدین چشتی سلطان الہند کے مرقد مبارک پر حاضر ہوکر سجدۂ شکر بجالائے گا ۔ چنانچہ بکمال عقیدت و استقامت کے ساتھ اُس نے پا پیادہ چلکر اس منت کو پورا کیا ۔ سلیم (جو تاج و تخت پاکر جہانگیر کہلایا) ۹۷۷ھ (۱۵۶۹ء) میں اکبر کے مشکوئے معلّٰی میں پیدا ہوا اور پھر مُراد ۹۷۸ھ (۱۵۷۰ء) میں ۔ تو اکبر نے آکر اس متبرک درگاہ کی زیارت کی شہر کے گرد قلعہ بندی کرائی ۔ تین برس میں دولت خانہ مکمل ہوا ۔ اُمرا و ارکان سلطنت نے عالیشان عمارات بنوائیں ۔ اکبر نے آگرہ سے اجمیر تک راہ بتانے کے لیے سڑک پر برابر ستون بنوائے تھے جو ابتک اچھی حالت میں ہیں ۔ جہانگیر و شاہجہاں نے بھی اپنے عہد کا معقول حصہ اجمیر میں صرف کیا یہی مقام ہے جہاں جہانگیر کے دربار میں سر ٹامس رو Sir Thomas Roe جیمس اول بادشاہ انگلستان کا سفیر حاضر ہوا تھا اور جہاں محرم ۱۰۲۵ھ (جنوری ۱۶۱۶ء) میں اُسکو پہلا موقع بجا آوری آداب و کورنشات کا ملا ۔ اجمیر کے قریب چھ میل جنوب کو ۹ رمضان ۱۰۶۹ھ کو (جون ۱۶۵۹ء میں) اورنگ زیب نے اپنے بھائی داراشکوہ کو شکست دی تھی ۔ دارا کی شکست کے زمانہ سے فرخ سیر کے دَور یعنی برادران سادات کے زوال و وفات ۱۱۳۲ھ (۱۷۲۰ء) تک اجمیر کی تاریخ قابل ذکر واقعات و ہنگاموں سے خالی نظر آتی ہے ۔ ۱۱۳۴ھ (۱۷۲۱ء) میں اجیت سنگھ ولد راجہ جسونت سنگھ والی مارواڑ نے سلطنت مغلیہ کے انحطاط و زوال سے فائدہ اُٹھاکر بادشاہی صوبہ دار کو مار ڈالا ۔ اور اجمیر پر قبضہ کرلیا محمد شاہ کا تسلط عارضی طور پر پھر ہوگیا تھا لیکن دس سال بعد اُس نے ابھے سنگھ پسر اجیت سنگھ کو صوبہ دار اجمیر او احمد آباد کا مقرر کردیا ۱۱۴۴ھ (۱۷۳۱ء) سے ۱۱۶۴ھ (۱۷۵۰ء) تک راٹھور راجگان مارواڑ اجمیر پر برابر حکمراں رہے ۔

شہر اجمیر کی آبادی ۱۹۰۱ء میں ۷۳۸۳۹ ، تھی ۔ ۱۹۱۱ء میں ۸۶۲۲۲ ہوئی اور ۱۹۲۱ء میں ۱۱۳۵۱۲ پر پہونچی ۔ اسمیں شک نہیں کہ اس اضافہ شمار میں غالب حصہ زائرین درگاہ شریف کا ہے لیکن ویسے بھی

سات ہزار سوار کا مرحمت فرمایا۔ ان کے باپ کا نام سید عبداللہ خاں تھا۔ اس لئے ان کو سید عبداللہ خاں قطب الملک یار وفادار ظفر جنگ خطاب عطا کیا وزارت اعلیٰ کا بلند پایہ تفویض ہوا۔ اہل تاریخ لکھتے ہیں کہ قطب الملک نے عنان وزارت راجہ رتن چند کے ہاتھ میں دیدی تھی اور خود عیش و عشرت

مجموعی حیثیت سے شہر کی آبادی ترقی پر ہے۔ ریلوں کی وجہ سے تجارت کو بھی فروغ ہے۔

یہاں کئی ریلوں کا مرکز ہے۔ شہر کے گرد سنگیں دیوار تھی، جو اب شکستہ حال ہے۔ پانچ پھاٹک ہیں آثار قدیمہ حسب ذیل ہیں۔ (۱) اڑھائی دن کا جھونپڑا ہے۔ وسال دیو چوہان راجہ کا تعمیر کردہ تعلیم گاہ تھا۔ محمد غوری کے عہد میں مسجد بنا۔ اس مسجد اور قطب مینار دونوں کی تعمیر کا زمانہ ایک ہی بتایا جاتا ہے۔ (۲) اناساگر کے بند پر شاہجہانی محلات و قصور۔ جو محض تفریح گاہیں تھیں۔ ان میں سے چار اب بھی اچھی حالت میں ہیں مع فرش حمام سابق۔ (۳) درگاہ خواجہ صاحب مع مساجد اکبری و شاہجہانی اور دیگر عمارات اور پھاٹک۔ حضرت خواجہ نے ننانوے سال کی عمر میں بروز جمعہ ۶۔ رجب ۶۳۳ھ (۱۶ مارچ ۱۲۳۶ء) کو وفات پائی۔ روضہ کی تعمیر ۶۳۳ھ میں بعہد شمس الدین التمش شروع اور زمانۂ ہمایوں میں ختم ہوئی ماہ رجب میں ۶ روز تک عرس ہوتا اور زائرین و طالبین کا ازدحام کثیر رہتا ہے۔ (۴) اکبر کا تعمیر کیا ہوا قلعہ۔ یہ ایک مربع اور بھاری، عظیم الشان عمارت ہے یہی بادشاہوں کا قیام گاہ اور جائے دربار عام تھا (۵) نور چشمہ، باغ و مسکن شاہان مغلیہ (۶) دولت باغ۔ اسکو جہانگیر نے نصب کیا تھا۔ اناساگر کے قریب شہر کی طرف ہے اس میں بڑے کہنہ سال درخت موجود ہیں۔

۱۲ الہ آباد۔ ہندو اور اسلامی تاریخوں کے لحاظ سے نہایت قدیم اور اہم مقام ہے۔ پانڈو برادران نے اپنی جلاوطنی کا کچھ زمانہ اس کے اطراف میں بسر کیا تھا۔ راجہ رام چندر اور سیتا جی بھی اپنی طویل اور دیرطلب سفر کے دوران میں یہاں سے ہو کر گزرے تھے۔ ایک عرصہ تک یہ بھی کہا جاتا تھا کہ کوسم جو جنوب میں ہے یہی کوسمبی ہے جس کا مہابھارت اور پرانوں میں ذکر ہے لیکن تحقیق و تفتیش کے بعد اب وثوق کے ساتھ صرف اسی قدر کہا جا سکتا ہے کہ یہ مقام چوتھی یا پانچویں صدی مسیحی میں مگدھ کے گپت حکمرانوں کی عملداری میں شامل تھا۔ چینی سیاح ہیون تسانگ کے سفرنامہ سے پتہ چلتا ہے کہ الہ آباد ہرش وردھن بادشاہ قنوج کی مملکت میں ساتویں صدی کے شروع میں شامل ہوا تھا۔ ۵۹۰ھ (۱۱۹۴ء) میں سلطان معزالدین محمد سام مشہور بہ شہاب الدین غوری نے اس پر حملہ کیا اور اس وقت سے مسلمانوں کا قبضہ ہو گیا۔ تیرھویں اور چودھویں صدی مسیحی میں نواح الہ آباد کے قطعات کڑا کے متعلق تھے یعنی وہی قصبہ گورنر کا دار الصدر تھا ۶۸۵ھ (۱۲۸۶ء) میں معزالدین کیقباد اور اس کے باپ سے کڑے میں ملاقات ہوئی۔ لڑکا ابھی ہلی

میں پڑ گئے تھے اس کے بعد جو موافقت بادشاہ سے رہی اور بعد چندے جس قدر ناموافقت ومخالفت بڑھی اور فرخ سیر اور ان بھائیوں اور ان کے ہواخواہوں کا جو حشر ہوا، جو واقعات وانقلابات نظم سلطنت

کے تخت پر اپنے دادا غیاث الدین بلبن کی جگہ پر بیٹھا تھا اور باپ اس کا مقابلہ کرنے کے لئے بنگالہ سے آیا تھا دونوں کڑے میں یکجا ہوئے اور اس سبب سے کہ خونریزی کی نوبت نہ آئے دریائے گنگ کے شکم میں ایک ایک کشتی پہ سوار ہو کر دونوں گفتگو کرنے لگے۔ ارادہ تھا کہ دونوں ساتھ ساتھ دارالسلطنت کو جائیں گے۔

اواخر تیرھویں صدی میں الہ آباد علاؤالدین حکمران کڑا کے قبضہ میں تھا۔ ۱۷ رمضان ۶۹۵ھ (۱۷ جولائی ۱۲۹۶ء) کو اسی دریائے گنگ کے طرف پار یگ کے میدان میں مانک پور وکڑا کے مابین علاء الدین نے اپنی رشت اعمالی وشقاوت قلبی سے اپنے معمر چچا سلطان جلال الدین فیروز شاہ کو دغا وفریب سے مار ڈالا۔ اس کے بعد بھی مدت ہائے دراز تک یہاں بغاوت کے اعلان، مطلق العنانی کے اشتہار اور تشددات وخونریزی کے واقعات ہوتے رہے۔ ۹۳۱ھ (۱۵۲۵ء) میں اسکو پٹھانوں کے ہاتھ سے ظہیر الدین بابر نے چھینا ۹۸۱ھ (۱۵۷۳ء) میں اکبر مہم ٹھٹہ پر جا رہا تھا، پریاگ سے گزرا تو حکم دیا کہ گنگا وجمنا کے اتصال پر جو ہندوؤں کی تیرتھ کا مقام ہے قلعہ آگرہ کے نقشہ پر ایک عظیم الشان اور مضبوط قلعہ تعمیر کیا جائے۔ چنانچہ ۲۸ سنہ جلوس میں یہ کام ختم ہوا۔ جسمیں چار قلعے اور بارہ باغ اور کئی مکانات دلکشا بیگمات اور شاہزادوں کی محلسرائیں اور دولت خانہ شاہی تعمیر وتکمیل کئے گئے۔ ٹکسال قائم کی گئی شریف سرمدی کا یہ شعر سکہ پر مسکوک ہوا ہے

ہمیشہ ہچوں زر خورشید و ماہ روشن باد ... بہ شرق وغرب جہاں سکۂ الہ آباد

شاہزادہ سلیم جو بعد کو جہانگیر کہلایا ہے اپنے باپ کے عہد میں الہ آباد کا صوبہ دار تھا خسرو باغ کے نام سے مشہور پر فضا اور روح افزا روضہ، جہانگیر کے باغی وطاغی بیٹے خسرو کی شوریدہ سری کی یاد اب تک تازہ کر رہا ہے۔ اٹھارھویں صدی مسیحی کے اوائل میں بوندیلے بسر کردگی چھتر سال سلطنت مغلیہ کے خلاف یورش وسرکشی کر رہے تھے کہ نواب محمد خاں بنگش (والی فرخ آباد) صوبہ دار الہ آباد مقرر کرکے انکے استیصال کے لئے بھیجا گیا

شہر الہ آباد کی مردم شماری ۱۹۲۱ء میں ایک لاکھ سینتالیس ہزار چھ سو پانچ نفوس کی تھی شہر جمنا کے بائیں ساحل پر جہاں وہ گنگا سے آکر ملگئی ہے آباد ہے۔ ہندوؤں کے زمانہ میں اس کا نام پریاگ یا پراگ (قربانی کی جگہ) تھا۔ دونوں دریاؤں کے اتصال کی وجہ سے یہ مقام ہمیشہ متبرک سمجھا گیا ہے۔ عام طور پہ یہ بھی مشہور ہے کہ ایک تیسرا دریا سرسوتی جو پنجاب کے جنوب مغرب میں بہکر ریگزار میں ناپید ہو گیا تھا، یہاں آکر پھر نمودار ہوا ہے اور گنگ وجمنا سے مل گیا ہے۔ سب سے پرانی یادگار قلعہ کے اندر ایک ستون ہے جس پر اشوک

میں پیش آتے رہے، بادشاہ گردی کی جو داستانیں یکے بعد دیگرے سنائی گئیں صفحات تاریخ اُن سے سیاہ ہیں
تفصیل ونقل کی ضرورت نہیں۔ قطب الملک اور اُن کے رفقا واعوان نے سلطان ابراہیم بن رفیع الشان
بن شاہ عالم کو تخت پر بٹھایا۔ ایک طرف سادات بارہہ اور اُن کے انصار تھے، دوسری طرف محمد شاہی فوج

کا کتبہ تیسری صدی قبل مسیح کا ہے۔ اسی پر دوسری تحریر سامودر گیت کی فتوحات واقع چوتھی صدی مسیحی کی ہے اور تیسری نور الدین جہانگیر کے عہد کی۔

پہلے پراگ نام تھا، اکبر نے عظیم الشان قلعہ بنوایا تو اُسی زمانہ سے شہر کا نام الہاباس۔ الہ آباس اور الہ آباد قرار پایا اور ایک صوبہ کا صدر مقام ہو گیا۔ اکبر کے عہد کے اختتام پر شاہزادہ سلیم (جہانگیر) اس صوبہ کا گورنر تھا اور قلعہ میں رہتا تھا۔ اٹھارھویں صدی عیسوی میں شہر اور صوبہ کو بھی اُنھیں تمام انقلابات وشورو شر سے سابقہ پڑا جو بالائی ہند میں زوال سلطنت مغلیہ کے پیش خیمہ تھے ۱۱۳۲ھ (۱۷۲۰ء) سے ۱۱۴۹ھ (۱۷۳۶ء) تک محمد خاں فرخ آبادی یہاں کا گورنر رہا۔ پھر ۱۱۵۲ھ (۱۷۳۹ء) میں مرہٹوں نے شہر پر حملہ کیا۔ ۱۱۶۰ھ (۱۷۴۷ء) میں صفدر جنگ نواب اودھ کے ہاتھ میں عنان حکومت آگئی۔

پرانے وقت کی عمارتیں قلعہ میں بہت کم باقی ہیں، ان کی بجائے زیادہ تر انگریزی بارکیں وسلاح خانہ وغیرہ قائم ہوئے ہیں۔ خسرو باغ شاہی تفریح گاہ ہے۔ خسرو جو جہانگیر کا سب سے بڑا بیٹا تھا اور جس نے اکبر کے بعد آگرہ کا تخت چھین لینے کی کوشش کی تھی مگر شکست پائی، اس باغ میں خود اُس کا اور اُس کی ماں وبہن کا روضہ ہے۔

عہد حاضرہ میں الہ آباد نہ صرف تین ندیوں کا سنگم بلکہ ہر قسم کے علمی وعقلی، ذہنی ومادی دریاؤں کا سرچشمہ بنا ہوا ہے۔ یہاں کی یونیورسٹی اپنے قابل وفاضل اساتذہ او پروفیسروں کے طفیل میں اور پبلک لائبریری اپنی نادر وبیش بہا کتابوں کے ذخیرہ کے ساتھ اہل شوق اور تشنگان کمال کو صلائے کرم دے رہی اور فیض ابدی پہونچا رہی ہیں۔ ہائی کورٹ اور بورڈ مال کی عدالتیں اہل مظلمت اور اہل دولت کے لئے سب سے بڑی نعمت گاہیں ہیں۔ ریلوں کا مرکز ہے جہاں سے ہر سمت سڑکیں جاتی ہیں، تجارت وآمدورفت کے لیے ہر قسم کی سہولت وآسانی مہیا ہے۔

روحانیات کے تعلق سے پریاگ راج، ایک بڑا پرستش گاہ اور مرتاض رشیوں کا مرجع ہے۔

عمارات محدثہ میں یونیورسٹی کا سینٹ ہال۔ لا کالج، یونیورسٹی لائبریری، میور سنٹرل کالج، میو ہال، تھارن ہل مین میموریل (جس میں کتب خانہ عامہ ہے) ہائی کورٹ، پتھر کا گرجا، بہت سے مدارس وکالج اور ہوسٹل ولورڈنگ ہوس (طلبا کے دار الاقامت) قابل دید ہیں۔

کا توپ خانہ۔ ۱۴ محرم ۱۱۳۳ھ مطابق ۲۔ نومبر ۱۷۲۰ع کو لڑائی ہوئی۔ سادات نے شکست پائی قطب الملک مجروح ہوئے۔ حیدر علی میر آتش اُنکو اپنے ہاتھی پر سوار کراکے بادشاہ کے سامنے لے گیا بادشاہ نے جان بخشی کرکے حیدر قلی خاں کے حوالہ کر دیا۔ قطب الملک بادشاہی قید میں کئی سال رہے۔ دو بار زہر دیا گیا۔ پہلی مرتبہ اُن کے وفاکیش خدمتگار نے زہر مہرہ گھس کر پلا دیا تھا۔ خوب استفراغ کیا اور قے سے زہر نکل گیا دوسرے دن بادشاہی خواجہ سرا پھر پیالہ لے کر آیا۔ حسن علی خاں نے راضی بہ قضا ہو کر پی لیا۔ او سلخ (۳۰) ذیحجہ ۱۱۳۵ھ

نواب شائستہ خاں بن نواب آصف جاہ کی شاہجہانی مسجد جو ۱۰۵۶ھ (۱۶۴۶ع) میں تعمیر ہوئی تھی گردش روزگار سے نذر ہو چکی۔ حسب روایت مسٹر ہیل اوائل عملداری ایسٹ انڈیا کمپنی یعنی ۱۸۰۰ع میں کرنیل کیٹ نے اسکو تغیر دیکر اپنی بود و باش کا مکان بنا لیا تھا۔ دس سال بعد یعنی ۱۸۱۰ع میں کمپنی کے حکم سے پھر اصلی صورت میں تبدیل کر دی گئی بشپ ہیبر نے بھی اس مسجد (جامع) کو دیکھا تھا وہ اسکی بڑی تعریف کرتا اور اسکی خوبی موقع بلندی حسن منظر قرب دریا کی تحسین کرتا ہے مدت تک جمعہ و عیدین کی نماز یہاں ہوتی رہی آخر یہ حالت بھی انقلابات حکومت و شدائد غدر سے قائم نہ رہی۔ اب اینٹ اور چونے کا ڈھیر ہے عہد اسلام کی مفصلہ ذیل یادگاریں اب بھی باقی ہیں (۱) خلد آباد کی سرائے ۹۹۷ھ (۱۵۸۹ع) (۲) مسجد شیخ محمد افضل (بقعہ افضل) ۱۰۸۸ھ (۱۶۷۷ع) (۳) خانقاہ شیخ محمد افضل (مقام افضل) ۱۰۹۲ھ (۱۶۸۱ع) (۴) مسجد دائرہ شاہ محب اللہ ۱۱۰۳ھ (۱۶۹۴-۵ع) (۵) خانقاہ دائرہ شاہ محب اللہ ۱۱۰۸ھ (۱۶۹۶ع) کی تعمیر ہیں۔ (۶) مقبرہ شاہ عبد الجلیل جو نہایت مرتفع اور شاندار و مستحکم ہے۔ شاہ صاحب کی رحلت کے بعد غلام محی الدین نے ۱۱۲۰ھ (۱۷۰۸ع) میں تعمیر کرایا تھا۔ (۷) روضۂ زینت النساء بیگم واقع بہادر گنج ۱۱۴۷ھ (۱۷۳۴ع) (۸) مسجد حسام الدین علی خاں۔ نزدیک باغ بادشاہی بزمانہ قیام شاہ عالم بادشاہ ۱۱۸۰ھ (۱۷۶۶ع) (۹) مسجد قدم رسول ۱۱۸۴ھ (۱۷۷۰ع) (۱۰) مسجد رسول پور (ساداٹ۔ حال انگریزی آبادی) قریب قدم رسول۔ تعمیر خدا رخاں فیلبان منصبدار شاہ عالم ۱۱۸۸ھ (۱۷۷۴ع) (۱۱) مقبرہ منور علی شاہ۔ شاہ صاحب بڑے معمر و سن رسیدہ ہو کر گزرے ہیں۔ آپ کے متعلق عجیب عجیب روایات مشہور و مذکور ہیں۔ تاریخ پیدائش ۱۱۔ رمضان ۱۰۹۱ھ (۱۵۔ اگست ۱۶۸۰ع) اور تاریخ وفات ۴ جمادی الآخر ۱۱۹۹ھ ۱۵۔ اپریل ۱۷۸۵ع بتائی جاتی ہے

الہ آباد کے آثار خصوصی میں بارہ سرائیں اور بارہ دائرے شمار کئے جاتے تھے۔ سرائے مسافروں کی قیامگاہ اور وارد و صادر کے لئے جائے راحت تھی۔ دائرہ Monastery یہاں کے باشندے فقرا اور اہل اللہ کے مساکن اور درویشوں کے مقامات کو کہتے ہیں۔ جس کے احاطہ میں متعدد مکانات بلکہ مساجد و خانقاہیں بھی ہوتی ہیں

۱۹؍ستمبر ۱۷۲۳ء) کو تین سال قید رہکر اس جہانِ ناپائدار کے تردّدات و صعوبات سے نجات پائی اور وہیں دہلی میں دفن ہوئے ؎

عجب رفیق ہے یہ بیکسی کہ بعدِ فنا سرِ مزار مجاور ہے نوحہ گر بھی ہے!

یہاں کبھی ذوق و شوق والوں کا مجمع اور طالبانِ فضل و کمال کا ہجوم رہتا تھا۔ علومِ صوری و معنوی سے افادہ و افاضہ کرتے تھے۔ سنہ ۱۲۲۰ھ (۱۸۰۵ء) میں جو دوائر شہرت و عمور رکھتے تھے صاحب آرائش محفل نے اُنکو مختصراً تحریر کر دیا تھا کچھ ان میں سے بھی اب نابود ہو چکے ہیں۔ اُن کے آثار زبانِ حال سے کہہ رہے ہیں ؎

محو ہونا ہی تجھے ہے اگر اے یاد دلا میری تربت پہ نشانِ سرِ تربت ہونا

چند باقی ہیں۔ مثلاً دائرۂ شاہ اجملؒ (سابق دائرہ شیخ محمد افضلؒ و شاہ خوب اللہؒ) ۲۔ دائرہ شاہ وجیہ اللہؒ (اصلاً دائرہ شاہ محب اللہؒ) ۳۔ دائرہ شاہ غلام نبیؒ (بحال محمدی شاہؒ) ۴۔ دائرہ شاہ نور علی وغیرہ۔ مگر ان میں نہ وہ رونق ہے نہ وہ عالم۔ شرف المکان بالمکین، بزرگوں کے نام لیوا اور نقشِ قدم پر چلنے والے اخلاف حتی الوسع ان کو آباد کیے ہوئے ہیں، اور اس دورِ خزاں میں بھی محرمانِ بادِ صبا کے مشامِ جاں میں گل و یاسمن کی روح پرور نکہت پہنچا رہے ہیں۔

اسی سلسلہ میں اس سیاہکار نقاشِ سطور کو دائرہ شاہ رفیع الزماں قدس سرہ اور مرقدِ مبارک حضرت شاہ عبداللطیف نور اللہ مضجعہ کا تبرکاً و تیمناً ذکر کرنا چاہیے تھا [حضرت شاہ عبداللطیف کا سال وفات ۱۰۳۹ھ مطابق ۱۶۲۹ء اور تاریخ وفات "ہائے شیخ عجم" ہے) گلچین گل چین تو از تنگی داماں گلہ دارد۔ حضرت قدسی منزلت ملاذی و ملجائی سیدی و مولائی شاہ محمد عبداللطیف (ثانی) الحسنی الحسینی القادری النقشبندی طاب ثراہ (متوفی ۱۳۲۶ھ) کی بارگاہ والا میں بھی مجھے اپنی عقیدت و امتنان کا اظہار لازم ہے جنکی آرامگاہ خاکی کے زیر سایہ بیٹھ کر میں نے ان اوراق کو سیاہ کیا ہے۔ اور جن کے حریم پاک کے آستانے رحمت سے فیوض ربانی اور لطائف و برکات روحانی راقم ذلیل البضاعت کے شامل حال رہے ہیں۔ مقبول نامقبول نہ رہے گا مگر معتقد ہونگا کہ یہ سطریں آپکی بدولت یادگار رہ جائینگی۔

ع ما نمانیم و بگیتی سخن ما ماند

۱۳۰؎ کھجوا، ضلع فتح پور، صوبجات متحدہ میں ایک قصبہ و تحصیل کا نام ہے آبادی تین ہزار ہوگی۔ اورنگ زیب نے اپنے بھائی شجاع پر ۱۹۔ ربیع الاول ۱۰۶۹ھ کو (۱۶۵۹ء میں) فتح پائی تھی اسنے موضع کھجوا کے موقع پر ایک نئے قصبہ کی بنیاد اس کی یادگار میں ڈالی۔ اور اورنگ آباد نام رکھا گر یہ نام مشہور نہ ہوا۔ سرائے اور بارہ دری، باغ اور تالاب جو اسی زمانہ میں بنائے گئے تھے ابھی عمارتیں ہیں اور سرکار کی طرف سے ان کی تعمیر [illegible]

میر عبدالجلیل نے ان کی مدح میں مثنوی لکھی تھی جو مثنوی شادی فرخ سیر بادشاہ میں حسب موقع شامل ہو داخل کر دی۔ چند اشعار یہ ہیں سے

مگر نواب قطب الملک یک رنگ وزیر صاحب شمشیر و فرہنگ
ارسطو فطرتے، کاصف نشان است یمین الدولہ عبداللہ خان است
نظر پروردۂ فضلِ الٰہی جوان بخت، تفضل دستگاہی
بدیوان چوں نشیند نوبہار است بمیداں چوں در آید ذوالفقار است
امیر واہب جود و کرم اوست وزیر صاحب سیف و قلم اوست
دلیلِ سیف، جدش شاہِ مرداں بدیہی کے بود محتاج برہان

مرمت و درستی بھی ہوگئی ہے ۱۱۲۴ھ (۱۷۱۲ء) میں فرخ سیر نے اپنے برادر عمزاد عزالدین کو اسی مقام کے قریب شکست دی تھی اور یہاں سے فاتحانہ کوچ کرتا ہوا دہلی گیا تھا۔

۱۳۳ راجہ رتن چند، عبداللہ خاں وزیر کا دیوان بلکہ اُس کے سارے خان ومان کا منتظم اور مختار مطلق تھا۔ اس کی دست اندازی شاہی احکام و دفاتر تک پہونچ گئی تھی۔ کہتے ہیں کہ رتن چند کسی وقت پر چونی کی دوکان رکھتا تھا۔ اپنے ایمان وعقائد میں کامل و پختہ تھا۔ فرائض کو پوری پابندی واحتیاط سرگرمی سے ادا کرتا تھا۔ مگر چنداں عاقبت اندیش نہ تھا نہ اپنے سود وبہبود پر نگاہ رکھتا۔ اپنے آقا کے نام سے اُسکے اختیارات نافذ کرتا تھا اور کل سلطنت پر حکمرانی کرنے لگا تھا اُس کی مطلق العنانی ودست درازی کی شکایت مسامع بادشاہی تک پہونچی مگر وزیر نے کبھی توجہ نہ کی۔ اُسکو برطرف کیا۔ رفیع الدرجات کے تخت نشین ہونے پر اس کی اور راجہ اجیت سنگھ کی خواہش سے جزیہ اُٹھا دیا گیا۔ آخر زمانہ میں وہ قاضیوں اور مفتیوں کے تقرر اور امور مذہبی میں بھی دخل دینے لگا تو لوگوں کی نفرت اور بیزاری بہت بڑھ گئی۔ نواب نظام الملک کا بالخصوص بدخواہ اور بداندیش تھا۔

حسن علی خاں کے قتل ہوجانے پر رتن چند نے عبداللہ خاں کے پاس تحریر بھیجا اور خود پالکی میں سوار ہوکر قیامگاہ کو بھاگا جا رہا تھا کہ مغلوں نے دیکھ لیا۔ اس کی سخت گیری کی وجہ سے عوام الناس عاجز تھے ہجوم کثیر ہوگیا۔ رتن چند کو پالکی سے باہر کھینچ لیا اور خوب زدوکوب کی۔ اور برہنہ کر کے محمد امین خاں کے مکان پر لوا گئے۔ خان موصوف نے ستر پوشی کرائی، کپڑے پہنائے اور پا بجولاں کر کے قید خانہ بھیجدیا۔

بخاطر خصم را اگر غار خار است   برو برہان قاطع ذوالفقار است

وطن او را چو واسط از قدیم است   قلم ہم زو است حجت مستقیم است

شاہجہان آباد میں بے آبی کی شکایت سخت تھی۔ قطب الملک نے پٹپڑ گنج کی نہر ۱۱۲۷ھ (۱۷۱۵ع) میں اصل نہر شاہجہانی سے نکلوائی اور وہاں کے لوگوں اور زمین کو سیراب اور جل تھل کر دیا میر عبدالجلیل نے تاریخ لکھی ہے

بحر جود و فیض، قطب الملک، عبداللہ خاں   نہر خیرے کرد جاری آن وزیر محتشم

بہر آں عبدالجلیل واسطی تاریخ گفت   نہر قطب الملک مد بحر احسان و کرم ۱۱۲۷ھ

میر عبدالجلیل اور اُن کے ارکانِ خاندان کا مسلک با وجود ان تمام تعلقات و مراسم کے نہایت منصفانہ رہا ہے۔ یہ حضرات جہاں سادات بارہہ کے فضائل و محامد و احسانات کو یاد کرتے، اُنکی سخاوت و شجاعت کی داد دیتے ہیں، اُنکے کارہائے نیک و مآثر شریفہ کو شمار کراتے، اُنکی خوبی و نیکنامی کا ذکر کرتے ہیں، وہاں ان کا قلم اس حقیقت کے لکھنے سے باز نہیں رہتا کہ " در اواخر دولت، راہ غلط پیمودند و تا روز قیامت داغ بدنامی بر خود بُردند " ۔ دوسری جگہ فرماتے ہیں کہ " سبحان اللہ ہرچند سادات خود دعوائے سلطنت نہ کردند و اولاد تیموریہ را بر تخت نشاندند، اما حرکتے کہ با محمد فرخ سیر کردند مبارک نیامد۔ دمے بآسایش نگزاریدند نفسے بہ طمانیت نہ کشیدند۔ دریاہائے فتنہ از ہر چہار طرف بتلاطم در آمد و اسباب زوال دولت آمادہ گشت " (سرو آزاد)

یہ بھی میر صاحب کی تعلیم کا نتیجہ ہے کہ میر غلام علی آزاد بھی بادشاہ کو ہر جگہ " فرخ سیر شہید مرحوم " کے نام سے یاد کرتے اور احترام مناسب کے ساتھ ذکر فرماتے ہیں۔

فرخ سیر کی نسبت خاتمۂ مثنوی میں جبکہ وہ ناشاد و نامراد دنیا سے رخصت ہو چکا تھا میر صاحب لکھتے ہیں

(۱) کہ شاہنشہ سوئے جنت خرامید

(۲) پے تاریخ ایں مصرع برآمد   بہ بحر رحمت ایزد در آمد

(۳) شہنشہ را بہ غفراں یاد آرند۔

میر سید محمد، امیرالامرا حسین علی خاں کی نسبت ایک گفتار (نوٹ) میں لکھتے ہیں "چوں بادشاہ از گفتۂ سادات تخلف نمی کرد، بداں رضا داد، ہشتم ماہ مذکور (ربیع الثانی سنہ ۱۱۳۱ھ - ۱۰ فروری سنہ ۱۷۱۹ء) ہفت چوکی و منصب داران خاص جلو[ف۹۵] و جلو قدیم را شکوہ برخیزانیدہ در قلعہ بندوبست خود نمود و مردم معتبر از نوکران خود جابجا نشاندہ خود در حویلی دارا با فوج مسلح نشستہ و نواب قطب الملک و اجیت[ف۹۶] سنگھ راٹھور

ف۹۵ ایم ریان فرانسیسی لکھتا ہے کہ فرخ سیر کا باڈی گارڈ (عسکر محافظ ذات) کئی سو عورتوں کی جماعت پر مشتمل تھا۔ اس میں حبشنیں بھی تھیں، گرجنیں بھی، قلماقنیاں بھی تیغ و سپر سے سب مسلح رہتی تھیں اکثر کے پاس نیزہ و بندوق بھی ہوتی تھی۔ حبشیہ اور نیگرو اس ملک میں عموماً حبشن کہلاتی تھیں، قلماق تاتاری عورتیں ہوتی تھیں۔ گرجن عورتیں وہی ہیں جن کے حسن و جمال کا اس قدر شہرہ و غلغلہ ترکستان اور ایران میں پھیلا ہوا ہے۔ ہندوستان میں تو یہ کسی قدر موٹی اور بھدی سمجھی جاتی ہیں حسن و نزاکت کے لئے اتنا لحم و شحم یہاں ناموزوں اور ناشایان بتایا جاتا ہے۔ نورس و نوخیز نازک و نازنین عورتیں، جن کی تازگی و رعنائیت کا آغاز ہو، اہل ہند کی نظر میں جذب خاص رکھتی ہیں اور ذوق سلیم کی چیزیں ہیں

ف۹۶ راجہ اجیت سنگھ کی معرکہ آرائی کا ذکر سید حسین علی خاں کے ذیل میں آچکا ہے، نیز جودھ پور یا مارواڑ کے سلسلۂ تاریخ میں۔ اجیت سنگھ جودھ پور کا راجہ یا اُس زمانہ کے بعض مورخین کے بقول "موروثی زمیندار" تھا راجپوت ٹھاکر راٹھور نسل سے تھا۔ سنہ ۱۰۹۲ھ (سنہ ۱۶۸۱ء) میں مسند نشین ہوا۔ اورنگ زیب کی وفات کے بعد اجیت سنگھ نے خود مختاری و بغاوت و شرارت اختیار کی تھی، بہت ہی ناشائستہ حرکات و افعال کا مرتکب ہوا تھا، مساجد کو منہدم کرکے اُن پر مندر تعمیر کرائے تھے۔ سنہ ۱۱۲۷ھ (سنہ ۱۷۱۴ء) میں اپنی لڑکی کی شادی فرخ سیر بادشاہ سے کی۔ دارالخلافہ کے واقعات اور ہنگاموں کے سلسلہ میں حتی کہ فرخ سیر کی معزولی و قید و بند میں بھی اجیت سنگھ کا نام بارہا آیا ہے۔ سنہ ۱۱۳۲ھ (سنہ ۱۷۲۰ء) میں دہلی سے چلے جانے کے بعد اُس نے سنہ ۱۱۳۴ھ (سنہ ۱۷۲۱ء) میں اجمیر پر قبضہ کر لیا اور سکہ بھی اپنے نام سے جاری کیا لیکن دو سال بعد محمد شاہ کے حوالہ کر دیا اسکی حالت دیکھکر اہل تدبیر اور واقعہ طلبوں نے اس کے بیٹے ابھے سنگھ کو ترغیب دی کہ ریاست جودھ پور کو تباہی و بربادی سے بچانا ضروری ہے اور اس ضرورت سے باپ کا قتل کرا دینا اور خود ابھے سنگھ کا گدی پر بیٹھنا عین مصلحت۔ نظر بر آں ابھے سنگھ نے سنہ ۱۱۳۷ھ (سنہ ۱۷۲۴ء) میں اپنے بھائی بخت سنگھ کو آمادہ کیا، اُس بدبخت نے اس عمل زشت کا ارتکاب کرکے اپنے باپ کے قتل کا پاپ اپنے سر پر لے لیا۔ یہ واقعہ محمد شاہ کی شروع عملداری کا ہے۔

راجہ جودھ پور و میرٹھ را در قلعہ فرستاد تا بادشاہ را در قید آوردہ میل در چشمش کشیدہ کور کردہ محبوس داشتند۔

اس کا دستور یہ تھا کہ لوہے کی سلائی آگ میں گرم کرکے آنکھ کے اندر پھیر دی جاتی تھی۔

اجیت سنگھ ایک رات خواب شیریں میں تھا کہ قتل کر دیا گیا۔ بارہ تیرہ برس باپ دادا کی گدی پر رہا۔ ابھے سنگھ مسند نشین ہوا۔ ۱۱۴۴ھ (۱۷۳۱ء) میں اس نے محمد شاہ بادشاہ کی بڑی خدمت و نمک حلالی کی احمد آباد کو فتح کیا سربلند خاں کی بغاوت و سرکشی کا استیصال کیا۔ چھبیس سال حکمراں رہا

اجیت سنگھ علم و ہنر اور اہل کمال کا بڑا قدردان تھا۔ اس نے ایک مبسوط کتاب تالیف کرائی تھی جس میں سورج بنسی خاندان کے حالات شروع سے لیکر اپنے عہد تک کے درج کرائے تھے۔ اس کا سال ولادت ۱۶۷۹ء تھا۔ اجیت سنگھ کا بیٹا ابھے سنگھ جو ۱۷۵۰ء تک حکمران رہا اس بارہ میں اپنے باپ کا ہم قدم صاحب فن اشخاص کا سرپرست اور شعرا کا محسن و مربی تھا۔ جسونت سنگھ (پدر اجیت سنگھ) جو ۱۶۲۵ء میں پیدا ہوا اور ۱۶۷۹ء میں فوت ہوا۔ ہندی اور بھاشا میں کامل بتایا جاتا ہے اس نے بھاشا بھوشن اور کئی کتابیں فلسفہ ویدانت پر یادگار چھوڑی تھیں۔

[illegible] ریاست جودھ پور، مارواڑ، راجپوتانہ میں سب سے بڑی، سب سے پرانی اور تاریخی ریاست ہے۔ چاروں طرف سے دیسی ریاستوں سے محصور ہے۔ مارواڑ کو اسکی خشکی اور کم آبی کی وجہ سے ارض الموت Region of death کہتے ہیں مکرانہ کی سنگ مرمر کی مشہور کانیں بھی اسی ریاست میں ہیں، جہاں سے مرمر اعلیٰ کے بلوری تیغروں کی طرح برآمد ہوتا ہے۔

مہاراجگان جودھ پور، رام چندر جی فرمانروائے اجودھیا کی نسل سے ہونے کے مدعی اور راٹھور راجپوتوں کے مسلم سردار ہیں۔ خاندان مغلیہ کے ساتھ عرصہ تک اس خاندان کے تعلقات قرابت و رفاقت نہایت مخلصانہ و عزیزانہ و راستبازانہ رہے ہیں۔ راجہ اودے سنگھ نے اپنی بہن جودھا بائی اکبر کو اور اپنی بیٹی مان بائی شاہزادہ سلیم جہانگیر کی زوجیت میں دی تھیں۔

مہاراجہ کا خطاب سب سے پہلے جسونت سنگھ نے پایا وہ مالوہ کا صوبہ دار اور افواج شاہی کا سالار تھا۔ بہت سی مہمات اور لڑائیوں میں بادشاہ کی طرف سے شریک ہوا اور داد تہور و شجاعت دی۔ اسی کا بیٹا اجیت سنگھ تھا جو باپ کے مرنے کے بعد پیدا ہوا تھا اور جس نے [illegible] اورنگ زیب کی وفات ۲۸ ذیقعدہ ۱۱۱۸ھ مطابق ۱۱ فروری ۱۷۰۷ء

ایک دوسرے موقع پر لکھتے ہیں کہ "ہشتم ماہ ربیع الآخر (۱۸-فروری ۱۷۱۹ء) سادات بارہہ فرخ سیر بادشاہ را گرفتہ اسیر زنداں کردند۔ شاہ تا دو ماہ محبوس ماندہ جان بجاں بخش سپرد۔ بالآخر ہشتم جمادی الآخرہ جنازۂ آں بادشاہ مغفور را بیروں آوردہ در مقبرۂ ہمایون مدفون ساختند۔"

کے بعد اپنے آبائی مقبوضات و مملوکات پر قبضہ کر لیا اور راجگان اودے پور و جے پور سے اتحاد و موافقت کر کے مسلمانوں کے دست تصرف یا ماتحتی سے خلاصی حاصل کی۔ معاہدۂ اتحاد میں اہم شرط یہ تھی کہ والیان جودھ پور و جے پور خاندان راجہ اودے پور سے پھر رسم قرابت و ازدواج قائم کر لیں گے جو سلاطین مغلیہ سے قرابت کر لینے کی وجہ سے قطع ہو گئے تھے۔ اسی کے ساتھ یہ اقرار بھی تھا کہ اودے پوری شہزادیوں سے جو اولاد ہو اسکو اور انہوں کی اولاد کے مقابلہ میں مسند نشینی کا حق فائق حاصل ہوگا۔ اسی عہد و پیماں کی بنا پر ۱۱۲۱ھ (۱۷۰۹ء) میں سانبھر میں راجگان موصوف سے سخت لڑائی ہوئی۔ جس کے ایک دو سال بعد بالآخر بہادر شاہ سے صلح ہوگئی۔

برادران سید (بارہہ نے) جن کو فرنگی مورخین 'مقتلہ جنگ' یا the Warwick s of the East کہتے ہیں جب حکومت و اقتدار پایا تو اجیت سنگھ کو مجبور کیا کہ حسب دستور قدیم اور معمول شاہانہ اپنے وارث و ولی عہد کو مع کسی قدر فوج کے بطور یرغمال (کفیل یا ضمانت) آستان خلافت کو بھیجکر اپنی اطاعت و فرمانبرداری کا اظہار کرے۔ اس نے انکار کیا۔ تو تنبیہ و سرزنش کے لئے فوج کشی کی گئی۔ تنگ ہو کر اس نے اپنا بڑا لڑکا ابھے سنگھ دہلی بھیجا اور اپنی لڑکی (راج کنواری) فرخ سیر کو بیاہ دی۔ پھر پائے تخت کو خود بھی گیا کئی سال تک مہاراجہ مذکور نے وہاں حاضری دی اور امرائے دربار اور ارباب حل و عقد کی سازشوں اور مشوروں میں شریک رہا لیکن جب ۱۱۳۱ھ (۱۷۱۹ء) میں فرخ سیر قتل کر دیا گیا تو اس نے سادات کی موافقت اور شرکت کار اور رفاقت سے انکار کر دیا۔ ان کے افعال و اعمال سے بیزاری و نفرت کا اعلان کیا اور ابھے سنگھ کو دہلی میں چھوڑ کر خود ۱۱۳۳ھ (۱۷۲۱ء) میں جودھ پور واپس چلا آیا۔

شہر جودھ پور پرانا اور سرسبز مقام ہے۔ آبادی ۱۹۲۱ء میں ۸۰۴۳۰ تھی۔ اس کو راؤ جودھا نے آباد اور اپنے نام سے منسوب کیا تھا۔ یہاں کی تجارت خوب اور روز افزوں ترقی پر ہے

۵۰ میرٹھ کا قلعہ مشہور ہے جس پر اکبر کے حکم سے ۹۶۹ھ (۱۵۶۱ء) میں مرزا شمس الدین نے فوج کشی کی تھی۔ جس وقت رانائے اودے پور کی حکومت میں تھا۔ جے مل راٹھور کی طرف سے حاکم تھا اس نے کمال دلیری و مردانگی سے مقابلہ کیا۔ آخر ٹھہر نہ سکا اور قلعہ خالی کر دینا پڑا۔ اکبر کے عہد میں یہ سرحدی مقام اور نہایت زبردست

مسٹر ٹامس بیل Thomas W Beale مفتاح التواریخ میں لکھتے ہیں کہ "فرخ سیر دو ماہ بعد از معزولی خود بتاریخ دراند دہم ماہ جمادی الثانی سال مذکور حسب ایمائے قطب الملک در زندان بقتل رسید لاش او را در مقبرہ ہمایون بادشاہ دفن کردند" لیکن بیچا تاریخ انگریزی میں تاریخ قتل ۹ رجب ۱۱۳۱ھ مطابق ۱۶ مئی ۱۷۱۹ء تحریر کرتے ہیں۔

حسب روایت سیر المتاخرین فرخ سیر ترپولیہ کے اوپر ایک تنگ و تاریک کمرہ میں محبوس رکھا گیا تھا۔

واضح رہے کہ فرخ سیر کے مظالم کی فرد بھی کچھ کوتاہ نہیں ہے۔ اُس نے ۱۷ ذیقعدہ ۱۱۲۴ھ (۷ دسمبر ۱۷۱۲ء) کو جہاندار شاہ پر فتح پا کر تخت فرمانروائی پر اکبر آباد میں جلوس کیا۔ مرزا ایزد بخش رسا کو جو کسی وقت عالمگیر کا میر منشی تھا اور پھر اعظم شاہ کا متوسل اور چیرہ طلب ہو گیا تھا، طلب کر کے حکم دیا کہ اُسکی و بچوں کا ایک ایک بال جڑ سے اکھاڑ ڈالا جائے بعد ازاں اُس کو ایک ستون سے باندھ کر آگرہ میں بڑی خواری و بے دردی سے ہلاک کرا دیا۔ شاہجہان آباد ہو چکنے جہاندار اور امیر الامراء ذوالفقار خاں اور بہت سے دیگر اعیان دولت کو قتل کرایا۔ ان کے سر تن سے جدا کر کے نیزوں پر آویزاں کئے گئے لاشیں پانوں کی طرف سے رسیوں سے باندھ کر ہاتھی کی پشت پر ایک اس طرف، اور دوسری دوسری طرف لٹکا دی گئیں۔ خود بڑی شان و شوکت سے شہر میں داخل ہوا۔ راجہ سبھہ چند دیوانِ امیر الامراء کو گرفتار کر کے اُسکی زبان کٹوا لی جہاندار کے بہت سے متعلقوں کو پکڑوا کر مروا ڈالا اعز الدین پسر جہاندار شاہ و عالی تبار پسر اعظم شاہ اور ہمایوں بخت اپنے چھوٹے بھائی کو معدوم البصر کرا کے محبس بھجوا دیا۔

اسی بنا پر بعض مورخین نے اسکو حجاج[1] ثانی کے لقب سے یاد کیا ہے یہ تشاہ (ایک بے اختیار بادشاہ کا ایک باقتدار وزیر سے) صحیح ہو یا نہ ہو مگر اس میں شک نہیں کہ اسکی شمشیر خون آشام نے اپنی پیاس

سمجھا جاتا تھا۔ احمد و ماگو سے اُس طرف میرٹھ تک مل کی تعریف و تحسین کے ترانے راجپوت اب تک گاتے ہیں۔ آئین اکبری میں اس کو متعلق سرکار ناگور کے لکھا ہے اور تحریر کیا ہے کہ "قلعہ از سنگ دارد۔" آزاد دہلوی دربار اکبری میں راجہ میرٹھ کے ذیل میں ناقل ہیں کہ سیاسٹ ناتشہ گان میرواڑہ کا نام تھا۔

[1] حجاج بن یوسف ثقفی عبد الملک بن مروان اموی کا امیر الامراء تھا مورخین عرب اسکو در پرتعظیم الوزرا لقب کہتے ہیں شاید بے جرائم اور جور و ستم کے لحاظ سے تاریخ اسلام میں اپنی نظیر نہیں رکھتا۔ نہایت ظالم و سنگدل تاجدار تھا۔

بہت سے گنہگار اور بے گناہوں کے لہو سے بلا امتیاز بجھائی تھی بلکہ بدنصیب نادانشمند فرخ سیر اپنا دامن زیادہ تر

شخص تھا اسکی گورنری و وزارت کی یادگار بہت سے دردانگیز و روح فرسا واقعات صفحۂ روزگار پر مرتسم ہیں اس نے حضرت عبداللہ بن زبیر سے مقابلہ کیا تھا یکم ذیحجہ ۷۲ھ (۲۰ اپریل ۶۹۲ء) کو مکہ معظمہ کا محاصرہ شروع ہوا چھ ماہ تک یہ معرکہ گرم رہا۔ ام القریٰ کے باشندے اور حرم بیت اللہ میں اماں پانے والے سامان رسد اور خورد و نوش کے بہم نہ پہونچنے سے عاجز آ گئے تھے بہت سے صحابۂ پاک قتل ہوئے۔

باایں ہمہ اس کے اعمال حسنہ سے بھی کچھ باتیں قابل تحریر ہیں۔

(۱) قرآن پاک پر اعراب لگائے سچ یہ ہے کہ یہ کام نہایت ضروری اور اچھا تھا اور وہ دنیائے اسلام پر بڑا احسان کر گیا ہے اگر یہ شخص حجاج سفاک نہ ہوتا تو خدا معلوم کہ اس کار خیر کے اجر و مزد میں اس کا شمار نیک و برگزیدہ مسلمانوں کے کن کن طبقوں میں کیا جاتا

(۲) حضرت عبداللہ بن زبیر کے تعمیر کرائے ہوئے خانہ کعبہ کو ۷۴ھ (۶۹۳ء) میں تغیر دے کر اپنی طرف سے بنوایا

(۳) ملوک عرب میں سب سے پہلے اپنے بادشاہ عبدالملک بن مروان کا سکہ سونے چاندی پر ۷۶ھ (۶۹۵ء) میں منقوش کرا کے جاری کیا۔ اس سے پیشتر بادشاہان عجم کے سکے چلتے تھے (بروایت دینوری)

(۴) بلاذری لکھتا ہے کہ ۷۸ھ (۶۹۷ء) تک محکمہ خراج میں فارسی طریقے، فارسی زبان اور فارسی رقوم و ہندسے رائج تھیں صالح بن عبدالرحمن کاتب نے جو سیستان کے گرفتار شدہ قیدیوں میں سے کسی کا بیٹا تھا زادان پسر فرخ (فرخ حجاج کا میرمنشی تھا) ایک دوسرے فارسی یا مجوسی سے جو سواد (کلدانیہ) کے دفتر مالی میں نائب کاتب اور محاسب کے عہدہ پر ممتاز تھا یہی یا طنز سے کہلا بھیجا کہ اگر اجازت ہو تو حسابات کلیتًا عربی میں کر دیئے جائیں۔ حجاج نے سنا تو اسکے موافق حکم دیدیا زادان کا بیٹا مروان شاہ چلا اٹھا کہ "خدا تیری نسل دنیا سے قطع کر دے جیسے تو نے فارسی زبان کی جڑ کاٹی ہے" دربار کے پارسیوں نے رشوت کے طور پر اسکو ایک لاکھ درہم بھی پیش کئے تاکہ وہ اس خدمت سے عجز و ناقابلیت کا اعتراف کر کے دستکش ہو جائے مگر اس نے انکار کر دیا۔ حتی کہ ۸۶ھ (۷۰۵ء) میں عراق کا سارا دفتر عربی زبان میں مستقلًا منتقل ہو گیا

سیدہ علیسر لوون لکھتے ہیں کہ عبدالملک کا قابل مگر بے رحم نائب حجاج بن یوسف تھا (یہ ایسا نام ہے جو یزید، ابن زیاد اور شمر کے نام سے کسی طرح کم نفرت و تاسف کے ساتھ نہیں سنا جاتا۔ یعقوبی) مکہ کے محاصرہ اور گولہ باری اور ابن زبیر کی بغاوت کے استیصال کے لئے اسکی تیاری و آمادگی ہی نے سب سے پہلے اسکی سفارش اسکے آقا سے کی تھی۔ پھر تو بائیس برس (۷۳ھ ۶۹۱ء سے ۹۵ھ ۷۱۳ء) تک یہ تشنہ خون اور بے درد شخص دنیائے اسلام میں طعون و مطرود بنا رہا۔ اپنی سنگدلی اور شقاوت سے جن لوگوں کو اس نے قتل کرا دیا تھا ان کی تعداد کا تخمینہ ایک لاکھ بیس ہزار کیا جاتا

ناکردہ گناہ لوگوں کے خون سے دامن داغدار کر کے رخصت ہوا ہے ؎

بجرم عشق مرا گر کشی، چہ خواہی گفت؟ — جواب خون رقیباں کہ بے گناہ ماند!

میدان جنگ میں جان دینے والوں کا تماشا ۔ اس کے علاوہ ہے (مروج الذہب مسعودی) ماشدگان کو کوفہ کا ان کلمات سے خطاب کرنا "خدا کی قسم میں دیکھتا ہوں کہ نظریں مجھ پر جمی ہوئی ہیں۔ گردنیں میری طرف بڑھی ہوئی ہیں اور سر درد ہو جانے کے لئے خود بخود جھکے ہوئے ہیں۔ کاٹنے والے کے لئے تیار ہیں میں ہی وہ شخص ہوں جو اسکو انجام کو پہونچاؤں گا" اس شخص کی خون آشام طبیعت کے خاصہ کو ظاہر کرتا ہے۔ (الطبری) اس کے آقا عبدالملک کے الفاظ بھی اس سے کم درجہ نہیں رکھتے جو اس نے مسند خلافت پر اپنے جلوس کی خبر پاکر کہے تھے جب خبر ملی تو نہایت بیکسی سے بیچارہ قرآن مجید پڑھ رہا تھا۔ سنتے ہی اس نے کتاب مقدس بند کر دی اور اس کی زبان سے نکلا ھٰذَا فِرَاقُ بَیْنِیْ وَبَیْنِکَ

حجاج ۴۱ھ (۶۶۱ء) میں پیدا ہوا۔ ترپن سال کی عمر پاکر شوال ۹۵ھ (جولائی ۷۱۴ء) میں فوت ہوا۔ مدفن کوفہ ہے۔ مگر طبری لکھتا ہے کہ پندرہ روز مرض آکلہ میں مبتلا رہا تھا پیٹ میں کیڑے پڑ گئے تھے سخت تکلیف و ایذا تھی، اسی حال میں جمعہ ۱۲۔ رمضان المبارک ۹۵ھ کو چون سال کی عمر میں اس کا خاتمہ ہوا واسط میں دفن کیا گیا مگر قبر نیست و نابود ہو گئی۔ اِنَّ فِیْ ذٰلِکَ لَذِکْرٰی لِاُولِی الْاَلْبَابِ

عراق و خراسان میں بیس سال حکومت کی مرنے کے بعد قیدیوں کا شمار کیا گیا تو پچاس ہزار نکلے بیس ہزار عورت اور تیس ہزار مرد۔ اس کے زندان خانہ پر چھت نہیں ہوتی تھی برسات اور بارش قیدیوں پر گرتی اور دھوپ کی شدت اور آفتاب کی تپش و تابش سے جلتے رہتے تھے

اگرچہ یہ سب مظالم مع اختلال عقل کا نتیجہ تھے مگر کچھ دن پہلے سے حواس ظاہری میں اختلال فاحش ہو گیا تھا جو جان کے ساتھ گیا مرض الموت میں ایک منجم سے پوچھا کہ امسال کوئی بادشاہ مریگا یا نہیں۔ اس نے کہا کہ عنقریب وہ فوت ہونیوالا ہے جسکا لقب کلیب ہے، حجاج بولا کہ صغرسن میں تو میری ماں بھی مجھے کلیب کہا کرتی تھی منجم نے جواب دیا وَاللّٰہِ اَنْتَ تَمُوْتُ حجاج نے کہا "اچھا پہلے میں تمہیں کو روانہ کرتا جاؤں" اور بیچارے بیگناہ کی گردن اڑا دی۔

رجال کے سلسلہ میں حجاج کا شمار تابعین میں ہے

حجاج کے سوانح حیات "الحجاج ابن یوسف ۴۱-۹۵ ہجریہ" کے نام سے J. Perier پیریر نے قلمبند کئے اور ۱۹۰۴ء میں پیرس میں طبع کرائے ہیں

سید حسین علی خاں

امیر الامرا سید حسین علی خاں، اگرچہ قطب الملک سے چھوٹے تھے لیکن شجاعت و بسالت، سخاوت و علو ہمت، وقار و تمکنت میں بڑے بھائی سے بدرجہا فائق تھے۔ خلد مکان کے عہد میں پہلے حکومت رنتھنبور ۱۱۵ اور آخر کو فوجداری ہنڈول تھا۔ پھر قربتے محمد اعظم کی لڑائی میں شاہ عالم نے انکی بہادری و مردانگی اور حسن تدبیر و کامیابی بجلدوے سہ ہزاری منصب اور نقارہ عنایت کیا پھر عظیم آباد پٹنہ کی نائب صوبہ داری پر مامور ہوئے۔ معز الدین اور فرخ سیر کی جنگ آزمائی میں حسین علی خاں نے کمال تہور و بہادری دکھائی۔ گھوڑے سے عین وقت پر اُتر کر پیادہ ہو گئے اور خوب لڑے، کاری زخم کھائے زمین پر گرے۔ فتح ہونے پر بادشاہ نے حسین علی خاں کو امیر الامرا بہادر فیروز جنگ خطاب اور ہفت ہزاری ہفت ہزار سوار کا منصب اور میر بخشی گری کی خدمت مرحمت فرمائی۔ جلوس کے دوسرے سال مہاراجہ اجیت سنگھ مارواڑ نے تمرد اختیار کیا۔ اس کی تنبیہ و استیصال کے لئے سید حسین علی خاں ع ایک

---

۱۱۵ رنتھنبور جس کا صحیح اور اصلی نام رنستمبھ پور (یعنی "ستمبھ جنگ کا مقام" ہے) نظامت سوائی مادھو پور ریاست جے پور واقع راجپوتانہ میں ایک مشہور قلعہ ہے جو مضبوط حصار اور دمدموں اور برجوں سے محاط و محفوظ ہے۔ اس کے اندر ایک محل، ایک مسجد اور ایک قبر کسی مسلمان ولی کی باقی ہے، باقی سب جین یادگاریں ہیں۔ سب سے پہلے سلطان التمش نے ۶۲۳ھ (۱۲۲۶ء) میں اس کو فتح کیا تھا۔ مگر قبضہ صرف چند روز رہا۔ ۶۸۹ھ یا ۶۹۰ھ (۱۲۹۰ء یا ۱۲۹۱ء) میں جلال الدین خلجی نے اور ۶۹۹ھ (۱۳۰۰ء) میں علاء الدین کی افواج نے محاصرہ کیا مگر ناکامی ہوئی۔ بالآخر ۷۰۰ھ (۱۳۰۱ء) میں خود علاء الدین گیا اور قلعہ فتح کیا۔ راجہ ہمیر دیو چوہان اور اُس کے رفقا تہ تیغ ہوئے۔ قلعہ کچھ زمانہ تک ریاست مالوہ سے، اور کچھ روز میواڑ سے، اور پھر ریاست بوندی کے تصرف میں رہا۔ ۹۷۶ھ (۱۵۶۹ء) میں اکبر نے خود محاصرہ کر کے اس کو ایک ماہ میں فتح کیا اور سرکار رنتھنبور کے نام سے معہ ترا سی محالات کے صوبہ اجمیر میں شامل کر دیا۔ رنتھنبور عرصہ تک خانخاناں کی جاگیر میں تھا۔ اسیران شاہی اور پولیٹیکل مجرم اکثر اسی قلعہ میں رکھے

فوج سنگین وجرار کے مامور ہوئے۔ فوج نے میرٹھ تک جہاں جہاں راجہ کا علاقہ تھا غارت وتاراج کر ڈالا مظفر و منصور لشکر کی ہیبت و صولت سے راجہ بیکانیر کی طرف بھاگ گیا مستحکم و استوار قلعہ میں چھپتا اور پناہ لیتا رہا۔ اس بارہ میں امیر الامرا کا حکم جس طرح عمل پذیر ہوتا تھا حسب ذیل بتایا جاتا ہے

"چونکہ اجیت سنگھ و جے سنگھ[1] سوائی کے بہات باہم مخلوط تھے۔ تعلقہ اول کی رعایا ہراس زدہ ہو کر فرار ہو جاتی تھی۔ اس لئے تاراج کرنے والوں کو حکم تھا کہ خالی مواضع کو لوٹ کر آگ لگا دیں آباد مکانات سے مزاحمت نہ کریں۔ یہ حالت دیکھکر اجیت سنگھ کی رعایا جے سنگھ کی رعایا کی وساطت سے اماں مانگ کر آجاتی تھی اس وقت سزاول متعین کر دئے جاتے تھے جو تاراجیوں کو ہدایت کرتے کہ آگ بجھا دیں اور جو کچھ لوٹا ہو واپس کر دیں۔ اس حکم کی خلاف ورزی نہیں ہونے پاتی تھی۔ بعض ثقہ لوگوں نے گانوں والوں سے جا کر دریافت کیا تو سب نے بالاتفاق کہا تھا کہ خشہ کے سوائے ہمارا کوئی نقصان نہیں ہوا۔

امیر الامرا کا ضبط و نسق اس حد تک تھا کہ اُن کی فوجیں دو کھیتوں کے اندر ہو کر تنگ و باریک راستے سے نکل جاتی تھیں مگر کسی کی مجال نہ تھی کہ راہ سے ذرا ہٹ جائے کھیتی کو ہاتھ لگانا معلوم

جاتے تھے

زوال سلطنت مغلیہ پر سترھویں صدی مسیحی کے آخر میں یہاں کے قلعہ دار نے خود اسکو راجہ جے پور کے حوالہ کر دیا تھا۔

اکبر نامہ میں وجہ تسمیہ یہ لکھی ہے کہ رن پہاڑ کو کہتے ہیں۔ یہ قلعہ رن پہاڑ کی چوٹی پر بنایا گیا تھا جس پر بڑے بڑے پتھر تھے، اس لئے رن تھمبور یعنی پوش پہاڑ ہوا۔ جہانگیر نے اپنے تزک میں ایک دوسری وجہ لکھی ہے دو پہاڑ برابر برابر ہیں ایک کا نام رن، دوسرے کا تھمبور ہے قلعہ تھمبور پر ہے کندھار کا مشہور و مستحکم قلعہ رن تھمبور سے پورب کی جانب چند میل پر تھا۔ ابوالفضل لکھتا ہے "قلعہ شگرف دارد بالائے کوہ"

[1] راجہ جے سنگھ ثانی ؟ ... راجہ جے پور میواڑ کا موروثی رئیس اور کچھواہہ راجپوتوں کا سردار۔ مرزا راجہ جے سنگھ کا پرپوتا تھا۔ معمولاً مرزا راجہ جے سنگھ سوائی کہلاتا ہے۔ فرخ سیر کے عہد میں ... راجہ جے سنگھ

اجیت سنگھ نے جب اپنی خرابی اور ملک کی تباہی دیکھی تو معتبر وکلا کی معرفت پیش کش حاضر کیا اسے بڑی لڑکے ابھے سنگھ کو بھیجا۔ اپنی لڑکی بادشاہ کی تزویج میں دینا چاہی جس کو اس ملک میں ڈولہ دینا کہتے ہیں اور اس طرح اپنے عفو جرائم کا خواستگار ہوا۔ امیر الامرا نے بھی مصالحت پسند کی اور ابھے سنگھ کو ہمراہ لے کر حضور میں پہونچا۔ ڈولہ کے لئے فوج مامور کردی۔ ڈولہ پہونچنے کے بعد بادشاہ کی شادی کے مراسم ادا ہوئے اہل تاریخ لکھتے ہیں کہ بادشاہان ماسبق کے زمانہ میں بھی ایسی عظیم الشان تقریب کبھی جلوہ پزیر نہیں ہوئی تھی۔ اور اس کے حسن انصرام کا سہرا انھیں بھائیوں کے سر باندھتے ہیں میر عبد الجلیل نے ایک مثنوی رنگین اس رسم طوی کے متعلق لکھی اور داد سخنوری دی تھی

کچھ دن بعد امیر الامرا صوبہ دار دکن مقرر ہوگئے۔ میر جملہ سمرقندی شکایت و سعایت کرکے فرخ سیر کا مزاج اُن کی طرف سے برابر برہم کرتا رہا بہت سے ناگوار و خلاف شان واقعات اور نا ملائم مکالمات پیش آئے۔ مخالفت بڑھتی رہی۔ بعض امرا و والیان ملک نے سرتابی اختیار کی جن کی سرزنش و گوشمالی اور باقتضائے مصالح، کسی کسی سے مصالحت کے لیے امیر الامرا کو حزم و ہوشمندی سے کام لینا پڑا قطب الملک، دار الملک کی روز افزوں سازشوں اور دربار کی نزاعات سے پریشان و دل شکستہ

خطاب پایا محمد شاہ نے "سوائی" اضافہ کیا بڑا مدبر و منتظم تھا ہندوستان کے ہر حصہ میں اس نے بازار و کاروان سرائے تعمیر کرائے۔ بڑا دانشمند و حکیم تھا۔ اپنی یادگار پانچ رصد گاہیں چھوڑی تھیں (۱) دہلی (۲) بنارس (۳) متھرا (۴) اوجین (۵) جے پور۔ زیج محمد شاہی کا مجوز و بانی بھی ہے ۹۔ شعبان ۱۱۵۶ھ (۱۰۔ ستمبر ۱۷۴۳ء) کو وفات پائی افواج بادشاہی کا سپہ سالار تھا۔ بڑے بڑے کارہائے نمایاں اس نے کئے تھے

۱۱۲ امیر الامرا کے بھائی قطب الملک عبد اللہ خاں، وزیر اعظم نے رفیع الدرجات کو تخت سلطنت پر بٹھایا اس کے حکم سے بادشاہ معزول (فرخ سیر) کی آنکھوں میں سلائی پھیر دی گئی۔ باقتضائے صلاح ملکی دوبارہ زہر دیا گیا سخت جانی کا بُرا ہو، کارگر نہ ہوا۔ آخر تسمہ کشی کی، اور پھر اسے فنا بنایا کہتے ہیں کہ یہ بدعت متحدثہ خود اسی بادشاہ مقتول کی نکالی ہوئی تھی جس روز فرخ سیر کا تابوت ہمایوں کے مقبرہ کو لئے جاتے تھے دہلی میں بلوائے عام ہوگیا تھا شہر کے ہزارہا حاجت مندوں نے، جو بادشاہ مجبر کی فیاضیوں اور خوان کرم و نوال سے روٹی پاتے تھے، کہرام برپا کر رکھا تھا مخالف فریق لکھتا ہے کہ دو تین ہزار مرد و عورت حاضر تھے اور بازاری بقر جمع ہوکر ساتھ ساتھ روتے ہوئے چلے۔

ہو گئے تھے ان کی متواتر و مسلسل تاکید و اصرار پر امیر الامرا آخر ربیع الاول ۱۱۳۱ھ (فروری ۱۷۱۹ء) میں دہلی آئے بادشاہ سے علانیہ مخالفت کی ایک ہفتہ بعد قطب الملک اور راجہ اجیت سنگھ کے مشورے سے قلعہ کا بندوبست ہوا فرخ سیر قید کر دیا گیا[۱] اب بھی امیر الامرا کو آرام و اطمینان نصیب نہ ہوا۔ پہلے شاہزادہ نیکو سیر اور اس کی فوج سے مقابلہ رہا۔ صلح ہوئی تو چھبیلہ رام ناگر، ناظم الہ آباد اور اس کے بھتیجے ورجا لشکن اور گردھر بہادر نے مخالفت کی بالآخر ان سے بھی مصالحت ہو گئی اب نواب نظام الملک ناظم مالوہ[۲] کو امیر الامرا سے رنجش پیدا ہوئی جس کا نتیجہ ایک معرکۂ عظیم تھا۔ صاحب سیر المتاخرین اور حاجی مصطفےٰ لکھتے ہیں کہ سید اسد خاں اور حسین علی خاں دونوں (بھائیوں) کے باہم صفائے قلب نہ تھی اور اندرونی تعلقات صمیم و خالص نہ رہے تھے

اعتماد الدولہ محمد امین خاں کی تحریک و تجویز اور نواب نظام الملک کی اجازت و مرضی سے ۱۵ ذیقعدہ ۱۱۳۱ھ (۲۹ ستمبر ۱۷۱۹ء) روز یکشنبہ کو ابو الفتح ناصر الدین محمد شاہ کو جس کا نام پہلے روشن اختر تھا تخت سلطنت پر بٹھا دیا گیا

۶۔ ذیحجہ ۱۱۳۲ھ (۲۷۔ ستمبر ۱۷۲۰ء) کو میر حیدر ترک نے اپنی "فرد احوال پیش کرنے کے حیلہ

---

[۱] سادات کے متوسلین پر پتھر پھینکتے۔ نفرین کرتے، اور آوازے کستے تھے بادشاہ کی قبر پر تین روز تک مجتمع ہو کر مولود خوانی کرتے رہے۔ اُن میں بھی دو گروہ بن گئے تھے۔ ایک حیدری، دوسرا نعمت اللٰہی تعیین محل مناسب پراگندگی

[۲] مالوہ سے کشور ہند کا وہ مسطح حصہ مراد ہے جس کا رقبہ ۶۳۰۰ میل مربع ہوگا اور جس میں وسط ہند کے مغربی قطعہ کا بڑا حصہ داخل ہے۔ وہ جزیرہ نمائے ہند کا سب سے زیادہ زرریز سرسبز اور آباد و قابل سکونت خطہ سمجھا جاتا ہے اور جو تاریخ ہندوستان کے عہد قدیم و متوسط میں ہمیشہ نمایاں و ممتاز رہا ہے ہندوؤں کے زمانہ میں اس کے حدود حسب ذیل تھے۔ جنوب میں سلسلہ کوہ وندھیاچل۔ شرق میں سلسلہ کوہ مذکور جو شمال میں بھوپال سے چندیری تک چلا جاتا ہے مغرب میں وہ شاخ جو ام جھیرہ سے چتور (راجپوتانہ) تک پھیلی ہے شمال میں مکندوارہ سلسلہ جو چتور سے چندیری کے پورب تک جا کر مل گیا ہے مسلمانوں کی عملداری میں صوبہ مالوہ اور بھی وسیع تھا۔ یعنی علاقہ مندرجہ بالا کے علاوہ، ضلع نماڑ جنوباً مابین وندھیا و ست پورہ سلسلہائے کوہ کے، میواڑ واقع راجپوتانہ) مغرب میں ہاروتی (یعنی ریاست ہائے بوندی و کوٹہ واقع راجپوتانہ) شمال میں

سے قریب جاکر امیر الامرا کے پہلو میں خنجر مار دیا۔ قابو طلبان خوشامد پرست نے تن سے سر جدا کر کے بادشاہ کے روبرو حاضر کیا۔ صاحب مفتاح التواریخ تاریخ قتل ۲۷ ذیقعدہ سنہ ۱۱۳۲ھ لکھتے ہیں جو ۱۰ ستمبر سنہ ۱۷۲۰ء کے مطابق ہوتی ہے۔

اور موجودہ ممالک متوسط کا بڑا حصہ جنوب و مشرق میں بعد گڑھ منڈلا کے شامل تھا

مالوہ کی تاریخ بہت قدیم ہے لودھیوں اور سدوؤں کے زمانہ کے حالات بھی تفصیل کافی فراہم و تلمبند کئے جاتے ہیں لیکن اس زنجیر کی کوئی کڑی اپنے اندر دلچسپی و اہمیت کا کوئی نمایاں پہلو نہیں رکھتی اس لئے اُس کے تذکرہ سے گریز کیا جاتا ہے۔

مسلمانوں میں سب سے پہلے سلطان التمش یہاں آیا اور سنہ ۶۳۱ھ (سنہ ۱۲۳۴ء) میں اوجین پر قابض ہوا پھر بلسہ پر تاخت کی ان دونوں شہروں پر تسلط ہو جانے سے تقریباً سارا مالوہ مسلمانوں کے تصرف میں آگیا جس کا زمانہ سلطان غیاث الدین بلبن کے وقت سے سلطان محمد بن فیروز شاہ کے عہد تک شمار ہوتا ہے تا آنکہ سنہ ۸۰۴ھ (سنہ ۱۴۰۱ء) میں دلاور خاں غوری استقلال و بادشاہی کا دعویدار ہوا۔

سنہ ۸۰۴ھ (سنہ ۱۴۰۱ء) سے سنہ ۹۳۷ھ (سنہ ۱۵۳۱ء) تک وہ ایک خود مختار سلطنت رہا جو صوبہ مالوہ یا مانڈو کے نام سے موسوم تھا مانڈو وہ مشہور قلعہ ہے جو ان حکمرانوں کا دار الملک تھا سنہ ۹۳۷ھ (سنہ ۱۵۳۱ء) میں اس کا الحاق گجرات سے ہوا اس کے امرا اس سے پہلے شاہان گجرات و شاہان دکن (خاندان بہمنی) و دیگر ہمسائے قریب جوار سے معرکہ آرا ہوتے رہے ابتدائے فیروز شاہ نے دلاور خاں غوری کو جس کا زمانہ سنہ ۷۹۳ھ سے سنہ ۸۰۴ھ تک یعنی سنہ ۱۳۹۰ء سے سنہ ۱۴۰۱ء تک تھا) مالوہ بطور جاگیر دیا تھا لیکن تیمور کے حملہ سے جو انقلابات رونما ہوئے اُن سے منتفع و متمتع ہو کر وہ خود مختار بن گیا اور دھار کو اپنا دار السلطنت مقرر کیا اس کا بیٹا الپ خاں عرف والی خاں جو ہوشنگ شاہ کے نام سے بھی مشہور ہے جانشین ہوا۔ اس کا زمانہ مابین سنہ ۸۰۸ھ و سنہ ۸۳۸ھ (سنہ ۱۴۰۵ء و ۱۴۳۴ء) کے تھا۔ اس نے ہوشنگ آباد کی بنیاد ڈالی، اس کا عظیم الشان مقبرہ سنگ مرمر کا بنا ہوا قلعہ مانڈو میں موجود ہے وہی یہاں دار السلطنت کو اُٹھا لایا تھا اُس نے ایک پسر نابالغ محمد غزنی خاں چھوڑا تھا جس کو اُس کے ولی و سرپرست محمود خلجی نے بعجلت ہلاک کرا دیا اور خود تخت نشین ہو گیا اس محمود خلجی کے عہد (سنہ ۸۳۹ھ سے سنہ ۸۷۳ھ مطابق سنہ ۱۴۳۶ء سے سنہ ۱۴۶۹ء تک) میں مالوہ کو بہت عروج و ترقی نصیب ہوئی اُس کی مستعدی حدِ کمال تک پہونچ گئی تھی۔ اُس کی نسبت یہ مقولہ زبان زد ہو گیا تھا کہ "اُس کا خیمہ اُس کا گھر ہے اور میدان جنگ اُس کی آرام گاہ"۔ با ایں ہمہ اس کے انتظام اور ملک داری کی خوبی یہ تھی کہ ہندوؤں اور مسلمانوں میں عناد و عداوت قطعاً مفقود تھی محمود نے اپنا قلمرو ہر طرف بڑھایا منجملہ دیگر مقامات کے اجمیر و رنتھمبور واقع راجپوتانہ اور ایلچ پور واقع دکن کو بھی شامل کر لیا۔ سنہ ۸۴۲ھ (سنہ ۱۴۳۸ء) میں چند امرا کے

ہنگامہ فرو ہوا تو بادشاہ کے حکم سے لاش کی تکفین کی گئی اور نماز جنازہ پڑھکر اجمیر بھیجدی گئی وہاں ان کے باپ سید عبداللہ خاں کے جوار میں دفن ہوئی۔ [امتیاز کے لئے یہ سید عبداللہ خاں اجمیری عرف میاں خاں کہلاتے ہیں۔]

بلانے سے وہ دہلی کی طرف بڑھا لیکن بہلول لودی نے مقابلہ کرکے اسکو پسپا کردیا اُسی زمانہ ۸۶۱ھ میں اُس نے رانا کمبھ والی چیتور پر حملہ کیا۔ حیرت ہے کہ اس کے نتیجہ اور اپنی اپنی فتح کے بابت دونوں فریق یکساں مدعی ہیں۔ رانا نے مشہور "فتح مینار" قلعہ میں تعمیر کرایا جو اس جنگ میں اُسکی کامیابی و اعزت نکلنے کی یادگار ہے۔ محمود کا بیٹا غیاث الدین ۸۷۳ھ (۱۴۶۹ء) میں تخت نشین ہوا، اس نے باپ کی حیات میں نہایت صبر و ضبط سے کام لیا اور بہت محنت و تکان اُٹھایا تھا لہذا عنان حکومت اپنے بیٹے ناصرالدین کے سپرد کی اور خود عزلت نشین و گوشہ گزین ہوگیا ناصرالدین کا زمانہ ۹۰۶ھ سے ۹۱۶ھ تک (۱۵۰۰ تا ۱۵۱۰ء) تمام تر بیرحمی و بیدردی و سنگدلی کے واقعات سے داغدار ہے۔ اُسکی بدنامی و جفا کاری کی داستان طویل ہے کہا جاتا ہے کہ اُس نے خود اپنے باپ اور ولی نعمت کو بھی زہر دلا دیا تھا۔ یہ ایک ایسا قبیح فعل تھا کہ جب ۹۲۵ھ (۱۶۱۹ء) میں سفر کرتا ہوا جہانگیر مانڈو پہونچا تو اُس کو سخت غیظ و اشتعال پیدا ہوا اور اُس نے بادشاہ کے فرسودہ استخوان نکلوا کر دریائے نربدا میں پھینکوا دیئے۔ ناصرالدین کالیا دہہ محل کے ایک تالاب میں اوجین کے متصل غرق ہوگیا تھا شراب کے نشہ سے بدمست تھا گرا، اور پھر کس کی مجال یا کس کو پروا تھی کہ اُس کو نکالے۔ ۹۱۶ھ (۱۵۱۰ء) میں محمود ثانی تخت نشین ہوا۔ اُس کی نسبت مورخین کا اجماع و اتفاق ہے کہ اُس کا یہ خیال بلکہ عقیدہ تھا کہ سلطنت و حکمرانی محض تلوار سے ہوتی ہے۔ اسی لئے اُس نے اس خیال یا ارادہ کو جامۂ عمل پہنایا اور اپنے طریق عمل کے دردناک نتائج دیکھے۔ اُس نے خود اپنے مقربین سے بدگمانی پیدا کرلی۔ میدنی رائے ایک راجپوت کو بلا کر وزیر سلطنت بنایا۔ اس شخص کے روز افزوں اثر اور قوتِ بازو سے خائف ہو کر اُس نے ۹۲۳ھ (۱۵۱۷ء) میں سلطان مظفر شاہ والی گجرات کو اپنی دستگیری اور اس غاصب کے اخراج کے لئے بلایا۔ کچھ زمانہ بعد وہ میدنی رائے اور رانا سانگا والی چیتوڑ سے نبرد آزما ہوا، گرفتار ہوگیا تھا مگر عزت و احترام کے ساتھ رہائی پائی۔ بایں ہمہ وہ باز نہ آیا اور چند سال بعد اُس نے رانا کے جانشین پر حملہ کیا۔ رانا کے رفیق و سرپرست بہادر شاہ والی گجرات نے پھر اُسکو گرفتار کیا۔ فرار ہوجانے کی تدبیر و کوشش میں مصروف تھا کہ مار ڈالا گیا۔ اس کے ساتھ بادشاہان مالوہ کے خاندان کا خاتمہ ہوگیا۔ اور ۹۳۷ھ (۱۵۳۱ء) میں یہ سلطنت گجرات سے ملادی گئی۔

۹۴۲ھ (۱۵۳۵ء) میں ہمایوں نے بہادر شاہ پر حملہ کیا اور مالوہ سے باہر نکال دیا۔ مندسور اور مانڈو میں متواتر شکستیں دیں۔ خاندان سوری کے عمل و حکمرانی میں (۹۴۷ھ سے ۹۶۲ھ تک یا ۱۵۴۰ سے ۱۵۵۵ء)

دنیا کی حالت دیکھئے۔ ایک وقت وہ تھا کہ ان دونوں بھائیوں خصوصاً امیر الامرا کی شجاعت و سخاوت، کرم و حلم، اور مواسات فطری کا ایک عالم معترف و مدح خواں تھا۔ ان کے احسانات کافۂ انام پر مبذول و مشمول تھے۔ یہ کسی متنفس پر کبھی ستم و بیداد جائز نہیں رکھتے تھے۔ یا یہ کیفیت ہوگئی اور منقلب القلوب نے دلوں کو ایسا پھیر دیا کہ خود ان کے دست گرفتہ اشخاص سادات سے برگشتہ و منحرف ہوگئے۔ جانتے تھے کہ ان کی قوت و دولت کا زوال خود اپنی خرابی و تباہی کا باعث ہوگا، مگر کہتے یہی تھے کہ "یار خدایا! یہ کشتی غرق ہو جائے اور ہم سب ڈوب جائیں۔" جب اپنوں کی یہ کیفیت تھی تو بیگانوں کی کون اور کیا شکایت کر سکتا ہے؟ ؎

مالوہ کا حاکم شیر شاہ کا نامزد راست شجاعت خاں تھا جو اس اطراف میں شادل خاں کے نام سے شہرت حاصل رکھتا ہے۔ اور جو شجالپور کا بانی تھا جس کا تذکرہ آئین اکبری میں بھی کیا گیا ہے [شجالپور یا شجاعت پور واقع وسط ہند کا پرانا نام رائے کرن پور تھا] اس کی وفات پر اس کا لڑکا باز بہادر جانشین ہوا، اس کی شہرت بالخصوص موسیقی اور دیگر علوم میں دخل و دستگاہ رکھنے کی وجہ سے ہے اس سے زیادہ شہرت و دلچسپی اس افسانہ آمیز و افسوں خیز تعشق سے باقی ہے، جو اسکو روپمتی باشندہ سارنگ پور کیسی باکمال و صاحب جمال سے پیدا ہوگیا تھا۔ تفصیل و تشریح کی گنجائش نہیں ؎

پروانہ جل کے خاک ہوا شمع رو چکی　　تاثیر حسن و عشق جو ہونا تھا ہو چکی

سنہ ۹۷۱ھ (سنہ ۱۵۶۲ء) یا ایک دوسری روایت کے مطابق سنہ ۹۶۸ھ میں باز بہادر کو مجبور ہوکر اکبر کی اطاعت کر لینا پڑی اور مالوہ سلطنت مغلیہ کا ایک صوبہ ہوگیا اور اٹھارھویں صدی تک رہا۔ آئین اکبری میں شیخ ابوالفضل نے کسی قدر تفصیل کے ساتھ مالوہ کا ذکر کیا ہے جیسا کہ اوپر لکھ چکا ہوں۔ مختلف زمانوں میں اس صوبہ کے حدود اور اس کی وسعت مختلف رہی ہے۔ سنہ ۱۰۰۳ھ (سنہ ۱۵۹۴ء) میں اس میں بارہ سرکاریں یا اضلاع تھے۔ لیکن سنہ ۱۰۷۶ھ (سنہ ۱۶۶۵ء) میں صرف نو رہ گئی تھیں۔ مالوہ کو زیادہ اہمیت اپنے موقع و محل کے لحاظ سے بھی حاصل تھی۔ وہ مغلوں کے شارع اعظم پر واقع تھا جس پر ہوکر شاہی فوجیں دہلی سے دکن کو جاتی تھیں، وہ ایک متعارف شاہراہ تھی جو دھولپور، گوالیار، نرور، سرونج اور ہنڈیا میں ہوکر گزرتی تھی۔ اس زمانہ کے متعدد صوبہ داروں میں سے شاہزادہ مراد سنہ ۱۰۰۰ھ (سنہ ۱۵۹۱ء)، و نظام الملک اول سنہ ۱۱۳۲ھ (سنہ ۱۷۱۹ء) اور مہاراجہ سوائی جے سنگھ والی جے پور سنہ ۱۱۴۷ھ (سنہ ۱۷۳۴ء) خاصکر قابل ذکر ہیں۔

اس کے بعد مختصراً مرہٹوں کا قدم مستقل طور پر مالوہ کی سرزمین پر قریب سنہ ۱۷۴۳ء کے جم گیا جب کہ پیشوا اس

بخون دیدہ نوشتیم بر در و دیوار　　　　که چشم مردمی از اہل روزگار مدار

سادات کی دولت کے زوال کے بعد لوگوں میں دو فرقے ہوگئے تھے ایک اُنکو نیکی و بھلائی کے ساتھ یاد کرتا تھا "نعمت اللّٰہی" دوسرا ہری و برائی سے "حیدری" یہ مناقشے اسی حد تک محدود نہیں رہے بلکہ مجالس اور باہمی صحبتوں میں دونوں فریق کے مابین بڑی بڑی بے لطفیاں ہو جاتی تھیں میر عبدالجلیل اور ان کے متبعین اپنی وضع نمک حلالی و وفاداری پر قائم رہے سادات کی مدح سرائی و منت شناسی میں ان کی نوا سنجی برابر جاری رہی میر صاحب کی ستایش گرانہ عربی رباعیاں موقع مناسب پر نقل کی جائینگی

فرخ سیر کی معزولی کی تاریخ مرزا بیدل نے کہی تھی ؎

دیدی کہ چہ با شاہِ گرامی کردند　　　　صد جور و جفا ز راہِ خامی کردند
تاریخ چو از خرد بجستم فرمود　　　　سادات بوے نمک حرامی کردند
۱۱۳۱ھ

میر عظمت اللہ بے خبر بلگرامی نے اس کے جواب میں لکھا تھا ؎

باشاہ سقیم، انچہ شاید، کردند　　　　از دست حکیم، ہرچہ آید، کردند
بقراط خرد نسخہ تاریخ نوشت　　　　سادات دوائش انچہ باید، کردند
۱۱۳۱ھ

صوبہ کا نائب گورنر مقرر ہوکر آیا۔ بیغور فتہ رفتہ سارا ملک مرہٹہ سرداروں کی سیاہ کا جولاں گاہ بن گیا اور ان کا اقتدار قائم و راسخ ہوگیا حتی کہ آج انھیں کے اخلاف، سندھیا والی گوالیار، ہولکر والی اندور، دیواران دھار و دیواس، قابض و دخیل ہیں

۱۱۴ میر حیدر خاں کاشغری، ترکان دوغلات توران سے تھا۔ اسکا پر دادا میر حیدر مغلائی، صاحب تاریخ رشیدی، بابر و ہمایوں کے ہمیشہ ہمرکاب رہتا تھا حیدری گروہ اسی قاتل سے منسوب ہے میر نہ شمشیر، ہونے کی وجہ سے ان لوگوں کو میر کہتے تھے سنی مذہب تھا بعض سادات بارہہ شیعہ غالی تھے سیاسی اور ذاتی اختلافات کے علاوہ تعصب و اختلاف عقائد بھی باعث منافرت تھا۔

محمد یوسف[۱۱۵] برہان پوری[۱۱۶] نکہت تخلص، نے جو بعد کو "سخنور خاں" کے خطاب سے ممتاز ہوا طبقہ

۱۱۵ خوش سلیقہ اور زمانہ شناس شاعر تھا اس کے آباواجداد اکبر بادشاہ کے تصرف سے پہلے کشمیر کے سلاطین تھے خلدمکاں کے عہد میں نکہت' امیرالامرا ذوالفقار خاں کا مصاحب تھا۔ اور محمد شاہ کے زمانہ میں وزیرالممالک قمرالدین خاں کا متوسل اور حاشیہ نشین بعد کو بادشاہ نے 'سخنور خاں' خطاب دیدیا تھا بہت سے قصائد امرائے وقت کے محامد میں اس نے لکھے ہیں۔ ۱۱۵۰ھ (۱۷۳۷ع) میں انتقال کیا اس قطعہ کا صلہ بارگاہ خسروی سے ہزار روپیہ نقد اور خلعت پایا تھا

۱۱۶ برہان پور اب ایک قصبہ چھتیس ہزار کی آبادی کا اور ایک تحصیل کا مقام ضلع نماڑ۔ صوبہ متوسط میں رہ گیا ہے اسی میں آسیر گڈھ کا پرانا قلعہ بھی تھا گریٹ انڈین پنینسولا ریلوے کا اسٹیشن لعل گڈھ یہاں سے دو میل پر ہے شہر کے گرد پختہ دیوار ہے جس میں بڑی بڑی سڑکوں کی نکاس پر عظیم الشان پھاٹک بنے ہوئے ہیں اور جس کی جانب جنوب دریائے تاپتی رواں ہے۔ بہت سے آثار قدیمہ و صنادید اسلامی اس حصار سے باہر بھی ہیں جن سے ثابت ہوتا ہے کہ مضافات شہر دور دور تک چلے گئے ہوں گے۔ شہر کے باشندگان میں مسلمانوں کی تعداد ایک ثلث کے قریب ہے۔ ان میں بوہرہ یا گجراتی تاجروں کا شمار غالب ہے۔

برہان پور کی بنیاد ۸۰۲ھ (۱۴۰۰ع) میں نصیر خاں نے ڈالی تھی جو خاندیش کے فاروقی خاندان کا سب سے پہلا آزاد فرمانروا تھا۔ اسی نے شہر کا نام شیخ برہان الدین غریب "دولت آبادی" سے منسوب کرکے رکھا تھا۔ دریائے تاپتی کی دوسری جانب زین آباد بھی اسی زمانہ میں آباد کیا تھا۔ یہ ایک دوسرے بزرگ شیخ زین الدین سے موسوم ہے اس کے بعد سے برہان پور برابر سلاطین فاروقی کا مسکن بنا رہا اور ان کے زمانہ حکومت میں جو دو صدیوں سے زیادہ رہا ہوگا دو بڑی بڑی مساجد یعنی جامع مسجد اور بی بی مسجد یہاں تعمیر ہوئیں ۱۰۰۹ھ (۱۶۰۰ع) میں برہانپور کو مع مملکت فاروقیہ کے شہنشاہ اکبر نے اپنی سلطنت میں شامل کرلیا اکبر اور اس کے جانشین کے عہد میں برہان پور کی رونق و تزئین خوب ہوئی۔ ابوالفضل لکھتا ہے کہ اکبر نے خاندیس کا نام شہزادہ دانیال کے نام سے واندیس رکھا تھا آئین اکبری میں لکھا ہے کہ "یہ شہر بڑا ہے۔ اس میں بہت سے باغات ہیں۔ بعض میں چوب صندل بھی برآمد ہوتی ہے ہر قوم کے لوگ یہاں آباد ہیں اہل صنعت و حرفت بکثرت ہیں موسم گرما میں یہ شہر گرد و غبار سے بھرا رہتا ہے اور برسات میں گلی کوچے کیچڑ اور پتھروں سے پُر ہو جاتے ہیں" ۱۰۴۵ھ (۱۶۳۵ع) تک برہان پور اس سلطنت کے شاہزادگان متعین دکن کا دارالصدر رہا پھر اس کی جگہ اورنگ آباد نے لے لی۔ اس انتقال کے بعد برہان پور خاندیس کے بڑے صوبہ کا صدر مقام ہوگیا جس کی حکمرانی کے لئے ہمیشہ کوئی نہ کوئی شاہزادہ خاص خاندان شاہی سے نامزد ہوتا تھا

سادات کے برہم ہوجانے اور محمد شاہ کے استقلال سلطنت پر قطعہ تاریخ لکھکر بادشاہ کی نظر سے

۱۰۲۳ھ (۱۶۱۴ء) میں جب سر ٹامس رو Sir Thomas Roe جیمس اول James I.
کی طرف سے معل اعظم کے دربار میں برسم سفارت آیا تھا اُس وقت تک یہ ردّو بدل نہیں ہوا تھا۔ چنانچہ جہانگیر کے فرزند شاہزادہ
پرویز کے حضور میں اسی جگہ وہ آداب بجالایا تھا سر ٹامس رو کے چوالیس سال بعد نامور سیاح ٹیورنیر
Tavernier کا گزر ہوا وہ اپنی زبان میں برہان پور کو برام پور Brampour لکھتا ہے وہ یہاں
سے ہوکر دوبار گزرا تھا۔
ٹیورنیر تحریر کرتا ہے کہ " یہ ایک بڑا شہر بہت زیادہ ویران و تباہ ہے بہت بڑی تعداد مکانات کی محض خس پوش
ہے " پھر لکھتا ہے کہ " شہر کے وسط میں ایک عظیم الشان قلعہ بھی ہے جس میں گورنر رہتا ہے اس صوبہ کی حکومت
بڑی وقعت و عزت کی بات سمجھی جاتی ہے جو صرف بادشاہ کے بیٹے یا چچا کو تفویض ہوتی ہے اس شہر میں تجارت
بھی بہت ہے خود برام پور میں جیسا کہ اور صوبجات میں بھی پایا جاتا ہے ایک عجیب و بے اندازہ مقدار چھینٹوں رنگا رنگ
کے کپڑوں پر چھپی ہوئی) کی تیار کی جاتی ہے جو نہایت صاف اور سفید ہوتی ہے۔ یہ ایران، ترکی، مسکو دیہ، پولینڈ،
عرب اور قاہرۃ الکبریٰ و دیگر مقامات کو بھیجی جاتی ہے "
مساجد و دیگر عمارات کے نشانات بتاتے ہیں کہ جب شاہان مغلیہ کے عہد میں برہان پور اپنے انتہائے عروج
و رونق پر رہا ہوگا تو اُس کا رقبہ پانچ میل مربع کے قریب ہوگا۔ سلطنت کے متعلق جو لڑائیاں ہوتی رہی ہیں اُن میں
بھی برہان پور کا حصہ غالب رہا ہے، خاصکر عالمگیر کے زمانہ میں۔ ۱۰۷۶ھ (۱۶۶۵ء) میں بادشاہ خلد مکان ایک
عظیم الشان سپاہ یہاں چھوڑ کر جیسے ہی کہ دکن کے فتح کرنے کے لئے اٹھا تھا کہ مرہٹوں نے برہان پور کو غارت و
تاراج کر ڈالا۔ اس کے بعد متوالی و متواتر معرکہ آرائیاں اس کے اطراف و نواحی میں ہوتی رہیں۔ حتی کہ ۱۱۳۲ھ
(۱۷۱۹ء) میں مرہٹوں کا مطالبہ چوتھ (مال کا حق چہارم) ما ضابطہ منظور کرنا پڑا۔ ۱۱۳۳ھ (۱۷۲۰ء) تا ۱۱۶۱ھ
(۱۷۴۸ء) کے مابین برہان پور نواب نظام الملک آصف جاہ کا دار الریاست رہا وہ اُس وقت صوبہ دار
دکن تھے۔ موجودہ حصار شہر پناہ ۱۱۴۱ھ (۱۷۲۸ء) میں نواب نے تعمیر کرایا تھا۔ اس کے بعد ۱۱۷۳ھ
(۱۷۶۰ء) میں برہان پور پیشوا کے قبضہ میں آگیا۔ پھر ۱۸۰۳ء میں سرکار انگریزی کے قلمرو میں داخل کر لیا گیا۔
تانہ گوجری کی مسجد کے مینار نہایت شاندار کوسوں سے نظر آتے ہیں بی بی مسجد اب بہت خراب و مرمت
طلب ہوگئی ہے جامع مسجد کے عربی و ہندی زبان کے کتابے بتاتے ہیں کہ اس کو سلطان عادل شاہ بن مبارک

گزارا تھا۔ "آفتاب ملک اقبال از کسوف آمد بدر" مادہ تاریخ تھا۔

شاہ فاروقی نے ۸۹۷ھ (۱۴۹۲ء) میں تعمیر کرایا تھا امپیریل گزیٹیر لکھتا ہے کہ اس کو علی خاں (علی شاہ) نے ۹۹۶ھ (۱۵۸۸ء) میں بنوایا تھا، دوسرا کتابہ بتاتا ہے کہ اس کو بارہ سال بعد یعنی رمضان ۱۰۰۸ھ میں اکبر نے آکر دیکھا تھا۔ یہ نہایت عمدہ و شاندار عمارت سنگ سیاہ کی ہے جس پر نقاشی و سنگتراشی کمال ذوق سلیم اور خوش سلیقگی سے کی گئی ہے۔ آبادی سے ملی ہوئی ساحل دریا کے ساتھ ساتھ قلعہ کی ویران عمارت اور شکستہ فصیل بڑی رفعت و بلندی تک چلی گئی ہے سر بفلک ایوانات، کمرے اور دیوان خلانے شہادت دیتے ہیں کہ اس کی شاہی محلسرائیں اور قصور کیسے رفیع و عظیم رہے ہوں گے۔ دو تین پختہ حوض بھی باقی ہیں۔ قلعہ کی مسجد کے صرف مینار رہ گئے ہیں مضافات شہر کے مقابر میں میراں عادل شاہ اور مبارک شاہ کے مقبرے قابل تذکرہ ہیں جن کی مرمت محکمہ آثار قدیمہ کرا رہی ہے۔ شہر کے جنوب و مشرق کے گوشہ میں ترکی وضع کا سنگ مرمر کا ایک زنانہ حمام بھی ابھی باقی ہے یہ اب ڈاک بنگلہ بنا دیا گیا ہے اور اس کی مرمت و نگہداشت ہوتی رہتی ہے۔ اس کی چھتیں گنبد دار مثمن ہیں۔ درمیان کے حوض بند کر دیے گئے ہیں۔ جھرنے اور نالیاں ہنوز قائم ہیں۔ دریائے تاپتی سے (جو نیچے بہتی ہے) اس کی کرسی اسی فٹ بلند ہوگی۔ نہایت دلکش و دلفریب منظر ہے۔ اتوارہ کے دروازہ کے باہر شاہ سونا کا گنبد مع چار دیواری کے نظر آتا ہے یہ نہایت خوبصورت عمارت ہے۔ گنبد نہایت خوشنما خربزہ کی شکل کا ہے۔ اس کے نیچے کا حصہ بارہ پہل کا ہے۔ ہر پہل میں نہایت خوش نما در بنے ہیں۔ اور بہت نفیس نقاشی اور گلکاری کی گئی ہے۔ وہ اب بھی اچھی حالت میں ہے۔ شیخ نظام الدین چشتی بھکاری (متوفی ۹۰۵ھ) شیخ بہاء الدین، شاہ منصور، شیخ عیسیٰ، شاہ برہان الدین راز الٰہی، شاہ جمال قادری، شاہ بہیم، اور اور بہت سے اولیاء کبار اور بزرگوں کی درگاہیں مرجع خاص و عام ہیں، ان کی شاندار عمارات اپنے گنبدوں، وسیع و خوبصورت مساجد اور خوش نما خانقاہوں کے ساتھ قابل دید ہیں کوس بھر کے فاصلہ پر شاہ نواز خاں (خطاب، مرزا ایرج نام، عبد الرحیم خاں خانخاناں کے بڑے بیٹے) کا نہایت خوبصورت اور رفیع الشان مقبرہ بنا ہوا ہے۔ اس پر چینی کا کچھ کام باقی ہے خود مرزا عبد الرحیم کی یادگار۔ ایک پختہ سرا ہے جس میں اب بازار لگتا ہے دروازہ کی پیشانی پر کتابہ لگا ہوا ہے۔ جہانگیر کے عہد میں ۱۰۲۷ھ (۱۶۱۸ء) میں اسکی تعمیر ختم ہوئی تھی

یہ بھی یاد رکھنے کی بات ہے کہ شہنشاہ جہانگیر نے برہان پور میں ایک مکمل سلسلہ آب رسانی کا قائم و جاری کرایا تھا اس میں سے بعض راجہاؤں اور چاہات اور حوضوں کے نشانات اب بھی باقی ہیں حال میں رد و بدل یہ کیا گیا ہے کہ سنگی نلوں کے بجائے آہنی لگا دئے گئے ہیں۔ اہل نظر لکھتے ہیں کہ اس سے بہتر اور

میر غلام علی لکھتے ہیں کہ "اس زمانہ میں اس خوبی و شان کا کوئی امیر سُنا یا دیکھا نہیں گیا۔ امیر الامرا جامع اخلاق حمیدہ تھا۔ اُس کی سرکار کا صلائے عام اور افراط طعام مشہور ہے۔ اورنگ آباد میں لوگ بالاتفاق کہا کرتے تھے کہ اُس کے عہد میں بہت سے آدمیوں کے گھر کھانا نہیں پکتا تھا امیر الامرا

باقاعدہ مصطفیٰ یابی ہو جانے کا کارخانہ کہیں پایا نہیں گیا۔

شاہجہاں کی محبوب اور شہرۂ آفاق ملکہ ممتاز محل کا انتقال بھی اسی برہان پور میں ہوا تھا وہ زین آباد کے مشہور وسیع باغ کے اندر جو ایک خوبصورت عمارت ایک حوض کے مابین واقع تھی چھ مہینہ تک دفن رہی تھی اس باغ کے نشانات اب بھی موجود ہیں

با ایں ہمہ افراط آب و آبرسانی برہان پور میں کسی وقت کثرت گرد و غبار کی شکایت بدرجہ غایت تھی۔

آزاد بلگرامی کو دکن کے قیام کے زمانہ میں اولیائے کرام کی قبور طیبہ کی زیارت خصوصاً حضرت شاہ برہان (متوفی ۱۰۳۱ھ) اور اُن کے پیر و مرشد سید لشکر محمد عارف (متوفی ۹۹۳ھ) کے مزارات کی آستان بوسی کے لئے بارہا یہاں آنا پڑا تھا۔ مآثر الکرام میں لکھتے ہیں کہ اس وسیع قلمرو میں کوئی دوسرا شہر اسکی گرد کو بھی نہیں پہونچتا۔ اس کی شاعرانہ یا عقیدتمندانہ توجیہ یہ فرماتے ہیں ؎

فتاد بس کہ گزر لشکر محمد را
غبار خیز بود کوچہائے برہان پور

۵۱۷ ملغوبہ۔ واو معروف۔ ہر غلہ جو چکی میں ڈال کر پیس لیا یا توڑ لیا گیا ہو اُس سے جو چیز یا آش تیار کیا جائے وہ بھی ملغور کہلاتا ہے۔ معمولاً آش گندم سے مراد ہوتی ہے۔

۵۱۸ شہر سورت، برلب دریائے راپتی، جانب جنوب، سمندر سے چودہ میل پر بذریعہ دریا، اور دس میل پر براہ خشکی واقع ہے عہد اورنگ زیب خلد مکان میں صوبۂ گجرات میں شامل تھا۔ کسی وقت ہندوستان کا سب سے بڑا تجارتی شہر تھا۔ اشیائے درآمد و برآمد کا کثیر حصہ تو بمبئی کو منتقل ہو گیا، تاہم ابھی سوداگری کا ایک بڑا مرکز سمجھا جاتا ہے۔ اٹھارھویں صدی میں اس ملک ہندوستان میں سورت سب سے زیادہ آباد شہر تھا۔ ۱۷۹۷ء میں اُس کے باشندگان کا تخمینہ آٹھ لاکھ نفوس کا کیا گیا تھا۔ اگر اس میں کچھ شک و شبہ کی گنجائش مانی جاوے تو بھی یہ شمار کہاں تک گھٹایا جائیگا ۱۸۱۱ء میں دو لاکھ پچاس ہزار اور ۱۸۱۶ء میں ۱۲۴۴۰۶ آبادی تھی جو رفتہ رفتہ کم ہوتی گئی۔ ۱۸۴۷ء کے بعد بتدریج اضافہ ہو کر ۱۹۰۱ء میں ایک لاکھ بیس ہزار سے قریب پہونچ گئی تھی ۱۹۱۱ء میں ۱۱۴۸۶۸ اور ۱۹۲۱ء میں ۱۱۷۴۳۴ رہ گئی۔

کی سرکار کے طباخ اپنے حصے کا کھانا بیچ ڈالتے تھے۔ مکلف پلاؤ کی قاب چند (تانبے کے) پیسوں کے عوض مل جاتی تھی"۔

دکن میں غلہ خام و پختہ کے لنگرخانوں کا جاری کرنا، ہر ماہ کی گیارھویں اور بارھویں کی مجالس کا دکن اور ہندوستان کے بڑے بڑے شہروں اور مقامات میں قائم کرنا، امیر الامرا کے اعمال خیر سے ہے۔ ان مجلسوں میں فقرا و مشائخ کے ساتھ وہ نہایت عجز و انکسار کے ساتھ پیش آتا، طرح طرح کے سلوک کرتا۔ خود اپنے ہاتھ میں آفتابہ لیکر مہمانوں کے ہاتھ دھلواتا تھا۔

امین الدولہ اور امیر الامرا کی بدمزگی اور میر عبدالجلیل کی سعی و سفارش سے امیر الامرا کا امین الدولہ کی تقصیرات سے درگزر کرنا اوپر لکھا جاچکا ہے۔ اُس کے انصاف و جوانمردی کی متعدد حکایتیں اور واقعات زبانزد ہیں۔ دکن پہونچنے سے پہلے روپیہ کی شدید ضرورت تھی وہاں پہونچکر ضرورت اور بڑھی سخت پریشانی ہوئی۔ عمال و متصدیوں نے آمدنی کی قلت اور اخراجات کی زیادتی کی اطلاعیں بھیجنا شروع کیں اسی بنا پر حیدر قلی خاں حاکم بندر سورت نے ملا عبدالغفور ملک التجار بندر مذکور کا مال و متاع جو ایک کرور سے زیادہ کا تھا ضبط کرلیا۔ متوفی کا لڑکا ملا عبدالحی مستغیثانہ حضور میں آیا اور بشرط معافی

یہاں کی دولت تمامتر پارسیوں اور اونچی ذات کے ہندوؤں کے ہاتھ میں ہے۔ مسلمان بجز بوہروں کے باقی سب شکستہ حال ہیں۔ بوہرے البتہ دولت مند اور مرفہ الحال تاجر ہیں ان کے پیر صاحب "ملا" کہلاتے ہیں اور یہیں رہتے ہیں۔ سیر و تفریح کا شوق اور مشغلہ سورت کی ہر ایک ملت اور طبقہ کے لوگوں میں یکساں اور تمام مقامات سے زیادہ پایا جاتا ہے۔ باغات میں برابر مختلف اقوام کے جلسے اور دعوتیں ہوتی رہتی ہیں۔ جلوس بڑے تزک و احتشام سے نکلتے ہیں جن پر صرف کثیر کیا جاتا ہے۔ شہر سے کچھ فاصلہ پر میلے لگتے ہیں۔ ان ضیافتوں میں پارسی بھی شامل و شریک ہوتے ہیں۔ بوہرے اپنی مہمان نوازی اور خوش گزرانی کی بدولت دنیا بھر میں [illegible] ہو رہے ہیں۔ یہ تمام فضول مصارف اور شاہ خرچیاں اُس زمانہ کی یادگار سمجھنا چاہیئے جب دولت و مال کا ان کے پاس حصر و شمار نہ تھا۔

دریا کے بیچ اور ساحل کے وسط میں قلعہ ہے۔ اس میں بہت سی بے قاعدہ قلعہ بندی و تحصین کی گئی ہے ہر گوشہ پر برج ہیں جن سے قلعہ بہت پر فضا اور دریا سے نہایت خوش نما معلوم ہوتا ہے۔ خداوند خاں لیکس ترک سپاہی نے جو

اس چندر لاکھ روپیہ امیر الامرا کو خیانت دیا جاتا۔ امیر الامرا نے ایک روز حج کے وقت [illegible] کو
بلاکر مال مذکور معہ رقم خیانت کے معاف و واپس کر دیا خلعت دیکر اس کے وطن کو رخصت کیا اور کہا
کہ آج شب کو اس شخص کے مال کے متعلق مجھ سے اور میرے نفس سے جنگ رہا۔ آخرالامر میں اپنے
نفس پر غالب آگیا"

[illegible] ایسا ہی واقعہ معدلت شاہجہانی کی یادگار ہے۔ سورت [illegible] جو [illegible]
بڑا بندرگاہ اور ممالک بیرونی کی تجارت کے لئے ممتاز تھا۔ وہاں کے حاکم [illegible]
میں سختی اور تحصیل مطالبات میں بیجا سخت گیری کی۔ اطلاع ہونے پر [illegible] گرفتار کر کے لایا گیا۔ منصب
[illegible] ہوئی ثبوت جرم پر اس کی [illegible]
ہوا۔ امرائے مقربین نے سعی و سفارش کی ناکامیوں [illegible] سورت اور شاہزادی [illegible]
تھا۔ [illegible] بیگم صاحبہ سے [illegible] سفارش پیش کرایا۔ شاہجہاں [illegible] ناخوش ہوا۔ [illegible] کو
حراست خانہ میں بھیجدیا اور محلسرا میں جا کر شاہزادی کو نہایت زجر و توبیخ کی۔ اسی سزا کے نفاذ کا حکم دیا
اب کس کو سرتابی یا دلیری کی مجال ہو سکتی تھی۔ مگر سعد [illegible] کا نائب [illegible] (جس کو [illegible]

شاہان گجرات [illegible] (سنہ [illegible]) میں [illegible] اور اس کی تعمیر [illegible]
[illegible] میں اور انگریزوں کے [illegible] مرکز [illegible] کی تعمیر [illegible]
مسجد [illegible] مرزا سامی کا مقبرہ بھی اسی سال کا ہے [illegible] نہایت عمدہ [illegible]
[illegible] مسجد [illegible] شہدا [illegible] مسجد سید [illegible] (سنہ [illegible]) [illegible]
[illegible] گجرات [illegible] سورت [illegible]
[illegible] سورت [illegible] قلعہ [illegible]

سورت ایک تاریخی مقام ہے۔ یونانی سیاح و جغرافیہ نویس ٹالمی Ptolemy (سنہ ۱۵۰ء میں)
اس شہر کے متبرک حصہ پھول پیدا کا ذکر کرتا ہے۔
مسلمان مورخین تیرھویں صدی کے آغاز میں قطب الدین کا فتح [illegible] کرتے ہیں [illegible]
(سنہ [illegible]) میں بغاوت گجرات کے [illegible] محمد بن تغلق کے عہد میں [illegible]

بھی عزت و نیکی کے ساتھ یاد کرتا ہے) بڑھکر آداب فدویانہ بجالایا اور گزارش کیا کہ اس ظالم و خائن کے ذمے مظلوم و ستم رسیدہ رعایا کا بہت سارا روپیہ واجب ہے۔ جب تک پوری تحقیقات ہو کر ہر کا ذرہ یا فلس ادا نہ ہو جائے تعمیلِ سزا میں توقف ہونا چاہئیے۔ یہ عرض قبول ہوئی اور جس قدر روپیہ لوگوں سے بیجا وصول کیا گیا تھا۔ اسے حساب کرکے واپس کرا دیا۔]

امیر الامرا نہایت ذہین تھا۔ شعر خوب سمجھتا۔ فن تاریخ دانی میں یکتا تھا۔ ادبا و اہل کمال کو نہایت دوست رکھتا تھا۔ نمازِ صبح کے بعد اذنِ عام تھا صاحبانِ فضل و کمال آتے اور پہر دن چڑھے تک اہل علم و ہنر کی صحبت رہتی۔ تاکید تھی کہ اُس وقت کوئی اہلکار یا متصدی سرکار آنے نہ پائے۔ میر عبدالجلیل امیر الامرا کی خوش فہمی کی اپنے اعزہ و اہل راز سے ہمیشہ اپنی زبان و قلم سے تعریف و توصیف کیا کرتے تھے۔ اُس کے مرثیہ میں ایک بڑا زبردست قصیدہ لکھا تھا جسمیں تاریخ بھی نکالی ہے۔ اُنکو امیر الامرا کے ساتھ جیسی محبت مفرط تھی اس کے الفاظ سے جلے ہوئے دل کے پھپھولے پھوٹے ہیں؎

آثار کربلاست عیاں از جبینِ ہند | زد جوشِ خونِ آلِ نبی از زمینِ ہند
شد ماتمِ حسینِ علی تازہ در جہاں | سادات گشتہ اند مصیبت نشینِ ہند
سیلی است زین معاملہ پیراہنِ عرب | وز خونِ گریہ سرخ شد است آستینِ ہند

(۱۳۴۳ء) میں فیروز تغلق نے یہاں قلعہ تعمیر کرایا۔ ۹۲۰ھ (۱۵۱۴ء) میں ایک پرتگیز سیاح باربوسہ Barbosa یہاں آیا۔ اس کے بعد سے برابر پرتگالی سیاح اور تاجر اور جہاز یہاں آنے اور لوٹ مار اور آتش زنی کرنے لگے۔ ۹۸۰ھ (۱۵۷۳ء) میں خود اکبر نے محاصرۂ سنگین کرکے سورت کو مرزایان کے ہاتھ سے فتح کیا۔ ایک سو ساٹھ (۱۶۰) سال تک یہ مقام مغلیہ کے اقتدار اور اُن کے امرا کے قبضہ میں رہا۔ اس کی دلچسپ تاریخ اور اس کی تجارت کی روز افزوں گرم بازاری ایک مستقل تحریر اور تفصیل کی محتاج ہے جسکی ان مختصر حواشی میں گنجائش نہیں۔
تاریخ اسلام میں سورت باب المکہ اور بندر مبارک کہلاتا تھا۔ ۱۰۷۵ھ (۱۶۶۴ء) سے سورت پر سیواجی کے حملے شروع ہوئے۔ اورنگ زیب کی وفات ۱۱۱۸ھ (۱۷۰۷ء) کے بعد سے تو سلاطین دہلی کا اقتدار و اختیار برابر گھٹتا رہا۔ ۱۱۴۶ھ (۱۷۳۳ء) میں تیغ بیگ خاں گورنر نے خود مختاری کا اعلان کیا۔ ۱۴ مئی ۱۸۰۰ء کو جو

گیتی چرا بیاد نگردد ز دود غم | خاموش شد چراغ نشاط آفرین ہند
ہند از چہ شد بہ مصیبت عظمیٰ ندیدہ است | دیدہ داستان شہود و شین ہند
از داغ دل زدند چراغان اشکہا دمی | این است نوبہار گل آتشین ہند
ماہی در آب می طپد ہمچو مرغ در ہوا | زشیون عظیم امیر مہین ہند
فرزند مصطفیٰ خلف الصدق مرتضیٰ | کز روے فخر بودند اتش نمیت ہند
رستم نشان حسین علی خان شہید شد | از خنجرے کہ بود نہان در کمین ہند
آن صفدرے کہ از قلم تیغ با ہا | تحریر کرد نسخۂ فتح مبین ہند
تیغش بہ روز معرکہ ہم سیر رفت | چون برق می شگافت صف آہنین ہند
دریا دلے کہ بود ز ابر عطاش | شاداب بہار بہشت برین ہند
از بہر ہر فلک زدہ عالی جناب او | در ترکتاز حادثہ حصن حصین ہند
منقاد او شدند از آن سرکشان دہر | کز داغ ضبط کرد نشان بر سرین ہند
ہند از شہادت آن تن بے سر گشت است | یعنی کہ بود او نفس واپسین ہند
عالم چو قیر در نظر خلق شد سیاہ | افتاد تا ز خاتم دہر آن نگین ہند

معاہدہ انگریزوں سے ہوا اس نے سورت اور اس کے مضافات وملحقات کا فیصلہ مختتم کر دیا۔
میر غلام علی آزاد نے اپنے سفر حجاز کے تذکرے میں سورت کو بڑی محبت سے یاد کیا اور "سورۃ محروسہ" "بلدۂ بابو" اور "سورۃ سرورہ" کا نام دیا ہے۔ تمام مورخین متفقاً لکھتے ہیں کہ سلاطین تیموریہ کے عہد عظمت و ترقی میں سورت سب سے بڑا بندرگاہ تھا۔ اس زمانہ میں اس کی رونق تمام بندرگاہوں سے بڑھی چڑھی تھی۔

۱۱۱۹ ملک التجار عبد الغفور کی نسبت صاحب سیر المتاخرین لکھتا ہے کہ وہ ایک ممتاز بوہرہ سوداگر تھا جس کی دولت و ثروت کا شہرہ اقصاے عالم میں پھیلا ہوا تھا۔ اس کے زر و مال کا شمار کروروں سے متجاوز تھا

اس پر بیان فرانسیسی نے (۱۶۶۶ء میں) اضافہ کیا تھا کہ 'بوہرے مسلمان تاجران سورت کا ایک مشہور فرقہ یا طبقہ ہیں۔ یہ داڑھی رکھتے ہیں ایک مخصوص وضع کا عمامہ باندھتے ہیں اور آپس ہی میں شادی بیاہ کرتے ہیں سورت کو سورت بندر انھیں دولت مندوں نے بنا رکھا ہے۔ انھیں میں اپنی لیجوں تک محدود رکھتے ہیں' حیدر

گردون ز اختران همه تن اشک گشته است
در اعتنا ز ماتم رکن رکین هند

دل چاک چاک گشت و جگر داغ داغ شد
زین غم که گشته زهر از و انگبین هند

اِستَرجَعَ المَلائِکُ وَاستَعبَرَ الفَلَکُ
فِی هٰذِهِ المُصِیبَۃِ سُحقًا لِّلدِّینِ هِند

از دست ابن ملجم ثانی شهید شد
گویی ز کوفه است گل ماتمین هند

تا کربلا و تا نجف و تا مدینه رفت
سیلاب خون دیده و آه انین هند

اے دوستان آل و محبان اہل بیت
غمگین شوید بہر حسین حزین ہند

تا حق اہل بیت رسالت ادا شود
بر رغم این جماعۂ منصوبه بین هند

از کلک من بمرثیۂ سید شهید
این چند بیت ریخت چو دُرّ ثمین هند

رضوان حق چو سبزه قرین ضریح او
تا هست حُسن سبزه به گیتی قرین هند

سال شهادتش قلم واسطی نوشت
قتل حسین کرد یزید لعین هند

سنہ ۱۱۳۲ھ

آزاد بلگرامی لکھتے ہیں کہ بعض ثقات (جن سے مراد غالباً اہل عقیدت ہوں گی) کہتے تھے کہ امیر الامرا کے واقعۂ قتل سے پہلے کسی مرد صالح نے خواب دیکھا تھا کہ سید الشہدا ثالث ائمہ اثنا عشر (علیہ و علی آبائہ السلام) نے امیر الامرا کو مخاطب کر کے فرمایا بلغ وعدک (سنہ ۱۱۳۲ھ) و غلب عدوک (سنہ ۱۱۳۲ھ)۔ اس سانحہ کے بعد جب حساب کیا تو یہ فقرہ تاریخ تھا اور صنعت تقلیب بھی۔

قلی خاں نے جس حصۂ دولت پر قبضہ کر لیا تھا اس کی مالیت ایک کرور ہوگی حالانکہ اس کا کاروبار کرورہا روپئے کا تھا۔ اس شاہ تاجر کے یہاں اتنے جہاز اتنے بڑے بڑے تھے جتنا دولت برطانیہ کا جہاز انڈیا مین Indiaman تھا مگر عجیب اتفاق یہ تھا کہ وہ اس شمار کو کبھی نہیں آج تک نہ پہنچ سکا ہر سال ایک دو جہاز بنائے اور اضافہ کئے جاتے تھے مگر اتنے ہی بیکار یا ضائع ہو جاتے تھے۔"

اسی کا ایک ہم پیشہ خواجہ جاوید فخر التجار تھا۔ پونے دو سو برس کی بات ہے کہ وہ ہندوستان کے گورنر جنرل سے بھی زیادہ شان و شوکت رکھتا تھا، اس کا احتشام و اقتدار اس زمانہ کے ناظم بنگال کے مساوی تھا پندرہ ہاتھی پچاس بیش قیمت گھوڑے اس کے اصطبل میں رہتے تھے۔ ایک سو بیس عورتیں محل میں تھیں۔ پندرہ چوبدار اور دو سو خدمتگار تھے۔ پانچ جہاز تھے۔ دو ہزار کشتیاں تھیں۔ تنباکو کا کل اجارہ تھا یہ تو معلوم نہ ہو سکا کہ اس کے

مثنوی شادی فرخ سیر بادشاہ میں حسین علی خاں کی ستائش میں بہت سے اشعار موجود ہیں ؎

سپہ سالارِ موجِ نصرت آثار | امیرِ صاحبِ شمشیرِ خوں بار
رسول اللہ را فرزند کو نین | امیر المومنین را قرۃ العین
پدر والا دو دمانی بے نظیر است | امیر ابن الامیر ابن الامیر است
امیر است و امیراں را بہ سیما | کہ سر باشد رئیس جملہ اعضا
فروغِ مہرِ شاہنشاہ والا | خلافت رتبۂ ایزد تعالا
نمایاں از دل و چشم بدوُور | چو از مصحف شعاع سورۂ نور
متجلّی دارد از مہرِ نبوت | نمایاں کرام ارثِ فتوت
کرم مسنون دستِ اوست در بزم | ظفر مفتون تیغ اوست در رزم
بروز جنگ نصرت تمغہ زیب است | نشانے از امیر المومنین ہست
نہ تنہا او ز حیدر یادگار است | کہ تیغش نیز یاد از ذوالفقار است
ازاں دستش قوی چنگال دارد | کہ زور از موئم الاشبال دارد
ازاں در رزم باشد نصرت ایجاد | کہ ہست او از حسین و از علی یاد
ہمہ ایجاد ش ازاں ہر دو امام است | مرکب نام او از ہر دو نام است
رکواب وزنِ قدرش بلند است | شرف زا جداد خود او را بسند است
سرا ے مدعا بر ریں مثل نیست | تحمل در لطافت چوں گل نیست
سیادت جامۂ بر اقتدار است | کہ ایں جامہ گل و آں چوں بہار است
ثنا ہا حید خاطر خود گوید | چو فرزند رسول اللہ ہے ہیں

میر عبد الجلیل نے عید قرباں کی تہنیت میں یہ قطعہ امیر الامرا کی نذر کیا تھا ؎

پاس کتنی دولت تھی لیکن اس کا صحیح معمولی ایک ہزار روپیہ روز ... تھا یک ... دہ دردی

حال ... اجر گورنر بنگال ... کا ... دیا ... دولت ... کی تھی

اگرچہ اس زمانہ میں ... ملکتا تھا

[illegible] آئین ... والیدن

فَمَن یَعِدِ البَحرِ یَامِن عَطَا دُہٗ   اَفَاضَ عَلی مَن جَرَّ جُودًا عَوَائِدَا
نَسَکتَ ھَدیَ الجُودِ فِی کُلِّ مَوقِفٍ   وَالبَستَ نَحرَ المُعتَفِینَ قَلَائِدَا[۱۲۲]

امیر الامرا ہر سال مولدِ نبی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم میں خوب روشنی و چراغاں کیا کرتا تھا کعب بن زہیر کے ایک مشہور مصرع کی تضمین کر کے میر نے اس اہتمام و احتشام کو خوب چمکایا ہے۔ ؎

اَسمَاءُ زکت بِہٖ عَالِی سَیِّدُ الاُمَرَاءِ   شَھرُ الرَّسُولِ شُمُوعًا فِی غَیَاھِبِہٖ
اَدعُو نِی الشُّمُوعِ عَلی الحُضَّارِ مُشتَمِلًا   اِنَّ الرَّسُولَ لَنُورٌ یُستَضَاءُ بِہٖ

واقعہ یہ ہے کہ میر عبدالجلیل پر امیر الامرا کے احسانات وعنایات کا بار کچھ کم نہ تھا۔ ان کے تعلق دربار و قیام دہلی کے باعث وہی تھے۔ ملازمت مکرّر و جاگیر انھیں کی بدولت نصیب ہوئی میر سید محمد کے تقرر خدمات کی سعی و توجہ میں بھی امیر الامرا کا حصہ غالب تھا

سیاسی مصالح اور روپیہ کی ضرورت مسلم مگر امیر الامرا کا یہ گناہ ناقابل عفو ہے کہ فرخ سیر کے زمانے میں اپنے اقتدار واختیار کا بعض اوقات بیجا استعمال کیا تھا۔ ممتاز محل (شاہجہاں کی ملکہ) کی تہہ آفاق قبر سے مروارید کی چادر جبر و ستم سے لے لی۔ اس دورِ فلاح وارزانی میں یہ چادر لاکھوں کی تھی اور اب تو کروروں کی ہوتی۔ تاج محل سے جو چیزیں امیر الامرا نے غصب کی تھیں انکی قیمت تین کرور بتائی جاتی ہے۔ ؎

اتنی نہ بڑھا پاکیِ داماں کی حکایت   دامن کو ذرا دیکھ! ذرا بندِ قبا دیکھ!!

---

[۱۲۱] نسک۔ تعبّد۔ کاٹنا اور کاٹی ہونا

[۱۲۲] معتفی۔ بعض معلم و تھا۔ جو شخص طالب فضل ہو رزق ہو۔ ارنہایہ جوزی

میر سیّد محمد المتخلص بہ شاعر

نِعَمُ الْاِلٰہِ عَلَی الْعِبَادِ کَثِیْرَۃٌ وَاَجَلُّھُنَّ نَجَابَۃُ الْاَوْلَادِ

میر سید محمد ہر اعتبار سے میر عبدالجلیل کے خلف الصدق تھے ۱۴ ربیع الاول ۱۱۰۱ھ (۱۶ دسمبر ۱۶۸۹ء) کو سہ شنبہ کے دن نماز ظہر کے بعد بلگرام میں پیدا ہوئے اور بمصداق الولد الحر یقتدی باٰبائہ الغر تمام علوم شریفہ و فنون لطیفہ کے جامع اور فضائل و کمالات کے حامل تھے عربیت، لغت، محاضرات اور تاریخ دانی میں خاصکر دستگاہ کامل رکھتے تھے۔ درسی کتابیں میر طفیل محمد سے پڑھی تھیں اور باقی کمالات و فنون اپنے پدر جلیل سے حاصل کئے تھے اور بقول الاسماء المستعمی بالسر حرئیکون مسل الاول تمام فضائل صوری و معنوی و خصائل رضیہ میں ممتاز اور باپ کے ہمقدم تھے۔ نہایت صدق و راستبازی، صفا، و یک رنگی سے بسر فرماتے، ان کا جوہر ہمت و سخاوت بہت بلند تھا سید العارفین میر لطف اللہ عرف شاہ لدھا کے مرید تھے۔ اکثر اوقات مطالعہ و مباحثہ کتاب میں مصروف رہتے کتب حقائق مثل فتوحات مکیہ وغیرہ کے اکثر زیر نظر رہتی تھیں۔ پڑھانے کا بھی شوق تھا آزاد اور یوسف دونوں خواہر زادوں کو عروض و قافیہ اور بعض فنون ذکات ادب بتلائے تھے۔ صوفیہ کرام کے اقوال و حکایات، و اشعار عربی و فارسی اور ہندی کے گیت اور دوہے ان کو بے شمار یاد تھے۔

میر عبدالجلیل کو شفقت کے سوا جو لازمۂ ابوّت ہے میر سید محمد سے عنایت و محبت زیادہ تھی جس زمانہ میں کہ میر صاحب بھکر میں تشریف فرما تھے میر سید محمد نے کئی بار وہاں جانے اور شرف قدم بوس حاصل کرنے کا ارادہ کیا۔ لیکن سفر کے شدائد اور بھکر کی آب و ہوا ناسازگار و ناموافق ہونے کی وجہ سے میر صاحب ہمیشہ (باوجود غایت الفت پدری و شوق لقا) مانع آتے رہے میر سید محمد کو آخر مرتبہ لکھا اور صاف طور پر سمجھایا تھا کہ

اگر علل می باشند بنا بر آں ارادہ سفر ایں طرف دارند بر خوردار، خود می دانید کہ در رسانیدن

ماہمیں شما ایدکسے کہ یک بسپرداشتہ باشد کہ باختیار خود جدائی پسر را قبول نہ دارد۔ تمام آرزوئے ماہمیں است کہ شما را بسیر بہ بینم۔ اما اسباب دواعی مختلفہ نمی گزارند کہ شمارا بہ طلبم۔ اول خود ہوائے بھکر از سہ چہار سال ایں قدر مختلف شدہ کہ در نوشتن نمی آید۔ خصوص در موسم سرما ایں قدر تغیر فاحش در ہوا ہم می رسد کہ ہیچ متنفسے از آزار سالم نمی ماند۔ ایں معنی را انہماری دفیض اللہ کہ تازہ می رسند تحقیق نمایند و مقدمات دیگر کہ عدم دلجمعی کلمۂ جا تفسیر آں تواند شد نیز مانع ایں ارادہ اند بنا بر آں جرأت بر راہ پیمائی دور و دراز نمودہ تجویز مشاق نمی کنم"

جب میر عبدالجلیل بھکر سے شاہجہان آباد پہونچے تو میر سید محمد کو اپنے پاس بلانا چاہا اور دوالانامہ بھیجا لیکن باقتضائے وقت و مصالح فی الفور یہ حکم بھی بھیجا کہ توقف کیجئے اور دوسری اطلاع یا طلب ثانی کا انتظار فرمائیے۔ میر سید محمد نے اس کے جواب میں عرض کیا لَنْ اَبْرَحَ الْاَرْضَ حَتّٰی یَاْذَنَ لِیْ اَبِیْ (جب تک مجکو میرے والد اجازت نہ دیں میں تو اس جگہ سے ٹلنے والا نہیں ہوں۔ جزء ۱۳۔ سورۂ یوسف ع ۱۰-۴)۔ میر عبدالجلیل اس جواب سے نہایت خوش ہوئے اور اپنی محبت و رضا کا ان الفاظ میں اظہار فرمایا

ع تا یاذن لی ابی بخط دیدم ؛ گلہائے طرب از چمن دل چیدم
از غایت اہتزاز پروانہ صفت ؛ اے شمع پدر! گرد سرت گردیدم

میر سید محمد نے ۱۱۵۵ھ (۱۷۴۲ء) میں کتاب مستطرف[۱۲۳] کا جو فن ادب عرب میں دلچسپ و مستند کتاب ہے نہایت دلپذیر انتخاب کیا اور الجزء الاشرف من المستطرف نام رکھا تھا۔ تبصرۃ الناظرین فارسی کی تاریخ بالخصوص بلگرام اور اہل بلگرام کے متعلق خوب لکھی ہے۔

---

۱۲۳ پورا نام المستطرف فی کل فن مستظرف ہے۔ امام الشبی شیخ شہاب الدین محمد بن احمد الخطیب کی تالیف ہے۔ مصر میں دو جلدوں میں چھپی ہے۔ ادب و انشا کی بہترین اور جامع کتابوں میں اس کا شمار ہوتا ہے مگر حقیقت یہ ہے کہ اسکے چوراسی بابوں میں محاضرات، اجتماع، سیاست، تصوف جملہ علوم و فنون کو مختصر حکایات و لطائف میں محفوظ و پیش کر دیا ہے۔ شیخ نے ۸۵۰ھ (۱۴۴۶ء) میں وفات پائی ع کان مثواہ جنۃ الماوی

جب میر عبدالجلیل نے ۱۱۳۰ھ (۱۷۱۸ء) میں اپنی خدمات سے استعفا دیا تو سلطان فرخ سیر نے سرکار بھکر و سرکار سیوستان کی بخشی گری و وقائع نویسی و سوانح نگاری میر سید محمد کے سپرد کیں۔ سید محمد نے اپنے محل خدمات پر ۱۱۳۳ھ (۱۷۲۱ء) میں پہونچکر اپنا کام شروع کر دیا۔ وہاں کی تمام رعایا اور رؤسا میر سید محمد کی ہمدردی، نیک نیتی، دیانت اور حسن معاملت سے نہایت راضی و مطمئن رہے۔ ۱۱۴۲ھ (۱۷۲۹ء) میں میر سید محمد سیوستان میں میر غلام علی آزاد کو اپنا نائب چھوڑ کر بلگرام چلے آئے اور جب انکی خدمات میں خلل پڑنے کی خبر ملی تو دہلی پہونچکر بعض امرا کے توسل سے اُسکو رفع دفع کیا۔ ۱۱۴۵ھ (۱۷۳۲ء) میں پھر سیوستان تشریف لے گئے۔ وسط ۱۱۴۷ھ (۱۷۳۴ء) میں آزاد کو ہندوستان واپس جانے کی اجازت دی اور خود اپنی خدمات کی انجام دہی میں مشغول و مصروف ہو گئے۔ جب سندھ میں نادر شاہ کا تسلط ہوا تو میر سید محمد سے عہدہائے بادشاہی کا سررشتہ منقطع ہو گیا۔ خدایار خاں[۱۲۴] والی سندھ نے آپ کو عرصہ تک نہیں چھوڑا اور کمال اعزاز و اکرام کے ساتھ سیوستان میں مقیم رکھا۔ نہایت شایستہ خدمات اور پسندیدہ سلوک عمل میں لایا۔ چونکہ اس ملک میں نادر شاہی ہنگامہ گرم تھا اور سندھ کی حالت پرانے طریق پر نہیں رہی تھی اس لئے میر صاحب وہاں سے نہایت دل برداشتہ تھے۔ چار و ناچار خدایار سے اجازت لی اور ۲۵۔ رمضان ۱۱۵۵ھ (۱۶۔ نومبر ۱۷۴۲ء) کو سیوستان سے نکل کھڑے ہوئے اور بہ راہ مارواڑ وطن کا رخ کیا۔ ۲۷۔ محرم ۱۱۵۶ھ (۱۳۔ مارچ ۱۷۴۳ء) کو داخل بلگرام ہوئے۔ فعاد

آهلا الی موطنه من غربة طال بها عهد النوی۔

نیرنگ روزگار سے چالیس سال بعد اس خاندان کا آب و خور سندھ سے اٹھا تھا۔

حکیم عرب ابن خلدون نے اقوام و امم کی زندگی و اجل اور دولت و حکومت کی بقا و فنا کے بارہ میں ایک عمدہ تقریر لکھی ہے جسمیں یہ بحث بھی کی ہے کہ ان پر پیری و کہن سالی کیونکر آجاتی ہے اور جب تنزل نمودار ہوتا ہے تو اس کا زوال دشوار ہوتا ہے۔ اس بحث میں اکثر باتیں صحیح و

۱۲۴۔ خدایار خاں بہادر ثابت جنگ عباسی، زمیندار ٹھٹھہ آباد۔ منشورات انند رام مخلص میں اس کے نام کا ایک خط ملاحظہ طلب ہے۔

درست لکھی ہیں لیکن بعض جگہ اُس کے ذہن نے خطا اور قلم نے لغزش بھی کی ہے جس طرح بعض اطبائے متقدمین نے افراد انسانی کی اجلِ طبیعی (درازیِ حیات) ایک سو بیس سال قرار دی ہے اسی طرح اس نے بھی دولت کی عمر تین اجیال (منزلیں) مانی ہیں اہل نظر اس رائے کو صحت و صواب سے بعید پاتے ہیں۔ ان کا قول ہو کہ خدا کے بنائے (ٹھہرائے) ہوئے دنوں میں و صرف تین ہی۔ ن دولت کی عمر ہوتی ہے یعنی طفولیت۔ بلوغ اشد و رشد۔ ہرم و شیخوخت۔ اس میں سال و قرن کی مہلت و میعاد کہاں۔ اس اعتبار سے میر عبدالجلیل اور برکات بلگرام کا اتنی مدت کے بعد اس ملک سے چلا آنا محض اقتضائے فطرت آسیا یا گردشِ لیل و نہار تھا۔

اس سلسلہ میں ایک علمی لطیفہ یاد آگیا جب نادر شاہ والی ایران نے ہندوستان پر تصرف و تسلط کر لیا اور اس کے بعد اپنے ملک کو واپس جانے کا ارادہ کیا تو کسی شخص نے نواب نظام الملک کو نادر شاہ کی واپسی و رجوع کی خبر دی۔ نظام الملک نے پوچھا کہ آیا اس خبر کی کچھ اصل بھی ہے؟ حاضرِ مجلس میں سے ایک صاحب بولے "النادر کالمعدوم" اس کے عربی کے معنی تو ظاہر ہیں۔ کل ہندی میں بمعنی "غد" یا "فردا" آتا ہے۔ مقصود یہ تھا کہ نادر کل معدوم ہو جائے گا۔ نادریں تو یہی ہو۔

میر سید محمد نے آٹھویں شعبان ۱۱۸۵ھ (۱۲ نومبر ۱۷۷۱ء) کو شنبہ کی شب میں بلگرام میں وفات پائی۔ ان کے بھانجے اور شاگرد میر غلام علی آزاد نے جو اپنی عمر کا سترواں مرحلہ طے کر رہے تھے اور وطن اور اہلِ وطن کو چھوڑ کر دکن میں مقیم تھے ان کا نہایت درد انگیز مرثیہ لکھا اور تاریخ نکالی ؏
رفت قدسیِ جہاں سید محمد از جہاں۔ آزاد نے ان کے حالات تقریباً ہر ایک تذکرہ میں لکھے ہیں اور بڑے امتنان و عقیدت سے ان کی شفقت و محبت کو یاد کیا ہے۔ عربی میں ایک قصیدہ اور چند قطعات و اشعار مدحیہ بھی آزاد نے لکھے ہیں۔

میر سید محمد بڑے طباع اور استاد شاعر تھے۔ شاعر تخلص تھا۔ فارسی و عربی و ہندی میں کمال مہارت تھی۔ تینوں زبانوں میں ان کا کلام موجود ہے اور دیوان مرتب۔

دنیائے علم پر میر سید محمد کا ایک بڑا احسان یہ ہے کہ انکو وقتاً فوقتاً جو خطوط میر عبدالجلیل نے سفر کی

لکھے تھے اُن کو یکجا کر دیا، بعض پر مختصر حواشی یا خود ہی تمہیدات بھی لکھ دیے ہیں۔ ان خطوط سے اُنکی اصلی خانگی حالت اور قدیم طرز معاشرت کی جھلک نظر آتی ہے۔ افسوس ہے کہ خطوط مطبوعہ کے ساتھ اُنکی تاریخ تحریر درج نہیں ہے ورنہ سلسلۂ مکاتبت اور تسلسل واقعات کا پتہ چلتا۔ دوسرے اُن کی تعداد نہایت کم ہے یعنی صرف بائیس (۲۲) اگر سب رقعات میر عبدالجلیل کے محفوظ و مرتب ملجاتے تو فن انشاء و مکاتبت میں اُن سے بڑا قابل قدر اضافہ ہو جاتا۔

میر سید محمد نے منصور حلاج کے سال شہادت کی تاریخ صحیح ہی آیۂ قرآنی سے نکالی تھی، وَلَبِثُوا فِي كَهْفِهِمْ ثَلٰثَ مِائَةٍ سِنِينَ وَازْدَادُوا تِسْعًا [اور (اصحاب کہف) اپنے غار میں تین سو برس رہے اور نو اور رہے۔ جزء ۱۵ سورۃ الکہف ع ۱۶-۳] ایک مثنوی موسوم بہ ناز و نیاز بھی یادگار چھوڑی تھی، سید حسن ترمذی بلگرامی اور شاہ فیاض کا جو اُن پر عاشق تھے دلچسپ پیرایہ میں قصہ نظم کیا ہے۔

میر غلام علی آزاد

میر غلام علی آزاد میر عبدالجلیل کے سب سے بڑے نواسے اور اُن کے مایۂ نازش، بلکہ سارے خاندان کے لئے باعث افتخار تھے۔ وہ اپنے تذکروں، قصائد اور مثنویات سے بلگرام اور اپنے اسلاف و اخلاف کو شہرت عام اور بقائے دوام کی سند دے گئے ہیں۔

آزاد کی ولادت ۲۵۔ صفر ۱۱۱۶ھ (۲۹۔ جون ۱۷۰۴ء) کو بلگرام میں ہوئی۔ تعلیم و تربیت تمام تر وہیں پائی۔ درسی کتابیں ابتداء سے انتہا تک وہاں کے مشہور عالم اور اُستاد میر طفیل محمد کے حلقۂ درس میں پڑھیں، لغت، حدیث، سیرت نبوی اور فنون ادب کو میر عبدالجلیل سے حاصل کیا۔ عروض و قافیہ اور بعض دیگر شعب ادب اپنے ماموں میر سید محمد شاعر سے حاصل کئے عربی شاعری میر عبدالجلیل سے سیکھی۔ ۱۱۳۴ھ (۱۷۲۲ء) میں سراج خاندان میر سید لطف اللہ عرف شاہ لدھا بلگرامی سے بیعت

طریقہ میں بیعت فرمائی۔ مذہباً حنفی تھے۔ اتباع امام کے ساتھ ضعیف الاعتقادی اور احداث فی الدین سے متنفر و محترز رہتے۔

جیسا کہ میر عبدالجلیل کے تذکرہ میں بیان ہو چکا ہے میر غلام علی و میر محمد یوسف اُنکے پاس سنہ ۱۱۴۱ھ (سنہ ۱۷۲۸ء) میں تکمیل علوم کے لیے دارالخلافہ شاہجہان آباد پہونچے۔ دو برس وہاں قیام رہا سنہ ۱۱۴۲ھ (سنہ ۱۷۲۹ء) میں آزاد کو سیوستان کے سفر کا اتفاق ہوا۔ میر سید محمد جو وہاں میر بخشی و وقائع نگار تھے ان کو نائب مقرر کرکے وطن چلے آئے۔ چار سال بعد واپس تشریف لے گئے تو سنہ ۱۱۴۷ھ (سنہ ۱۷۳۴ء) میں آزاد کو دوبارہ بلگرام کا موقع ملا۔

آزاد نے کسی وقت حضرت پیغمبر جناب رسالتمآب صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی عالم رؤیا میں زیارت کی تھی۔ شوق تجرید اور ذوق زیارت حرمین محترمین اسی زمانہ سے مستولی اور سینہ میں موجزن تھا۔ اسی سال میں جذبات الٰہیہ سے ایک جذبہ جسکو جذبۃ من جذبات الرحمٰن یوازی عمل الثقلین کہا گیا ہے پہونچا اور آزاد اسی روز افزوں ذوق و شوق کے عالم میں اپنے اعزہ و اقربا کی اطلاع بغیر رجب سنہ ۱۱۵۰ھ (اکتوبر سنہ ۱۷۳۷ء) میں تنہا اور پا پیادہ بلگرام سے چل کھڑے ہوئے۔ زاد سفر کچھ نہ لیا۔ صرف اِنّی ذاهِبٌ اِلیٰ رَبّی سَیَهدِین (میں تو اپنے پروردگار کی طرف چلا جاتا ہوں۔ وہ مجھے ٹھکانے لگا دیگا۔ جزء ۲۳ سورۂ والصّٰفّٰت ع ۳ ...) زبان پر تھا اور جاذبۂ عقیدت و محبت دامنگیر۔ رستے کی صعوبات ناقابل برداشت ثابت ہوئیں۔ اور وہ محبت، سوز و گداز، کشش و نیاز کی کل روداد کو آزاد نے ایک مثنوی میں درج کر دیا ہے جسکا تاریخی نام طلسم اعظم ہے۔ اتفاقاً اثنائے راہ میں نواب آصف جاہ کا لشکر اطراف مالوہ میں خیمہ زن تھا۔ کسی مرد صالح نے بے سابقہ معرفت و شناسائی ان کو اپنا مہمان بنایا۔ [illegible] شکرگذاری بجا لایا۔ سواری کے لیے ایک پُر تکلف رتھ نذر کیا۔ ۲۲ شعبان کو نواب عالی مرتبت کا شرف لقا نصیب ہوا۔ آزاد نے یہ رباعی برجستہ عرض کی ؎

اے حامیِ دیں! محیط جود و احساں — حق داد ترا خطاب آصف شایاں
از تخت بدرگہ سلیماں آورد — تو آل نبی را بہ درِ کعبہ رساں

میر غلام علی آزاد نے مدۃ العمر شاعری کی مگر عیشاً و دواماً کی طرح سرائی سے دور رہے۔ تمام زندگی میں ایک یہی رباعی اور دو شعر اور نواب نظام الدولہ شہید کی شان میں کہے تھے۔ ظاہر ہے کہ یہ رباعی محض مجبورانہ اور استعانت سفر بیت اللہ کے لئے گزارش کی تھی۔ آصف جاہ جب ورود اس وقت مرہٹوں کی تنبیہ پر متوجہ تھے۔ صفوف اسلام کے ساتھ آزاد کو بھی شریک غزا و جہاد ہونا پڑا۔ سارا رمضان سواد شہر بھوپال ۱۱۵۰ھ میں گزرا۔ آخر رمضان میں مصالحت ہوگئی۔ نواب نے زاد و راحلہ حاطر خواہ بہم پہونچا دیا۔ برہان پور ہوتے ہوئے آزاد سورت پہونچے اور جہاز پر سوار ہوگئے۔ ۱۱۵۱ھ کا پہلا چاند (۹۔ اپریل ۱۷۳۸ء کو) سطح دریا پر کشتی کے عرشے سے دیکھا۔ جہاز سے اتر کر جدہ سے مکہ پہونچے

۱۱۵۰ھ بھوپال، اکبر و اورنگ زیب کے عہد میں گانڈ قوم کے گونڈوانہ میں داخل، اور صوبہ مالوہ میں شامل تھا۔ اب ایک ریاست وسط ہند میں مالوہ کے حدود شرقی میں واقع ہے۔ حکمران خاندان کا مورث یعنی ریاست کا بانی تیراہ کا ایک پٹھان دوست محمد خاں نام، بہادر شاہ کے اوائل عہد یعنی ۱۱۲۰ھ (۱۷۰۸ء) میں دہلی آیا اور رفتہ رفتہ آزادی واقتدار و اختیار حاصل کرتا گیا۔ بڑا دلیر و مستقل مزاج تھا۔ پہلے تو اس نے کچھ زمین اجارہ پر لی، بعد ازاں ریاست کی بنیاد ڈالی۔ ۱۱۵۳ھ (۱۷۴۰ء) میں وفات پائی۔ فیض محمد خاں جب میر و حاکم تھا تو اس سے عنان حکومت ایک ہندو بیجے رام کے ہاتھ میں دیدی تھی وہ شخص فی الواقع نہایت منتظم و مدبر تھا مگر بعد کو اس نے مفتوحات بھوپال باجی راؤ پیشوا کے حوالہ کر دی تھیں۔ فیض محمد خاں نے ۱۱۹۱ھ (۱۷۷۷ء) میں انتقال کیا۔ اٹھارھویں صدی کے آخر میں اس قطعۂ ملک پر جسونت راؤ نمبالکر راؤ دھار رہے اور اس کے بعد امیر خاں نے قبضہ کر لیا

ابتدا سے کچھ روز تک اسلام نگر دار الریاست رہا تھا

بھوپال میں بعض عمارات نفیس و قابل دید بنائی گئی ہیں۔ شہر کی آبادی عرصہ سے مائل بہ زوال ہے۔ ۱۹۲۱ء میں صرف ۴۵۰۹۴ اشخاص شمار میں آئے تھے۔

بھوپال کی فرمانروا بیگمات میں، نواب سکندر بیگم اور نواب شاہجہاں بیگم کا عہد نہایت ممتاز رہا ہے۔ ان کی خدمات نمایاں، معدلت گستری، حسن انتظام اور کارہائے رفاہ خلائق کے تذکروں سے صفحات تاریخ معمور ہیں۔ مدبرین فرنگ اور غیر ممالک کے اہل وقوف و خبرت نے خاص الفاظ میں ستایش و تحسین کی ہے۔

تقریباً پون صدی سے بھوپال علم و ادب کا مرکز چلا آتا ہے۔ پہلے صرف علوم دینیہ اسلامیہ اور فنون مشرقیہ کا معہد تھا۔ والیۂ عالیہ سابقہ نواب سلطان جہاں بیگم صاحبہ ادام اللہ ظلالہا کے عہد ہمایوں میں ہر قسم کے علوم و

بیت اللہ کی آستانہ بوسی فرمائی۔ مدینۃ النبی علیٰ صاحبہا الصلوٰۃ والسلام کے دیکھنے کا اشتیاق ستا رہا تھا۔ تین دن مکہ شریف میں ٹھہر کر اُدھر کا رُخ کیا۔ ۲۵ صفر ۱۱۵۱ھ (۲۸ جون ۱۷۳۸ء) کو سواد یثرب پاک سرمہ کش چشم سعادت ہوا۔ وہاں کے دوران قیام میں شیخ محمد حیات[۱۲۶] سندی مدنی سے صحیح بخاری پڑھکر سند حاصل کی۔ صحاح ستہ اور سائر مفردات کی اجازت لی۔ کئی نعتیہ قصائد عربی میں لکھکر روضۂ اقدس میں پیش کئے۔ عید الفطر آستانِ اطہر پر ہوئی۔ ۱۴ شوال (۱۵ جنوری ۱۷۳۹ء) کو بارگاہِ رسالت پناہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے ادائے حج کے لئے رخصت حاصل کی۔ ۲۶ ماہ مذکور (۲۷ جنوری) کو پھر مکہ مکرمہ میں داخل ہوئے۔ ذی الحجہ میں مناسک حج بجا لائے۔ طائف بھی گئے۔ مکہ معظمہ میں شیخ عبد الوہاب طنطاوی کی صحبت میں حاضر رہکر فن حدیث کے فوائد حاصل کئے۔ انھیں کے مکان پر قیام تھا۔ شیخ اس وقت سرآمد علمائے عصر سمجھے جاتے اور مکہ معظمہ میں فروکش تھے۔ مجالس درس وموعظت انکی ذات اقدس سے گرم ومنور رہتی تھیں۔ آزاد کے اشعار عربی سنکر شیخ صاحب بہت تحسین فرماتے تھے جب میر غلام علی کا تخلص آزاد سنا اور اس کے معنی ومصرف کو سمجھا تو فرمایا کہ سید ی انت من عتقاء اللہ

فنون اور تمدن وسندت نے توزیع وترقی پائی جن کے دست جود وعطا کی بدولت اس وقت ہندوستان کی بڑی بڑی تعلیم گاہیں قائم اور سرسبز وشاداب ہیں سلیا حضرت کی کامیاب اور فیض رساں حکمرانی کو ایک عالم مانتا اور اعتراف کرتا ہے۔

فرمانفرمائے ریاست وہی شوکت سکندر صولت اعلیٰ حضرت حضور نواب لفٹیننٹ کرنیل افتخار الملک حاجی محمد حمید اللہ خان صاحب بہادر جی سی آئی ای ایک سراپا خبر، روشن خیال، بیدار مغز اور قابل افتخار حکمراں ہیں۔ اپنی والدۂ ماجدہ کے نقش قدم پر چلتے اور اہل علم وہنر کی سرپرستی وقدر دانی فرماتے ہیں ؎

علا عن المدح حتی ما یزان بہ ۔۔۔ کانما المدح من مقدار لا یصم

۱۲۶ اطراف عادل پور توابع بھکر کے باشندے، قبیلۂ حاجر سے تھے۔ باپ کا نام ملا فلاریہ تھا۔ عادل پور نے بھی دیکھا تھا۔ شیخ محمد حیات آغاز شباب میں حجاز شریف تشریف لے گئے۔ مدینہ منورہ میں توطن اختیار کر لیا تھا تحصیل علم بھی وہیں کی۔ باوجود فقدان وجہ معاش بڑی استقامت سے کام لیا۔ حرمین معظمین کی علمائے نامور مثل شیخ ابو الحسن سندی سرحلقہ وشیخ عبد اللہ بن سالم البصری المکی سے تلمذ تھا۔ حدیث شریف کی خدمت میں تمام عمر صرف کر دی اور

اسی طرح وہاں کے صاحبان فضل و ادب اور بزرگان عرب نے آزاد کی عربی دانی اور قادر الکلامی کو بڑی قدر کی نظر سے دیکھا اور تعریف کی

ربیع الآخر ۱۱۵۲ھ (جولائی ۱۷۳۹ء) میں طواف وداع بجا لائے ۳ جمادی الاول (۲۹ جولائی ۱۷۳۹ء) کو جدہ سے جہاز پر سوار ہوئے۔ بندرگاہ مخا (ساحل یمن) ہوتے ہوئے سورت پہنچے۔ پانچ مہینہ قیام کیا وہاں سے سیدھے دکن چل دئے آخر ذیقعدہ ۱۱۵۲ھ (وسط فروری ۱۷۴۰ء) میں وارد اورنگ آباد ہوئے۔ بابا شاہ مسافر[128] نقشبندی کے تکیہ[129] (مکان بود و باش فقرا) میں قیام اختیار کیا۔ سات سال تک اُسی جگہ بسر کی۔ نواب نظام الدولہ خلف آصف جاہ سے بڑا ارتباط و اتحاد تھا۔ با ایں ہمہ آزاد آزاد رہے، اور کوئی خدمت یا منت کشی اُن کی یا کسی میر کی گوارا نہ کی۔

۱۱۶۱ھ (۱۷۴۹ء) میں وحشت دل پھر دامنگیر ہوئی۔ دیار عرب جانے کی کشش تھی اور وطن و اہل وطن سے قطع تعلق پر سرگرمی و انہماک لیکن ایک شب سروش غیبی کی صدا آئی ع کش دست از دامن رہ نوردی گار ست امتثال امر غیب پر مجبور ہوئے ارادہ فسخ کرنا پڑا [illegible]

...ماہ مبارک میں سبحۂ تعلیم حاصل کر لیا۔ اپنے اوقات عزیز کی بڑی نگہداشت کرتے اور زیادہ تر علوم و مسائل میں مصروف رہتے۔

...حرمین پاک کے خاص و عام اور مصر و روم و شام کے لوگ ان سے اعتقاد و اخلاص رکھتے اور فیوض و برکات حاصل کرتے تھے

چہار شنبہ ۲۶ صفر ۱۱۶۳ھ (۴ جنوری ۱۷۵۰ء) کو رحلت فرمائی۔ لفظ "مبارک" سے تاریخ نکلتی ہے۔

۱۱۵۷ھ (۱۷۴۴ء) میں رہگرائے عالم جاودانی ہوئے۔ صحن اقصیٰ میں جگہ پائی۔

العزائم اس زمانہ میں ان کو بارہا شہر حیدرآباد[۱۱۹۹ھ] اور دکن کے مختلف مقامات کو کبھی ازخود اور کبھی نواب نظام الدولہ کی معیت میں جانا پڑا۔ آزاد نے اپنی عمر کا بڑا حصہ (اڑتالیس سال) دکن میں گزارا۔ شفیق ماموں اور اُستاد (میر سید محمد) کے مرنے، نوجوان اکلوتے بیٹے (میر نور الحسن[۱۲۹]) کے خرق آب

---

۱۲۸ بابا شاہ مسافر خلیفہ ارشد بابا شاہ سعید پلنگ پوش کے تھے۔ شاہ مسافر کا اصلی نام حافظ محمد عاشور، در مولد و منشاء غجدوان تھا مسافر رہبر طریقت کا دیا ہوا خطاب تھا بابا سعید ہندوستان چلے آئے تھے اور نواب غازی الدین خاں فیروز جنگ پدر نواب آصف جاہ کے لشکر کی نگہبانی و حراست پر مامور تھے، ہمیشہ ہمراہ رہتے تھے حافظ محمد عاشور نے اوائل میں میر عطاء اللہ ساکتری کی خدمت میں حاضر ہو کر کبرویہ طریق پر ریاضتیں کیں میر عطاء اللہ نے رخصت کیا تو سیاحت کی ہدایت کی سمرقند چلے آئے۔ بارہ سال قیام فرمایا وہاں سے کابل آئے اور بابا شاہ سعید کے مرید ہوئے۔ سات سال بعد اجازت لیکر حرمین شریفین گئے۔ سعادت حج حاصل کر کے ابتدائے عہد خلد مکاں میں ہندوستان آئے اور اورنگ آباد میں جس جگہ کہ اس وقت مرقد مبارک کا تکیہ ہے اقامت گزیں ہوگئے نفس واپسیں تک وہاں سے نہیں اُٹھے۔ تشنگان ارادت و عرفان اس چشمہ ربانیت و رحمت سے خوب سیراب ہوتے رہے ۴۔ رجب ۱۱۲۲ھ (۷۔ جولائی ۱۷۱۴ء) کو اس عالم سفلی کو چھوڑا اور اپنے پیر کے پہلو میں جانب قبلہ آسائش فرمائی۔

آزاد نے ان کو دیکھا نہ تھا لیکن بڑے اخلاص و عقیدت سے یاد کرتے ہیں ؎

قطب زماں صاحب شان عظیم	شاہ مسافر بہ در حق مقیم
خسرو بے تاج و نگین و علم	تاج دہ قیصر و خاقان و جم
ریشہ بہ اسرار حقیقت دواند	دامن ہمت بہ دو عالم فشاند
خود شکنی ها اثر ذکر او	روشنی دل اثر فکر او
پادشہ سلسلۂ نقشبند	یک نظر او دو جہاں را پسند

۱۲۹ یہ خانقاہ ایک بڑے وسیع باغ میں محمود دروازہ کے پاس واقع ہے اور اب درگاہ شاہ مسافر کے نام سے زیادہ شہرت رکھتی ہے اورنگ آباد میں یہ روضہ نہایت دلفریب اپر فضا اور فرح بخش مقام سمجھا جاتا ہے۔ اورنگ زیب اور اُس کے اعیان سلطنت کو ان بزرگ سے کمال اعتقاد تھا۔ شاہ صاحب کے پیر و مرشد کے لئے ۱۰۹۰ھ (۱۶۷۹ء) میں امرائے دولت اور اہل ارادت نے اس خوشنما اور شاندار تکیہ کو تعمیر کرایا تھا۔ اس کے متعلق مدرسہ، مسجد، دیوان خانہ اور ایوان سرا اور دیگر ضروری عمارات متعدد تیار کرائی تھیں آصف جاہ

ہونے خالہ زاد اور عزیز تر از جاں بھائی (محمد یوسف) کی وفات اور پیارے سے پیارے رشتہ داروں کی مفارقت دائمی اختیار کرنے کی خبریں آتی رہیں۔ مگر یہ دکن میں کچھ ایسے پاؤں توڑ کر بیٹھے تھے کہ اُٹھنا اور ہٹنا گوارا نہ کیا۔ حبِ وطن کا جاذبہ خاک دکن کی پابوسیوں پر غالب نہ آسکا شفقت بزرگانہ

اول میر درسکے عہد مبارک میں درگاہ نے اور بھی وُسعت اور رونق پائی درگاہ کے احاطہ کے اندر کئی پختہ حوض ہیں اور فوارے لگے ہیں باہر ایک نہایت لمبا چوڑا حوض ہے جس کے لئے نہر سے پانی آتا ہے اور بڑی بلندی سے حوض کے اندر گرتا ہے۔ کسی وقت اس آبشار کے قریب ایک پن چکی بھی قائم تھی، جس کے اب صرف آثار و نشان باقی رہ گئے ہیں۔ درگاہ کی مسجد میں ایک دُرّہ رکھا ہوا ہے جس کی نسبت روایت یہ ہے کہ شاہ دیں پناہ (عالمگیر) خلاف شرع کام کرنیوالوں کو اس سے تعزیر دیتا تھا

نمبر ۳۱ شہر حیدر آباد۔ یہ شہر ریاست حیدر آباد دکن کا دارالصدر حقیقتاً پایہ تخت خلد اللہ سلطنتہ کا دارالملک موسیٰ ندی کے داہنے ساحل پر واقع ہے۔ اس کی آبادی مع اس کے محلہ مضافات کے سنہ ۱۹۲۱ء میں چار لاکھ چار ہزار ایک سو ستاسی ۴۰۴۱۸۷ تھی۔ بلحاظ کثرت آبادی وزینت و رونق یہ شہر ہندوستان میں چوتھا مگر باعتبار تمدن و تہذیب پہلا سمجھا جاتا ہے۔

اس شہر کی بنیاد سنہ ۹۹۷ھ (سنہ ۱۵۸۹ء) میں محمد قلی قطب شاہ بن ابراہیم قطب شاہ (پانچویں قطب شاہی بادشاہ) نے ڈالی تھی وہ اُس وقت گولکنڈہ کا فرمانروا تھا۔ جو حیدر آباد سے پانچ میل پچھم پر ہے۔ بانی نے اس کا نام بھاگ نگر رکھا تھا پھر حیدر آباد بدل دیا۔ سنہ ۱۰۷۶ھ (سنہ ۱۶۶۵ء) میں جب شہنشاہ اورنگ زیب محمد قلی اور اس کے شکستہ خاطر و دل برداشتہ وزیر میر جملہ کے مابین تصفیہ کرانے آیا ہے اُس وقت تک شہر کی حالت روبہ ترقی اور رونق روز افزوں تھی۔ سنہ ۱۰۹۸ھ (سنہ ۱۶۸۷ء) میں شہنشاہ عالمگیر کا حملہ گولکنڈہ پر ہوا تو حیدر آباد مغلوں کے قبضہ میں آگیا اور ان کے قبضے میں اُس وقت تک رہا کہ نظام اول نے اپنی خود مختاری کا اعلان کیا اور اس کو اپنا دارالصدر قرار دیا۔

شہر کے گرد سنگین دیوار ہے، جس میں برج بنے ہیں۔ سترہ پھاٹک اور بارہ کھڑکیاں ہیں۔ یہ شہر بشکل متوازی الاضلاع تعمیر ہوئی ہے۔ دَور چھ میل اور رقبہ سولہ میل مربع ہوگا۔ اس کی تعمیر کا آغاز مغلوں کے اخیر صوبہ دار مبارز خاں نے کیا تھا۔ نظام اول نے اس کی تکمیل فرمائی۔ شمال و مشرق میں شہر اپنے اصلی حدود سے بہت بڑھ گیا ہے۔ موسیٰ ندی پر چار پل بنے ہیں۔ پُرانا پل، مالک پچھم کو ہے اولی فینٹ برج Ohphant Bridge شرق انتہا میں ہے۔ ان دونوں کے مابین نیا پل (۱) افضل پل۔ اور

اور حقوق اعزہ کا اقتضا اسی قدر تھا کہ اپنے بھتیجے (علام امام صادق کے بیٹے) میر اولاد محمد ذکا اور اپنے پوتے میر امیر حیدر ۱۲۳۲ھ کو اپنے پاس دکن میں بلالیا اور وہیں ان کی تربیت و پرداخت عالمانہ اور امیرانہ طریقہ پر کی۔ اپنی صحبت گرامی کے فیض اور علوم عالیہ سے بہرہ وافر دے کر وطن کو رخصت کر دیا

(۲) چہار دروازہ پل، واقع ہیں

عہد قطب شاہی کی سب سے خوبصورت اور شاندار عمارات میں سے ایک چار مینار ہے اس کی تعمیر ۹۹۹ھ (۱۵۹۱ء) میں ہوئی تھی۔ یہ شہر کے وسط یا مرکز میں واقع ہے اس کے اندر سے چار سڑکیں نکل گئی ہیں مینارے ایک سو اسی فٹ بلند ہیں۔ ان میں سے ایک مینار پر علماء کے قصہ کے [illegible] تعلیم دیا کرتی تھی۔ اس کی از سر نو تعمیر میں ساٹھ ہزار روپیہ صرف ہوا۔ فرانسیسی جنرل بانشو رسی اور اس کی افواج ۱۱۶۹ھ (۱۷۵۶ء) میں چار مینار پر قابض رہیں، سر سالار جنگ نے اپنی [illegible] اس عمارت کی تمام و کمال درستی و تجدید و تزئین کرادی تھی۔ چار مینار کے قریب چار کمان واقع ہے جس کی تعمیر ۱۰۰۱ھ (۱۵۹۲ء) میں ہوئی تھی چار شوارع پر جو شہر کے چار حصوں یعنی اسمات اربعہ کو جاتی ہیں بنائی گئی ہیں۔ چار سو کا حوض چار مینار کے شمال میں ہے بادشاہ نے اس حوض کے پاس ایک کوشک تعمیر کرایا تھا جہاں سے اپنی فوج کی قواعد کو دیکھا کرتا تھا۔ دار الشفاء (ہسپتال) پرانی حویلی کے بالکل شمال میں دو فرلانگ کے فاصلے سے واقع ہے۔ اسکو سلطان قلی قطب شاہ نے بنوایا تھا یہ ایک بڑی عمارت ہے جس کا صحن پختہ اور چوگوشہ ہے۔ مریضوں کے قیام و آرام کے لئے ہر طرف کمرے بنے ہیں۔ دروازے کے سامنے ایک نفیس مسجد اسی زمانہ کی تعمیر شدہ ہے۔ ایک بڑی عمارت سر سالار جنگ کے محل کے پیچھے جانب "عاشور خانہ" نام، سلطان محمد قلی قطب شاہ نے ۱۰۰۵ھ (۱۵۹۶ء) میں تعمیر کرائی تھی محرم وغیرہ میں اب بھی یہاں عزاداری اور ماتم گساری ہوتی ہے۔ "پرانا پل" شہر کو اس کاروان سڑک سے ملا دیتا ہے جو گولکنڈہ جاتی ہے اس میں تیئیس ۲۳ محرابیں ہیں۔ چھ سو فٹ لمبا تیئیس ۲۳ فٹ چوڑا اور چوبیس فٹ ظرف دریا سے بلند ہوگا۔ یہ ۱۰۰۱ھ (۱۵۹۲ء) میں تعمیر ہوا تھا۔ دریا یہاں سے بہت تنگ ہے اور اس کے کنارے گھاٹ بنے ہیں۔ قصر "گوشہ محل" کی تعمیر ابو الحسن تانا شاہ آخر قطب شاہی بادشاہ نے کی تھی یہ شہر سے ایک میل شمال پر ہے اسمیں ایک بڑا حوض ہے اور بیگمات کے لئے نزہت گاہیں ہیں "مکہ مسجد" جو چار مینار کے جنوب مغرب میں ہے سوا دو سو فٹ لمبی ایک سو اسی فٹ چوڑی اور پچھتر فٹ بلند ہوگی یہ تمام و کمال پتھر کی عمارت ہے۔ اس کا پختہ چبوترہ فرش تین سو ساٹھ فٹ مربع ہے۔ اس کی سقف پندرہ محرابوں پر قائم ہے جن پر دو بڑے بڑے برج بنے ہوئے ہیں۔ یہ چھت سے [illegible] فٹ بلند ہوں گے۔ اسمیں دس ہزار نمازیوں کی گنجایش ہے۔ محمد قطب شاہ (محمد قلی کے بھتیجے اور جانشین ۱۶۱۱ء) اس کی تعمیر شروع کی تھی اس کے انتقال کے بعد

یہ لوگ یہاں آکر پھولے پھلے مگر آزاد کو اپنی طرف کھینچنے میں ناکام رہے۔ آزاد نے چھیاسی برس کی عمر میں سنہ ۱۲۰۰ھ (۱۷۸۶ء) میں انتقال فرمایا۔ اور روضہ شریفہ خلد آباد میں پیوند زمین ہوئے انکی قبر پختہ شہر پناہ کی جانب جنوب، حضرت میر حسن ابو العلائی سجزی کے احاطہ کے ایک گوشہ

ابو الحسن نے تعمیر جاری رکھی مگر تکمیل اورنگ زیب کے ہاتھوں سے ہوئی۔ اسی مسجد کی جنوب لستان اراضی میں نظام علی خاں مرحوم، اور ان کے سب جانشین استراحت گزین ہیں۔ حمام مسجد چار مینار کے قریب ہے جو ۱۰۰۰ھ (۱۵۹۱ء) میں تعمیر ہوئی تھی۔ مگر جدا در گوشہ محل کو چھوڑ کر یہ سب باقی عمارتیں سلطان محمد قلی قطب شاہ کی تعمیر کرائی ہوئی ہیں۔ جس نے ساٹھ کروڑ روپیہ رتن طبیں اسٹرلنگ، رفاہ عام کی عمارات اور آبپاشی کے کاموں پر صرف کیا تھا۔ اس کے مقربین اور امراء نے بھی تقلید و متابعت کی اور کارہائے نیک پر بیدریغ روپیہ صرف کیا۔ ایک بڑا وسیع گورستان ہے جو میر مومن کا دائرہ کہلاتا ہے۔ میر مومن نے جو بعہد عبداللہ قطب شاہ کربلائے معلیٰ سے حیدرآباد آیا تھا اس کام کے لئے وقف کیا تھا۔ سر سالار جنگ کے خاندان کا قبرستان دائرہ مذکور کے جنوب ہے۔

بعد کی تعمیرات میں پرانی حویلی ہے۔ یہ ایک وسیع عمارت شہر کے شمال و مشرق کے حصہ میں واقع ہے اسکو نظام اول مرحوم نے تعمیر کرایا تھا۔ ایوان چو محلہ میں تین چوگوشہ محلات ہیں۔ اسکے ہر طرف نہایت خوشنما عمارات ہیں۔ وسط میں ایک بڑا حوض ہے۔ یہ محل نہایت پر تکلف اور سلیقہ مندی سے آراستہ ہے۔ بیگمات عصمت سمات کی شاہانہ محلسرائیں تیسرے چوگوشہ سے اس علاقہ ہیں

شاہی محلات و قصور گول کنڈہ، سرور نگر، مولا علی، آصف نگر، لنگم پلی اور ملک پیٹ میں بھی ہیں سالار جنگ کا محل، افضل دروازہ کے قریب ہے۔ اس میں دو قطعے یا حصے ہیں۔ ایک جس میں بارہ دری اور لکڑ کوٹ محل جو ہیں، یہ موسیٰ ندی کے داہنے ساحل پر ہے اور دوسرا پرانی حویلی کو جانے والی سڑک کے اس طرف۔ دونوں نہایت وسیع عمارتیں ہیں جو بہت سی اراضی پر پھیلی ہوئی ہیں۔ شمس الامراء کی بارہ دری شہر کے مغرب میں واقع ہے۔ اس کو ایک نہایت وسیع قطعہ زمین پر شمس الامراء اول نے تعمیر کیا تھا "فلک نما" ایک نہایت نفیس محل ہے۔ اس کو شہر کے مضافات جنوبی میں ایک پہاڑی کی چوٹی پر پینتیس ۳۵ لاکھ روپیہ کے صرف سے سر وقار الامراء مرحوم نے بنوایا تھا۔ اس قصر رفیع سے شہر اور اس کے اطراف کا نظارہ نہایت دلکش اور نظر فریب ہوتا ہے۔ حیدرآباد میں کوئی عمارت، خواہ بلحاظ حسن تعمیر خواہ باعتبار خوبی تجویز نقشہ، اس کا مقابلہ نہیں کر سکتی ہے۔ جنت آشیان نظام سادس نے ۱۸۹۷ء میں ذریعہ خریداری اسکو مملوکات شاہی میں شامل و داخل فرما لیا تھا۔ جہاں نما محل، اور اس کے خوشنما باغات جو سر آسمان جاہ مرحوم کے مملوکہ ہیں، فلک نما

میں حظیرہ (کٹھڑہ) کے اندر واقع ہے۔ اہل وقوف نے اُس کا پتہ زائرین اور مستفیدین کو کسی قدر دشواری سے چلتا ہے۔ افسوس ہے کہ کسی حوصلہ مند نے اُس پر کتبہ نہ لگادیا تاکہ کسی سے پوچھنے اور دریافت کرنیکی ضرورت باقی نہ رہتی۔

بارھویں صدی کے لئے ہندوستان میں آزاد کی ذات ایک نعمت بے مثال تھی۔ وہ مجسمہ ذہانت و قابلیت تھے اپنی لازوال یادگاریں عربی و فارسی تصانیف کا بڑا ذخیرہ چھوڑا ہے شعرائے ہند و ایران کے تین مبسوط تذکرے (۱) ید بیضا [۱۱۴۵ھ] (۲) سرو آزاد [۱۱۶۶ھ] (۳) خزانۂ عامرہ [۱۱۷۶ھ] - اور

کے شمال میں ہیں محل اور اُس کے بنگلوں میں جو باغات کے اندر بنے ہوئے ہیں، ایک بڑی تعداد باسلیقہ و ہنرمندانہ کلوں اور پرزوں کے کھلونوں کی موجود ہے۔

اطراف بلدہ، دو طور پر منقسم ہیں۔ ایک جو موسی ندی کے اُس پار ہیں۔ دوسرے وہ جو شہر کے ملحق ہیں۔ اول الذکر میں بیگم بازار، کاروان، افضل گنج، مشیر آباد، خیرات آباد، سیف آباد اور چادرگھاٹ داخل ہیں جو پورب سے پچھم کو تین میل تک چلے گئے ہیں اوسط عرض، شمال سے جنوب تک ڈیڑھ میل ہوگا اور رقبہ پانچ میل سے اوپر۔

رزیڈنسی بازار۔ ان بستیوں کے جنوب و شرق، اور شہر کے شمال و شرق میں واقع ہیں۔ باقی حصص ان مضافات کے جو شہر کے جنوب اور شرق میں ہیں یاقوت پورہ، ملک پیٹ، اور جہاں نما کہلاتے ہیں اور چار میل مربع رقبہ گھیرے ہوئے ہیں۔

رزیڈنسی۔ موسی ندی کے ساحل چپ پر، شہر کے شمال و مشرق کے گوشہ کے مقابل واقع ہے یہ شاندار عمارت ہے۔ ایک خوش نما رمنہ کی شکل کے قطعہ کے اندر واقع ہے۔ اس کے باغ نہایت خوبصورت آراستہ اور اچھی حالت میں ہیں۔ اسکی تعمیر سنہ ۱۸۰۳ء سے شروع ہوکر سنہ ۱۸۰۸ء میں ختم ہوئی تھی۔ اس کے اندر اور باہر بھی افسروں کے لئے کوٹھیاں بنی ہیں۔ انگریزوں کا قبرستان بھی ہے۔

حسین ساگر پانی کی ایک بڑی چادر ہے۔ جب خوب بھری ہوتی ہے تو آٹھ میل مربع سے زائد رقبہ پر پھیل جاتی ہے۔ اس سے رزیڈنسی اور مضافات شمال دریائے موسی کو پانی پہونچتا ہے۔ پشتہ یا بند [illegible] ڈھائی ہزار گز لمبا ہے۔ اسی پر وہ سڑک رواں ہے۔ جو مضافات شمالی کو سکندرآباد سے ملاتی ہے۔ اسکو سلطان ابراہیم قطب شاہ نے قریب سنہ ۹۸۳ھ (سنہ ۱۵۷۵ء) کے ڈھائی لاکھ کے خرچ سے بنوایا تھا۔ پانی کی ایک اور عظیم چادر میر عالم نام آٹھ میل کے دور میں ہوگی۔ یہ شہر کے جنوب غرب میں ہے۔ اس کا طول

بلگرام کے علماء و مشائخ کی ایک اچھی تاریخ مآثر الکرام [۱۱۳۰ھ] فارسی میں لکھی ہے۔ ہندوستان کی ایک دلچسپ مختصر تاریخ عربی میں سبحۃ المرجان [۱۱۳۸ھ] نام تحریر کی ہے۔ جس میں اس ملک کے خصائص و فضائل و شرائف کے بیان کے علاوہ فضلاء و فقراء کا ایک دلپسند تذکرہ لکھا ہے۔ ہندوستان کے مخصوص فنون، موسیقی اور شاہد پرستی یعنی نایکہ بھید، پر ایک نہایت مدلل مقدمہ اور مفصل تبصرہ قلمبند کیا ہے اس میں کچھ حصہ اپنی دوسری عربی تالیف شمامۃ العنبر فی ما ورد فی الهند من سید البشر سے نقل فرمایا ہے عربی میں سات دیوان [۱۱۳۹ھ] سبعۂ سیارہ

۱۲۰ اگز ہوگا۔ اسکی تعمیر فرانسیسی انجنیروں نے کی تھی جو نظام کی ملازمت میں تھے۔ سرینگاپٹم کے فتح ہو جانے سے جو زر غنیمت میر عالم وزیر کے حصہ میں آیا تھا اُس سے اُس نے اس تالاب اور بارہ دری اور دیگر عمارات کو تیار کرایا۔ صرف اسی باندھ میں آٹھ لاکھ لگا ہوگا۔ ان دونوں تالابوں سے شہر اور مضافات کو خوب پانی پہونچتا ہے۔ واٹر ورکس بھی یہاں قائم ہے اور نفع عام پہونچا رہا ہے۔ باغ عامہ نہایت خوبصورت آراستہ و پیراستہ نوبت پہاڑ کے دامن سے ملحق واقع ہے۔ وسط میں دو بڑے بڑے تالاب ہیں خوشنما دیوار چار طرف محیط ہے۔

ایک تالاب گندی پیٹھ خاصکر قابل ذکر ہے جو گولکنڈہ سے دو میل جانب شمال واقع ہے۔ ۱۹۰۸ء کے طوفان موسیٰ ندی کے بعد حکومت کے اہل حل و عقد کو یہ خیال پیدا ہوا کہ اس دریا کو کہیں روک کر اسکا زور و تلاطم کم کر دیا جائے۔ چنانچہ ۱۹۱۲ء میں ایک قابل ہندوستانی انجنیر کی تجویز سے شہر سے چند میل کے فاصلہ پر جانب شمال اسکو ایک مضبوط بند سے روک دیا گیا۔ ایک تند و پر زور طوفان خیز دریا کو جس سے تیس سو مربع میل زمین زیر آب ہوتی ہے سوا سو فٹ بلند دیوار سے روک دینا دنیا کے محیر العقول انسانی کارناموں میں داخل ہے اس سے دو غرضیں پوری ہوتی ہیں ایک تو یہ کہ شہر حیدرآباد اور سکندرآباد کو صاف و شیریں پانی نلوں کے ذریعہ سے بہم پہونچتا ہے دوسرے یہ کہ موسیٰ کے آئندہ طوفان خیز اور باعث ہلاکت ہو جانے کے مواقع بہت گھٹ گئے ہیں۔ اب موسیٰ میں صرف اتنا ہی پانی آتا ہے جتنا کہ گندی پیٹھ کی چادر سے زائد سمجھکر چھوڑ دیا جاتا ہے۔ وسعت و عظمت میں گندی پیٹھ حسین ساگر سے چار چند ہے بعض انجنیروں کا خیال ہے کہ کسی وقت آفت سماوی یا زلزلہ وغیرہ کے صدمہ سے (خدا نہ کرے) اگر یہ ایک سو چھبیس فٹ بلند بند ٹوٹ گیا تو گندی پیٹھ کا پانی شہر حیدرآباد میں بھر کر چارمینار کی بلندی سے بھی اونچا ہو رہے گا۔

سررشتہ آرائش بلدہ نے لاکھوں روپیہ کے مصارف اٹھا کر دو تین سال سے بعد ادائے معاوضہ وسط

نام سے لکھے حرمین شریفین و فارس و مصر میں انکی زندگی میں ان کے کلام نے بڑی شہرت و قبولیت پائی۔ سادات کے فضائل میں ایک جداگانہ کتاب سند السعادات فی حسن خاتمۃ السادات تحریر کی ہے۔ روضۂ شریفۂ خلد آباد کے آسودگان خاک و بزرگان کرام کا ایک تذکرہ روضۃ الاولیا کے نام سے لکھا ہے تسلیۃ الفواد ان کے تمام قصائد کا مجموعہ ہے حدیث پاک سے توغل تھا صحیح بخاری اکثر زیر مطالعہ و زیر عمل رہتی تھی، اُس کی ایک شرح

شہر کی گنجان آبادی کے ہزارہا ناموزوں اور بدزیب مکانات منہدم کرا دیے ہیں۔ اب ان کے بجائے حفظان صحت اور رونق شہر کا لحاظ رکھتے ہوئے ایک خوش آیند و آرام دہ وضع کے مناسب مکانات اور سڑکیں اور پارک وغیرہ بنائے جا رہے ہیں۔ امید ہے کہ تین چار سال کے اندر آرایش بلدہ کا یہ کام تکمیل پا جائیگا۔

۱۳۱ سنہ ۱۱۶۸ھ (سنہ ۱۷۵۵ء) میں نورالحسن ایک تالاب میں غسل کرتے وقت عین شباب میں غرق ہو گئے تھے آزاد نے ان کا نہایت دردانگیز مرثیہ لکھا ہے ؎

قیامت بر سر این بوستاں رفت
کہ یک گل داشت آں ہم نوجواں رفت

۱۳۲ امیر حیدر کے باپ میر نورالحسن جب غرق ہوئے ہیں تو امیر حیدر تین سال کے تھے۔ سنہ ۱۱۶۵ھ (سنہ ۱۷۵۱-۵۲ء) کی پیدائش تھی اولاً تحصیل علوم بلگرام میں کی۔ اپنے دادا کے ماموں میر سید محمد شاعر سے اکتساب فضائل کیا۔ پھر اپنے جد امجد کے پاس اورنگ آباد چلے آئے اور وہیں تکمیل و تربیت ہوئی۔ آزاد کی رحلت پر بلگرام واپس آئے اور بود و باش اختیار کی کلکتہ پریسیڈنسی میں عدالت کل (سپریم کورٹ) کے عہدۂ افتا پر مامور تھے بنگالہ سے وطن آ رہے تھے کہ مرشد آباد میں ہاتھ میں ایک پھنسی (دانہ) نکلا جو اس جہان فانی سے انتقال کا سبب ظاہری ہوا۔ "وائے ویلا امیر حیدر رفت" سنہ ۱۲۱۷ھ (سنہ ۱۸۰۲ء) تاریخ وفات ہے جب مفتی امیر حیدر بلگرام میں تھے تو آزاد نے کئی خطوط ان کے نام عربی میں لکھے تھے جو آزاد کے دیوان میں موجود ہیں۔ مفتی صاحب کے ایک رسالہ "بیان مالیہ ہائے سرکار و تقابض اراضی حسب شرع محمدی" کا ترجمہ انگریزی اورینٹل مسلینی Oriental Miscellany مطبوعہ کلکتہ سنہ ۱۷۹۸ء (سنہ ۱۲۱۳ھ) میں میری نظر سے گذرا ہے۔ نہایت قابلیت و تحقیق کے ساتھ قلمبند کیا ہے عہد اکبر بادشاہ کی ایک نہایت مستند و مکمل تاریخ سوانح اکبری کے نام سے لکھی ہے جس کی مورخین و محققین فرنگ بیحد ستایش و تحسین کرتے ہیں۔

۱۳۳ تاریخ فرخ آباد مولفہ مفتی محمد ولی اللہ اور اتحاف النبلا مصنفہ نواب سید محمد صدیق حسن خاں او تذکرہ خازن الشعرا مضافہ شاہ محمد فاخر افضلی اور مسٹر بیل کی اورینٹل بیاگرافی کل ڈکشنری

اول کتاب سے لے کر آخر کتاب لزکوۃ تک ضوء الدراری[۱۴۲] تحریر فرمائی ۔ حضرت شیخ مجدد سرہندی کے مکاتیب میں سے بعض کا عربی میں ترجمہ کیا تھا۔

ان کے کلام کا بڑا حصہ مدائح و مناقب رسول اللہ صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم میں واقع ہوا ہے اس لئے یہ حسان الہند[۱۴۳] کے لقب سے مشرف تھے ۔

آزاد ہندی یا ہندوستانی (ریختہ یا اردو) میں شعر نہیں کہتے تھے وہ اسکو اپنے مرتبہ عالی

Oriental Biographical Dictionary اور اکثر مستند تذکروں اور تاریخوں میں آزاد کا سال وفات سنہ ۱۲۰۰ھ (۸۶-۱۷۸۵ء) لکھا ہے قطعہ تاریخ یہ ہے ۔ امام اہل سخن فخر اتقیا آزاد کہ بود سید والا نژاد نیک نہاد چو رخت بست ز دنیا بہ عالم عقبیٰ بیا بہ روضۂ قدسی ملک ندا در داد لیکن سہو کتابت یا عدم تحقیق سے ضلع ہردوئی کے گزیٹر مطبوعہ سنہ ۱۹۰۴ء میں صفحہ ۱۷۰ پر ۱۲۰۰ھ کی بجائے ۱۲۲۷ھ تحریر ہے میر شیر علی افسوس نے بھی آرائش محفل میں سنہ ۱۲۰۰ھ لکھا ہے



۱۳۴ھ ید بیضا غیر مطبوع ہے

۱۳۵ھ سرو آزاد مطبوعہ رفاہ عام اسٹیم پریس لاہور

۱۳۶ھ خزانۂ عامرہ مطبوعہ نول کشور پریس لکھنؤ ۱۸۷۱ء

۱۳۷ھ مآثر الکرام مطبوعہ مفید عام پریس آگرہ ۱۹۱۰ء

۱۳۸ھ سبحۃ المرجان مطبوعہ بمبئی ۱۳۰۳ھ ۔ جس کے ابتدائی اجزاء کا اردو ترجمہ موسوم بہ مظہر آزاد نول کشور پریس لکھنؤ میں ۱۸۷۸ء میں چھپا تھا

۱۳۹ھ السبعۃ السیارۃ کا انتخاب "مختار دیوان آزاد" کے نام سے مطبع آسی لکھنؤ سے ۱۳۲۲ھ میں شائع ہوا

۱۴۰ھ سند السعادات طبع ہو گئی ہے اور میرزا محمد شیرازی تاجر کتب بمبئی کے یہاں ملتی ہے

۱۴۱ھ روضۃ الاولیا مطبوعہ اورنگ آباد دکن

۱۴۲ھ ضوء الدراری شیخ شہاب الدین کی ارشاد الساری سے بزیادت بعض فوائد ملخص ہے۔

۱۴۳ھ حضرت حسان بن ثابتؓ کی کنیت ابو الولید تھی ۔ آپ انصاری خزرجی اور رسول مقبول صلی اللہ علیہ وسلم کے شاعر خاص تھے ۔ آپ کا شمار فحول شعراء میں ہوتا ہے ۔ ابو عبیدہؓ فرماتے ہیں کہ اس امر پر عرب کا اجماع ہے کہ حسان بن ثابت سب سے بڑے شاعر اہل مدر (دہات و صحرا والوں) میں سے تھے آپ کی شان جلالت و مرتبہ یہ ہے کہ حضرات عمر و ابو ہریرۃ و عائشہ رضی اللہ عنہم نے آپ سے روایت کی ہے سنہ ۵۴ھ (سنہ ۶۷۴ء) سے قبل زمانہ خلافت حضرت علی

سے پست و دُون سمجھتے تھے۔ اپنے تذکروں اور احوال میں وہ اپنی ہندی شاعری سے انکار بحت کرتے ہیں جو غزل ان کی طرف منسوب کی جاتی ہے اُس کی روایت بے اصل اور غیر مستند ہے۔ اِن کو قائم چاند پوری کا شاگرد بتانا محض بُہتان و اتہام ہے، اور ان کے خاندان کی خصوصیات و محفوظ روایات کے بالکل منافی۔ بازاروں میں ایک چند ورقہ رسالہ "گُربہ نامہ" نام ملتا ہے۔ اس میں چوہے بلی کا قصہ عوام یا نوعمروں کی تفریح خاطر کے لئے اردو میں قلمبند کر دیا ہے۔ صاف زبان ہے جابجا آیات قرآنی و احادیث بھی موجود ہیں۔ سادات و شیخ بلگرام کا نسب نامہ "شجرہ طیبہ" کے نام سے نہایت احتیاط و تحقیق کے ساتھ مرتب کیا ہے۔ ان کتابوں کے سوا آزاد کا دیوان فارسی، اور "کشکول اشعار منتخبہ" اور چند منظومات اور رسائل بھی انکی یادگار ہیں

مآثر الامرا کی ترتیب جدید اور اس کی تہذیب و تکمیل، آزاد کی حیات علمی کا ایک بڑا کارنامہ ہے اور انکی بقائے شہرت کی ضامن

آزاد کی پرورش اور تربیت، تعلیم و تعلم، رفاہیت اور امیرانہ گزران کے متعلق میر عبدالجلیل کے بہت سے حقوق آزاد پر تھے۔ اصل یہ ہے کہ میر عبدالجلیل نے ہی میر غلام علی کو "آزاد و سُحبان الہند" بنایا تھا یہ شہرہ و فضل انھیں کے فیوض و برکات سے حاصل ہوا تھا آزاد نے بھی ہر ممکن اسلوب سے ان حقوق کو ادا کیا اور ہر موقع پر ان کو یاد رکھا ہے۔ عبادات مالی و جانی ادا کی ہیں اور یدِ بیضا تو خاصکر میر عبدالجلیل کے تذکرہ و یادگار میں لکھا ہے۔ اس کے بیان کی تمہید میں معذرت کرتے اور فرماتے ہیں کہ:-

---

رضی اللہ عنہ و کرم اللہ وجہہ میں وفات پائی اور بعض لکھتے ہیں کہ ۵۴ھ میں سن مبارک ایک سو بیس سال کا تھا۔ ساٹھ سال جاہلیت میں گزارے تھے اور ساٹھ زمانۂ اسلام میں

جو شعرا رسول اللہ صلعم کی ہجو کرتے تھے انکا جواب حسان دیا کرتے تھے

خاقانی شروانی بھی آنحضرت صلعم کی مدح و نعت اکثر کیا کرتا تھا۔ وہ حسان عجم کہلاتا تھا

"برمطالعہ کنندگان ایں سطور مخفی و مستور نماند کہ علت غائی تسویدایں کتاب ذکر آنجناب تقدس مآب است پس اگر عندلیب ناطقہ زمزمہ سنج گشتہ داد درازنفسی بخشید کلیم وار معذور لذت گفتار است سہ

اعد ذکر نعمان لنا ان ذکرہ هو المسک ما کررته یتضوع "

تسلیۃ الفواد میں آزاد نے اپنے بہت سے قصائد اور مختلف مضامین وحالات جمع کئے تھے۔ ان میں سے کچھ سبحۃ المرجان میں بھی نقل کر دیے ہیں۔ میر عبدالجلیل کے تذکرہ اور قصائد واشعار مدحیہ نے اس میں بھی حصہ غالب پایا ہے۔ ایک زبردست قصیدہ سینتیس ۳۷ شعر کا لکھا تھا جس نے اُدبائے عرب سے بھی خراج تحسین وصول کیا۔ قصیدہ کا مطلع یہ ہے سہ

ادرک علیا لا لقاء منک یکفیه وطرفک الناعس المراض لیشفیه

ایک دوسرے محل پر میر غلام علی آزاد اپنے نانا کی مدح میں فرماتے ہیں سہ

ان فاض امواہ العراق فاننی اسعی علی راسی الی البحرین

اعنی یدی سلطان مملکۃ الندی ینصب عن هاتین ماء لجین

آزاد کا مفصل تذکرہ قلمبند کر چکا ہوں، قدرے تحقیق مزید اور نظر ثانی کی ضرورت ہے بارگاہ تعالی شانہ میں دست بدعا ہوں کہ اس عاجز ناکارہ کی محنت ٹھکانے لگے۔ اور وہ اوراق مطبوع ہو کر اہل علم کے حضور میں باریاب ہوں۔ آزاد کے کلام اور تصنیفات کو بہت سے قدر شناسوں نے اپنی توجہ اور عنایت اشاعت سے زندہ کر رکھا ہے ممکن ہے کہ خود آزاد کے احیاء و ابقا کا شرف تقدیر الٰہیہ نے فقیر ہیچمدان کے لئے ودیعت فرمایا ہو۔ سہ

زخیل دُرد کشاں غیر ما نماند کسے
بیار بادہ کہ ما ہم غنیمتیم بسے

ردّ و قبول

شیخ وجیہہ الدین اشرف، صاحب بحر زخار، موج احوال شمار ۰۰۰ میں تحریر کرتے ہیں کہ میر سید عبدالجلیل متخلص بہ واسطی، خواص اتقیا اور اجلّۂ علماء سے تھے۔ تزکیۂ قلب، تصفیۂ باطن، تقدس ذات اور جلائل صفات میں یگانۂ زمانہ تھے راقم اوراق زخار کو آپ کے حالات کے لکھنے میں توقف و تأمّل تھا۔ آپ کی ثروت ظاہری اور رفاقت و مصاحبت سلاطین پیش نظر اور وجہ تردد تھی۔ لیکن میں (شیخ اشرف) نے ایک شب حضرت سید غلام علی آزاد کو معاملہ (خواب) میں دیکھا کہ اپنی تصنیف مآثر الکرام کا نسخہ میرے سامنے رکھتے اور اپنے حالات کے متعلق اوراق دکھا کر فرما رہے ہیں کہ ان تین شخصوں کا حال ضرور لکھئے گا اور اس کے لئے اصرار فرمایا۔ صبح کو میں بیدار ہوا، کتاب کھول کر وہ جگہ نکالی۔ تحریر یہ تھا کہ بندہ آزاد نے علامی میر سید عبدالجلیل اور ان کے خلف الصدق میر سید محمد و نیز سید طفیل محمد سے تحصیل علوم کی ہے۔ اس لئے میں (صاحب تذکرۂ زخار) نے ان تینوں حضرات کا حال لکھ کر اپنی کتاب میں داخل کر دیا۔ خود میر صاحب کو درویشوں کی صف میں جگہ دی، ان کے فرزند رشید کو مریدان شاہ لدھا کے زمرہ میں، اور میر طفیل محمد کو متفرقات میں رکھا۔

صاحب بحر زخار نے میر جلیل کی بیعت علویہ اور طریقت اویسیہ و حمویہ کا بھی حوالہ دیا اور آپ کو مصاحب و محرم اسرار مرتضویہ بتایا ہے۔ آپ کے کمال و کلام اور وفات اور نعش کے متعلق خرق عادت کا بھی حوالہ دیا ہے۔ یہ واقعہ بھی نقل فرمایا ہے کہ حضرت کی رحلت کے بعد، ایک بار میر آزاد اورنگ آباد میں تپ محرق میں مبتلا ہو گئے تھے۔ بہت دن گزر چکے تھے اور تپ مفارقت نہیں کرتی تھی۔ ایک شب کو عالم رویا میں حضرت کو دیکھا فرماتے ہیں کہ بیشک بہت تکلیف اٹھائی کل تپ جاتی رہیگی چنانچہ ایسا ہی ہوا۔

شیخ کا قول مختصر یہ ہے کہ[1] میر کو شعر گوئی میں مرتبۂ عالی حاصل تھا اور بلگرام[2] کا نام آپ ہی کے وجود فائض الجود سے شہرۂ آفاق ہوا۔

مصلی واعظم مفعو دتجیت بہ　　من لانظیر لہ فی الناس یخلفہ

ذکر خیر

میر صاحب کے حالات کم و بیش اکثر کتابوں میں پائے جاتے ہیں وہ شہرت و ناموری جو انکو زندگی میں نصیب نہیں ہوئی تھی مرنے کے بعد انکے حصہ میں آئی انکی قابلیت و سخن سنجی کی داد اہل فن اور اہل نظر نے دی اور کمالات کا اعتراف کیا ہے۔ بے شبہ میر کے نام کے احیا اور انکو حیات ابدی بخشنے میں آزاد اور انکے قلم نے دم عیسوی کا کام کیا ہے اور انکے بعد مقبول ستھام گمنام نے لیکن کچھ ایسے حضرات بھی ہیں جنکو آزاد کے بعض اقوال و تحریرات سے اختلاف رہا ہے مگر میر جلیل کے متعلق وہ بھی متفق المدح اور رطب اللساں ہیں (۱) تاریخ آرائش محفل (۲) منتخبات ہندی و ہندوستانی برائے ترجمانان فوج مطبوعہ کلکتہ ۱۸۲۷ء (۳) جامع التواریخ (۴) حدیقۃ الاقالیم (۵) تاریخ فرخ آباد۔ مولفہ مولوی محمد ولی اللہ حسینی مفتی (۶) گلشن بیخار (۷) الفرع النامی من الاصل السامی، مصنفہ نواب صدیق حسن خان میں میر اور میر کی شاعری کا حال درج ہے (۸) نواب صاحب نے غصن البان المورق بمحسنات البیان، مطبوعۃ الجوائب، قسطنطنیہ ۱۲۹۶ھ میں میر کی بعض لطیف عربی تاریخوں کا ذکر کیا اور (۹) تذکرہ شمع انجمن میں بڑے احترام سے یاد کیا ہے (۱۰) انتخاب اشعار سراپا موسوم بہ ارمغان گوکل پرشاد مطبوعہ کانپور بھی میر کے اس رنگ کے کلام سے خالی نہیں رہا مسٹر طامس ولیم بیل نے (۱۱) مفتاح التواریخ فارسی تالیف ۱۲۶۴ھ ۱۸۴۸ء اور (۱۲) تذکرہ مشاہیر شرق The Oriental Biographical Dictionary 1881 میں میر کے سوانح و احوال تحریر کیے ہیں (۱۳) میر حسین دوست سنبھلی نے جو آزاد کے ہم عصر تھے تذکرہ حسینی (شعرا) میں میر جلیل کو "سر حلقۂ علمائے نامی عمدہ بلغائے زمان، قدوہ کمالات و سنگاہ" لکھا ہے۔

پایانِ سخن

عذر و شکر

کارسازِ حقیقی کا شکر ہے کہ منزل ختم ہوئی اور قلم کا مسافر تھک کر بیٹھ گیا جسکے آہنگ بلند سے کبھی مُغنی کی دیہ، صدا آتی تھی ؎

لَأَسْتَسْهِلَنَّ الصَّعْبَ أَوْ أُدْرِكَ الْمُنَى   فَمَا انْقَادَتِ الْآمَالُ إِلَّا لِصَابِرِ

اُسکی نگاہ کے سامنے کوئی فراخ دست میدان نہین، بلکہ ایک پُرخار خطۂ دشت تھا جس کے طے کرنے کیلئے وہ کبھی چلا کبھی بھاگا اور کبھی بیتابی سے دوڑا۔ بالآخر اُسکی آبلہ پائی نے جواب دیدیا اور وہ باہمت، ہمت ہار گیا۔ ہر چند کہ حوصلہ شایستۂ رُسوائی نیست! الرفیق ثم الطریق مشہور مقولہ ہے مگر اِس دلیر مسافر نے یکہ و تنہا قدم نکالا تھا اور اِسی طرح اِس دیارِ بیگانہ سے گزار کیا۔ توفیقاتِ ربّانی اور تائیداتِ یزدانی نے دستگیری و رہبری فرمائی اور وہ یہ کہتا ہوا مرحلۂ مقصود پر پہونچ گیا ع

مُژدہ باد اہلِ ریا را کہ زمیدان رفتم - اس نے اپنی منزل کس طرح طے کی؟ اِس کا فیصلہ اِس وقت نہین بلکہ غالباً میرے بعد، اہلِ نظر کرین گے، مین نہ لذتِ عاجل کا طالب ہون نہ مسرتِ آجل کا متمنّی محنت کی داد اور کام کی قدر و تحسین کی آرزو مجھکو نہ اب ہے نہ شاید کبھی ہوگی ؎

دل لذّتِ طلبم ذوقِ جراحت می خواست   لختِ ہائے دل خود را بہ نمکدان زدہ ام

دُنیا معترضین سے خالی نہین۔ اگر جاننے اور سمجھنے والے نکتہ بینی و نکوہش فرمائین تو مجھ ایسے ہیچ میرز کے لئے سرمایۂ صد نازش اور موجب فخر و امتیاز ہے لیکن ستم ظریفی تو یہ ہے کہ بعض مدعیان ہمہ دانی (بھی) جو تصنیف و تالیف کے دشوار گزار کوچہ سے نابلد و ناآشنا ہوتے ہین

ترجمہ: مین دشواریوں کو ضرور آسان سمجھتا رہوں گا، یہاں تک کہ اپنی آرزوؤں کو پورا کرلوں۔ کیونکہ صبر کے ساتھ کام کرنیوالے کی سوا امیدیں اور کسی کے قابو مین نہین آتیں۔

اور جن کو چند سطریں صحیح یا غلط لکھنے کی نوبت، اتفاق سے آتی ہے خوردہ گیری اور عیب جوئی کو اپنا جوہر و شعار بنا لیتے ہیں۔ للہ الحمد کہ اس فقیر آزادہ رو کو نہ تحسین ناشناس کی آرزو ہے نہ سکوت قدرشناس کی شکایت ہوگی۔ میں تو بلبل شیراز کا ہمنوا ہوں ع دل نہی بخوب ما طعنہ مزن بزشت ما۔ میں اپنی تقصیرات و فروگزاشتوں سے بے خبر نہیں۔ آگاہی ہے کہ اس آوارہ گردی و بادیہ پیمائی میں بارہا غلط روی و کج راہی کا شکار ہوا ہوں۔ اس لئے مجھے قارئین کریم النفس سے محض عفو و مکرمت کا مترصد و متوقع رہنا چاہئے ؎

خوے آدم دارم، آدم زادہ ام — آشکارا دم زعصیان می زنم

عذر۔ بزرگان فرنگ کا دستور ہے کہ نقل و روایت کے وقت اپنی معلومات کا ذریعہ و ماخذ بتاتے جاتے ہیں میرے ہم وطن و ہم عصر صاحب قلم بھی اُن کا تتبع کرتے اور اس بارہ میں کوتاہی کرنے والوں پر زبان تعنت دراز فرماتے ہیں۔ اس ناچیز تذکرہ میں حتی الوسع اس عاجز نے بھی انکی تقلید کی ہے لیکن حواشی و اذیال بخت الصنن میں پوری پابندی نہ کر سکا اور اس التزام کو خیرباد کہنا پڑا ہے۔ ممکن ہے کہ بعض نکتہ بین حضرات کو اس سے ملامت و تشنیع کا موقع ملے ؎

یک زندہ دل نہ رفت سلامت زعیب جو — کین ماجرا بخضر علیہ السلام رفت

عذر مقبول اسی قدر ہے کہ اس پانسو صفحے کی کتاب میں ایسی باتیں بہت کم درج ہیں جو اس ہیچمدان ہی کی دست کی ذاتی واقفیت و معلومات پر مبنی ہوں، اِلّا ما شاء اللہ۔ ان اوراق میں سیاہ و سفید، رطب و یابس جو کچھ ہے وہ دوسروں ہی کے دست و بازو سے بہم پہنچا ہے۔ میں نے متقدمین و معاصرین کے خوان کرم سے زلہ ربائی اور خرمن علم سے خوشہ چینی کی

۱۲۵؎ حقیقتاً یہ معمول تو ہمارے ائمہ حدیث اور سلف صالح کا تھا (رضی اللہ عنہم) جو دور صحابہ سے... یورپ نے یہ دولت اکابر اسلام سے پائی اور اس کی پوری حفاظت و قدر کی۔ مصنفین متقدمین کی یہ رسم تھی کہ نقل و روایت کے ساتھ سلسلہ رواۃ کو بھی بتاتے جاتے تھے۔ وہ صرف کسی واقعہ کو بلکہ اس کے ہر ایک حرف کو بھی حدیث سلسلے سے ذکر کرتے تھے اس قسم کے محدثانہ پیچیدہ طرز بیان سے نہ تو مضمون کا تسلسل قائم رہتا تھا اور نہ عبارت کا لطف سننے والوں کی

کانٹون کو ہٹا کر چند برگ و گل چن لیے ہین اور اُن کو محل مناسب پر یکجا کر کے یہ دستۂ گل تیار کر دیا ہے۔ بندہ اپنی تنگ دامنی سے مجبور تھا۔ ورنہ خدا کے ہرے بھرے چمن مین مقبول دریوزہ ہ کے لئے نہ پھولون کی کمی تھی نہ کلیون کی۔ کہان تک اُن لکھنے والون کا حوالہ دیتا اور اپنے مآخذ و مسانید کو شمار کراتا جن کی تعداد احاد و اعشار سے تجاوز کر کے مآت تک پہونچتی ہے۔ مکنونات الٰہیہ کی ازلی و قدیم ترین کتاب سے لے کر جس کی اس عالم کی تنزلی عمر بھی ساڑھے تیرہ سو سال سے زائد ہی کل شام تک کی مفید مطلب تحریر جو میری نگاہ سے گذری ہی، مین نے اُس سے فائدہ اٹھایا اور اقتباس و استنباط کیا ہے اگر ہر ایک موقع پر ہر ایک راوی یا قائل کا نام لیتا جاتا تو تکرار بے سود کے علاوہ قرائے معظم کی بے لطفی و زحمت کشی کا باعث ہوتا۔ ناگزیر ضخامت کتاب بھی بڑھ جاتی۔ اس لئے مدعیانہ و حریفانہ نہین بلکہ نیاز مندانہ و مخلصانہ، اتنا عرض کر دینا ضروری سمجھتا ہون کہ اس عاجز نے بلا تحقیق و تجسس کچھ نہین لکھا ہے۔ بلکہ تا امکان خود متعدد و مختلف ذرائع سے اپنی معلومات کی توثیق کی اور اپنی تحریر کی صحت و صواب کا اطمینان کر لیا ہے ع زہر دیوانہ در زیر لب افسانہا دارم۔ روایات و منقولات کے مقابلہ مین معقولات یا اپنے معتقدات کو دخل نہین دیا ہے۔

شکر ہے مین جملہ بزرگان اہل قلم (الاحیاء منہم و الاموات) کا زیر بار احسان اور اُن کے رشحات قلم کا رہین منت ہون بعض اوقات مین نے اپنی کم نظری کے باعث چند حضرات کے کسی خیال یا تحریر سے اختلاف کیا ہی مگر یہ احساس باقی ہی کہ اس دریوزہ گر و کم مایہ نے انھین کے تیار کیے ہوئے خوان کرم و نعم سے فائدہ اٹھایا اور انھین کے خرمن علم و ادب سے

وسعت بڑھنے لگی تو رفتہ رفتہ یہ طریقہ بھی اُٹھتا گیا۔ ثمرا افاضل اور علمائے فن اس تغیر کو پسند نہین فرمایا وہ توثیق و استناد اور ضبط اعتبار و اعتماد کے لئے سلسلۂ روایات کے مسلسل متواتر و متوقع رہے۔ مگر شفقت بائین کی خواہش غالب آئی اور اس کا رواج گھٹتا گیا۔

ریزہ چینی کی ہے۔ الفضل للمتقدم کی مصداق یہی نام آور و عالی قدر ہستیاں ہیں، جنکے درخشاں کارنامے صفحات روزگار پر ہمیشہ ثبت رہیں گے۔ یہی ذوات گرامی ہمارے امتنان وتشکر کی مستحق ہیں۔ میقول عاجز بھی انھیں کی ہدایت و رہبری سے متنفع و مستفید ہوا اور اُن کے نقوش قدم پر چلا ہے۔ ترک ادب یا اعتراض، حتےکہ سوء ظن بھی اس عصیاں کار کا شیوہ نہیں۔ معہذا، جانتا ہوں کہ ناشکری و کفران نعمت کی جز اعیب جوئی و خوردہ گیری کے سوا کچھ نہیں۔ مجھے ایک ممتاز جرمن فاضل کا قول یاد ہے جس نے اپنے سے بھی زیادہ ممتاز اور متبحر علوم باپ کے سایۂ شفقت میں تعلیم و تربیت پائی تھی۔ اس بلند فطرت انسان نے جب ایک اعلیٰ درجہ کی ادبی تصنیف شائع کی تو اس کی شرح و تحشیہ میں اپنے مطالعہ یا اپنے خیال کے اظہار کا آغاز ان کلمات سے کیا تھا (qutzdissime qater meus)

"پوئی ڈسی می پیٹر می اس" "بابائے بزرگ نے کمال غلط کاری سے" یا "پدر مکرم نے بدترین ذوق سے" صریحاً مقصود یہ تھا کہ میں علیٰ سبیل البدل (اس کی بجائے) یہ تجویز کرتا ہوں ایسی رائے زنی یا خودستائی و خود پسندی دور حاضرہ کی روز افزوں روشنی اور کمال ارتقاء و تہذیب کا نتیجہ سمجھی جائے یا فطرت کی نیرنگی کا اقتضاء، لیکن اکبر مرحوم اس کو درس عبرت و بصیرت بتاتا ہے ؎

یہ جو ہنگامہ ہے جبکی ہر طرف تائید ہے — آپ کی تعلیم ہے اور آپ کی تقلید ہے
مستحقان ادب کو آپنے رسوا کیا — آپکے اصول عظمت کی بھی اب تردید ہے

میں ان تمام ارباب ادب و اصحاب علم کا منت شناس و سپاسگزار ہوں جنھوں نے اس کتاب کی تالیف کے دوران میں میری ہمت افزائی کی، اور نیک مشوروں اور صحیح معلومات سے دستگیری و اعانت فرمائی ہے۔ حبیب لبیب مولوی زبید احمد صاحب ادب العربیہ خطیب جامعۂ الہ آباد، جن کا نام نامی آغاز کتاب میں آچکا ہے، بالخصوص قابل ذکر ہیں جن کی متواتر و مسلسل تحریک نے مجھے مشتغل رکھا اور اس ناچیز تذکرہ کی اشاعت و عجلت

کے لئے ایک بہتر صورت تجویز فرما دی۔

صاحب مناقب فاخرہ مولانا حکیم سید اسحق علی پروفیسر نے بہ کمال شفقت ان اوراق پر نگاہ ڈالی اور اپنے فیضان کمال سے حتی الوسع مجھے جادہ مستقیم پر گامزن رکھا۔

عزیز محترم منشی محمد شبیر علیخان کا بھی رہین منت و کرم ہوں جن کی توجہ و التفات سے تذکرہ ہذا کی کتابت بہ آئین بہین تذکرہ نگار کی نظروں سے دور مقام پر ہوئی اور جنھوں نے باوصف اشتغال خدمات سرکاری کبھی دریغ عنایت نہ فرمایا۔

بااین ہمہ سعی و کاوش اس حقیر مجموعہ میں بہت سی غلطیاں اہل نظر کی نظر سے گزریں گی کچھ تو کاتبین کرام (کاپی نویسوں) کے طفیل میں مگر زیادہ تر خود اس غلط کوش کی بدولت سیدنا عمر فاروق رضؓ کا قول ہے رَحِمَ اللّٰہُ مَنْ اَھْدیٰ اِلَیَّ عُیُوْبِیْ خدا اُس کا بھلا کرے جو میرے عیبوں کا تحفہ میرے پاس لائے میں اُن صاحبوں کا شکر گذار ہوں گا جو میری تقصیرات اور غلطیوں سے مجھ آگاہ فرمائیں گے ہوسکا تو طبع آیندہ میں ان کی درستی و اصلاح کر دوں گا۔ ورنہ "جس کسی کے دل میں جو کچھ آئے کہہ ڈالے کہ انسان اُسی امر میں قابل سرزنش ہوسکتا ہے جو اُسکے بس کا ہو" ؎

اَلَا لِیَقُلْ مَنْ شَآءَ مَا شَآءَ اِنَّمَا　　　　یُلَامُ الْفَتیٰ فِیْمَا اسْتَطَاعَ مِنَ الْاَمْرِ

۲۷ ذی قعدہ ۱۳۴۵ھ　　سمدن۔ (فتح گڈھ)

نامہ سیاہ مقبول

ملحقات

استدراک و اضافہ

تذکرہ ہذا کی کتابت وطباعت میں پورے دو سال صرف ہو گئے۔ جو بواخوش مقبول کو اس دوران میں بہت سی باتیں لکھنے کے قابل یاد آئیں۔ بعض طاق نسیاں میں محفوظ ہیں باقی سپرد قلم کیجاتی ہیں۔

قرائے کرام ان سطور کو خواہ یہاں رہنے دیں خواہ کتاب میں مناسب موقع پر نقل فرمائیں۔ حیات مستعار کا بھروسہ نہیں جو طبع آئندہ میں اضافہ و اصلاح کی امید رکھوں ؎

از ہستی ما ہمیں نمونہ است چو موج　　نقشے است وجود ما کہ برآب زدند

آخر جمادی الآخر ۱۳۶۲ھ
مقبول

حصہ اول

صفحہ ۱۰، نوٹ ۳۴۔ اضافہ (آخر میں۔)

ذیل کی انتقادیہ ونتائجات بھی قابل ذکر ہیں

(۱) ہیملٹن Capt A Hamilton نے سیاحت ہند کی

ایک کلید تیار کی تھی جو ۱۸۲۰ء میں کیمبرج سے دو جلدوں میں شائع ہوئی۔
(۲) ایک جدول تقاویم ۱۸۳۵ء میں کلکتہ میں چھپی تھی۔ اسمیں صوبجات بنگال، بہار، اوڑیسہ، بنارس و دیگر ممالک مقبوضہ و مفتوحہ میں جو مختلف سال رائج تھے انکی تاریخیں بالمقابل درج تھیں۔
(۳) احاطۂ بمبئی میں جو مختلف سن یعنی عیسوی، ہندی، اسلامی و پارسی مستعمل تھے انکی متوازی و متقابل تاریخوں کا ایک زائچہ "جدول تقاویم" کے نام سے پوری ایک صدی کا (از ۱۷۵۲ تا ۱۸۵۲) بمبئی سے ۱۸۵۰ء میں شائع ہوا تھا۔
(۴) بوناڈ W. A Bonnaud نے بھی ایک جنتری ہندوستان کے مختلف سالوں (سنون) کی ۱۸۴۸ سے لیکر ۱۸۵۵ تک کی ۱۸۷۵ء میں مرتب کی تھی جو کلکتہ اور بمبئی دونوں مقامات سے شائع کی۔
صفحہ ۱۴۱۔ نوٹ ۲۷ متعلق سمدن۔ اضافہ (آخر میں)
"قنوج کی ہندو سلطنت کا وہ بڑا اور قدیم صومعہ اور آشرم جو ہندوستانی تہذیب و شایستگی اور تربیت و آموزش کا سرچشمہ تھا، اور جسکا شمار ہندوستان کے لئے آرہونکے بخشے ہوئے بڑے بڑے فیوض و برکات میں ہوتا ہے اسی موضع میں اُس بلند مقام پر تھا جہاں اب بڑی عیدگاہ واقع ہے۔ اس خانقاہ با متی تو اس کے گرد جنگل تھا جہاں مرتاض رشی مع اپنے کنبہ و خاندان کے رہتے تھے۔ انکے گوشہ عافیت مساکن "تپوون" کہلاتے تھے۔ ان مقدس ہستیوں کی توجہات تمام تر توسیع و ترقی علم اور حسن سیرت و نکوئی اخلاق کے سکھانے اور پھیلانے پر منعطف و مصروف رہتی تھیں۔
پرچم اسلام تو اس مقام پر محمود غزنوی کے عہد دولت میں بلند ہوا ہے لیکن سب سے پہلا مسلمان جس کے قدم سمدن کی خاک نے چومے تھے زید بن عمر

کلابی تھا جو پہلی صدی ہجری کے آخر یعنی تقویم مسیحی کی آٹھویں صدی کے آغاز میں ولید بن عبد الملک اموی خلیفہ دمشق کا فرمان لیکر سفیرانہ حیثیت سے قنوج کے راجہ کے یہاں گیا تھا۔ تاریخوں کے پڑھنے والے جانتے ہیں کہ محمد بن قاسم اول مجاہد و فاتح ہندوستان نے سندھ سے اپنے سپہ سالار ابو حاکم شیبانی کو ان اطراف میں دعوت اسلام اور اعلائے کلمۃ الحق کے لئے روانہ کیا تھا۔ لیکن مختلف انتظامی وجوہ اور فوجی مصالح سے وہ خود تو اودے پور میں ٹھہر گیا اور اس اولوالعزم و بہادر جنرل (کلابی) کو ادھر بھیجدیا۔ اصابہ فی تمئیز اسماء الصحابہ میں جو علم رجال میں حافظ احمد بن حجر عسقلانی کی مستند و ضخیم تالیف ہے نیز کتاب الذیل میں اسحاق بن ابراہیم طوسی (جنکی عمر اسوقت ستانوے ۹۷ برس کی تھی) اور سرباتک بادشاہ ہند کی ملاقات و گفتگو کا حال مرقوم ہے۔ مگر اہل تحقیق عموماً اور امام ذہبی خصوصاً جو رجالی بھی ہیں محدث بھی اور عظیم الشان مورخ اور مصنف بھی اپنی تجریدمیں انکی یا (یوں کہئے کہ) سرباتک کی باتوں کو کذب واضح سے تعبیر کرتے ہیں۔ اس واقعہ اور مکالمہ کو اور بھی بہت سے راویوں نے کم و بیش نقل کیا ہے۔ عمر بن احمد بنیشاپوری کا قول ہے کہ سرباتک نے ۳۳۳ھ (۹۴۴ء) میں وفات پائی تھی۔ بہرکیف قابل وثوق ذرائع سے اسقدر ثابت ہے کہ اسحاق بن ابراہیم طوسی تبلیغ و ہدایت کے لئے اسیطرف ہوکر قنوج گئے تھے۔

چند سلاطین دہلی کو بھی سمدن میں ٹھہرنے یا گذرنے کا اتفاق ہوا ہے تاریخوں کی ورق گردانی خصوصاً فیروز شاہی (وترجمہ ڈوسن Dowson) و طبقات طبقات ناصری و طبقات اکبری و مبارک شاہی و فرشتہ وغیرہ کے مطالعہ سے اسکا پتہ چلتا ہے۔

لہ سمدن۔ تقریباً قنوج اور بھوج پور کے وسط میں ہے غیاث الدین بلبن کو

وہاں کے آنے جانے میں دو بار یہاں آنیکا اتفاق ہوا تھا۔ پہلے ۶۴۵ھ (۱۲۴۷ء) میں بزمانۂ وزارت بعد ازاں ۶۶۷ھ (۱۲۶۸ء) میں بطور شاہنشاہ۔

۲۔ جلال الدین خلجی نے جب الغ خاں پر فوجکشی کی تھی جسکا ذکر امیر خسرو نے مفتاح الفتوح (غرۃ الکمال) میں کیا ہے تو وہ ۶۸۹ھ (۱۲۹۰ء) میں سمدن ہوتا ہوا گیا تھا۔

۳۔ محمد جونا بن تغلق۔ پہلی مرتبہ سرگ دواری جاتے ہوئے ۷۴۶ھ (۱۳۴۵ء) میں دوسری دفعہ ۷۴۸ھ (۱۳۴۷ء) میں واپسی قنوج پر اور

۴۔ ناصر الدین محمد تغلق اٹاوہ جاتے ہوئے ۷۹۴ھ (۱۳۹۲ء) میں گذرے تھے۔

۵۔ محمود شاہ تغلق۔ ۸۰۴ھ سے ۸۰۸ھ (۱۴۰۱ سے ۱۴۰۵ء) پانچ سال تک قنوج میں مقیم فرمانروا رہا ہے سیر و تفریح کے لئے اس طرف اکثر نکل آتا تھا۔ وہ اس کشت زار کی لطافت و دلفریبی اور دلکشی کا بڑا معترف تھا سمدن کا پرانا اور شیریں کنواں اٹھ کونا اسی عہد کی یادگار اور فیض جاری ہے۔

۶۔ بہلول لودی یہیں سے دو بار شمس آباد گیا تھا۔ انہیں ہنگاموں یا کوکبہ شاہی کے غلغلوں سے متاثر و مرعوب ہوکر بعض سادات تلاش معاش اور ترک وطن کے لئے مجبور ہوئے تھے۔ بعض اہل شوق تحصیل و تکمیل علوم و فنون کے لئے باہر نکل گئے تھے صاحب شرائف عثمانی کا بیان ہے کہ میر غلام علی آزاد کے بزرگوں نے اسی زمانہ میں اور اسی ضرورت سے سمدن کو چھوڑا تھا۔

۷۔ شاہزادہ جوان دولت و اقبال ہمایوں مرزا جب بابر کے حکم سے سلطان محمد دہار خاں پر فوج لیکر گیا ہے تو سمدن میں فروکش ہوا تھا۔ یہ روایت مقامی سینہ بسینہ چلی آتی ہے کہ سمدن سے ساتھ ہمایوں کو اسی وقت سے الفت ہوگئی تھی حتی کہ جب وہ ایران سے واپس آیا اور ہندوستان کو پھر فتح کیا ہے تو سمدن کو یاد کیا اور اپنے رفقا سادات

مشہدی کو یہاں اقامت گزیں ہونے کا مشورہ دیا تھا۔

شاہ عالم بعض سیاسی وجوہ و مصالح سے خود تو یہاں نہ آسکا تھا مگر اُس نے اظہار ارادت و عقیدت کے لئے اپنا دیوان اشعار حجۃ الملۃ والامہ سید برہان الدین مولانا اتار اللہ برہانہ کی خدمت میں بھیجا تھا۔ شقہ مصحوب میں لکھا تھا کہ آپ کا آستانہ مدتوں سے زیارت گاہ خلائق اور مرکز فیوض و سعادات رہا ہے۔ آپ کا قصبہ کئی جہت سے ایک مخصوص امتیاز و شہرت رکھتا ہے۔ وہ علم کے لعل ہائے درخشاں کے لئے مدتوں سے بدخشاں اور فنون و کمالات کے لآلی آبدار کا معدن بنا ہوا ہے۔ (یہ شقہ بہ دستخط خاص شاہان سابق کے دیگر فرامین کے ساتھ میرے آبائی کتب خانہ میں محفوظ ہے)

فرخ آباد کے نواب رئیس بھی بڑی قدر و احترام ملحوظ رکھتے تھے انکی سرکار میں بعض باشندگان سمدن کو پورا اقتدار و اختیار حاصل تھا۔ مسلمانوں کی سلطنت میں ضعف آنے اور انکی دولت و قوت کے زائل ہونے کے ساتھ ساتھ سمدن کی عظمت ایک علمی و روحانی مرکز ہونے کی حیثیت سے روز بروز گھٹنے لگی حتیٰ کہ یہاں کے سادات و مشائخ کے بعض اخلاف سبحہ و سجادہ چھوڑ کر تلاش معاش اور تیغ و تفنگ اٹھانے پر مجبور ہوئے اور اس خرقہ پوش و طیلسان بردوش جماعت کے افراد چست فوجی وردی زیب تن کئے نظر آنے لگے تقریباً ڈیڑھ صدی یعنی امن و سکون کے موجودہ دور کے آغاز تک یہ مقام جنگی زاویہ نگاہ سے ایک اہم مقام رہا ہے مورخین متاخرین اسی حیثیت سے اسکی تقریب کرتے ہیں۔ شیخ مرتضیٰ حسین الہ یارخانی حدیقۃ الاقالیم (مطبوعہ نولکشور صفحہ ۱۷۳) میں اُس میدان کا نشان دیتے ہیں جہاں جولائی ۱۷۵۰ء میں نصیرالدین حیدر اُسکے بیس ہزار جنگ آزمودہ سپاہیوں اور سرداروں کو احمد خاں بنگش نے زبردست شکست دی تھی اور ہمیشہ یا کم از کم ایک زمانہ کے لئے نواب وزیرالممالک فرمانروائے اودھ کی حکومت اس قطعہ ملک سے اٹھا دی تھی۔

احمد خاں بن محمد خاں باغوائے افاغنہ . . . . شمس آباد کہ سرگروہ آں رستم خاں نام داشت
خروج کردہ و با راجہ نول رائے متصل سمدن رزمے صعب نمودہ او را بقتل رسانید"
انگریزوں کی نظر میں اسکی خاص وقعت تھی۔ اسکو بہت سے جنرلوں اور افسروں نے
سپرد قلم کیا ہے۔

(۱) ایڈورڈ تھارنٹن Edward Thornton نے جو ہندوستان
میں سلطنت برطانیہ کی تاریخ کا مشہور مولف ہے سرکار ایسٹ انڈیا کمپنی کی مقبوضات
اور اقلیم ہند کی دیسی ریاستوں کا گزیٹیر بحکم آنریبل کورٹ آف ڈائرکٹرس مرتب
کیا تھا اور جس میں خاص طور پر اُن وثائق و دستاویزات سے استنباط و استناد
کیا گیا تھا جو کمپنی کے قبض و تصرف میں تھے۔

A Gazetteer of the Territories under the Government of the East-India Company, and of the Native States on the continent of India. Vol IV, page 615.

اسکی جلد چہارم صفحہ ۶۱۵ مطبوعہ ۱۸۵۴ء لندن میں سمدن کا حال لکھتا ہے اور
گرین ایچہ (انگلستان) کی مساحت کے اعتبار سے عرض البلد ستائیس درجہ ساٹھ
دقیقہ اور طول البلد اُناسی درجہ چھیالیس دقیقہ بتاتا ہے۔
(۲) وہ لکھتا ہے کہ ایسٹ انڈیا کمپنی کی اکثر سرکاری تحریرات و دستاویزات
E. I. C. Mis Doc. میں اس کا ذکر موجود ہے معروف نام سمدن Sumdun
ہے مگر عوام کالانعام سمجن Sumjun بولتے ہیں۔ یہ ایک چھوٹا سا قصبہ
a small town شرق آباد کے پرگنا تو ی ضلع اور صوبجات شمال و مغرب کی

لفٹنٹ گورنری میں اُس سڑک پر واقع ہے جو کانپور سے چھاؤنی فتحگڈھ کو جاتی ہے۔

(۳) گارڈین اپنی کتاب "شوارع وسُبل" کے صفحہ ۱۲۱ پر۔

Garden. Tables of routes, 121

اسکے موقع و مناظر کو بیان کرتا ہے اور اُس کا فاصلہ قریب کی بعض لشکرگاہوں سے بتاتا ہے۔

(۴) کپتان آرمنڈی نے "قلم و پنسل کے نقوش" یعنی "ہندوستان میں ایک دورہ کا سفر نامہ" دو جلدوں میں لندن سے ۱۸۳۲ء میں شائع کیا تھا۔

Mundy (Cap -R)--Pen and Pencil sketches, being the Journal of a tour in India. London, 1832, Vol 1-44.

اسکی جلد اول کے صفحہ ۴۴ میں۔ اور

(۵) میجر ای سی آرچر نے اپنی سیاحت کی یادداشتیں نہایت مکمل لکھی تہیں جو "بالائے ہند اور بعض حصص کوہ ہمالیہ کے دورے - مع حالات دربارہائے امرائے ہند" کے نام سے لندن میں ۱۸۳۳ میں دو ضخیم جلدوں میں چھپی تہیں۔

Archer (Maj E C)--Tours in Upper India, and in parts of the Himalaya Mountains , with accounts of the Court of the Native Princes. London. 1833. Vol. 1-43.

اسکی پہلی جلد کے صفحہ ۴۳ پر۔

یہاں کے راستہ کی عمدگی کا اعتراف کیا گیا ہے۔ زمین کے ہموار و مسطح ہونے اور لہلہاتے ہوئے سرسبز قطعات اور مزارع و مزارع کی تحسین کی ہے۔

حال کی تاریخوں میں سے سید بہادر علی جیبرا موی (راسخ اصدقی) کی لوح تاریخ

(۱۲۵۵ھ) رائے بہادر منشی کالی رائے ڈپٹی کلکٹر کے فتحگڈھ نامہ (مطبوعہ ۱۸۷۹ء) اور مسٹر ولیم آیروین کی انگریزی تاریخ نوابین بنگش فرخ آباد (۱۸۷۸ء) اور اسکے اردو ترجمہ (مطبوعہ حسنی پریس ۱۹۱۲ء) میں ان کا ذکر موجود ہے۔

حضرت قلندر کا خمیر پاک اسی خاک سے تھا جو وطن آبائی سے دور دیار شرق میں پیدا ہوئے اور آگرہ میں پیوند رہیں۔ ملا طاہر غنی کشمیری نے اس بلند پایۂ مصنف و شاعر کی شان میں فرمایا تھا ؎

از اہل سخن کس بہ قلندر نرسد در شعر بادہ حرفی بہ تستر نرسد

العجب ثم العجب! ایک نکتہ شناس بالغ نظر ان کو عرفی جیسے قادر الکلام سے بڑھا بتاتا ہے۔

زندۂ جاوید فیضی کی گور معطر رہے جس نے بزرگان سمدن کے حسب حال یہ شعر کہا تھا ؎

شدیم خاک ولیکن بہ بوئے تربت ما توان شناخت کزیں خاک مرد می خیزد

بہو بیگم صاحبہ زوجہ نواب شجاع الدولہ کی رحلت پر اہل کمال فیض آباد سے رخصت ہونے لگے تو استاذ الاساتذہ محمد محسن حقیقی اپنے میراثیوں سے فرخ آباد کا رخ کیا۔ رجب ۱۱۹۴ھ میں سمدن پہونچے۔ سادہ دل سادہ منش سیدوں نے کمال محبت و احترام سے اپنے غریب الوطن بھائی کی دل سے خاطر و مدارات کی۔ مہمان عزیز بھی ان کے خلوص و بے تکلفی سے متاثر ہوا۔ پھر وہ یہیں بس گئے۔ نواب رئیس (والی فرخ آباد) کے یہاں بھی سمدن ہی کے ایک باشندہ سید مراد نے تقریب و سعی کی۔ سمدن کے بعض خاندانوں میں مرثیہ گوئی کی بنیاد اسی زمانہ میں پڑی۔ ان سادات کے اخلاف تحت اللفظ پڑھتے ہیں اب تک اسی روش اجداد پر قائم ہیں۔

صفحہ ۵۲۔ نوٹ ۵۴۔ نواب مبارک خاں کا پورا قطعہ یہ ہے سہ

مالک ملک نظم شیخ نظام   شاعرے نادر و فصیح کلام
در قصیدہ شدہ ظہیر زماں   در غزل گشتہ خسرو ایام
بست رخت بقا ز ملک فنا   کرد آہستہ سوئے خلد خرام
کردم اندیشہ بہر تاریخش   خردم گفت "آہ آہ نظام" ۱۱۰۳ھ

صفحہ ۵۳۔ نوٹ ۵۵۔ آخر۔ شیخ سلیمان بلگرامی کی رحلت کا قطعۂ تاریخ مولانا ضمیری نے لکھا تھا سہ

سپہر جاہ و دولت اے سلیماں   کہ تاج مکنتش شد تا سر ماہ
شدہ پیمانہ اش پر چوں ذیقعد   بوقت رحمت حق اولیں ماہ
حدیث خلق و احسان و حیایش   شدہ افسانہ در عالم با فواہ
بسوے جنت عالی رواں شد   بحکم ایزدی آں طاب مثواہ
چو با جاہ و جلال خویش آں شیخ   گرفتہ جانب خلد بریں راہ
پئے تاریخ فوتش در بدیہہ   خرد گفتہ کجا آں شیخ با جاہ ۹۹۷ھ

دوسری تاریخ ایک مصرع "شمار سال و فاتش میان خلد بریں" سے نکلتی ہے

صفحہ ۵۵۔ سطر ۱۰۔ حاشیہ متعلق شیخ الہ یار (پسر شیخ عبدالسبحان)۔ (شہید ہونے کے بعد)

یہ واقعہ برسات میں عین دسہرہ کے دن ہوا تھا۔ شیخ روح الامین نے قطعہ تاریخ لکھا سہ

ناگہاں ہاتفے از در دکشیدآہ وبگفت   آبرو دادہ الہ یار بلشکر اسلام

سے تاریخ (۱۱۲۹ھ) نکالی تھی شیخ غلام حسین ثمین نے شعر آخر کو بدل کر دائرہ تاریخی تیار کر دیا

ناگہاں ہاتف غیب از سر اعلام بگفت   حرمتے دادہ الہ یار بفوج اسلام ۱۱۲۹ھ

صفحہ ۵۵ سطر ۱۳۔ اضافہ شیخ روح الامین کسی وقت نواب کمال الدین خاں کے مصاحب و رفیق تھے تین ماہ کے محاصرے کے بعد نواب نے قلعہ ستھر فتح کیا تو شیخ نے فی البدیہہ تاریخ لکھی سہ

چو تاریخش زعقل خویش جستم بگفت اہنگ شکست از پائے کفار ۱۰۰۲ھ

صفحہ ۵۸۔ سطر ۱۶۔ حاشیہ۔ رفع اشتباہ کے لئے یہ لکھدینا ضروری ہے کہ اسی نام (قاضی محمد یوسف) کے ایک اور مشہور بزرگ بھی بلگرام میں گزرے ہیں۔ جو قاضی بہکاری فرزند قاضی کمال کے بیٹے تھے۔ ۵ ذیقعدہ ۱۰۸۴ھ کو وفات پائی سید ضیاءاللہ نے تاریخ لکھی ؎

آہ قاضی یوسفم کو آہ آہ | پادشاداں او برضواں آلہ
درسن ہشتاد و چارم با ہزار | خامس ذیقعدہ رفت آں یار غار
سال فوت آں شریعت دستگاہ | آہ قاضی یوسف آمد آہ آہ ۱۰۸۴ھ

تاریخ بحساب مکتوبہ آہ قاضی یوسف آہ آہ سے نکلتی ہے۔ ایک (کا عدد) زائد معلوم ہوتا ہے اور لفظ آمد مادہ تاریخ سے باہر۔

صفحہ ۶۰۔ سطر ۸۔ اضافہ حاشیہ پر۔ تردی بیگ، نامور امرا و اعیان دولت سے تھا۔ اوائل جلوس اکبر بادشاہ میں حکومت و حراست دہلی پر مامور تھا ہیمو بقال کے معرکہ سے روگرداں ہوجانے یا منہ چھپانے کا اتہام لگاکر بیرم خاں نے بے اطلاع بادشاہ ۹۶۳ھ میں اسکو قتل کرادیا تھا یہی فعل خود بیرم خاں کے زوال و معزولی کا سبب ہوا۔

صفحہ ۶۷۔ سطر ۱۰۔ ترجمہ آیت کے بعد۔ اُس کا قول ہے ۲ العلم ۲ فضل ۲ النسب ۲ الشرف ۲ للقب۔ علم ہی بزرگ ترین نسب اور بہترین لقب ہے۔ اس شرف سے بڑھکر کوئی شرف نہیں۔ شرافت خاندانی کوئی چیز نہیں۔

صفحہ ۶۸۔ نوٹ ۶۲۔ سطر ۱۲۔ اضافہ۔ لاڈلی بیگم کا روضہ مسٹر بیل نے ۱۸۴۹ء میں دیکھا تھا۔ مفتاح التواریخ میں اسکے حسن تعمیر و استحکام کی تعریف کرتے اور ضروری حالات درج کرتے ہیں آگرہ کے دُو دولتمند بنیوں کی بدولت یہ رفیع الشان سنگین عمارت

اب صفحہ روزگار سے محو ہو چکی ہے۔ اسکی شاندار باؤلی، بلند چار دیواری، خوشنما گنبد اور عمارات، پر تکلف تہہ خانے سب کھد گئے۔ مقبرہ کا دمدمہ نہایت مضبوط تھا اور بے سے کھد نہ سکا تو سرنگیں لگا کر اُس کا اینٹ پتھر سب نکال لیا گیا۔ رہے نام باقی بس اللہ کا

صفحہ ۱۰۷۔ نوٹ ۴۰ کے آخر میں۔ ہندوستان کے اول مسلمان فاتح عماد الدین محمد بن قاسم نے ابو حاکم شیبانی کو ایک لشکر جرار کے ساتھ قنوج کی مہم پر بھیجا تھا وہ اودے پور تک (جسکو عربی مورخین اوذافر لکھتے ہیں) پہونچا تھا کہ سپاہیوں کی بے انتہا تکلیف و زحمت، تعب سفر اور تجربہ اسکو آگے بڑھنے سے روکا تو وہ اودے پور میں ٹھہر گیا اور اپنی طرف سے زید بن عمر کلابی کو سفیر بنا کر خلیفہ ولید بن عبد الملک اموی کے خط کے ساتھ قنوج بھیج دیا۔

مشہور مورخ Mill اپنی تاریخ ہندوستان جلد دوم (صفحہ ۳۵۰) میں یہاں لکھتا ہے کہ "اودے پور ایک کوہستانی قطعہ مابین اجمیر و مالوہ کے واقع ہے۔ یہاں کا رئیس اگرچہ مسلمانوں کی اطاعت کا اعتراف کرتا رہا ہے مگر حقیقت یہ ہے کہ پہاڑوں سے محفوظ ہونے کی وجہ سے اُس نے واقعی طور پر کبھی اطاعت نہیں کی تھی۔"

تھارنٹن Thornton لکھتا ہے کہ "اودے پور کا شاہی خاندان تمام راجپوتوں میں بیحد ممتاز و محترم رہا ہے۔ اس خاندان کو افتخار و دعویٰ ہے کہ اُس نے دہلی کی شاہنشاہی سے رشتہ و قرابت کرنیکا عار و ننگ گوارا نہیں کیا۔"

رینل Rennell اپنے تذکرہ سیر و سیاحت میں تحریر کرتا ہے۔ "رانا یعنی فرمانروائے اودے پور ہمیشہ راجپوت ریاستوں کا سردار شمار ہوتا رہا ہے ایسے راجہ بھی ہیں جو اُسکی برتری و تفوق کسی اور نہج پر تسلیم نہیں کرتے ہیں مگر قدیم الایام سے ان کا دستور بھی اطاعت و بندگی کا رہا ہے۔ ظاہر ہے کہ یہ ثبوت

راناکے مورثوں کے ہاتھیں اصلی نحوت کے موجود ہونے کا تھا جسکو سب مانتے ہیں
غالباً کسیوقت راجپوتانہ میں اسکے تحت میں ایک مُسَلّم بادشاہت یا شاہنشاہی
قائم تھی"

ٹاڈ Tod راوی ہے کہ "حکمران خاندان اور کُل قبیلہ اہل فارس کی نسل
سے ہے۔ پہلے گھلوت کہلاتے تھے جو انکے ایک سردار کا نام تھا۔ پھر سیسودیا کا لقب
اختیار کرلیا"

صفحہ ۱۰ سطر ۴۔ چتور پر نوٹ۔ حاشیہ۔ چتور گڈھ کا مشہور وزبردست قلعہ اودے پور
کے شمال ومشرق میں پینسٹھ ۶۵ میل کے فاصلہ پر اور چھاؤنی نصیر آباد سے ستر ۷۰ میل کے
قریب جانب جنوب واقع ہے۔ چھٹویں صدی مسیحی میں اسکو راجہ چترنگ نے تعمیر
کیا تھا۔ ترکوں اور مغلوں کے عہد میں یہ قلعہ اکثر جولانگاہ سپاہ بادشاہان رہا ہے
یہاں کی خونریزیوں سے اوراق تاریخ ہمیشہ رنگین رہیں گے۔

قلعہ جس پہاڑی پر واقع ہے تین ہزار فٹ بلند ہے۔ اسکا طول شمالاً جنوباً تین
میل کے قریب اور عرض شرقاً غرباً سوا دو میل ہوگا۔ دامن کوہ کی آبادی سے
ایک وسیع وہموار راستہ قلعہ کو جاتا ہے۔ اس راستہ میں تین موڑ پڑتے ہیں۔
اسوجہ سے قدرتاً چڑھائی کے بھی تین حصے ہوگئے ہیں۔ اسی طرح پھاٹک بھی
تین رکھے گئے ہیں۔ پہلا۔ پہاڑ کے دامن میں۔ دوسرا وسط میں۔ تیسرا قلعہ کی
بلندی کے قریب۔ ایک چھوٹا سا دروازہ (یا کھڑکی) مشرق کی سمت بھی تھا
جو اب بند کر (پاٹ) دیا گیا ہے۔ قلعہ کے آثار قدیمہ میں سب سے زیادہ قابل
توجہ دو منارے یا استمبھا ہیں جنکو فرمانروایان وقت نے اپنی فتح کی یادگار میں
تعمیر کرایا تھا۔ پورب طرف کا منارہ اگرچہ نہایت قدیم ہے لیکن جو منارہ قلعہ کے
غربی پہلو میں ہے اُس سے زیادہ عظیم الشان بلند اور خوشنما ہے۔

انگریز اہل قلم لکھتے ہیں کہ اسکو پندرہویں صدی مسیحی کے وسط میں یہاں کے راجہ کونبھا نے محمود خلجی پر فتح پانے کی یادگار میں تعمیر کیا تھا (مگر تاریخی نقطہ نظر سے نجے اس واقعہ کے اس زمانہ کو صحیح ماننے میں تامل ہے)۔ اسکی بلندی اکتالیس گز ہے۔ آٹھ گز کے مربع چبوترے پر یہ قائم ہے۔ حسب دستور اسکے اندر زینے اور دریچے بنے ہوئے ہیں۔ ان سے کوسوں تک کے خوشنما اور دلکش مناظر نظر آتے ہیں۔ اسکی بیرونی سطح پر سنگ تراشی اور نہایت عمدہ مینت کاری کی گئی ہے۔ بہت سی مورتیں بنی ہوئی ہیں لیکن اب انکے چہرے صاف طور پر نمایاں نہیں۔ انگریز کہتے ہیں کہ مسلمانوں نے اپنی فتح ہو جانے پر ان بتوں کے چہرے بگاڑ دیے تھے۔

صفحہ ۱۱۵۔ پانچویں سطر کے بعد اضافہ۔ سلطان احمد شاہ بہمنی سادات کی بڑی تعظیم وتکریم کرتا تھا۔ ملا قاسم فرشتہ لکھتا ہے ؂

ندیدے کس از خویش و از اجنبی　　گرامی تر از اہل بیت نبی
بجاں معتقد بود سادات را　　ہماں اہل تقویٰ وطاعات را
یقینش قوی بود و دینش درست　　بجز داد گر یاری از کس نہ جست

صفحہ ۱۲۲۔ سطر آخر حضرت شہربانو۔ ترکی میں یہ نام اب بھی بہت مقبول ہے اور اکثر رکھا جاتا ہے مگر وہاں تلفظ اور املا دونوں "شہریان" رہ گیا ہے۔

صفحہ ۱۳۳۔ سطر ۸۔ قاضی سید نور اللہ شوستری پر حاشیہ۔ قاضی صاحب جملہ خصائل حمیدہ اور اوصاف پسندیدہ کے جامع اور تمام اصناف علوم معقول و منقول کے حامل تھے۔ علم وحلم کے سوا جودت طبع، صفائے ذہن اور زیرکی میں مثیل نہ رکھتے تھے۔ بیل لکھتا ہے کہ انصاف، نیک نفسی، حیا و تقویٰ اور تمام صفات شریفانہ آپکی ذات میں مجتمع تھیں۔ معاصرین کے کمال وکلام کی داد فیاضی سے دیتے۔ فیضی کی بے نقط تفسیر سو۲طع ۲لا لہام پر نہایت لطیف ونفیس تبصرہ

کیا تھا۔ حکیم ابوالفتح شیرازی کی سعی وسفارش سے اکبر کے دربار میں جگہ پائی اور شیخ معین کے بجائے قاضی مقرر ہوکر لاہور بھیجے گئے۔ اپنے زمانہ میں خائن اور بد دیانت قاضیوں اور مفتیوں کو اچھا سبق دیا تھا۔ رشوت کا دروازہ بند ہوگیا۔ اگرچہ مذہباً امامیہ تھے اور نہایت پابند مذہب، لیکن فقہ حنفی پر بھی عبور کامل حاصل تھا۔ مقدمات کا انفصال اُسی کے مطابق کرتے تھے۔ جہانگیر نے لاہور سے تبدیل کرکے اپنے لشکر کا میر عدل مقرر کر لیا تھا۔

۱۰۱۹ھ (۱۶۱۰ء) میں وفات پائی۔ آپ کا مرقد آگرہ میں مشہور اور مرجع اہل عقیدت ہے۔ اسی احاطہ میں اور بہت سی قبریں ہیں جنکے کتابے قابل دید اور عبرت آموز ہیں

صفحہ ۱۳۴۔ سطر ۷ متن کے خاتمہ پر۔ شرفائے بلگرام کو، سادات ہوں خواہ شیوخ، متوطن ہوں خواہ مہاجر، میر عبدالجلیل اور میر غلام علی کے خاندان کو بلگرامی الاصل ماننے سے ہمیشہ احتراز رہا ہے۔ وہ انکے طبقہ کو چُھٹّہ کے لقب سے ملقب بتاتے ہیں۔ انکے خاندان کے مراسم و رسوم اور طرز معاشرت برادران سادات صغراوی سے قطعاً جدا و مختلف رہی ہے۔

انکے نزدیک تمام پُرانی تاریخوں اور روایات اور متقدمین وسابقین کی تحقیقات و تحریرات سے ثابت ہو چکا ہے کہ سید صغریٰ کے صرف ایک ہی فرزند سید سالار نام تھے۔ جو سید السادات اور دُر یکدانہ جدالسادات کہلاتے ہیں تمام سادات صغراوی بلگرامی انہیں کی اولاد ہیں مگر میر عبدالجلیل نے اس قصیدہ (اور میر غلام علی آزاد نے اپنے تصنیف کردہ نسب نامہ سادات بلگرام موسوم بہ شجرہ طیبہ) میں سید محمد صغریٰ کا ایک اور فرزند سید عمر قائم کرکے اپنا سلسلۂ نسب پیوند کر دیا اور اپنے خاندان کے سادات کو بھی صغراوی بلگرامی قرار دیدیا ہے

بلگرام کی ایک نہایت پرانی تاریخ جامع البرکات نام ہے اسکے مولف شیخ برکت اللہ بن شیخ شاکر فرشوری رقم طراز ہیں "سید محمد واسطی از واسطہ بہ بلگرام تشریف آوردہ سکونت ورزیدند و میر محمد صغری یک پسر داشت بروایت صحیحہ سید سالار .... واز قوم تُھنہ سید عمر بعد آں سید حسین، باز سید نصیر، باز سید حسین، باز سید سالار، باز سید لطف اللہ لدھاکلاں، باز خداداد عرف دادن، باز سید محمود تُھنہ لقب بود ایشاں باز سید پیارا پسرے داشت مسمی سید حسین و سید حسن ہمعصر شیخ المشائخ حافظ کمال علماے دین متولی فرشوری بلگرامی۔ درہمیں عرصہ سادات تُھنہ در بلگرام آمدہ سکونت ورزیدند سید حسین بن پیارا پسرش لطف اللہ، باز سید کرم اللہ، باز سید لطف اللہ، باز سید نوازش علی شاہ لالہ میاں، باز شاہ رحم میاں۔ دوئی سید حسین بن پیارہ کہ بہ بلگرام آمدہ سکونت اختیار نمودند و قیام کردند"

صفحہ ۱۴۸۔ نوٹ ۱۲۷، فضائل خاں کا آخر۔ آزاد نے فضائل خاں کا اصلی نام نہیں لکھا۔ تحقیق مزید سے خیال ہوتا ہے کہ شیخ سلیمان نہ ہوں بلکہ میر ہادی سے مراد ہو۔ میر ہادی نے بھی بارگاہ عالمگیری سے فضائل خاں خطاب پایا تھا۔ انکے والد کا نام میر حاجی، وزیر خاں، شاہزادہ محمد اعظم کے دیوان تھے۔ میر ہادی ملا شیخ عبدالعزیز اکبر آبادی کے ممتاز شاگرد تھے اور علم و فضل میں یگانۂ زمانہ۔ عربی فارسی کے سوا ہندی میں بھی دستگاہ کامل رکھتے تھے۔ دربار سلطانی میں مختلف مناصب جلیلہ پر مثل میر منشی داروغہ کتب خانہ سرکاری و خانسامانی پر مامور رہے تھے۔ بڑے علم دوست تھے۔ آپکا دل و دماغ علوم اور کتابوں کا خزانہ تھا اور زبان مشاہیر کی ترجمان۔ ۱۰ ذیقعدہ سنہ ۱۱۱۴ھ کو رحلت فرمائی مدفن آگرہ تھا مگر اب مزار ہے نہ نشان مزار باقی ہے۔ ایک بے مثل و نادر کتاب خانہ یادگار چھوڑا تھا۔ اپنے استاذ معظم کی خدمت میں دم آخریں تک سجود و کمربستہ رہے۔ ملا عبدالعزیز جسوقت بستر مرگ پر تھے اسوقت بھی تالیف و تصنیف

میں مشغول تھے۔ وہ جو کچھ ارشاد فرماتے اسکو میر ہادی (فضائل خاں) اور محمد سعید اعجاز قلمبند کرتے جاتے تھے۔

صفحہ ۱۵۷۔ نوٹ ۱۳۳۔ آخر میں اضافہ۔ اپنی دلچسپی اور اہمیت کے لحاظ سے یہ عنوان زیادہ تفصیل و تحریر کا مستحق تھا۔

ہندوستانی موسیقی میں بہت سے راگ راگنیاں تال اور ٹھاٹ ہیں سنگیت گور و انکو کہتے ہیں۔ ہر صنف موسیقی کے ماہرین اُسی خاص صفت سے منسوب مشہور ہوتے ہیں مثلاً جو بین (وین) میں ید طولےٰ رکھتے ہیں بین کار اور رباب باز کہلاتے ہیں۔

تانسین یا میاں تانسین کو اکبر نے ۱۵۶۲ء میں مرزا کا خطاب دیا تھا۔ وہ رباب بجانے کے فن کا بادشاہ تھا اسکے کمال کے متقدمین و متاخرین سب معترف ہیں۔ اس کا گورو ہرداس سوامی تھا جو بندرابن میں جمنا کنارے رہا کرتا تھا۔ میں نے جو نام اوپر لئے ہیں ان میں سے ہر ایک فرد اپنے کمال فن میں فرد تھا۔ بیجو باورے کے گانے سے جنگل کے وحش و بہائم مسحور و متاثر ہوکر دوڑے چلے آتے تھے۔ گوپال نایک جب الاپتا اور دیپک راگ گاتا تھا تو چراغ خود بخود روشن ہو جاتے تھے۔ اہل فرنگ کہتے ہیں کہ آرفیوز یونانی Orpheus جب اپنا بربط بجاتا تھا تو ہیبت ناک و خونخوار درندوں کے دل پر چوٹ لگائے بغیر نہ رہتا تھا۔ وہ بھی وجد وکیف میں آجاتے تھے۔ آرفیوز یورپ کا بہترین مغنی تھا جس پر مغرب کی دنیائے موسیقی کو بڑا ناز ہے مگر مشرق کا وہ یکتائے فن جسکی ہنرمندی و کمال کا اعتراف یورپ کو بھی کرنا پڑا ہے تانسین تھا مسٹر پوپلے نے موسیقی ہند میں Music of India—H. A. Popley. اسکے متعلق بہت سی حکایات اور عجیب وغریب واقعات نقل کئے ہیں۔ وہ لکھتا ہے کہ ایک دفعہ

اکبر نے تان سین سے رات کا راگ گانے کی فرمایش کی۔ دوپہر کا وقت تھا چلچلاتی دہوپ پڑ رہی تھی۔ تعمیل حکم بغیر چارہ نہ تھا۔ تانسین نے گانا شروع کیا تو وہ جس مقام پر کھڑا تھا وہاں رفتہ رفتہ تاریکی و سیاہی دوڑ آئی اندہیرا چھا گیا۔ اُسکی آواز جہاں تک پہونچ رہی تھی تیرگی و ظلمت طاری تھی۔ خود اکبر کی آنکھوں کے سامنے اندہیری رات کا سماں چھایا ہوا تھا۔

صفحہ ۱۶۴۔ نوٹ ۱۳۶۔ اضافہ۔ آخر میں مفتی صاحب دو کتابوں کا حوالہ اور دیتے ہیں (۱) حاشیہ قاموس موسوم بہ القول المانوس۔ شیخ عبد الباسط بن خلیل حنفی نے سراج الدین بلقینی نے لکہا تھا۔ شیخ صاحب کا سال وفات ۹۲۰ھ ہے (۲) کسی اور فاضل نے بھی حاشیہ سعدی اور بلقینی کو یکجا کیا اور اُسکا نام القول المانوس شرح مغلق القاموس رکھا تھا۔

صفحہ ۱۶۸ سطر اول۔ حاشیہ متعلق نوشہرہ — اقصائے مشرق ہند میں بیٹھ کر اس مقام کی تحقیق میرے لئے دشوار ہے تاہم دو مواضع کا تذکرہ لابد ہے۔

ایڈورڈ تھارنٹن اپنے گزٹیر کی جلد دوم مطبوعہ ۱۸۴۴ء میں لکھتا ہے۔ نوشہرہ یا نوشہر سرائے۔ ایک نہایت وسیع کارواں سرائے اُس راستہ پر ہے جو لاہور سے کشمیر کو پیرپنجل کے درہ ہو کر جاتا ہے۔ خشت پختہ سے تعمیر ہے مگر پہاٹکوں میں سامنے کی طرف پتھر لگا ہوا ہے۔ ابتداءً ایسی مستحکم و محفوظ تھی کہ قلعہ اور کارواں سرائے دونوں کا کام دیتی تھی۔ لیکن اب شکستہ حال ہے۔ یہ دریائے ٹوہی یا ٹہوئی پر واقع ہے جو پینتیس یا چالیس میل جنوب و مشرق کو چل کر چناب میں گرتا ہے۔ پہاٹک کے ایک کتبہ سے واضح ہوتا ہے کہ اسکی تعمیر مغل شاہنشاہ اکبر کے حکم سے ہوئی تھی۔ نوشہر سرائے کا عرض البلد ۳۳ درجہ ۹ دقیقہ اور طول البلد ۷۴ درجہ ۱۷ دقیقہ ہے۔
ایف وان ہیوگل F. Von Hugel نے اپنے سیاحت نامہ کشمیر میں اور

مورکرافٹ Moorcroft نے سفرنامہ پنجاب و بخارا میں اسکا ذکر کیا ہے۔
ٹھارنٹن ایک دوسرے نوشہرہ کا نام بھی لکھتا ہے جو سندھ میں ایک قصبہ زیر حکومت
میر علی مراد کے تھا سکھر سے جنوب و غرب میں چہتر میل پر اور شکارپور سے اٹھاسی
میل پر جنوب و غرب میں۔ عرض البلد ۲۶ درجہ ۱۵ دقیقہ اور طول البلد ۶۸ درجہ ۵ دقیقہ
صفحہ ۱۷۱ نوٹ ۲ ۱۴۲۔ خاتمہ۔ مشاہیر کاملین میں چند حضرات اور مستحق تذکرہ ہیں جنکی
بدولت اس شریف فن نے خاک ہند کو کیمیا بنا دیا تھا۔

میر عبدالحی[1] مشہدی اکبر آبادی۔ کمالات شاعرانہ میں یگانہ تھے اور حلیہ علم و عمل
سے آراستہ و پیراستہ۔ اکثر فنون میں دستگاہ تام حاصل تھی ہمایوں کے عہد ہمایوں
میں منصب صدارت پر ممتاز ہوئے خط بابری مخترعہ بابر بادشاہ کو خوب جانتے اور
خوب لکھتے تھے۔

محمد یوسف[2]۔ قلم و خوش نویسی کا بادشاہ تھا۔ کابل میں پیدا ہوا۔ تربیت و نشو و نما
ہندوستان جنت نشان میں پائی حسن خط کے سوا شعرگوئی میں دخل کامل اور
سخن فہمی کا ذوق سلیم رکھتا تھا۔ اکبر بادشاہ کا منشی خاص تھا۔ سنہ [illegible]ھ میں ریعان
جوانی میں وفات پائی۔

خواجہ ابراہیم حسین[3]۔ بزرگ زادگان قصبہ بلہنی سے تھا نستعلیق نہایت عمدہ
لکھتا۔ اسکے کمال خوشنویسی نے کمال شہرت پائی تھی۔ دربار اکبری کے ندیمان خاص
سے تھا۔ عین شباب میں صفر سنہ ۱۰۰۱ھ میں اس جہان فانی سے رخصت ہوا۔

میر عبداللہ ترمذی[4]۔ شاہ نعمت اللہ ولی کی اولاد سے تھے۔ دینی علوم شیخ غیاث
اور مولانا راقمی سے حاصل کئے تھے۔ طریقت میں شیخ فیض اللہ چشتی سہارنپوری کے
عقیدتمند و دست گرفتہ تھے۔ ہفت قلم لکھنے میں استاد تھے بالخصوص نستعلیق میں بے
نظیر رکھتے تھے۔ دربار جہانگیری سے مشکین رقم خطاب پایا تھا ایک شعر پر فتوا

فرماتے ہیں ؎

وصفی تخلص من و مشکیں قلم خطاب ایں نامہا ز شاہ شہنشاہ یافتم

مختلف مقامات میں اکثر کتبے آپکی سحر طرازی و جادو نگاری کی یادگار اب بھی نظر آتے ہیں۔ سخنور و سخن فہم تھے۔ کلام نہایت دلکش و شیریں ہوتا تھا تاریخ مثنویان اور ایک دیوان اولاد معنوی یادگار اور میر محمد صالح کشفی اور میر مومن دو نامور و رشید فرزند چھوڑے تھے۔

۱۰۳۵ھ (۱۶۲۵ء) میں رحلت فرمائی۔ مزار آگرہ میں ہے۔ محمد صالح حسینی موصوف نے اسپر عالیشان گنبد بنوایا تھا متعدد قطعات تاریخ بخط نستعلیق کندہ ہیں۔

میر صالح مرد صالح اور الولد سر لابیہ کے پورے مصداق تھے۔ زہد و اتقاء و تقدس میں بے نظیر تھے زیور علم و فضل سے متحلی۔ مذاق سخن آبائی تھا۔ فن خطاطی بھی پدر نامور سے سیکھا تھا۔ مشکیں قلم موروثی خطاب سے مفتخر تھے۔ شاہجہاں کے امراء سے ملازمت سرکاری منظور کر لی تھی۔

آپکی تصانیف میں (۱) مناقب مرتضوی اور (۲) مجموعہ راز شہرت کافی رکھتے ہیں۔

۱۲۔ شعبان ۱۰۶۱ھ کو (۱۶۵۰ء میں) انتقال کیا۔ اپنے والد ماجد کے مقبرہ کے پہلو میں استراحت گزیں ہیں۔

صفحہ ۱۷۱۔ نوٹ ۱۴۳۔ فیروز نے قطعہ تاریخ بھی لکھا تھا ؎

اے دریغا کہ مشفق و مکرم عارف وقت خسرو بحر نوال

آں محقق مدقق دوراں آں مفتح دسرائے بلال

سال ہشتا دو چار در دینا کرد تلقین دین مبارک فال

چوں ندا در رسید از عالم غیب گشت پنہاں بسان آب زلال

اسم و تاریخش از خسرو جستم گفت ہاتف بدانکہ شیخ کمال

باش آزاد از غم فیروز صبر بہتر ازیں ملال مثال سنہ ۱۱۰۱ھ

صفحہ ۲۰۶-نوٹ ۸۳-امام ابوحنیفہ سطر ۵-کم وبیش انہیں حالات کو صاحب عجائب القصص نے بھی نقل کیا ہے اور وہ حوالہ محمد بن علی بن الحسین بن علی بن ابی طالب رضی اللہ عنہم کا دیتا ہے حضرت محمد سے مراد امام محمد باقرؒ کا نام نامی ہے۔

صفحہ ۲۵۱ سطر ۱۷-ملا انواں-اضافہ-درگاہ اب کسیقدر شکستہ حالت میں ہے اکبر کے عہد میں کنکر کے چوکوں سے تعمیر ہوئی تھی حسب معمول انگریزوں کا خیال ہے کہ یہ کنکر غالباً کسی قدیم عمارت سے لئے گئے ہونگے خواہ وہ ہندوؤں کی رہی ہو خواہ جینوں خواہ بودھوں کی چونکہ یہ مقام قنوج کے قریب ہے اسلئے زیادہ قرین قیاس یہی ہے کہ ملانوہ بھی بودھوں کے تابع رہا ہوگا جبکہ قنوج بدھ مذہب کا گہوارہ تھا۔

حصہ دوم

صفحہ ۲ سطر ۷ ہویدا است کے بعد اضافہ-شیخ مرتضیٰ حسین بلگرامی حدیقۃ الاقالیم صفحہ ۱۵۰ میں آزاد پر اعتراض یا ان الفاظ میں طعن کرتے ہیں "۔ ۔ در عہد سلطنت التمش سید محمد صغرا کہ جد سادات واسطی ساکنان محلہ سید واڑہ است وسلسلہ نسب خود را باو رسانیدہ ۔ ۔"

صفحہ ۱۵ سطر ۶-حاشیہ پر اضافہ-قلعہ بسنت گڈھ ۱۲ جمادی الآخرہ سنہ ۱۱۱۱ھ کو اولیائے دولت عالمگیری کے تصرف میں آیا تھا۔

صفحہ ۱۵ سطر ۱۲-حاشیہ-اضافہ-پرولی کا قلعہ بھی دکن میں ہے-۳-محرم سنہ ۱۱۱۲ھ کو فتح ہوا تھا ھذا نصر اللہ تاریخ فتح ہے۔

صفحہ ۲۲ سطر ۲۱-حاشیہ ادونی اضافہ-ادونی کا قلعہ شہر بیجانگر سے پچاس کوس اور شہر احمد آباد بدر سے ایکسو ستر کوس پر ہے مورخ فرشتہ اسکو قلاع دکن میں عدیم المثال بتاتا ہے سلطان مجاہد شاہ بہمنی نے اسکے محاصرہ کے لئے صفدر خاں سیستانی کو امیرالامرا بہادر خاں اور اعظم ہمایوں کی معیت میں سنہ ۷۶۰ھ میں بھیجا تھا-عالمگیر نے گول کنڈہ فتح کرنیکے بعد سنہ ۱۰۹۸ھ میں اس قلعہ کو

فتح کیا اور امتیاز گڈھ نام رکھا تھا "فتح اودنی نمودہ بادشہ دین پناہ" تاریخ فتح ہے۔

صفحہ ۲۹ سطر ۱۹۔ حاشیہ۔ مولانا قاسم خطاب، سید نجم الدین محمد نام کاہی تخلص تھا۔ عام طور پر میاں کالے کہلاتے تھے۔ مولد کابل تھا۔ فرماتے ہیں سہ

کاہی تو بلبل چمن آرائے کابلی　　　زاغ و زغن نہ کہ بہ ہندوستان شوی

تفسیر، تصوف، ہیئت، تاریخ اور موسیقی میں کامل مہارت رکھتے تھے۔ فن موسیقی میں بہت سی کتابیں یادگار ہیں۔ اکثر مشاہیر اساتذہ کی خدمت کی تھی۔ صغر سنی میں حضرت جامی کا شرف زیارت بھی حاصل کیا تھا۔ شاعری میں ایسی شہرت پائی کہ اسکا اور کمال دب گئے۔ سیر چشم و غنی مزاج تھے۔ مرزا عسکری والی بدخشاں نے اپنا تمام خزانہ (جو زر خطیر تھا) صلہ سخن میں عطا کیا۔ آپ نے دفعتاً سارا مال تقسیم و خیرات کر دیا۔ بھکر کی راہ سے ہندوستان آئے دربار اکبری میں رسائی ہوئی۔ ایک غزل (لازم فیل) کے صلہ میں بادشاہ نے ایک لاکھ تنکہ مرحمت فرمایا۔ اسکو بھی ایک ہفتہ میں بانٹ کر بیٹھ رہے۔ شاعرانہ نازک مزاج بھی رکھتے تھے بادشاہ قدر شناس کا حکم تھا کہ دربار میں جب کبھی کاہی حاضر ہو تو اسکو ایکہزار تنکہ بصیغہ پا مزد ملا کرے۔ طبع نازک پر گراں گزرا اور آپ برداشتہ خاطر ہوکر بہادر خاں (برادر خانزماں) کے پاس بنارس چلے گئے۔ کچھ مدت بعد وہاں سے آگرہ آئے اور پاؤں توڑ کر بیٹھے کہ اٹھنے کا نام نہ لیا۔ ایکسو دس سال کی عمر میں ۲ ربیع الثانی ۹۸۸ھ کو سفر آخرت اختیار کیا۔ ایک شاگرد مولانا قاسم بخاری نے "رفت ملا قاسم کاہی" مولانا عارفی نے "زجہان رفت قاسم کاہی" میر یوسف استرآبادی نے "خوش طبع" (۹۰۷ بکمی عدد یک) تاریخ کہی ملک الشعرا فیضی نے تاریخ نکالی۔

تاریخ وفات سال و ماہش جستم　　　گفتا دو یم از ماہ ربیع الثانی

مقبرہ آگرہ میں مدار دروازہ کے قریب تھا۔ اب نشان بھی باقی نہیں۔

دیوان ضخیم چھوڑا تھا۔ بوستان سعدی کے جواب میں "گل افشاں" مثنوی لکھی تھی۔

پہلا شعر یہ تھا ؎

جہاں آفریدہ بجاں آفریں   بجاں آفریں صد جہاں آفریں

اللہ عزاسمہ کے نام کا یہ معما لکھا تھا ؎

نیست از ہستیش کسے آگہ   اللہ کان لانہایۃ لہ

اسم نبی کا معمے اوپر مذکور ہوچکا ہے ؎

تازہ شرح را شگافتہ ام   از محمد بنی شگافتہ ام

میرا آزادنے بزرہ شرح لکھا ہے۔

ملاکاہی کے معاصرین اور معمے گو شاعر مولانا شہاب الدین معمائی گزرے ہیں۔ بابر بادشاہ کے ساتھ ہندوستان آئے تھے۔ جملہ علوم عقلی و نقلی میں فرد کامل تھے فن معما میں نظیر نہ رکھتے تھے۔ یہ کمال آپکے تمام کمالات پر غالب آگیا تھا۔ اس فن میں ایک نادر رسالہ لکھکر ہمایوں کو پیشکش کیا تھا۔ سخن فہم سلطان نے صلہ جنریٹ کے علاوہ یہ رباعی آپکی شان میں لکھکر بھیجی تھی ؎

نامت ز عجم رفتہ بملک عرب است   وز نامۂ تو در دل محزوں طرب است

ہرکس بدر آرد ز معما نامے   نام از تو برآوردہ معما عجب است

سنہ ۹۴۲ھ (۱۵۳۵ء) میں رحلت فرمائی۔ شہاب الثاقب تاریخ ہے۔ مدفن آگرہ متصل مسجد ہمایوں (کچھپورہ) امیر خسرو دہلوی کے مرقد پر آپ نے ایک لوح تاریخ کندہ کراکے نصب کرادی تھی۔

صفحہ ۴۳۔ سطر ۹۔ شادی دختر پر حاشیہ۔ تاریخ فیض بخش میں بھی لکھا ہے۔ شرائط صلح میں یہ طے ہوا تھا کہ شادی کے تمام انتظامات کا انصرام خود راجہ کرائے۔ اور بادشاہ کے لئے ایک لڑکی بھیجے جو عمر کے لحاظ سے محل سرائے سلطانی میں داخل ہونیکے قابل ہوچکی ہو۔

صفحہ ۱۰۷ سطر ۶۔ شیلان پر حاشیہ۔ شیلان دسترخوان یا خوان طعام۔ سفرہ۔ مجازاً محفل

طعام کو بھی کہتے ہیں۔

صفحہ ۸۱۔ سطر اول۔ پدماوت پر نوٹ۔ اس وفا شعار بہادر راجپوت رانی کا واقعہ حصہ اول میں صفحہ ۱۰۰ پر نوٹ نمبر ۸۲ میں مختصر اً حوالہ قلم کر چکا ہوں۔ پدماوت کا سب سے پہلا مصنف ایک نامور مسلمان شاعر ملک محمد جائسی تھا۔ یہ قصبہ جائس ملک اودھ میں ۹۱۷ھ (۱۵۱۲ء) میں پیدا ہوا تھا۔ انگریز اہل قلم لکھتے ہیں کہ پوربی ہندی میں یہ ایک عمدہ ایلی گوری ہے یورپ میں بھی اسکی کم و بیش قدر ہوئی ہے۔ فرانس کے ایک شہرۂ آفاق موسیقی نواز البرٹ رسل Albert Roussel نے بھی پدماوت کا ڈراما مرتب و تصنیف کیا تھا جو بانشر روش M. Rouche مشہور آپرا ڈائرکٹر کے زیر اہتمام دکھایا گیا تھا بعض ہندو اہل نظر حضرات کا قول ہے کہ اس ڈراما اور اپنے مصنفہ قصہ میں مصنف نے بعض مقامات پر تاریخ کی متعارف شاہراہ سے لغزش کی ہے تاہم اس نے پدماوت کی وفاداری بہادری اور نسوانی خوبیوں کو بہ آئین بہیں نمودار کیا ہے۔

صفحہ ۱۰۲۔ نوٹ نمبر ۹۵ کے آخر میں۔ ملا احمد ٹھٹوی جو ملا قاسم فرشتہ کا استاد تھا ٹھٹہ کا رہنے والا تھا تاریخ الفی اپنی یادگار چھوڑی ہے۔ مولانا عبدالرشید حسینی مدنی بھی اسی شہر ٹھٹہ کے باشندے تھے منتخب اللغات شاہجہانی آپکی تالیف ہے شاہجہاں آپکی بڑی قدر و احترام کرتا تھا۔

صفحہ ۱۲۳۔ متن آخر میں اضافہ۔ پنڈت تربھون ناتھ سپرو متخلص بہ ہجر۔ اودھ پنچ کے ایک طباع وجدت پسند مضمون نگار تھے کسی موقع پر ایک خط میں بے فصل کی بارش کے سلسلہ میں لکھتے ہیں

"…… ہاں آپ نے کچھ اور بھی سنا۔ فرخ سیر کے وقت میں ع
باران بار پدر ریزۂ قند و نبات
واللہ۔ اچھا چاشنی دار ابر تھا۔ مگر افسوس لکھنؤ میں ایسی بارش نہ ہوئی کہ ہر ایک

چھینٹے کے بعد فوراً منہ میٹھا ہوتا"

صفحہ ۱۳۱۔ سطر سوم کے بعد متن میں اضافہ۔ مولانا محمد فیض بخش اپنی تاریخ فرح بخش میں تحریر کرتے ہیں کہ قطب الملک سنی مذہب تھے۔

پانچ ہزار سالانہ حضرت شیخ محی الدین عبدالقادر جیلانی کی فاتحہ گیارہویں پر خرچ کرتے تھے۔ حالت اسیر و حبس میں جب خبر پائے کہ آج گیارہویں ہے تو کسی کسی امیر یا درباری کو لکھ بھیجتے۔ وہ اس کار خیر کے لئے روپیہ سید کے پاس ضرور بھیج دیا کرتا تھا۔ اپنی اسیری کے چار سال پورے کر کے اسی تاریخ پر قید ظاہری سے مخلصی پائی تھی۔

صفحہ ۱۳۷۔ سطر ۷۔ حاشیہ مرزا ایزد بخش رسا۔ یہ مرزا جعفر آصف خاں وزیر جہانگیر کے پوتے تھے۔ جملہ علوم و فنون میں کامل اور فصاحت و بلاغت و انشا پردازی میں یگانہ عصر تھے۔ عہد عالمگیری میں میر منشی رہے تھے۔ مدفن آگرہ حویلی ایزد بخش میں تھا جو اب محلہ بیلن گنج میں رابٹ صاحب کی کوٹھی کے نام سے مشہور ہے۔ تعویذ قبر ۱۸۲۹ء تک سلامت تھا جب اسکومسٹر ہیل نے دیکھا تھا۔

صفحہ ۱۵۳۔ نوٹ نمبر ۱۸۔ سطر ۱۸۔ اضافہ۔ طبقات اکبری میں لکھا ہے کہ صفر آغا نامی غلام سلطان محمود گجراتی نے جسکا خطاب خداوند خاں تھا سورت میں یہ قلعہ نہایت مستحکم و استوار ۹۴۷ھ میں دریائے عماں کے کنارے فرنگیوں کے فتنہ و فساد کے دفع کرنے کے لئے بنایا تھا۔ تعمیر سے پہلے نیز دوران تعمیر میں ان لوگوں نے بڑا شر و فساد برپا کیا تھا۔ تمام رعایا خصوصاً مسلمانوں کو بہت ستاتے اور تنگ کرتے تھے

صفحہ ۱۷۹۔ متن۔ آخر میں اضافہ۔

مولانا مفتی سید محمد ولی اللہ حسینی نے اپنی تاریخ فرخ آباد میں میر عبدالجلیل کو بڑی عظمت و ادب کیساتھ یاد کیا ہے۔ چند باتیں قابل نقل ہیں۔

(۱) حکیم جعفر جونپوری در شاہجہاں آباد بود۔ انتساب دارد بحکیم مصری کہ سرآمد اطبائے عہد بادشاہ اکبر بودہ۔ (نوٹ ۲۰۔ صفحہ ۲۰۔ تذکرہ ہذا۔ حصہ دوم متعلق حکیم جعفر)

(۲) نواب صمصام الدولہ خاندوران خاں کی مجلس میں معموں کے بارہ میں گفتگو ہو رہی تھی۔ نواب صاحب نے فرمایا کہ قرآن شریف میں رطب و یابس ہر چیز موجود ہے مگر معما کہاں ہے؟ ایک حاضر طبع درباری نے عرض کیا کہ اس (کلام پاک) کا اول بائے (ب) اور آخر سین (س) ہے۔ دونوں کا مجموعہ "بس" ہوا یعنی یہ کتاب تکمیل ہے۔ اور اس معمے کے استخراج کو امیرالمومنین سیدنا علی ابن ابی طالب سے منسوب کیا۔ اعتراض پیش ہوا کہ "بس" تو فارسی لفظ ہے آنجناب سے اس کا استخراج کیا معنی رکھتا ہے؟ حاضرین میں سے ہر شخص نے اپنی استعداد و فہم کے موافق جواب دئے۔ نواب کو انکے ماننے میں تامل تھا۔ حتیٰ کہ میر عبدالجلیل بلگرامی نے "بس" کا عربی ہونا ثابت کر دیا اور شہادت میں قاموس کا حوالہ دیا اور عبارت پڑھ دی۔ نواب مستطاب نے نہایت پسند فرمایا

چنانچہ مفتی صاحب فرماتے ہیں ؎

اول و آخر کلام اللہ — بائو سین آمدہ دو حرف شگرف
یعنی اے اہل دیں برائے شما — بس بود ایں کتاب بے حرف

(صفحہ ۴۰۔ سطر ۱۱۔ آخر۔ حصہ دوم تذکرہ ہذا)

(۳) جب ۱۱۳۵ھ میں اودہم بائی کے بطن سے احمد شاہ فرزند محمد شاہ پیدا ہوا تو میر عبدالجلیل بلگرامی نے تاریخ لکھی ؎

خسرو جم نشاں محمد شاہ — رتبہ افزائے تخت و تاج و نگیں
حق تعالے باو کرامت کرد — بادشہ زادہ شگفتہ جبیں
بہر تاریخ مصرعے گفتم — "شہر یار ملوک روئے زمیں" ۱۱۳۵ھ

(صفحہ ۴۹۔ بعد سطر ۱۶۔ تذکرہ ہذا۔ حصہ دوم ۔)

سطر ۸ صفحہ ۳ حصہ اول (نعت شریف کے چھٹے شعر کے دوسرے مصرع) میں "قدسی السان سرشت" کی بجائے "حاکی قدسی سرشت" بنا لیجئے۔

HAYĀT-I-JALĪL

OR

The Life, Teachings and Works of

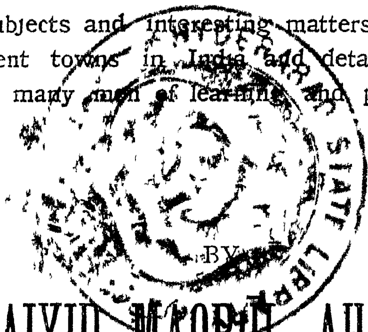
'ALLĀMA MĪR 'ABD-UL-JALĪL BILGRAMĪ

CONTAINING ALSO THE BIOGRAPHICAL SKETCHES OF

NAWĀB ĀSAF JĀH I of the Deccan, SAIYIDS HASAN 'ALĪ KHĀN and HUSAIN 'ALĪ KHĀN of Bāraha, MĪR SAIYID MUHAMMAD, SHĀ'IR and MĪR GHULĀM 'ALĪ ĀZĀD, BILGRĀMĪ

WITH COPIOUS NOTES ON

Several useful subjects and interesting matters and on numerous new and ancient towns in India and detailed accounts of many men of learning and power



BY

MAULAVĪ SAIYID MAQBŪL AHMAD SAMDANĪ,

Late Member of the Royal Asiatic Society of Great Britain and Ireland, Fellow of the Royal Society for the encouragement of Arts, Manufactures & Commerce, London, etc , etc

RAM NARAIN LAL,

Publisher and Bookseller.

ALLAHABAD,

1929